www.Paksociety.com
اپریل 2012
خواتین ڈائجسٹ
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com
سالگرہ نمبر
www.Paksociety.com

بھی سنیے	مدیرہ	14
کرن کرن روشنی	ادارہ	15
تمہارے نام	نادیہ خاتون	278

آپ سے کیا پردہ

جگنو میاں	انشا جی	20

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے	امت الصبور	267

مجھ سے ملیے

باتیں نور حسن سے	شاہین رشید	270

انٹرویو

فرحت اشتیاق	شاہین رشید	22

سالگرہ نمبر سروے

جو دل پر نقش ہیں	ادارہ	30

مکمل ناول

جو بچے ہیں	فرحت اشتیاق	148
دل و نظر کے سلسلے	سائرہ رضا	72

ناول

کوہ گراں تھے ہم	عنیزہ سید	36

ناولٹ

دھنک کے رنگ	عفت سحر	180
ساری بھول	راحت جبیں	116
مسافت	رمشا خالد	198
پریت نگر	سدرۃ المنتہیٰ	234

افسانے

چاندنی	بشریٰ رحمن	110
دل تک سفر	رخسانہ نگار	60
اک بیج جو	کرن نبیدی	139
بساط	اقبال بانو	172
سرشت عشق	ثمینہ عظمت	66
ایسا بہروپ	میمونہ الکبریٰ	232

نظمیں غزلیں

غزل	میثم علی آغا	262
نظم	حمیدہ شاہین	263
غزل	نعمان فاروق	263
غزل	محسن اسرار	262

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

رنگارنگ پھول

رنگارنگ سلسلہ	شگفتہ جاہ	264
خبریں وبریں	تبصیر نشاط	285

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے	خالدہ جیلانی	268

پکوان

آپ کا باورچی خانہ	فرح فاطمہ	274
موسم کے پکوان	خالدہ جیلانی	276

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں	عدنان	287

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے	امت الصبور	290

اپریل 2012

جلد 39 شمارہ 12

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

مدیرہ

کہی سُنی

اللہ تعالیٰ کے حضور سربسجود ہیں۔
خواتین ڈائجسٹ کا اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
40 واں سالگرہ نمبر
چالیس سال ایک طویل مسافت جو کامیابی کے ساتھ طے ہوئی، وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے کا عمل جاری رہا۔
کامیابی اپنی جگہ ایک بھرپور خوشی کن احساس ہے لیکن خوشی کے ساتھ ساتھ ایک طمانیت کا احساس بھی ہے کہ خواتین ڈائجسٹ نے کہیں سمجھوتے نہیں کیے۔ اپنی راہیں خود متعین کیں۔
اپنے معاشرے، اپنی روایات، اپنے ماحول اور اپنے لوگوں کی زندگی کی سچی اور حقیقی تصویر پیش کی۔ خواتین کے ذہنوں کو مسموم نہیں کیا۔ انہیں زندگی گزارنے کا، اوروں میں پھول کھلانے کا، محبتوں کو بانٹنے کا ہنر سکھایا، صبر و برداشت اور اپنی اقدار کی پاس داری کا درس دیا۔
یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم، اسی کی نوازشیں اور عنایتیں ہیں کہ آج خواتین ڈائجسٹ کو بلا جھجک گھر میں رکھا جاسکتا ہے اور ہر ایک وقت میں نسلوں کا پسندیدہ ترین پرچا ہے۔ ہماری قارئین اسے اپنا سب سے اچھا دوست سمجھتی ہیں، جو کسی بھی مشکل میں اپنوں سے بڑھ کر ان کی رہنمائی کرتا ہے۔
خواتین ڈائجسٹ کو ایک بامقصد اور دلچسپ پرچا بنانے میں سب سے بڑا تعاون اور حصہ ہماری مصنفین کا ہے۔ جن کی بے مثال اور بہترین تحریریں اس کی زینت بنیں، جو قدم بہ قدم ہمارے ساتھ رہیں، شکریہ کا لفظ ہمارے جذبات کی ترجمانی کے لیے ناکافی ہے۔ وہ ہماری دعاؤں میں شامل ہیں۔ ہم ان کی کامیابی اور خوشیوں کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعاگو ہیں۔
ہم اپنے قارئین کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں۔
بلاشبہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہمیں بہت ذہین اور باصلاحیت قارئین کا ساتھ حاصل ہے، خواتین ڈائجسٹ کے سلسلوں کے صفحات ان کی ذہانت اور صلاحیت کے گواہ ہیں۔
محمود ریاض صاحب جنہوں نے خواتین ڈائجسٹ کا اجرا کیا، محمود بابر فیصل، خادم محمود اور ہماری بہت سی مصنفین جو آج ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ ان کی مغفرت کے لیے دعا کرتے ہیں۔ قارئین سے بھی درخواست ہے کہ انہیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

اس شمارے میں،

- جو دل پر نقش ہیں، سالگرہ نمبر کا خصوصی سروے،
- آپ سب کی پسندیدہ مصنفہ فرحت اشتیاق سے ملاقات،
- سائرہ رضا کا مکمل ناول۔ دل و نظر کے سلسلے،
- فرحت اشتیاق کا مکمل ناول۔ جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو،
- راحت جبیں، عفت سحر طاہر، رمشہ خالد خان اور سعدیہ العنتبی کے ناولٹ،
- رخسانہ نگار عدنان، شمیمہ عظمت علی، کنیز نبوی، اقبال بانو اور بشریٰ رحمن کے افسانے،
- عنیزہ سید کا ناول۔ کوہ گراں تھے ہم، ڈرامہ سیریل ہم سفر کے خفر نورحسن سے باتیں،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر دلچسپیاں شامل ہیں۔

آپ کے خطوط نہ صرف ہماری حوصلہ افزائی کرتے ہیں بلکہ آپ کی آراء کی روشنی میں پرچے کو مزید بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ ہمیں خط لکھ کر ضرور بتائیے گا کہ ہم اپنی محنت میں کس حد تک کامیاب ٹھہرے۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے۔ اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

کیا غلام کے بدلے میں آزاد کو (قصاص میں) قتل کیا جائے گا؟

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس نے اپنے غلام کو قتل کیا ہم اسے قتل کر دیں گے اور جس نے غلام کے ناک کان کاٹے ہم بھی اس کے ناک کان کاٹ دیں گے۔"

قاتل جس طرح قتل کرے اس سے اسی طرح قصاص لیا جائے

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ۔
"ایک یہودی نے ایک عورت کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل کر اسے قتل کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس (قاتل) کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل دیا۔"

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "ایک یہودی نے ایک لڑکی کو اس کے چاندی کے زیوروں کے لیے قتل کر دیا۔ (ابھی فوت نہیں ہوئی تھی کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا۔
"کیا تجھے فلاں آدمی نے قتل کیا ہے؟"
اس نے سر سے اشارہ کیا کہ "نہیں" پھر دوبارہ (کسی اور کا نام لے کر) دریافت فرمایا تو اس نے اشارہ کیا کہ "نہیں" تیسری بار (اس یہودی کا نام لے کر) پوچھا تو اس نے سر سے اشارہ کیا کہ "ہاں۔"
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس (مجرم) کو دو پتھروں کے درمیان (سر کچل کر) قتل کروا دیا۔"

فوائد و مسائل:

1- پتھروں کے درمیان قتل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا سر پتھر پر رکھ کر اوپر سے دوسرا پتھر مارا جس

www.paksociety.com

سے وہ شدید زخمی ہو گئی اور بعد میں زخموں کی تاب نہ لا کر فوت ہو گئی۔
گواہی کے معاملے میں واضح اشارہ کلام کے حکم میں ہے۔ نماز میں اس قسم کا اشارہ کلام کے حکم میں نہیں۔
سزائے موت اسی طرح دی جائے جس طرح قاتل نے قتل کیا ہو۔

قصاص صرف تلوار سے قتل کر کے لیا جائے

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"قصاص صرف تلوار سے ہوتا ہے۔"

کوئی کسی کے جرم کا ذمے دار نہیں

حضرت عمرو بن احوص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا۔ "میں نے حجتہ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔
"سنو! کوئی جرم کرنے والا اپنے سوا کسی پر جرم نہیں کرتا۔ نہ باپ کے جرم کی ذمے داری اس کے بیٹے پر ہے' نہ بیٹے کے جرم کی ذمے داری اس کے باپ پر ہے۔"

حضرت طارق محاربی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا۔ "میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ بلند فرمائے حتی کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلوں کی سفیدی نظر آئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"سنو! کسی ماں کے جرم کی ذمے داری اس کے بیٹے پر نہیں۔ سنو! کسی ماں کے جرم کی ذمے داری اس کے بیٹے پر نہیں۔"

حضرت خشخاش عنبری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا۔ "میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا' اور میرے ساتھ میرا بیٹا تھا۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"تیرے جرم کی پرسش اس سے نہیں ہو گی اور اس کے جرم کی پرسش تجھ سے نہیں ہو گی۔"

حضرت اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"کسی جان کے جرم کی ذمے داری دوسری جان پر نہیں۔"

فوائد و مسائل

1۔ : مجرم کے جرم کی سزا اس کے باپ' بیٹے' بھائی یا دوست وغیرہ کو نہیں دی جا سکتی۔
2۔ مفرور مجرم کو پکڑنے کے لیے اس کے اقارب پر سختی کرنا شرعاً ممنوع ہے۔
3۔ مشکوک شخص سے اقرار کرانے کے لیے مناسب حد تک سختی کی جا سکتی ہے۔
4۔ مشکوک یا مجرم شخص سے اس کے شریک جرم ساتھیوں کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے مناسب حد تک سختی کی جا سکتی ہے' بشرطیکہ ایسے قرائن موجود ہوں جن سے اس کا مشکوک و مجرم ہونا ظاہر ہوتا ہو۔

جن چیزوں میں دیت نہیں

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"چوپائے کا پہنچایا ہوا زخم ہدر (رائیگاں) ہے اور کان (میں گر کر آنے والا زخم) ہدر ہے اور کنواں ہدر ہے۔"
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "آگ ہدر (رائیگاں) ہے اور کنواں ہدر ہے۔"

فوائد و مسائل

1۔ : عربی لفظ "هدر" کے معنی رائیگاں ہونا' بے کار' لغو' بے فائدہ اور بے مقصد ہو جانا' اسی طرح رائیگاں کرنا' بے کار اور بے مقصد بنانا ہیں یعنی یہ لازم اور متعدی دونوں معنوں میں مستعمل ہے۔
2۔ مویشی کے ہدر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کا

جانور چھوٹ کر بھاگ جائے اور اسی اثنا میں کسی کو زخمی کر دے یا ہلاک کر دے تو جانور کے مالک پر اس کی ذمے داری نہیں ہو گی۔ اس سے قصاص یا دیت کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔
2۔ معدنی چیزیں نکالنے کے لیے جو کان کھودی جاتی ہے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مزدور کان میں کام کر رہا ہے کہ اوپر سے پتھر گرا یا پیچھے سے پتھر گر کر راستہ بند ہو گیا جس کی وجہ سے وہ مزدور فوت ہو گیا۔ اس صورت میں کان کا مالک قاتل شمار نہیں ہو گا۔ اس پر قتل خطا والی دیت بھی لازم نہیں ہو گی۔
4۔ کنویں کے ہدر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کنویں سے پانی نکالنے کی کوشش میں کنویں میں گر پڑے یا کوئی اور ایسا حادثہ پیش آ جائے تو کنویں کا مالک ذمے دار نہیں ہو گا۔
5۔ آگ ہدر ہونے کی یہ صورت ہے کہ ایک شخص نے اپنی کسی ضرورت سے آگ جلائی ہوا سے اس کی چنگاریاں اڑ کر کسی کی چیز پر پڑ گئیں جن کو روکنا آگ جلانے والے کے بس میں نہ تھا۔ اس صورت میں آگ سے پہنچنے والے نقصان کی ذمے داری آگ جلانے والے پر نہیں ہو گی اور اس سے تاوان نہیں لیا جائے گا۔

قسامت کا بیان

حضرت سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ اپنے قبیلے کے بزرگوں سے روایت کرتے ہیں کہ۔
"حضرت عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ اور حضرت محیصہ رضی اللہ عنہ تنگ دستی کی وجہ سے (روزی کی تلاش میں) خیبر گئے۔ (وہاں) کسی نے آ کر محیصہ رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ۔
"عبداللہ بن سہل کو قتل کر کے خیبر کے ایک کنویں یا چشمے میں پھینک دیا گیا ہے۔"
محیصہ رضی اللہ عنہ نے یہودیوں کے پاس جا کر انہیں کہا۔
"قسم ہے اللہ کی! تم ہی نے اسے قتل کیا ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "قسم ہے اللہ کی! ہم نے اسے قتل نہیں کیا۔"
پھر وہ (خیبر سے) اپنے قبیلے والوں کے پاس گئے اور انہیں صورت حال بتائی' پھر محیصہ رضی اللہ عنہ اپنے بڑے بھائی حویصہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن سہل رضی اللہ عنہ کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔
محیصہ رضی اللہ عنہ نے بات شروع کرنی چاہی کیونکہ (حادثے کے وقت) خیبر میں وہی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محیصہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔
"بڑے کا لحاظ کرو۔" (یعنی جو عمر میں بڑا ہے اُسے بات کرنے دو۔)
چنانچہ حویصہ رضی اللہ عنہ نے بات کی' پھر ان کے بعد محیصہ رضی اللہ عنہ نے بات کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"یا وہ تمہارے مقتول کی دیت دیں یا جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔"
چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے میں اہل خیبر کے نام تحریر فرمایا۔
انہوں نے (جواب میں) لکھا۔ "قسم ہے اللہ کی! ہم نے اسے قتل نہیں کیا۔"
تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حویصہ' محیصہ اور عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔
"کیا تم قسمیں کھاتے ہو اور اپنے آدمی (مقتول) کا خون بہا (دیت) لینے کے مستحق بنتے ہو؟"
انہوں نے کہا۔ "جی نہیں۔"
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "پھر یہودی تمہارے لیے قسمیں کھائیں گے۔" (قسمیں کھا کر خود کو بے گناہ ثابت کریں گے۔)
انہوں نے کہا۔ "وہ مسلمان نہیں۔" (ان کے لیے جھوٹی قسمیں کھانا معمولی بات ہے۔)
چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاس سے عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ کی دیت دے دی

اور ان کے پاس سو اونٹنیاں بھیج دیں اور وہ ان کے گھر پہنچا دی گئیں۔

حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "ان میں سے ایک سرخ اونٹنی نے مجھے لات بھی ماری تھی۔"

فوائد و مسائل :

1۔ جب کوئی شخص قتل ہو جائے اور اس کے قاتلوں کا پتا نہ چلے تو مدعی قبیلے کے پچاس آدمی مشکوک افراد کے بارے میں قسم کھائیں کہ یہ ہمارے قاتل ہیں۔ اگر وہ قسم کھائیں تو مدعا علیہم سے دیت دلوائی جائے گی۔ اگر یہ لوگ قسم نہ کھائیں تو مدعا علیہم میں سے پچاس آدمی یہ قسم کھائیں گے کہ ہم نے اسے قتل نہیں کیا' نہ ہم قاتل کو جانتے ہیں۔ اگر وہ قسم کھانے سے انکار کریں تو ان پر ضروری ہو گا کہ قاتل کو پیش کریں اور اگر وہ قسم کھائیں تو وہ بری ہو جائیں گے اور ان سے دیت وصول نہیں کی جائے گی۔ اس صورت میں دیت بیت المال سے ادا کی جائے گی۔

2۔ قسم کھانے والوں میں کوئی بچہ' عورت' غلام یا مجنوں شامل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر پچاس افراد کی تعداد مکمل نہ ہو سکے تو جتنے افراد موجود ہیں وہی پچاس قسموں کی تعداد پوری کریں۔

3۔ اہم معاملات میں بزرگوں کو بات کرنی چاہیے' نیز بزرگوں کی موجودگی میں نوجوانوں کو بات کرنے میں پہل نہیں کرنی چاہیے۔

جھوٹی قسم

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مسعود کے بیٹے حویصہ اور محیصہ (رضی اللہ عنہ) اور سہل کے بیٹے عبداللہ اور عبدالرحمن (رضی اللہ عنہ) غلہ لینے خیبر گئے۔ (وہاں) عبداللہ رضی اللہ عنہ پر حملہ کرکے اسے قتل کر دیا گیا۔ یہ معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا تم قسمیں کھا کر (دیت کے) مستحق بنتے ہو؟"

انہوں نے کہا۔ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم کیسے قسم کھا سکتے ہیں جب کہ ہم نے دیکھا نہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "پھر یہودی (قسمیں کھا کر) تم سے بری ہو جائیں گے۔"

انہوں نے کہا۔ "اللہ کے رسول! صلی اللہ علیہ وسلم! تب تو وہ ہمیں قتل کرنا شروع کر دیں گے۔" (وہ جسے چاہیں گے قتل کرکے پچاس جھوٹی قسمیں کھا لیا کریں گے۔)

تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاس (بیت المال) سے اس کی دیت ادا فرما دی۔

اگر کوئی شخص اپنے غلام کا مثلہ کرے تو غلام آزاد ہو جائے گا

حضرت سلمہ بن روح جن زنباع اپنے دادا (حضرت زنباع بن روح جذامی رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے' انہوں نے اپنے غلام کو خصی کر دیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مثلے کی وجہ سے اس غلام کو آزاد کر دیا۔

مومن قتل کرتے وقت بھی سب لوگوں سے زیادہ تقوے کا خیال رکھتے ہیں

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قتل کرنے کے انداز میں بھی سب لوگوں سے زیادہ گناہ سے بچنے والے مومن ہی ہوتے ہیں۔"

فائدہ :

1۔ مذکورہ دونوں روایتیں اکثر محققین کے نزدیک ضعیف ہیں' تاہم صحیح مسلم میں اسی مفہوم کی روایت موجود ہے' جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

2۔ "جب تم قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو اور جب تم ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو۔

3۔ آدمی کو چاہیے کہ اپنی چھری تیز کرے اور ذبح

ہونے والے جانور کو راحت پہنچائے (ممکن حد تک کم سے کم تکلیف پہنچائے۔)

سب مسلمانوں کا خون برابر ہے

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مسلمانوں کے خون باہم ہم مرتبہ ہیں۔ وہ دوسروں (غیر مسلم دشمنوں) کے خلاف ایک ہاتھ کی طرح ہیں۔ ان کا ادنیٰ بھی معاہدے کی ذمے داری اٹھا سکتا ہے۔ مسلمانوں کو وہ (مجاہد) بھی غنیمت لوٹا کرے گا جو سب سے دور (اور دشمن سے بالکل قریب) ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ خون برابر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قصاص اور دیت کے معاملات میں کسی اونیٰ اور اعلا کا فرق نہیں۔ نہ قبائل کے لحاظ سے' نہ غریب امیر ہونے کے لحاظ سے۔ سب کے حقوق برابر ہیں۔ اسی طرح بچہ اور بڑا بھی ایک ہی حکم میں ہے۔

2۔ مسلمانوں کو دشمن کے خلاف بالکل متحد ہونا چاہیے ورنہ پوری قوم کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

3۔ مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنا چاہیے اور کسی مسلمان کو دشمن سے میل جول نہیں رکھنا چاہیے۔

4۔ اگر کسی غیر مسلم کو ایک ادنیٰ مسلمان بھی امان دے دے تو سب مسلمانوں کے لیے اس کی پابندی ضروری ہے۔

5۔ کوئی مجاہد غنیمت کا مال خود ہی اپنے پاس نہیں رکھ سکتا' بلکہ اسے چاہیے کہ غنیمت کم ہو یا زیادہ' امیر لشکر کے پاس جمع کرائے' پھر اپنے حصے کے مطابق وصول کرے۔ یہ نہ سوچے کہ امیر دور ہے' اور اگر وہاں یہ تھوڑی سی چیز پہنچاؤں گا تو ہو سکتا ہے' یہ میرے حصے ہی میں آجائے' لہٰذا میں اسے امیر کے پاس جمع نہیں کراتا' اپنے پاس ہی رکھ لیتا ہوں ایسا نہ کرے' بلکہ اصول کی پابندی کرے۔

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مسلمان دوسروں کے خلاف ایک ہاتھ کی طرح ہیں اور ان کے خون باہم برابر ہیں۔"

ذمی کے قتل کا گناہ

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص کسی ذمی کو قتل کرے اسے جنت کی خوشبو نہیں آئے گی' حالانکہ اس کی خوشبو چالیس سال کے فاصلے سے محسوس ہوتی ہے۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے کسی ذمی کو قتل کیا جس کی (حفاظت کی) ذمے داری اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھائی ہے تو وہ جنت کی خوشبو نہیں پائے گا' حالانکہ اس کی خوشبو ستر سال کے فاصلے سے محسوس ہوتی ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ مسلمان ملک کے غیر مسلم باشندے "ذمی" کہلاتے ہیں کیونکہ اسلامی حکومت ان کے حقوق کی حفاظت کا ذمہ اٹھاتی ہے۔

2۔ یہ حقوق انہیں اللہ کے حکم سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی روشنی میں دیے جاتے ہیں' اس لیے گویا ان کا ذمہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھایا ہے' لہٰذا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کی ذمے داری کی ادائیگی میں خلل ڈالے۔

3۔ جنت کی خوشبو نہ پانے کا مطلب یہ ہے کہ جنت سے ہزاروں میل دور ہو گا۔ آخرت میں صرف جنت اور جہنم ہی کے مقامات ہیں' اس لیے اس میں یہ وعید ہے کہ وہ شخص جہنم میں جائے گا۔

جگنو میاں کی کہانی

انشائیہ

میں ابتداً جگنو میاں سے میری ملاقات پہلے کس طرح سے ہوئی تھی۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ جگنو میاں اسکول میں پڑھتے تھے اور بوائے اسکاؤٹوں کے ایک جتھے کے ساتھ مضافات میں کیمپ لگائے ہوئے تھے۔ ایک لڑکا درخت پر لکڑی کے ایک تختے کو کیلوں سے اس طرح جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس پر چیزیں لٹک سکیں۔ جگنو میاں نے اسے ایک طرف ہٹا کر کہا۔

"میاں! تم سے نہیں ہوگا۔ ادھر لاؤ میں ٹھونکتا ہوں کیل۔" تختے کو دیکھ کر وہ کہنے لگے۔

"ذرا ایک منٹ ٹھہرو۔ اس تختے کا یہ سرا جو ٹیڑھا ہے، پہلے اسے برابر کرنے کی ضرورت ہے۔ بس آری سے کاٹ دیا جائے گا۔"

آری بھی کہیں سے مل گئی اور جگنو میاں نے کاٹنا بھی شروع کر دیا، لیکن ایک دو ہاتھ چلا کر رک گئے اور کہا۔

"کسی کباڑ خانے سے اٹھا لائے یہ آری۔ ذرا اس کے دندانے تیز کرنے چاہئیں یوں کام نہ چلے گا۔"

دندانے تیز کرنے کے لیے ریتی چاہیے تھی۔ کسی کی خوشامد کر کے کوئی شخص مانگ لایا، لیکن قباحت یہ تھی کہ اس کی ہتھی نکلی ہوئی تھی۔ اس پر جگنو میاں نئی ہتھی لگانے کے لیے کوئی مناسب لکڑی تلاش کرنے لگے۔ خیر لکڑیوں کی وہاں کیا کمی تھی، لیکن جب تک کلہاڑے کی تیز دھار نہ ہو، لکڑی ٹھیک کٹنا ممکن نہیں۔ کلہاڑے کی دھار تیز کرنا کوئی ایسا علم تو نہیں جو صرف کابلی پٹھانوں کو آتا ہے۔ لیکن سان کا پتھر اس وقت تک کہاں بنتا ہے جب تک اس کے سارے کے لیے لکڑی کی ٹانگیں مضبوط نہ ہوں۔ اس کام کو ڈھنگ سے کرنے کے لیے جگنو میاں نے سب سے پہلے بڑھیوں والا بینچ بنانے کا فیصلہ کیا جس میں جمائے بغیر آپ لکڑی پر رندہ کر ہی نہیں سکتے۔ وقت یہ تھی کہ اچھے اوزاروں کے بغیر بینچ کا بننا مطلوب۔ آخر بے چارے جگنو میاں کو اوزار لینے کے لیے شہر جانا پڑا اور وہ پھر نہیں لوٹے۔

ہاں کئی ہفتے بعد شہر سے کوئی آدمی آیا تو اس نے اطلاع دی کہ جگنو میاں ہر طرح خیریت سے ہیں۔ بازار میں مل گئے تھے۔ اوزار بنانے کی ولایتی مشینوں کے تھوک بھاؤ پوچھتے پھر رہے تھے۔

اس کے بعد تو ایک زمانے میں جگنو سے میری اچھی خاصی دوستی بھی رہی۔ کچھ دنوں ہم کالج میں پڑھتے رہے لیکن اتفاق قسمت کہ جگنو میاں پڑھائی میں زیادہ نہ چل سکے۔ وہ جس کام کو شروع کرتے، بڑے ذوق شوق سے شروع کرتے، لیکن راستے میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ آن پڑتی تھی۔ مثلاً ایک بار انہوں نے جدید اردو ادب کا مضمون لیا۔ تھوڑے دنوں بعد انہوں نے محسوس کیا کہ اس کے لیے قدیم اردو ادب کا پڑھنا ضروری ہے۔ قدیم اردو ادب کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیے ابھی دو ہی ہفتے ہوئے تھے کہ دریافت ہوا کہ جب تک عربی پر عبور نہ ہو فارسی کا علم مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ عربی میں ہاتھ ڈالا، پتا چلا کہ منبع عبرانی زبان ہے۔ جگنو میاں نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر عبرانی کے معلم کی تلاش شروع کر دی۔ دوڑ دھوپ کے بعد ایک شخص ملا تو اس نے بتایا کہ عبرانی کا فینقی اور آرامی وغیرہ زبانوں سے جو پرانے حروف میں مٹی کے لوحوں پر لکھی جاتی تھیں گہرا تعلق ہے۔ جگنو میاں کو یہ جان کر بے حد مایوسی ہوئی کہ ان حروف کا آخری ماہر دو سال قبل کسمپرسی کے عالم میں فوت ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے چارے کو پھر سے مضمون کا انتخاب کرنا پڑا۔

اب کے انہوں نے جغرافیہ لیا۔ کورس میں صرف ہندوستان کا جغرافیہ تھا۔ لیکن ہندوستان کوئی فضا میں معلق چیز تو ہے نہیں، آخر ایشیا کا حصہ ہے۔ لہٰذا جگنو صاحب نے، جو ہر مسئلے کا باقاعدہ مطالعہ کرنے کے قائل ہیں، ایشیا کے متعلق پڑھنا شروع کیا۔ دوران مطالعہ انہیں خیال آیا کہ یہ مطالعہ تقابلی ہونا چاہیے۔ جب تک افریقہ، یورپ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ کا بھی زیادہ نہیں تو تھوڑا تھوڑا حال نہ پڑھا جائے ایشیا کا صحیح مقام کیسے متعین کر سکتے ہیں۔ بات ٹھیک تھی، لیکن پورے کرۂ ارض کا جغرافیہ جاننے کے بعد انہیں شوق ہوا کہ دوسرے سیاروں سے اتنی بے اعتنائی نہیں برتنی چاہیے۔ بالخصوص مریخ کے متعلق تفصیلی تحقیقات کر کے عام غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا چاہیے۔ یہ کام تمام ہوا اور وہ زحل کی طرف توجہ کرنے والے تھے کہ کسی نے کہا۔ "میاں کس چکر میں ہو، یہ تمہارا سارا نظام شمسی کائنات کا ایک حقیر حصہ ہے۔ ایسے نہ جانے کتنے نظام شمسی اس میں بکھرے پڑے ہیں۔" جگنو صاحب کائنات کی کنہ تلاش کرنے چلے تو اپنی بھی خبر بھول گئے۔

جگنو میاں نے کوئی ڈگری نہ لی لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔ انہیں تو محض علم کی طلب تھی، ورنہ خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ روٹی کمانے کے لیے بزنس کی طرف رجوع کیا اور وہ دس ہزار روپے، جو خاندانی جائیداد سے ان کے حصے میں آئے تھے، انہوں نے ایک گیس پلانٹ میں لگا دیے۔ اس میں کچھ گھاٹا ہوا، جس کی وجہ یہ تھی کہ گیس بنانے میں جو کوئلہ استعمال ہوتا ہے، وہ مہنگا پڑتا ہے۔ چند ہزار روپے لے کر انہوں نے گیس پلانٹ سے قطع تعلق کر لیا اور کوئلے کی کان میں روپیہ لگا دیا۔ یہ کاروبار بھی ایسا کامیاب نہ رہا۔ کیونکہ کان کنی کی مشینیں بہت گراں ہوتی ہیں۔ جگنو میاں نے کان کے حصے اونے پونے بیچے اور دس ہزار روپے جو حاصل ہوئے، کان کنی کی مشینیں بنانے کے ایک کارخانے میں لگا دیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں انہیں بہت فائدہ ہوتا، بشرطیکہ گیس جس کے بل پر کارخانہ چلتا ہے، اتنی مہنگی نہ ہوتی۔ انہوں نے وہ کاروبار بھی پانچ ہزار کا گھاٹا اٹھا کے چھوڑ دیا اور اس کے بعد ایک سے دوسری، دوسری سے تیسری صنعت میں پاؤں جمانے کی کوشش کی، لیکن کسی نے غلط نہیں کہا کہ

"وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے"

جگنو میاں کی گھریلو زندگی بہت خاموش اور پرسکون تھی۔ انہوں نے شادی کبھی نہیں کی، البتہ محبت متعدد بار کی۔ افسوس یہ کہ کبھی اس محبت کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ ان کی پہلی محبت کا قصہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کیونکہ ان دنوں ہمارے تعلقات خاصے گہرے تھے۔ انہیں ایک لڑکی سے فوری اور بے پناہ قسم کی محبت ہو گئی۔ جیسی پرانی داستانوں کے ہیرو ہیروئنوں میں ہوا کرتی تھی۔ یعنی آنکھیں چار ہوتے ہی عشق وغیرہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی نیت نیک تھی۔ ملاقات کے بعد ہی انہوں نے اسے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "میں اپنے گھر کی زینت بناؤں گا تو اس لڑکی کو، چاہے ادھر کی دنیا ادھر کیوں نہ ہو جائے۔"

"کب؟" میں نے پوچھا۔ "کیا فوری طور پر شادی کر رہے ہو؟"

"نہیں جی!" انہوں نے کہا۔ "میں پہلے اپنے کو اس کے قابل بنانا چاہتا ہوں۔"

اپنے کو اس کے قابل بنانے کے لیے انہوں نے اپنی روحانی اور اخلاقی سطح کو بلند کرنا شروع کیا۔ انہیں افسوس ہوا کہ وہ اب تک ایک مذہب سے، جو اخلاق کی بنیاد ہے، اتنے بیگانہ کیوں رہے۔ انہوں نے محلے کے مدرسہ فیض العلوم میں داخل ہو کر علوم قرآنی کی باقاعدہ تحصیل شروع کر دی۔ تھوڑے دنوں بعد انہوں نے محسوس کیا کہ یہ تضیع اوقات ہے تا وقتیکہ کسی کو عرب کی تاریخ معلوم نہ ہو اور عرب قبائل کے سماجی پس منظر سے کما حقہ واقفیت نہ ہو۔ جگنو میاں نے نہایت خضوع و خشوع سے ان چیزوں کا مطالعہ شروع کیا اور دو سال تک اس میں جٹے رہے۔ دو سال کے بعد جب انہوں نے اپنے کو اس لڑکی کے قابل محسوس کیا تو انہیں یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ موصوفہ ایک ان گھڑ گھوڑی سے شادی رچا چکی ہیں۔ جس کا مونگ پھلی کا بزنس ہے اور جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ مدینہ کس شہر کا نام ہے یا پودینے کی طرح کوئی چیز جو کھیتوں میں اگتی ہے۔

☆

www.Paksociety.com

ڈیئر خالہ جان!
السلام علیکم۔

سب سے پہلے تو میں ہم سفر کی کامیابی پر آپ سب کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ جس طرح سے آپ نے اسے سراہا، آپ سب کا بے حد شکریہ۔ آپ سب کی محبتیں اور مبارک باد کے پیغامات جو مجھ تک پہنچ رہے ہیں، میں آپ سب کی محبتوں کی دل سے قدر کرتی ہوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ میرے پڑھنے والے مجھ سے اس قدر والہانہ پیار کرتے ہیں۔

میں اس موقع پر ادارہ خواتین ڈائجسٹ کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ یہ خواتین ڈائجسٹ ہی تھا جو میری تخلیقی صلاحیتوں کو آپ کے سامنے لانے کا ذریعہ بنا تھا۔ ستمبر 2000 میں خواتین ڈائجسٹ میں اپنی پہلی تحریر شائع ہونے کا وہ لمحہ میں آج تک نہیں بھول سکی ہوں۔ وہ لمحہ جس نے مجھے یہ ادراک دیا تھا کہ میں لکھ سکتی ہوں اور میرا لکھا شائع بھی ہو سکتا ہے۔ خواتین ڈائجسٹ میرے لیے میری پہلی درسگاہ کی طرح ہے۔ جس پر میرے لکھنے کی صلاحیت نکھر کر بھی اور جس پر مجھے آپ سب کا ساتھ بھی ملا۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ اور اس کے پڑھنے والوں کے ساتھ میرا رشتہ ان شاء اللہ ہمیشہ قائم و دائم رہے گا۔

تقریباً 12 سال قبل جب افسانہ نگاری کے مقابلے میں شرکت کی غرض سے میں نے اپنی پہلی تحریر خواتین ڈائجسٹ بھجوائی تھی تب میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اگلے 12 سال وہ کچھ میں بھی کام کروں گی۔ پچھلے گزرے تمام سالوں میں اگر کبھی میں بے حد ڈپریس ہوئی تو اس کا تمام تر کریڈٹ آپ قارئین کو جاتا ہے۔ یہ آپ کی محبتیں ہی تھیں جو مجھ سے لکھواتی رہیں۔ اور یہ آپ کی محبتیں ہی ہوں گی جو مجھ سے آئندہ بھی لکھوائیں گی۔

مجھے آپ سب کی حوصلہ افزائی اور محبتوں کی آج بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی 12 سال قبل تھی۔

محبتوں کے ساتھ

فرحت اشتیاق

19/03/2012

فرحت اشتیاق سے ملاقات

شاہین رشید

اس حقیقت سے شاید ہی کوئی انکار کرے گا کہ ڈراما چینلز کی کامیابی میں ادارہ خواتین ڈائجسٹ کا بڑا حصہ ہے۔

جب سے خواتین ڈائجسٹ کے ادارے سے وابستہ ناول نگار اور افسانہ نگار خواتین کے ناولز ڈرامے کی شکل میں پیش کیے جانے لگے ہیں گویا ڈراموں کی دنیا میں ایک انقلاب آگیا ہے اور ڈرامے اب اسی ذوق و شوق سے دیکھے جانے لگے ہیں جس طرح پہلے کسی زمانے میں دیکھے جاتے تھے۔ خواتین ڈائجسٹ سے ہی وابستہ عمیرہ احمد، سائرہ عارف، فائزہ افتخار، نگہت عبداللہ، عالیہ بخاری، رفعت سراج، ماہا ملک، شگفتہ بھٹی، رخ چوہدری، راحت رزاق، رخسانہ نگار وہ نام ہیں جنہوں نے ڈرامے کو پھر سے زندہ کیا ہے اور اب فرحت اشتیاق وہ مصنفہ ہیں جن کے سیریل "ہم سفر" نے ایک تاریخ رقم کی ہے۔ ڈرامے کی تاریخ میں یہ وہ واحد سیریل ہے، جو اپنے اختتام سے پہلے ہی نشر مکرر ہوا ہے۔

"کیسی ہیں فرحت! اور آپ کو میری طرف سے اور خواتین ڈائجسٹ کے ادارے کی طرف سے "ہم سفر" کی کامیابی پر مبارک باد۔"

"جی! میں ٹھیک ہوں اور مبارک باد کا بہت شکریہ۔"

"امید تھی کہ سیریل اتنا زیادہ کامیاب ہوگا؟"

"امید تھی لیکن اتنی نہیں۔ اگرچہ میرا ناول قارئین نے بہت پسند کیا تھا لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اتنا زیادہ پسند کیا جائے گا۔"

"آپ نے ناول میں کہانی کا آغاز "فلیش بیک" سے کیا ہے، جبکہ ڈرامے میں ایسا نہیں ہوا، ڈائریکٹ کہانی شروع ہوئی اس کی کیا وجہ تھی؟"

"کسی ٹی وی چینل کے لیے میرا پہلا سیریل تھا۔ مجھے اسکرپٹ رائٹنگ نہیں آتی تھی۔ سیریل کی پروڈیوسر مومنہ درید نے مجھے اسکرپٹ رائٹنگ کی باریکیاں سمجھائیں کہ کیا تکنیک ہوگی۔ پھر انہوں نے کہا کہ اگر ناول کی طرح چلیں گے تو ناظرین کو مزا نہیں آئے گا وہ اپنا انٹرسٹ لوز کر دیں گے۔ ناول میں کہانی وہاں سے شروع ہوتی ہے، جب وہ اپنی چار سالہ بچی کے لیے اشعر کے آفس آتی ہے۔ ناول کے لیے وہ ایک پرفیکٹ اسٹارٹ تھا، لیکن ڈرامے میں گرفت والی بات نہیں آتی تھی اس لیے ہم نے کہانی کا آغاز وہاں سے کیا، جب خرد اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس طرح کہانی کے ساتھ ناظرین کی فیلنگز بھی چلی گئیں۔ اصل میں ناول اور ڈراما ان دونوں میڈیم میں فرق بہت ہے۔"

"ناول بھی اس انداز میں لکھا جاتا جس طرح ڈراما ہوا تو کیا بہتر نہ ہوتا؟"

"نہیں ناول کے لیے وہی بہتر تھا جس طرح میں نے شروع کیا تھا۔ اگر ناول کو ڈرامے کی طرز پر لکھتی تو ناول بہت سمپل ہو جاتا اور ایک بہت ہی عام سی اسٹوری بن جاتی اور مزے کی بات بتاؤں کہ جب میں نے ناول لکھنے کا سوچا تو اس طرح شروع کرنا چاہا جس طرح ہم نے ڈرامے میں کیا تھا، لیکن مجھے یہ سب اتنا

بورنگ لگا اور مجھے لکھنے میں ذرا بھی مزا نہیں آ رہا تھا۔ تب میں نے سوچا کہ اسٹارٹنگ دھماکا خیز ہونی چاہیے تاکہ پڑھنے والے چونک جائیں کہ ان دونوں کے درمیان کیا مسئلہ ہے۔ اس لیے میں نے آفس سے اسٹارٹ لیا۔ میرے ذہن میں یہی آیا کہ فلیش بیک میں لے کر کہانی کو چلاؤں گی۔ اس طرح ناول بہت دلچسپ ہو جائے گا اور پڑھنے والوں کو اینڈ تک یہ تجسس رہے گا کہ ان دونوں کے درمیان ہوا کیا تھا۔"

"کسی نے بڑی دلچسپ بات کی کہ جب "اے آر وائی ہم اور جیو انٹرٹینمنٹ" آن کرو تو خواتین ڈائجسٹ ہی چل رہا ہوتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہا۔ آپ ضرور لکھیے گا اور میں نے اصل سے بھی یہ بات کہی تھی کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے ہمیں لکھنے کی صلاحیت دی ہے، لیکن ہم لوگوں کو جو پذیرائی، جو عزت ملی، جو فورم، جو پلیٹ فارم ملا وہ خواتین ڈائجسٹ کا ادارہ ہی ہے۔ جہاں سے ہماری صلاحیتیں لوگوں کے سامنے آئیں اور پاکستانی ڈرامے کی جو واپسی ہوئی ہے اس کا سارا کریڈٹ بھی ڈائجسٹ کی رائٹرز کو ہی جاتا ہے۔ ہمارا ڈراما جو مر چکا تھا وہ دوبارہ زندہ ہوا ہے۔"

"صرف ڈائجسٹ کہنا غلط ہو گا۔ خواتین ڈائجسٹ کا ادارہ کہنا صحیح ہو گا کیونکہ ساری خواتین اسی ادارے کی ہیں۔"

"بالکل! میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں۔ اکثر لوگ سوچتے ہیں یہ جو رائٹرز ہیں، یہ قابلیت میں کچھ کم ہیں تو یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ اب لوگوں کو اس سوچ اور ذہنیت سے باہر آ جانا چاہیے، کیونکہ ساری رائٹرز ماشاء اللہ بہت اعلا تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کی قابلیت میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہے اور یہ خواتین ڈائجسٹ کے ادارے کی ہی خواتین ہیں، جنہوں نے ڈراما انڈسٹری کو دوبارہ سے کھڑا کر دیا ہے، لہٰذا اس ادارے کو کریڈٹ دیا جانا چاہیے۔"

"کہتے ہیں کہ زندگی میں کوئی لمحہ، کوئی وقت ایسا ضرور آتا ہے، جو انسان کو بلندی پر لے جاتا ہے تو آپ کی زندگی میں وہ لمحہ آیا؟"

"بے شک یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے ورنہ محنت تو ہر کوئی کرتا ہے مگر اللہ جس کو نواز دے، لیکن جہاں تک بلندی کا تعلق ہے، تو خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے شہرت اور مقبولیت مجھے حاصل تھی۔ جو میرے فینز ہیں، جو مجھے پڑھتے ہیں۔ ابھی ناول کی ڈراما ئی تشکیل ہو ہی رہی تھی کہ ان کو انتظار شروع ہو گیا کہ کب یہ سیریل آن ایر ہو گا۔ مجھ میں کوئی غیر معمولی صلاحیتیں نہیں ہیں۔ یہ میرے والدین کی دعائیں قبول ہوئیں، ورنہ مجھ سے زیادہ قابل لوگ اس سرزمین پر موجود ہیں۔"

"خرد جیسی فرشتہ صفت لڑکیاں آج کے دور میں نظر نہیں آتیں یا پھر بہت کم ہوتی ہیں؟"

"ہوتی ہیں مگر بہت کم ہوتی ہیں اور اگر آپ خرد کو دیکھیں تو وہ بھی 100 فیصد ٹھیک نہیں تھی۔ اس کی بھی غلطیاں تھیں اور میرے جو کردار تھے وہ پوزیٹو سوچ بھی رکھتے تھے اور نگیٹو بھی۔ نہ کوئی پوری طرح ولن تھا اور نہ ہی کوئی فرشتہ تھا خواہ وہ خرد ہو فریدہ آنٹی ہوں، اشعر ہو یا سارہ۔

خرد کی بھی غلطیاں تھیں۔ خرد کو میں نے بہت زیادہ "اناپرست" دکھایا جبکہ انسان کو کبھی کبھی اپنی بات کی وضاحت بھی کر دینی چاہیے۔ کبھی کبھی اپنے آپ کو ایکس پلین بھی کرنا چاہیے۔"

"کوشش تو خیر اس نے بہت کی تھی ایکس پلین کرنے کی۔ خیر اگرچہ ڈرامے میں باقاعدہ ولن نہیں تھا لیکن عموماً" ڈراموں میں اور فلموں میں جب ہیرو ہیروئن کا ملاپ کرانا ہوتا ہے تو "ولن" کو مار دیا جاتا ہے۔ تم نے بھی سارہ کو مار دیا تو ایسا کیوں کیا؟ وہ زندہ بھی رہ سکتی تھی۔"

"ہاں۔۔۔ بالکل رہ سکتی تھی۔ جب میں اینڈ لکھ رہی تھی تو مجھے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر نے پوری آزادی دی ہوئی تھی کہ میں جیسا چاہوں ویسا اینڈ دکھاؤں۔

سارہ کے ساتھ جو سلوک کرنا ہے، مجھے اجازت تھی۔۔۔ فریدہ کے ساتھ جو کرنا ہے، مجھے اجازت تھی۔۔۔ میں نے یہ سوچا کہ سارہ کو میں نے اشعر کے لیے جتنا جنونی دکھایا تھا اس کے لیے یا تو وہ پاگل ہو جاتی یا مر جاتی، کیونکہ اپنی لائف میں سیٹل ہونا اس کے لیے ناممکن تھا اس لیے کہ وہ اشعر کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھی، اس لیے میں نے اس کو مار دیا۔ عام لائف میں بھی ایسی جنونی لڑکیاں یا تو مر جاتی ہیں یا پاگل ہو جاتی ہیں۔"

"ڈراموں میں کرداروں کے نام کہانی سے مماثلت رکھتے ہیں یا جو ذہن میں نام آتے ہیں، وہی رکھتی ہیں؟"

"نہیں ڈرامے سے مماثلت نہیں رکھتے، بلکہ مجھے جو نام اچھے لگتے ہیں میں وہی رکھتی ہوں۔"

"آپ کے ناولوں میں لڑکی اور لڑکے کو بھی خوب صورت دکھایا جاتا ہے اور بہت خوب صورت منظر کشی کی جاتی ہے۔ اب وہ لوگ، جو خوب صورت نہیں ہیں یا جو خوب صورت مناظر کو نہیں دیکھ پاتے ان کو احساس کمتری ہوتا ہو گا؟"

"ہاں۔۔۔ ہو جاتا ہو گا۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے مجھے کسی نے کہا کہ آپ صرف امیر گھروں کی محبت دکھاتی ہیں۔ غریب گھروں میں کیا محبت نہیں ہوتی؟ تو میں نے کہا کہ یقیناً ہوتی ہو گی۔ میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ یہ میری تحریر کی کمزوری ہے کہ میں نے غریب گھرانوں کی محبت نہیں دکھائی اور جو کم خوب صورت ہوتے ہیں یا معمولی شکل کے لوگ ہیں وہ بھی ہیرو ہیروئن ہو سکتے ہیں۔"

"آپ کی تحریروں میں فیض کے مصرعوں کا استعمال کافی ہوتا ہے، کیوں؟"

"کافی نہیں بہت ہوتا ہے۔ اس لیے کہ مجھے فیض احمد فیض بہت پسند ہیں، میں رہ نہیں سکتی ان کی شاعری کے بغیر۔ میں اپنے ناولوں کے نام بھی بہت سوچ بچار کے بعد رکھتی ہوں۔ ناول لکھنا ایک الگ کام ہے اور نام رکھنا ایک الگ کام ہے۔"

"بے شک ڈائریکٹر کا کمال ہوتا ہے، لیکن آپ نے بطور ایک ڈراما نگار اور ناول نگار کے ایک ایک سین کی اس انداز میں منظر کشی کی کہ ہمارے ذہن میں سب کچھ آ گیا کہ یہ ایسے ہوا ہو گا۔ تو کمال تو آپ لوگوں کا ہوتا ہے، جو ڈائریکٹر کے کام کو آسان کر دیتے ہیں۔ تو پھر ڈائریکٹر تو آپ لوگ خود ہی ہوتے ہیں؟"

"بھئی! میں تو سمجھتی ہوں کہ ڈائریکٹر کا بہت کمال ہے۔ ویسے آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ منظر کشی کی گئی ہوتی ہے اور مجھے تو منظر نگاری کی بہت عادت ہے۔ جب تک پورا منظر میں ڈسکرائب نہ کر دوں، مجھے تسلی نہیں ہوتی اور اسی چیز نے مجھے اسکرپٹ رائٹنگ میں مدد دی۔ اسکرین پلے میں بھی میں بہت تفصیلات میں چلی جاتی تھی۔ مسکراہٹ، ایکسپریشن، ہاتھ کس طرح رکھا ہوا ہے، اندر کمرے میں کیسے داخل ہوا وغیرہ۔ تو ڈائریکٹر کا کمال یہ ہے کہ جس طرح میں سوچ رہی تھی وہ اس کو ویسے ہی لے کر چلے۔"

"متاعِ جاں ہے تو" میں انجینئر دکھایا گیا ہے مرکزی کرداروں کو تو انجینئرنگ کی اتنی شدبد ہے آپ کو؟"

"شدبد۔۔۔؟" (ہنستے ہوئے) "میں نے این ای ڈی یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی ڈگری لی ہوئی ہے۔ میں بنیادی طور پر سول انجینئر ہوں۔"

سانحہ ارتحال

ہماری ساتھی شاہین رشید کے ماموں جان شیخ محمد وارث (نواب کے) تقاضائے الٰہی سے وفات پا گئے۔

اناللہ وانا الیہ راجعون

ادارہ خواتین ڈائجسٹ شاہین رشید کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعاگو ہے کہ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین

www.Paksociety.com

"کام آ رہی ہے؟"

"بہت کام آ رہی ہے۔ میں نے کچھ عرصہ جاب بھی کی اور پھر لکھائی پہ انجینئرنگ کی جاب کو قربان کر دیا، کیونکہ یہ بھی ایک فل ٹائم کام ہے اور "متاع جاں ہے تو" میں میرے اپنے تجربے ہیں انجینئرنگ کے جو دوران تعلیم مجھے حاصل ہوئے۔"

"اس سیریل میں آپ نے امریکا کا انتخاب کیا، کیا امریکا جا چکی ہیں؟"

"امریکا نہیں گئی ہوں لیکن کافی ممالک میں جا چکی ہوں کیونکہ میرے والد پی آئی اے میں تھے تو ان کی وجہ سے بیرون ملک جانے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ مجھے بذات خود بھی ٹریولنگ کا شوق ہے اور کولمبیا یونیورسٹی کا انتخاب اس لیے کیا کہ مجھے ایک اچھی یونیورسٹی دکھانی تھی۔ اس کے لیے تھوڑا سا ریسرچ بھی کیا اور جو میرے جاننے والے اور دوست نما تھے وہاں رہتے تھے ان سے میں نے ان کے تجربات شیئر کیے تھے۔"

"معاوضہ اچھا ملتا ہے؟"

"ہاں جی! بالکل اچھا ملتا ہے۔ اماؤنٹ مت پوچھیے گا لیکن میں مطمئن ہوں۔"

"میں انٹرویو میں جس کسی سے پوچھتی ہوں کہ پہلی کمائی کیا تھی تو لوگ بہت تھوڑا اماؤنٹ بتاتے ہیں۔ مگر پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ "جی! کچھ عرصے کے بعد یا سال دو سال کے بعد ہم نے گاڑی خرید لی یا گھر بنا لیا۔""

(بے ساختہ ہنستے ہوئے) "جی! گاڑی تو میں نے بھی خرید لی۔"

"شہرت ملنے کے بعد 'رائٹرز ہوں یا فنکار' معاوضے کے لیے ڈیمانڈنگ ہو جاتے ہیں۔۔۔ آپ کی کیا صورت حال ہے؟"

"مجھے ذاتی طور ایسا لگتا ہے کہ پیسے کی بات کرنا برا ہے، کیونکہ ہمارے ہاں یہ تصور ہے کہ اگر کوئی آرٹسٹ یا کوئی بندہ معاوضے کی بات کرے گا تو گویا اس نے بہت بری بات کر دی۔۔۔ یا چھوٹی بات کر دی۔ لیکن میں کہتی ہوں کہ بھئی! وہ پیسوں کی بات کیوں نہ کرے۔ اس نے بھی تو زندگی گزارنی ہے۔ ساری زندگی تعریفوں سے تو گزارہ نہیں ہو سکتا۔ تو میرے خیال میں پیسوں کی بات کرنا یا اپنے حقوق کی بات کرنا کوئی بری بات نہیں ہے۔"

"تو پھر آپ نے اس شہرت کے بعد کچھ ڈیمانڈ کی یا جو ملا اسی پہ مطمئن ہو گئیں؟"

"سچی بات ہے کہ میرے لیے ڈیمانڈنگ ہونا بہت مشکل بات ہے۔ میری نیچر ہی ایسی نہیں ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ بندے کو ڈیمانڈنگ ہونا چاہیے۔"

"لکھنے کا آغاز کب ہوا؟" "اور اب تک کتنے ناول لکھ چکی ہیں؟"

"میری نو کتابیں آ چکی ہیں جبکہ شارٹ اسٹوریز اور ناولٹ تو بے شمار ہیں اور جہاں تک لکھنے کے آغاز کی بات ہے تو وہ بہت ہی پرانا اور گھسا پٹا جملہ ہے کہ "بچپن سے ہے" "تو واقعی مجھے بھی بچپن سے ہی شوق ہے۔ میں پہلے بھی یہ بات کہہ چکی ہوں کہ میں نے زندگی میں پہلا کام جو کیا 'وہ کہانیاں سوچنے کا کیا ہے۔ میں ہر وقت کہانیاں سوچا کرتی تھی اور کہانیاں بنایا بھی کرتی تھی پھر جب تھوڑا لکھنا پڑھنا آیا تو میں نے خود بخود کہانیاں لکھنا شروع کر دیا اور لکھ لکھ کر اپنے پاس محفوظ کر لیا کرتی تھی۔ کہیں چھپوانے کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔"

"تو پھر پہلی تحریر کیا تھی جو منظر عام پر آئی؟"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سن 2000ء میں خواتین ڈائجسٹ والوں نے افسانہ نگاری کے مقابلے کا اعلان کیا تھا تو بس ایسے ہی شوقیہ میں نے ایک افسانہ "خوشبو، بادل، چاند ہوا" لکھ کر بھیج دیا۔ اس وقت میں طالبہ تھی اور میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ مجھے اسے اپنا کیریئر بنانا ہے۔ افسانہ بھیجا۔ اگلے ہی مہینے وہ چھپ بھی گیا اور آپ یقین نہیں کریں گی، میں اتنی خوش ہوئی تھی کہ میں نے باقاعدہ چھلانگیں مار کر اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا۔"

"گھر والوں کا کیا رد عمل تھا؟"

"گھر والوں نے بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا تھا لیکن جب میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں انجینئرنگ کی

[...] کروں گی تو گھر والوں نے تو کچھ نہیں کہا، [...] لوگ اور میرے ملنے جلنے والوں نے مجھ پر تنقید کی کہ میں ایک غلط فیصلہ کر رہی ہوں۔ انجینئرنگ کی ڈگری ہوتے ہوئے میں اس کو چھوڑ رہی ہوں اور رائٹر کو ملتا ہی کیا ہے سوائے تنگیوں اور پریشانیوں کے۔ محض لکھنے کے شوق پر اپنی جاب کو قربان کر رہی ہوں مگر گھر والوں نے بھرپور ساتھ دیا اور کہا کہ جو تم بہتر سمجھتی ہو وہی کرو۔"

"اب تو خاندان والے بہت خوش ہوں گے۔ بہت واہ واہ ہوتی ہو گی اور سب رشتے داریاں نکال نکال کر آپ کا ذکر کرتے ہوں گے۔"

"جی جی۔۔۔ بالکل ابھی تو نہیں کہاں کہاں سے پرانے لوگ اور رشتے داریاں نکلتی چلی آ رہی ہیں۔"

"یہ بتائیں کہ آپ کی کہانیوں میں اور ناولوں میں آپ کی شخصیت کا عکس کتنا ہے؟"

"دنیا کے لوگوں کی نفسیات تو یہی ہے۔ جہاں تک میری شخصیت کا سوال ہے تو یقیناً 'میری تحریروں میں میرا عکس ہوتا ہو گا' کیونکہ جو رائٹر یہ کہتا ہے کہ اپنی تحریروں میں ہم خود نہیں ہوتے 'وہ جھوٹ بولتا ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ رائٹر اپنی تحریروں میں خود موجود نہ ہو۔"

"اتنی ہی رومانٹک ہیں جتنی ناول میں نظر آتی ہیں؟"

"ہاں جی۔۔۔ میں اتنی ہی رومانٹک ہوں، بلکہ یہ کہوں تو غلط نہ ہو گا کہ میں بہت رومانٹک ہوں۔ دیکھنے میں لگتی نہیں ہوں مگر ایسا نہیں ہے۔ رومانٹک بہت ہوں، حساس بہت ہوں، جذباتی بہت ہوں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پہ آنسو بہنا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو بہت جذباتی ہوتے ہیں ان کا چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل ٹوٹ جاتا ہے یا چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جاتے ہیں۔ میں ان میں سے ہوں۔"

"فلمیں شوق سے دیکھتی ہیں؟ اور اداکار کون سے پسند ہیں؟"

"شوق تو آپ نہیں کہہ سکتیں۔ البتہ میرے

بہنوں کا شعاع اپنا ماہنامہ

اپریل 2012 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

اپریل 2012 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

- "جنت کے پتے" نمرہ احمد کا مکمل ناول،
- "دل کی بات" نایاب جیلانی کا مکمل ناول،
- عالیہ بخاری اور آمنہ ریاض کے ناول،
- سویرا فلک، صوفیہ اسد اور فلک حبیب کے ناولٹ،
- عاقبہ محمد بیگ، عفت رابعہ، راحیل عزیز شہزاد، سلمیٰ فاروقی اور فاطمہ عسکری کے افسانے،
- "بندھن" میں ٹی وی فنکار "کاشف خان اور کنول کاشف" سے ملاقات،
- "میکسم گورکی" کے شہرہ آفاق ناول "ماں" پر تبصرہ،
- "دستک" معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ،
- "بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا" مضامین فرحت پر آمنہ زریں کا تبصرہ،
- "پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں" احادیث مبارکہ کا سلسلہ،
- اور آپ کے شاعری بچے، قوس قزح اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع، اپریل کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

دوست مجھے بتاتے ہیں کہ فلاں فلم بہت اچھی ہے، ضرور دیکھنا تو دیکھ لیتی ہوں، ورنہ کوئی ایسا شوق نہیں ہے اور اداکاروں میں کوئی ایسا نہیں کہ بس یہی پسند ہے اور کوئی نہیں۔ جو اچھا کام کرتا ہے، وہی اچھا لگنے لگتا ہے۔ مجھے کرینہ کپور کبھی اچھی نہیں لگتی تھی، لیکن جب میں نے اس کی "جب وی میٹ" دیکھی، وہ مجھے اچھی لگنے لگی ہے اور انڈیا کی موی "بلیک" بھی مجھے بہت اچھی لگی تھی۔"

"ڈرامے دیکھتی ہیں؟"

"جب سے اپنا ڈراما آیا ہے، ڈرامے دیکھنے لگی ہوں، ورنہ پہلے میں ڈرامے نہیں دیکھتی تھی۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہیں پڑھ کر اطمینان حاصل ہوتا ہے۔"

"جب افسانہ یا ناول لکھتی ہیں تو کہانی کو اینڈ تک سوچتی ہیں؟"

"بالکل اینڈ تک سوچتی ہوں، پھر لکھنا شروع کرتی ہوں ہر بات کو ذہن میں اچھی طرح سوچ کر لکھنا شروع کرتی ہوں۔"

"لکھنا اگرچہ خداداد صلاحیت ہوتی ہے، مگر پھر بھی کچھ مشاہدات وغیرہ بھی ہوتے ہوں گے؟"

"کہیں نہ کہیں سے تو انسپائریشن حاصل ہوتی ہی ہے۔ اور وہ کسی بھی چیز سے ہو سکتی ہے۔ کوئی منظر ہو سکتا ہے، کوئی بات ہو سکتی ہے، کوئی گانا اچھا لگ جاتا ہے، کوئی شاعری اچھی لگ جاتی ہے، مجھے اکثر لوگ کہتے ہیں کہ ہم آپ کو ایک آئیڈیا دیتے ہیں تو اگر کسی کا آئیڈیا دل کو چھونے لگے، تب میں لکھ سکتی ہوں ورنہ نہیں۔ عموماً اپنے ہی آئیڈیاز پہ کام کرتی ہوں۔"

"کبھی کوئی ڈراما یا فلم دیکھ کر سوچا کہ اس کہانی کو تو میں زیادہ اچھا لکھ سکتی تھی؟"

"بالکل! یہ خیال بہت مرتبہ آتا ہے۔ بعض اوقات اینڈ پہ اختلاف ہوتا ہے، بعض اوقات کہانی اچھی ہوتی ہے، مگر خیال آتا ہے کہ اسے مزید اچھا بنایا جا سکتا ہے یا تھا۔"

"کچھ فیملی بیک گراؤنڈ بتائیں۔"

"میرے والدین کا تعلق انڈیا سے ہے۔ ہم اردو اسپیکنگ ہیں اور میں 27 جون کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ میرے والد پی آئی اے میں جاب کرتے تھے۔ اب ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ والد کی جاب کی وجہ سے تقریباً آدھی دنیا دیکھنے کا موقع ملا۔ والدہ ہاؤس وائف ہیں۔ آج میں جو کچھ ہوں اس میں میرے والدین کا ہی ہاتھ، تعاون اور دعائیں شامل ہیں۔ مجھے ملا کر ہم چھ بہن بھائی ہیں یعنی ہم چار بہنیں ہیں اور دو بھائی ہیں اور میرا نمبر بہن بھائیوں میں دوسرا ہے۔ بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔"

"اور آپ نے کیوں نہیں کی؟"

"اپنی مرضی سے نہیں کی اور جس دن مجھے میری مرضی کا کوئی مل گیا تو شادی بھی کر لوں گی اور نہیں ملے گا تو نہیں کروں گی۔ کمپرومائز کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"لکھنے کے جراثیم کس سے آئے؟"

"سچ بتاؤں کہ یہ اللہ کا تحفہ ہے میرے لیے کہ مجھ میں لکھنے کی صلاحیت ہے، ورنہ میری فیملی میں دور دور تک نہ کوئی شاعر ہے نہ ہی کوئی ادیب ہے۔ بے شک میری فیملی میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھے بغیر سو نہیں سکتے خاص طور پر میری امی ابو کو تو بہت شوق ہے پڑھنے کا، لیکن شاعر اور ادیب کوئی نہیں ہے۔"

"لوگوں پر پڑھنے کا اثر زیادہ ہوتا ہے یا ڈراموں کا؟"

"اگر میں اپنی بات کروں تو مجھ پر تو پڑھنے کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ لکھے ہوئے الفاظ مجھ پر بہت دیر تک اثر انداز رہتے ہیں۔ آج کل چونکہ زندگی میں آسانیاں بہت آگئی ہیں تو لوگوں کو پڑھنا مشکل کام لگتا ہے۔"

"مزاج کی کیسی ہیں؟ غصہ آتا ہے؟"

"مجھے غصہ آتا بھی ہے تو اپنے اوپر ہی جھیل جاتی ہوں۔ مجھے غصے کا اظہار کرنا نہیں آتا اور نہ ہی زیادہ دیر تک کسی سے ناراض رہ سکتی ہوں۔ تھوڑی دیر میں بھول جاتی ہوں کہ میں اس سے ناراض بھی تھی یہاں!"

جاتی بہت ہوں۔"

"اور گھریلو؟"

"گھریلو کاموں کے لیے اب میرے پاس ٹائم نہیں ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ مجھے کچھ نہیں آتا۔ کوکنگ وغیرہ سب کچھ آتی ہے اور بہ وقت ضرورت بہت اچھا کھانا پکا بھی لیتی ہوں۔ میری مصروفیات کی وجہ سے گھر والوں نے مجھے ان کاموں سے فراغت دی ہوئی ہے۔ میں گزشتہ چند سالوں سے ایک کالج میں لیکچرار تھی، لیکن اپنی مصروفیات کی وجہ سے اب میں نے یہ جاب بھی چھوڑ دی ہے۔ میرے شاگرد مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ بہت ادب کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ٹین ایجز بدتمیز ہوتے ہیں، بے ادب ہوتے ہیں مگر مجھے ایسا کچھ فیس نہیں کرنا پڑا۔"

"ناولز کی تو ڈرامائی تشکیل ہو رہی ہے۔ آپ نے اوریجنل کہانی لکھی ڈرامے کے لیے؟"

"لکھی تو نہیں ہے، لیکن میں لکھنا چاہتی ہوں اور اپنے آپ کو چیک کرنا چاہتی ہوں کہ میں کتنی کامیاب اسکرپٹ رائٹر ہوں۔"

"اچھا یہ بتائیں کہ بناؤ سنگھار سے لگاؤ ہے آپ کو؟"

"بناؤ سنگھار سے لگاؤ میرے خیال میں ہر عورت کو ہوتا ہے اور مجھے بھی ہے مگر نارمل حد تک۔ ہاں یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ مجھے اچھا لگنا چاہیے، اچھا ڈریس اپ ہونا چاہیے۔ فیشن آپ کی شخصیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ ایسا فیشن نہ ہو جو گھر والوں کے لیے شرمندگی کا باعث بنے۔ میں اپنی روزمرہ کی زندگی میں بہت سادگی پسند ہوں۔"

"لکھنے والے عموماً گم صم اور سنجیدہ مزاج کے ہوتے ہیں۔ آپ بھی ایسی ہیں؟"

"میں بہت زیادہ سنجیدہ نہیں ہوں۔ بہت زیادہ بولتی ہوں، البتہ اجنبی لوگوں کے ساتھ ریزرو رہتی ہوں۔"

"ہوٹلنگ پہ جانے کا موڈ ہو، گھر سے باہر کھانا کھانے کا دل چاہے تو کہاں جاتی ہیں؟"

"مجھے ہوٹلنگ پہ جانا اچھا لگتا ہے۔ مجھے "پزا" بہت پسند ہے۔ پزا ہٹ جانا اور باربی کیو ٹونائٹ جانا اچھا لگتا ہے۔"

"ہمسفر کی کامیابی کو کس طرح سیلیبریٹ کیا تھا؟"

"گھر والوں نے مجھے سیلیبریٹ کروایا ہے۔ گھر والوں نے مجھے گفٹ دیے ہیں اور باہر کھانا کھلانے بھی لے کر گئے۔ دوستوں نے بھی گفٹ دیے۔ ابھی تک یہ نوبت نہیں آئی کہ میں کسی کو گفٹ دے سکوں۔ میں اس معاملے میں بہت خوش قسمت ہوں کہ سب مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ دل سے محبت کرتے ہیں۔"

"کوئی تاریخی شخصیت جو آپ کو پسند ہو؟"

"مجھے ٹیپو سلطان بہت پسند ہیں۔ مجھے رضیہ سلطانہ بہت پسند ہیں۔ وہ اپنے زمانے کی بہت اسٹرانگ خاتون تھیں۔ ہسٹری سے مجھے لگاؤ ہے۔"

"سیاست سے؟"

"نہیں، پہلے تھا، اب نہیں ہے۔ پہلے تو ٹاک شو دیکھا کرتی تھی، مگر اب تو اس میں اتنی طوفان بدتمیزی ہوتی ہے کہ دیکھنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔"

"مذہب سے کتنا لگاؤ ہے؟"

"پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہوں اور اللہ تعالیٰ کے بہت قریب ہوں۔ اللہ سے محبت بھی بہت ہے اور خوف بھی۔ کوشش کرتی ہوں کہ کوئی ایسا کام نہ کروں کہ جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو اور گھر میں اس طرح کی تربیت دی گئی ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی خوشی پہ بھی نفل شکرانے کے پڑھتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا بہت ضروری ہے۔"

اور اس جواب کے ساتھ ہی ہم نے فرحت اشتیاق سے اجازت چاہی اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے اتنا وقت دیا۔

www.Paksociety.com

ہر پل میں لاکھوں تصویریں' ہر لمحہ اک دنیا
کتنے منظر کھو دیتا ہے آنکھ جھپکنے والا

ارض و سما کے اس رنگ محل میں ہر جا ایک جہان دیگر پوشیدہ۔ مختصر سی عمر کے سراب اجل خیز میں کہاں ممکن ہے کہ ان جہانوں کی کھوج کی جائے' نہ ہی وہ نظر ہر ایک کے پاس ہوتی ہے' جو پس منظر میں جھانک سکے۔

دلوں میں جھانکنے والی نظر کچھ اور ہوتی ہے
نظر آتے نہیں جو' وہ تماشے اور ہوتے ہیں

اہل فکر اور اہل نظر ہی ان لمحوں کو تصویر کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ وہ اپنے قلم سے لفظوں کو تراش کر اپنی سوچوں کے رنگ بھرتے ہیں تو پڑھنے والا ان کی آنکھوں سے اس کائنات کے ہزاروں رنگ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ یہ تخلیق کار زندگی کی راہوں پر اپنی سوچ اور فکر کی شمعیں جلاتے ہیں۔ محبتوں کے چراغ روشن کرتے ہیں۔ ان شمعوں کی روشنی تاریک راہوں کو اجالتی ہے۔ دلوں کو آباد اور شاداب کرتی ہے۔

جس طرح کچھ یادیں آنکھوں میں تم کر رہ جاتی ہیں' اسی طرح کچھ تحریریں ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں اور زندگی کے سفر میں ہمارا پلو تھام کر ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی بے شمار تحریریں ذہنوں پر نقش ہیں۔ سالگرہ نمبر میں ہم نے قارئین سے اسی حوالے سے سروے کیا ہے' ہم نے قارئین سے سوال کیے تھے۔

1- اپریل 2011ء سے مارچ 2012ء کے دوران شائع ہونے والی تحریروں میں وہ کون سی تحریریں تھیں' جنہوں نے آپ کو متاثر کیا؟

2- اس دوران شائع ہونے والی تحریروں میں سے اپنا پسندیدہ جملہ یا اقتباس تحریر کیجیے۔

آئیے دیکھتے ہیں قارئین نے کیا جوابات دیے ہیں۔

جو دل پر نقش ہیں

ادارہ

شفق افتخار.... سکھر

1- اس پورے سال میں جو تحریریں مجھے سب سے زیادہ پسند آئیں۔

مصحف	نمرہ احمد
سفال گر	بشریٰ سعید
معجزہ	عنیزہ سید
مائے نی میں کنوں آکھاں	نبیلہ عزیز
مرگ وفا	آمنہ ریاض
حساب باقی ہے	آسیہ رزاقی
امرت اور پیالہ	راحت جبیں
اب محبت کرنی ہے	راشدہ رفعت
سنہری دھوپ کا موسم	نایاب جیلانی

سب سے پہلے میں بات کروں گی نمرہ احمد کے "مصحف" کی۔ ایک انتہائی خوب صورت' بامعنی' اثر انگیز ناول' موضوع ایسا خوب صورت جو دل میں روشنی کر دے۔ کتنی ہی مثبت تبدیلیاں لے آیا یہ ناول بہت سے لوگوں کی زندگی میں۔ اس میں شامل تمام احادیث' تمام تراجم تمام باتیں مجھے بہت پسند ہیں۔

دوسرے نمبر پہ میں بات کروں گی آمنہ ریاض کے "مرگ وفا" کی۔ یہ تحریر مجھے بے انتہا پسند آئی۔ ایک ایسی کہانی جس میں مجھے سچائی محسوس ہوئی۔ خاص کر حسن جب نور کی بھتیجی سے شادی کی خواہش کرتا ہے۔ وہ لمحہ تو مجھے بالکل سن ہی کر گیا تھا۔ نور کا کردار بہترین تھا۔ بے شک یہ "آمنہ ریاض" کی ایک بہترین تحریر تھی۔

تیسرے نمبر پر میں بات کروں گی آسیہ رزاقی کی تحریر "حساب باقی ہے" کی۔ اس کہانی کو پڑھ کر بار بار پتا نہیں کیوں مجھے عمیرہ احمد کی "میری ذات ذرہ بے نشان" یاد آتی ہے۔ شاید نام کی مماثلت کی وجہ سے۔ انداز بیان بہت خوب تھا' لگ رہا تھا کہ کردار ہمارے آس پاس ہیں۔ صبا کے چھت کے کمرے کا جو حال رائٹر نے بیان کیا تھا۔ وہ سوچ کر تو دل اتنا برا ہوا کہ بس۔ اور اس کا اینڈ تمام ناول پہ بھاری تھا۔ اس کا اینڈ مجھے بہت پسند آیا۔ بے شک کسی پر تہمت لگانا بہت گناہ ہے۔ یہ کہانی مجھے ہر لحاظ سے بہت پسند آئی۔

یہ تینوں کہانیاں جو مجھے بہت پسند آئیں۔ اس کے علاوہ اس سال نبیلہ عزیز میری پسندیدہ رائٹرز کی لسٹ میں خوب صورت اضافہ ثابت ہوئیں۔ مئی 2011ء کے خواتین میں چھپنے والی ان کی تحریر "مائے نی کنوں آکھاں" بہت اچھی تحریر تھی۔ مسز ملک کی بیٹی سے محبت انہیں مار گئی۔ یہ نبیلہ کی تمام تحریروں کی طرح نہایت عمدہ تحریر تھی۔ ان کا انداز بیان بہت اچھا ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے جو میں پڑھنا چاہتی ہوں' وہ سب کچھ ان کی تحریروں میں ہوتا ہے۔ شرارت' کردار' شرط' یادیں۔ ان کی تمام تحریریں مجھے بہت پسند ہیں۔

عنیزہ سید کی "معجزہ" بھی ایک ایسی تحریر تھی جس کا موضوع بہت ڈفرنٹ تھا اور جہاں تک میرا خیال ہے تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ کہانی ہماری ماضی کی معروف اداکارہ روحی بانو کی زندگی سے کچھ ملتی جلتی تھی۔ وہ ایک اچھی کہانی تھی۔

راشدہ رفعت کی "اب محبت کرنی ہے"۔ کافی عرصے بعد اس طرح کی ہلکی پھلکی تحریر پڑھنے کو ملی تو بہت اچھا لگا۔

نایاب جیلانی کی "سنہری دھوپ کا موسم" کافی اچھی تحریر تھی۔ کافی عرصے بعد مجھے نایاب کی کوئی تحریر اچھی لگی' ورنہ معذرت کے ساتھ نایاب کی تحریروں میں اب یکسانیت آگئی ہے۔

"راحت جبیں کی "امرت اور پیالہ" اور نمرہ احمد کی "تم میرے ہو" بھی قابل ذکر تحریریں تھیں۔ "تم میرے ہو" میں نمرہ نے اپنے انداز سے ہٹ کر اچھا لکھا۔ ہلکی پھلکی پر مزاح کہانی تھی۔

یہاں میں تھوڑی سی بات کرنا چاہوں گی فروری 2012ء میں صوفیہ بشیر کی تحریر توبہ کی۔ موضوع کے اعتبار سے خاصی حساس تحریر تھی اور صوفیہ نے اس موضوع سے انصاف بھی کیا۔

سب سے زیادہ خوشی کی بات کہ اس سال ستمبر سے فرحت اشتیاق ایک بے حد خوب صورت ناول لے کر آئیں۔ اس کی تمام تعریفیں میں نے سنبھال رکھی ہیں۔ ناول ختم ہونے کے بعد اکٹھی کروں گی۔

ویسے تو ہم بہت کچھ پڑھتے ہیں اور بہت سے جملے ایسے ہوتے ہیں جو دل پہ نقش ہو جاتے ہیں مگر جب لکھنے بیٹھو تو سوچنا پڑتا ہے۔

مگر مصحف ایک ایسی تحریر ہے۔ جس کے بہت سے جملے آج پورا سال گزرنے کے بعد بھی مجھے یاد ہیں۔ اس تحریر نے بہت سے مثبت در کھولے۔ آج جب بھی میرے ساتھ کچھ ایسا ہونے لگے جو میرے لیے ناقابل برداشت یا ناقابل قبول ہو تو فوراً ذہن میں یہ جملے گونج جاتے ہیں اور پھر سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔

”انسان جس سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اللہ اسے اسی کے ہاتھوں سے توڑتا ہے۔ انسان کو اس ٹوٹے ہوئے برتن کی طرح ہونا چاہیے جس سے لوگوں کی محبت آئے اور باہر نکل جائے۔“

2۔ ”سفال گر“ بشریٰ سعید۔ مجھے سفال گر کا وہ حصہ بہت پسند ہے جب عمر صوفیہ پہ دم کرتا ہے اور اسے غلط راہ پر چلنے سے روک لیتا ہے۔ پورے ناول میں وہ حصہ میرا بہت پسندیدہ ہے اور کچھ جملے بھی ہیں جو مجھے بہت پسند آئے۔

”میرا گناہ یہ ہے کہ میں ایک موسے محبت کرتی ہوں۔

صرف اتنی محبت کہ اسے نہ دیکھوں تو مجھے بینائی کی ضرورت نہیں۔

اس کی آواز نہ سنوں تو مجھے سماعت سے غرض نہیں۔

وہ مبہم سا مسکرا دے تو میری روح سینے سے کھینچ لیتا ہے۔

آنکھ کے ایک اشارے سے وہ میری نبض روکنے پر قادر ہے۔

اتنی سی محبت تو خدا مجھے معاف کردے گا۔“

بے شک اس کے ایک ایک لفظ میں جو شدت ہے۔ جو گہرائی ہے۔ وہ محسوس کیے جانے کے قابل ہے۔

”مرگ وفا“ آمنہ ریاض۔ ”محبوب کا انحصار اس کا والہانہ پن وہ اسم ہوتا ہے۔ جو عورت کے وجود کو روئی کے گالے میں ڈھال دیتا ہے اور عورت تفکرات زمانہ سے آزاد ہو کر ہوا میں اڑنے لگتی ہے۔ بارش کی ننھی ننھی چھوٹی بوند بن کر فضا میں تیرنے لگتی ہے۔ پانی کی نازک لہر بن کر بہنے لگتی ہے اور یہ ایک ایسا دلفریب

احساس ہوتا ہے۔ جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا۔“

”مائے نی میں کنوں آکھاں“ نبیلہ عزیز۔ ”وہ پورا دن اپنے گھر میں بولائی بولائی پھرتی رہی۔ چاہتوں کے پھول سینے سے لگائے تھے تو احساس ہوا تھا کہ بے رخی کی آگ نکوے بھی جلاتی ہے۔ پاؤں زمین پہ نہیں انگاروں پہ پڑتا ہے اور جلن روح تک ہوتی ہے۔ محبت کی طلب میں جذبات سلگتے ہیں۔ دل سے گیلی لکڑی کی مانند دھواں اٹھتا ہے اور انسان کی پوری ہستی راکھ کا ڈھیر بننے لگتی ہے۔“

”امرت اور پیالہ“ راحت جبین۔ یہ ہے تو پہلے کی تحریر لیکن میرا دل چاہا کہ میں اپنے خط کا اختتام اس جملے سے کروں۔

”ہیرے کی قدر جوہری جانتا ہے۔ مگر سامنے والا جوہری نہ ہو یا جوہری کی نگاہ نہ رکھتا ہو تو ہیرے کو معمولی سا موتی سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی تقدیر ہمیں مٹی کے پیالے میں امرت پیش کرتی ہے مگر ہم مٹی کے پیالے کو حقارت سے دیکھتے ہوئے ٹھکرا دیتے ہیں۔“

ثمینہ اکرم..... لیاری کراچی

1۔ خواتین ڈائجسٹ اپنی نوعیت کا ایک منفرد رسالہ ہے۔ جو پاکستان کے کونے کونے میں ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ اس سے رہنمائی حاصل کرنے والوں کی تعداد ان گنت ہے۔ 40 برس قبل یہ رسالہ جتنا معیاری تھا آج تک اپنا وہی معیار برقرار رکھا ہوا ہے بلکہ اس میں کئی سو گنا اضافہ ہو چکا ہے۔

گزشتہ سال شائع ہونے والی کئی ناقابل فراموش تحاریر کا میں یہاں ذکر کروں گی اور ان کے رائٹرز کو خراج تحسین بھی پیش کرنا چاہوں گی۔

میری پہلی پسندیدہ تحریر رفعت ناہید سجاد کا ناول ”چراغ آخر شب“ ہے۔ اس کی تعریف کرنا میرے بے ہنر قلم کے بس میں نہیں۔ اس میں تاریخ کے مختلف ادوار بیان کیے گئے تھے اور پاکستان کی تاریخ اس سے بہتر انداز میں ہمارے سامنے نہیں آ سکتی۔ یہ رفعت صاحبہ کی بھرپور تحقیق اور وسیع تر مطالعے کا نچوڑ شاہکار ناول ہے۔ جو کہ ہماری بھرپور توجہ اور یکسوئی کا متقاضی رہا۔ کرداروں کے جذبات و احساسات کو زیر قلم لانے میں رفعت ناہید اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔

”سفال گر“ بشریٰ سعید کا ناول جس نے کئی ماہ تک قارئین کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا۔ جوانی تھیم کہانی اور کرداروں کی بدولت پسندیدگی کے لحاظ سے اول درجے پر رہا۔ بشریٰ سعید کے خوب صورت لفظوں کا چناؤ لاجواب رہا۔ اس کہانی میں حکیم بیگم کا کردار لازوال بنا۔ ہر کردار نے اپنے اپنے حصے کا بوجھ بہت سجاؤ سے اٹھایا۔

پچھلے دنوں ایک اور ناول نے میرے دل سے

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

پسندیدگی کی سند حاصل کی۔ ناول "مصحف" جسے نمرہ احمد نے تحریر کیا تھا۔ اس کی پسندیدگی کی وجہ اس کا منفرد موضوع ہے۔ اس کہانی کو پڑھنے کے بعد کتنی ہی قاری بہنوں نے قرآن پاک بمعہ ترجمہ و تفسیر پڑھنا شروع کر دیا۔

شازیہ ہمایوں کا ناول "نگاہ آئینہ ساز" بھی مجھے بے حد پسند آیا۔ اس کہانی میں دیار غیر میں مقیم پاکستانیوں کی کہانی بیان کی گئی ہے، جو کہ ہمارے خیال میں خوشی و اطمینان اور بڑے مزے کی زندگی بسر کر رہے ہیں مگر دراصل انہیں وہاں کتنی مشکلات اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

"سنگ سمیٹ لو" فرحت اشتیاق کوئی ناول لکھیں اور اسے پذیرائی نہ ملے یہ ناممکن بات ہے۔ آج کل یہ ناول بھی محبت کی ہاٹ اسٹوری بنا ہوا ہے مگر مجھے یہ روم کی تاریخی اور یادگار جگہوں کے تعارف کی وجہ سے پسند آ رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم گھر بیٹھے روم کے مشہور تفریحی مقامات کی سیر کر رہے ہیں۔

2- خواتین ڈائجسٹ کے ہر شمارے میں کوئی اقتباس یا کوئی جملہ ایسا ضرور ہوتا ہے جو قاری کے دل میں گھر کر جاتا ہے۔ جیسے کہ یہ اقتباس میرا پسندیدہ رہا۔

"وقت سب کو ایک طرز پر نہیں برتتا۔ کسی کو تو وہ ہتھیلی پر بٹھا کر سفر کی منازل طے کراتا ہے اور کچھ کو وہ اپنے قدموں تلے روندتا ہوا زندگی کی شاہراہ پر گھسیٹتا ہوا لے جاتا ہے۔"

یہ ایک جملہ بھی کافی اثر انگیز ہے۔

"محبوب اگر محب سے بیزار ہو جائے تو پیچھے کیا ہے سوائے ہجر و فراق کے۔" (تنزیلہ ریاض)

"پہلے سفر کی صعوبتوں سے پاؤں آبلہ پا اور وجود تھکاوٹ سے چور ہو تو کبھی دوسرے سفر کا ارادہ فوراً نہیں باندھنا چاہیے ورنہ منزل تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔" (شگفتہ بھٹی)

"انسانوں کو جج نہیں کیا کرتے ان سے محبت کیا کرتے ہیں۔ اگر تم لوگوں کو جج کرنے لگ جاؤ گے تو ان سے محبت نہیں کر سکو گے۔" (نمرہ احمد)

ویسے بھی اچھی بات جس نے بھی کی ہو اور جہاں سے ملے اسے ضرور نوٹ کر لیتی ہوں۔

"زندگی کے حقائق سے بہت سنجیدہ اور بہت زیادہ رنجیدہ نہ ہو۔ ایک بات طے ہے کہ تم زندگی سے نکل کر بھاگ نہیں سکتے۔" (خلیل جبران)

شبانہ نوید ...... ملتان

1- اپریل 2011ء سے مارچ 2012ء کے دوران بہت سی تحریریں اچھی لگیں، لیکن ہمیشہ یاد رہ جانے

بقیہ صفحہ نمبر 281

www.Paksociety.com

www.paksociety.com

عنیزہ سید

جو دکھ کو گوارا تھے

فضا میں دھول اڑ رہی تھی آسمان میلا سا ہو رہا تھا۔ میدان آہستہ آہستہ خالی ہو رہا تھا۔ لوگ باگ ہنستے اور باتیں کرتے اپنے گھروں کی طرف چل دیے تھے۔ وہ ان سب کے لیے ایک تفریح سے پُر شام ثابت ہوئی تھی۔ چند نوجوان میدان کے اختتام پر لگے بجلی کے کھمبے کے نیچے کھڑے گپ شپ میں مشغول تھے اور کھینچ کھینچ کر دوپٹے سروں پر لاتی چھوٹے بہن بھائیوں کو ہانکتی لڑکیوں کو کن انکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔ لڑکیوں کو دیکھنے کے بعد وہ آپس میں کسی جملے کا تبادلہ کرتے اور پھر ہاتھ پر ہاتھ مار کر بلند آواز میں قہقہے لگاتے۔ ان کا یہ انداز دیکھ کر کچھ لڑکیوں میں شوخی آ جاتی اور کچھ گھبرا کر تیز تیز قدموں سے چلنے کی کوشش کرتیں۔

اپنے سامان کو سمیٹتے اور باندھتے ہوئے بندر کے تماشے والے نے دلچسپی سے یہ منظر دیکھا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ سامان باندھ کر اس نے اپنا جھولا کاندھے پر ڈالا ڈگڈگی ہاتھ میں پکڑی اس کا بندر اور بندریا کا جوڑا اس کے دوسرے ہاتھ میں پکڑے بانس سے لٹک گیا اور اس نے بانس بھی دونوں شانوں پر رکھ لیا۔ اس کا سامان کاروبار سمٹ گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے دیکھے منظر کی مسکراہٹ ابھی بھی اس کے لبوں پر تھی۔ وہ مڑ کر اپنے راستے پر چلنے لگا مگر پھر ٹھٹک گیا۔ میدان کے آغاز میں بکھرے کوڑا کرکٹ کے پاس ایک لڑکی اکیلی کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں مکئی کا بھٹا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے شام کی خوشگوار ہوا میں اڑتے اپنے بالوں کو قابو کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔

بال سمیٹتی، بھٹا کھاتی وہ لڑکی اب تماشے والے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تماشے والے نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر سر جھکا کر اپنے راستے پر چل دیا۔

www.paksociety.com

"تھوسو۔ پلیز رکو۔" کچھ دیر بعد اسے اپنے عقب سے آواز آئی۔ اس نے رک کر گردن موڑ کر دیکھا۔ ہنستا کھاتی لڑکی تیز قدموں سے چلتی اس کے پیچھے آرہی تھی۔

"بات تو سنو۔" تیز قدموں سے چلنے کی وجہ سے اس کا سانس پھول رہا تھا۔ تماشے والا رک کر اس کی بات کا منتظر ہوا۔

"یہ تم کیسے کرلیتے ہو؟" وہ کہہ رہی تھی۔

"کیا کیسے کرلیتے ہو؟" تماشے والے نے کہا۔

"یہی بندر کا تماشا۔" اس نے اس کے کندھے پر رکھے بانس پر چڑھ کر بیٹھے بندر اور بندریا کی طرف اشارہ کیا۔

"ہمارا کام ہے یہ جی' کیسے کرلیتے ہو کا کیا مطلب؟" بندر والے نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے کہ یہ تمہارا کام ہے' مگر تم نے یہ کیسے سیکھا؟ بندر اور بندریا کو سدھایا ہوگا اور یہ جو ریچھ ہے اسے بھی۔" اس نے بندر والے کے پیچھے پیچھے چلتے ریچھ کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں جی!" بندر والا اس کی بات سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔

"تو پھر مجھے بھی سکھادو۔" وہ اچانک بڑی عاجزی سے بولی۔ بندر والے کو شاید اس درخواست کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے چپ رہ گیا۔

"مجھے بہت شوق ہے لوک ہنر سیکھنے کا۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "میں بڑے پیمانے پر ایک فوک فیسٹیول منعقد کرنا چاہتی ہوں' فوک فیسٹیول۔ یو نو' واٹ از اے فوک فیسٹیول؟" جوش میں وہ یہ بھول گئی تھی کہ بندر والا انگریزی نہیں جانتا ہوگا۔ اس کے سوال پر وہ نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگا۔

"ہے ماہی!" وہ کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی' جب دور سے آتی کسی آواز نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی۔ وہ دو نوں لڑکے تھے جنہوں نے گھٹنوں سے نیچے تک نیکر پہن رکھے تھے اور آدھے بازو کی قمیص' پاؤں میں ہوائی چپل پہنے' وہ تیزی سے ان کی طرف آرہے تھے۔

"سو سلی یو آر ماہی! یو ور سو ریڈ لیباؤٹ یو۔ ہو آسکڈ یو ٹو کم آؤٹ آف دِٹ پلیس ود آؤٹ انفارمنگ اَس؟"

(تم بے حد بے وقوف ہو ماہی! ہم سب تمہارے لیے اتنے پریشان تھے' تم سے کس نے کہا کہ ہم سب کو بتائے اس جگہ سے باہر نکل آؤ۔)

اس لڑکی نے بھی انگریزی میں ہی کوئی جواب دیا تھا۔ اپنی بات کے دوران وہ بار بار بندر والے کی طرف اشارہ بھی کررہی تھی۔ وہ تینوں آپس میں کسی بحث میں الجھتے دکھائی دیتے تھے۔ بندر والے کے بندر بھوکے تھے اس کا ریچھ چلا چلا کر تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ بھی اب واپس جانا چاہتا تھا' سو بندر والے نے انہیں بحث میں مشغول وہیں چھوڑا اور اپنی منزل کی طرح چل پڑا۔ ان تینوں کی بحث جب ختم ہوئی تو اس لڑکی نے مڑ کر دیکھا' تماشے والا جاچکا تھا۔

"دیکھا تم نے؟" اس نے منہ بنا کر پاؤں زور سے زمین پر مارا۔ "وہ چلا گیا' اتنی مشکل سے ہاتھ آیا تھا۔" اس کے چہرے پر ناراضی تھی اور رنج بھی۔

"تم کیسے کیسے لوگوں کے بس ہو جانے پر دکھی ہوتی ہو ماہی!" لڑکا جس کا نام سلمان تھا' منہ بنا کر بولا وہ اس کا سگا بھائی تھا۔ "کبھی کبھی مجھے یقین نہیں آتا۔"

"نہ آئے' مجھے تم کو یقین دلانا بھی نہیں۔" لڑکی نے منہ بنا کر کہا۔ "مگر مجھے اس تماشے والے کو لوکیٹ کرنا ہے' مجھے اس سے کام سیکھنا ہے' میں اس کو پروموٹ کروں گی۔ سی' ول بی مائی فائنڈنگ۔" (وہ میری دریافت ہوگا) وہ

سامنے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی اور اس کا دماغ مستقبل کے نظارے دیکھ رہا تھا۔

"ووش فل تھنکنگ۔" (خوش امیدی) دوسرے لڑکے جمال نے قہقہہ لگا کر کہا۔ وہ ان دونوں کا فرسٹ کزن تھا۔ "یہ تماشوں والے سیلانی ہوتے ہیں' یہ تمہیں اب کہاں ملے گا' بھول جاؤ۔"

"کتنے سیلانی ہوتے ہیں۔" وہ اڑ جانے والے انداز میں بولی۔ "یہیں کہیں گھومے گا' اس آس پاس کے گاؤں میں' اس کی اپنی روزی کمائی ہے' وہ کراچی' کوئٹہ جا کر تو تماشے دکھانے سے رہا۔ یہیں گھوم کر تماشے دکھائے گا اور روزی کمائے گا' میں اس کو لوکیٹ کراؤں گی۔ سردار چاچا ول ہیلپ می۔" (سردار چاچا میری مدد کریں گے۔)

"یو آر کریزی (تم پاگل ہو)۔" جمال نے سر جھٹک کر کہا۔ "ہم تو کل واپس جارہے ہیں' یہاں مزید رکنا مشکل ہی ہے۔"

"تم جاؤ' میں تو رکوں گی۔" وہ اسی ضدی انداز میں بولی۔

"اور ماما تمہارا حشر کردیں گی۔" پہلا لڑکا جو اس کا سگا بھائی تھا' بولا۔ "ابھی تک تو ان کو خبر بھی نہیں کہ ہم یوں سردار چاچا کے ہاں رہ رہے ہیں' مسٹر وڑے کو واپس آرہی ہیں' اس سے پہلے ہمیں یہاں سے بھاگ لینا ہے میڈم! ورنہ شامت آجائے گی۔"

"سنڈے میں ابھی تین دن باقی ہیں۔ ان تین دنوں میں اس نے ویسے ہی مل جانا ہے۔" لڑکی کے لہجے میں لاپروائی تھی۔

"چلو اب چل پڑو یہاں سے۔" جمال نے کہا۔

"ہاں چلو!" سلمان نے تائید کی اور پھر وہ تینوں آہستہ قدموں سے چلتے اس سمت چل دیے' جہاں وہ گھر تھا جس میں وہ مہمان تھے۔ گہری ہوتی شام کے ملگجے اندھیرے میں ادھر ادھر جلتی روشنیوں میں ان کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ وہ تینوں ایک بار پھر کسی بحث میں الجھ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

اس کے قدم تھکنے لگے تھے۔ وہ سارا دن پیدل چلتا رہا تھا۔ اس نے سر جھکا کر ایک نظر اپنے پیروں پر ڈالی اس

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی قیمت: 450 روپے

☆ درد کی منزل، رضیہ جمیل قیمت: 500 روپے

☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبیں قیمت: 400 روپے

☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری قیمت: 250 روپے

☆ امربیل، عمیرہ احمد قیمت: 550 روپے

خوبصورت سرورق

خوبصورت چھپائی

شائع ہوگئے ہیں

مضبوط جلد

آفسٹ پیپر

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

کے جوتے اور پیر دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اسے وہ چہرے یاد آنے لگے جو یقیناً" اس کے منتظر تھے۔ ان کا تصور آتے ہی اس کے قدم تیز ہونے لگے اور اس کے بعد جلدی وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ کھلے میدان میں قطار در قطار جھونپڑیاں تھیں۔ رنگ برنگے اور مختلف جتنوں والے کپڑوں کو بانس کی کھپچیوں پر چڑھا کر بانس کا سہارا دے کر بنائی گئی جھونپڑیاں جن کے باہر تیل اور مٹی کے چولہے رکھے عورتیں ہانڈیاں چڑھائے بیٹھی تھیں۔ ننگ دھڑنگ اور کچھ صرف نیکریں پہنے بچے ہاتھوں میں سلور کی پلیٹیں اور کٹورے لیے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ دن ڈھل چکا تھا، رات آرہی تھی۔ وہ سب بھوکے تھے اور ان کو کھانا چاہیے تھا۔ ان جھونپڑیوں کے مالک مرد دن بھر کی محنت مزدوری جس میں گداگری سرفہرست تھی کرنے کے بعد اب جھونپڑیوں کے باہر بچھی چارپائیوں پر بیٹھے اور لیٹے گپ شپ میں مصروف تھے۔

اس کے شانوں پر رکھے بانس سے لٹکے بندر یہ منظر دیکھ کر چھلانگ لگا کر اترے اور بھاگ کر اپنی اپنی پسندیدہ جگہوں تک پہنچ گئے۔ ریچھ نے اس کے ہاتھ سے لپٹی زنجیر چھڑانے کی کوشش میں کودنا شروع کردیا۔ جونہی اس نے زنجیر چھوڑی، وہ ایک عورت کی طرف بھاگا، جو پرات گود میں دھرے چاول چننے میں مصروف تھی۔

"آؤجی آؤ۔ بسم اللہ!" حقے کے کش لگاتا ایک تنومند مرد چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"جی آیاں نوں سرکاراں!" مٹی کے کٹورے میں پانی پیتا ایک اور مرد ہاتھ ہلا کر بولا۔ جھٹپٹے میں بھی اس کے ہاتھوں کی چاروں انگلیوں میں پہنی موٹے نگوں والی انگوٹھیاں نظر آرہی تھیں۔

وہ ان سب کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور زمین پر بیٹھ کر گھٹنے اس چادر پر ٹیک دیے جس پر ساڑ بچھائے چند لڑکے پانسا کھیل رہے تھے۔ اس نے اپنے کرتے کی جیب چادر پر الٹ دی۔ دس، پانچ کے چند نوٹوں کے علاوہ ریزگاری کا ایک چھوٹا سا ڈھیر چادر پر نظر آنے لگا۔

"واہ سرکار واہ!" حقے کے کش لگانے والا ریزگاری پر نظریں جمائے متاثر ہوتی آواز میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں نئی سی چمک آگئی تھی۔

"بلے بلے بلے۔" ایک ادھیڑ عمر شخص قریب آکر کھڑا ہوا اور بندر والے کے شانے دباتے ہوئے بولا "بڑیاں کمائیں سرکار! اگے وادا ای وادا پیسے گا (بہت کمائی سرکار! آگے اضافہ ہی اضافہ ہوگا۔)"

"تاپانسیمہ کدھر ہیں؟" بندر والا جو خود بھی اپنی کارکردگی پر خوش ہو رہا تھا۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں ایدھر ہیں صدقے۔" اسے قریب سے آواز آئی۔

"لے تایا یہ تیرے لیے۔" اس نے اپنے جھبلے کی طرف اشارہ کیا۔ "کدھر ہے تیرا آٹے والا برتن۔"

"ایدھر آجا۔" چالیس بیالیس سالہ کالی بجھنگ عورت کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ دانت نکوستی ایک جھونپڑی کی سمت چلی۔ بندر والے نے اس کی تقلید کی اور جھونپڑی کے پاس جاکر عورت کے اپنے سامنے رکھے ٹین میں جھبلا خالی کرنے لگا۔ نسیمہ کے لیے کئی دن کے آٹے کا بندوبست ہوگیا تھا۔ پھر اس نے واپس اس جگہ جاکر جہاں وہ اپنی جیب خالی کر آیا تھا۔ نیچے جھک کر مٹھی بھر ریزگاری اٹھائی اور بولا۔

"یہ میرے ننھے دوستوں کے لیے۔" اس کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے بچے آجمع ہوئے جنہوں نے ادھورے اور پھٹے پرانے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس نے ایک، ایک، دو دو روپے کے کچھ سکے ان میں بانٹ دیے۔ وہ شور مچاتے ادھر ادھر چھٹ گئے۔

"تو چاچا! تمہاری بڑی مہربانی۔" پھر اس نے مسکراتے ہوئے حقہ پیتے شخص سے ہاتھ ملایا۔ "اپنا سامان وصول کرو اور مجھے اجازت دو۔"

"ہزاری برس جئیں۔" حقہ پینے والے نے حقے کی نے پیچھے ہٹا کر دعا دی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"پھر ملاقات ہوگی جلد ہی۔" وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور ان سب پر نظر ڈالی۔ "اگلی باری تم سے ظفری!" اس نے گھنی داڑھی میں انگلیاں چلاتے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"خیر نال سائیں سرکار خیر نال۔" اس شخص نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اس نے ان سب کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔

"کوئی روٹی ٹکی سرکار؟" جھونپڑی کے باہر رکھے چولہے کی جلتی آگ پر توا رکھتے ہوئے ایک بوڑھی عورت کو خیال آیا۔

"نہیں اماں! بہت دیر ہوگئی۔" وہ اس کی طرف معذرت خواہانہ انداز میں دیکھ کر بولا اور پیچھے کو مڑ گیا۔ ظفری اور ایک دو سرا لڑکا اٹھ کر اس کے ساتھ چلنے لگے۔

"وہ جھلی۔۔۔ اس نوں اے روٹی لنگدی اے بھلا۔" (اس سے یہ روٹی کھائی جائی بھلا) ایک بوڑھے شخص نے کھانے کی پیشکش کرنے والی مائی کو گھورا۔

"پوچھنا تاں ہے سی۔" (پوچھنا تو تھا نا)

مائی متاثر ہوئے بغیر بولی اور گھر جاتے مہمان کو دیکھنے لگی۔ وہ تینوں چلتے چلتے اس جگہ پہنچ چکے تھے جہاں چمکتی سیاہ گاڑی کھڑی تھی۔ وہ ان دونوں سے ہاتھ ملا کر گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی، مڑی اور قریب سے گزرتی سڑک پر رواں ہوگئی۔ دن مکمل طور پر ڈھل چکا تھا اور رات کی تاریکی ہر چیز پر اپنا قبضہ جما چکی تھی۔

اس رات غسل کرنے اور تازہ گرم کھانا کھانے کے بعد اپنے نرم گداز بستر پر لیٹ کر اپنی دن بھر کی مصروفیت کو یاد کرتے ہوئے اسے اچانک وہ لڑکی یاد آگئی جو اسے بہت عاجزی سے کہہ رہی تھی۔

"تو پھر مجھے بھی سکھادو۔" مکی کا بھٹا کھاتی، بکھرے بال سمیٹتی وہ لڑکی باقی تماشائیوں سے بالکل مختلف تھی اور اس کی فرمائش بھی بالکل انوکھی تھی۔ پھر اسے وہ نوجوان لڑکے بھی یاد آگئے جو اس لڑکی کو آوازیں دیتے اس سے انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے۔ شاید وہ تینوں سوچ بھی نہ سکتے ہوں کہ اپنی دھن میں وہ جو باتیں کر رہے تھے ان کے تئیں وہ ان پڑھ گنوار تماشے والا دھیان سے سن رہا تھا۔ نہ صرف سن رہا تھا بلکہ اس کا ایک ایک لفظ سمجھ بھی رہا تھا۔ وہ اس واقعے کو یاد کر رہا تھا اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی پھر اس کی نیند سے بوجھل آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ گہری نیند میں چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

"نہ پتر نہ، اگر ماہ نور نہیں جانا چاہتی ابھی تو میں تمہیں اسے نہیں لے جانے دوں گا دھکے سے۔" سردار خان نے ماہ نور کی بسورتی شکل دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر چاچا جی! ہمیں بہت دن ہوچکے ہیں یہاں آئے ہوئے۔ ہماری پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔" سلمان نے جواب دیا۔

"ان دونوں کی پڑھائی کا حرج ہو رہا ہوگا۔" ماہ نور نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے دانت پیسے۔ "میرا تو نہیں ہو رہا۔ ویسے بھی مجھے یہاں رہ کر کام کرنا ہے تھوڑا سا اپنی پڑھائی ہی کے سلسلے میں۔" اس نے وجہ سوچ لی۔

"او میرے خدایا!" جمال نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے توبہ کی۔ وہ اس کے اس سفید جھوٹ پر محظوظ ہو رہا تھا۔

"تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟" ماہ نور نے اسے گھورا۔ "بڑے دانت نکال رہے ہو، وہ جو میں نے بتایا تھا

تمہیں شام کو۔" اس نے دیکھا' مجال اس کے گھورنے کے باوجود جس رہا تھا۔ "وہی جو نوک فیسٹول کا بتایا تھا میں نے تمہیں کمس کے لیے کام یہاں نہیں کرتا' مجھے تو اور کہاں کرتا ہے۔"

"نوک فیسٹول کی بچی!" سلمان نے غصے سے کہا۔ "وہ جو ماما تمہارا اشہر کریں گی نا آکر' تمہارا سب نوک فیسٹول نکل جائے گا۔ خوابوں میں رہنے والی شہزادی! پہلے اپنا ماسٹرز تو مکمل کرلو' پھر خواب دیکھنا نوک فیسٹول کے۔"

"چلو چلو۔" وہ مزید منہ بنا کر بولی۔ "کچھ نہیں کہیں گی ماما مجھے۔ سردار چاچا خود بات کرلیں گے ان سے۔"

"ہاں ہاں' بے شک بات کرلوں گا میں اس سے۔ بھرجائی ہماری بے شک غصے کی تیز ہے' پر دل کی بری نہیں۔" سردار چاچا نے اسے شہ دیتے ہوئے کہا۔

"بس پھر تم دونوں جاؤ' اپنا بوریا بستر سمیٹو' میں نہیں جا رہی۔" وہ خوش ہو کر بولی۔

"مان جاؤ ماہی!" سلمان نے اسے وارننگ دینے کے انداز میں کہا۔ "ماما کو جانتی ہو تم۔"

"چلو جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔" وہ ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر بولی۔

"تم پرا پنو گی ماہی!" سلمان نے اسے یاد دلایا۔

"کوئی بات نہیں' میں بنوں گی نا' تم تو نہیں اور پھر ڈیڈی بھی تو ہیں نا۔" وہ ہنوز بے نیاز تھی۔

آپ بتائیں سردار چاچا۔ اب کب آئے گا بندر کے تماشے والا ادھر؟" پھر اس نے منہ دوسری طرف کرکے سردار چاچا کو مخاطب کیا۔

"وہ روز ایک ہی گاؤں میں نہیں جاتے پتر جی! ابھی ادھر تو اگلے دن کہیں اور اس سے اگلے دن کہیں اور' راستے میں رک رک کر جگہ جگہ دکھاتے ہیں تماشا!" سردار خان نے ہنس کر کہا۔ "تو فکر نہ کر' میں کرلوں گا پتا کدھر کو جانا ہے اس نے اب۔"

"روز روز سارا دن کون سا لگاتے ہیں یہ لوگ۔" چچی صابرہ نے کہا۔ "ایک دن کماتے ہیں' دس دن آرام کرتے ہیں۔"

"ایک دن کی کمائی دس دنوں کے لیے کافی ہوتی ہے کیا؟" ماہ نور حیران ہوئی۔

"کرنا کیا ہوتا ہے انہوں نے۔" چچی صابرہ نے جواب دیا۔ "ایک دن کی کمائی سے آٹا' چاول لے جاتے ہیں۔ بیویوں پر احسان کرتے ہیں۔ ایک دن کماتے ہیں' دس دن نشہ کرکے پڑے رہتے ہیں۔ بیوی' بچوں کی ہڈیاں توڑتے ہیں۔ جوئے کھیلتے ہیں اور دس دن بعد پھر نکل پڑتے ہیں۔ بیچ کے نو دن ان کی بیویاں جگہ جگہ مانگ کر لے آتی ہیں جو کم پڑ جائے تو۔"

"دس دس دن کے بعد؟" ماہ نور کو کچھ مایوسی ہوئی۔

"سوچ لو' دس دن انتظار کرنا پڑے گا۔" سلمان نے اسے ڈرایا۔

"او تو فکر نہ کر بٹیا رانی! میں پتا کروالوں گا اس کے ٹھکانے کا۔" سردار چاچا نے اپنائیت سے کہا۔

"چلیں ٹھیک ہے۔" ماہ نور خوش ہوئی۔

اسے یہ سوچ کر ہی مزا آ رہا تھا کہ وہ بندر کے تماشے والے سے کرتب سیکھ سکے گی۔ ڈگڈگی کی آواز پر جس طرح وہ بندر کو نچاتا تھا اور اس کے ساتھ ڈانس کے گز کے سنگ پر فار مِنس لیتا تھا' وہ بھی کر پائے گی۔ آنے والے دنوں کے اس خاکے کا تصور کرکے ہی وہ خوش ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تم آج کل کہاں غائب ہو جاتے ہو؟" بلال نے سعد سے پوچھا تھا۔

"کہیں نہیں' میں یہیں ہوتا ہوں۔" سعد ان کے لہجے پر کچھ دیر کے لیے گڑبڑا گیا۔

"تم مجھے بتا رہے ہو؟" بلال نے اس کی آنکھوں میں جھانکا' "باپ ہوں میں تمہارا اور مجھے تمہارے بارے میں ہر خبر ہوتی ہے۔" سعد جو آرام کرسی پر بیٹھا جھول رہا تھا' ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ اس کے بارے میں کیا خبر رکھتے ہیں۔ وہ اس کی اس حرکت پر بے ساختہ ہنس دیے۔

"اس کا مطلب ہے کہ تمہاری روٹین میں کچھ گڑبڑ ہے نا؟" وہ بولے۔

"کوئی گڑبڑ نہیں ہے' بس میرا آج کل آفس میں کچھ زیادہ دل نہیں لگتا اور میں ابراہیم کی طرف چلا جاتا ہوں آفس سے جلدی اٹھ کر۔" ان کی اس بات سے وہ جان گیا تھا کہ وہ صرف اس کے آفس سے غائب ہونے والی خبر سے واقف ہیں' اس لیے فوراً بات بتائی۔

"ابراہیم کی طرف۔" انہوں نے اسے گھورا۔ "سخت ناپسند کرتا ہوں میں اسے' اس کی نامعقول حرکتوں کی وجہ سے۔"

"نامعقول حرکت؟" اس نے حیران ہونے کا مظاہرہ کیا۔

"تو اور کیا۔" وہ اسی انداز میں بولے۔ "جو لڑکا باپ کا اچھا خاصا بزنس جوائن کرنے کے بجائے جم کھول لے' وہ نامعقول حرکتیں ہی کرتا ہے۔"

"وہ انڈیپینڈنٹ کام کرنا چاہتا تھا ڈیڈی! اور یہ کوئی برا آئیڈیا نہیں۔" سعد نے ابراہیم کی طرف داری کی۔

"ہوں!" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "تو آپ کس انڈیپینڈنٹ کام کو کرنے کے لیے صلاح مشورے کرنے جا رہے ہیں آج کل اس کے پاس' کوئی مارٹ کھولنا ہے یا بیوٹی سیلون؟" سعد کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"آپ فکر نہ کریں' مجھے جب کوئی ایسا کام کرنا ہوگا' آپ سے ہی مشورہ کرکے کروں گا' ادھر ادھر سے نہیں۔"

"ہوں۔" انہوں نے اس کی طرف دیکھا "ایک کہاوت سناؤں؟"

"کہاوت۔" سعد نے دہرایا۔ "ٹیل یا فیری ٹیل؟"

"نہ ٹیل نہ فیری ٹیل۔ ایک کہاوت ہے۔"

"چلیں' جو بھی ہے سنائیے۔" اس نے دلچسپی لی۔

"ایک میراثن پر کسی بادشاہ کا دل آ گیا۔"

"یہ بادشاہ بھی خوب مخلوق ہوا کرتے تھے' میراثنوں تک کے لیے دل پھینک' جگہ جگہ اچھال دیا کرتے تھے۔" اس نے لقمہ دیا۔

"بادشاہ آدمی تھے' کچھ بھی کر سکتے تھے۔" وہ مسکرائے۔

"ہاں یہ تو ہے۔" اس نے سر ہلایا۔ "اچھا چلیں' آگے سنائیں۔ کیا ہوا؟"

"کہا نا بادشاہ تھے' تو دل پھینکا' دل کے شوق کو پورا کرنے کے لیے میراثن سے بیاہ کرلیا۔"

"اچھا ہے' جس سے دل کیا' بیاہ کرلیا۔" اس نے ہنس کر کہا۔ "کبھی اتنی آزادی عام انسان کو مل جائے تو ہر گھر میں حرم کھل جائے۔"

"تم خاموشی سے سنو گے یا میں سنانا بند کروں کہانی؟" وہ ناراض ہو گئے۔

"اوہ میں معذرت خواہ ہوں!" اس نے فوراً ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

"بس پھر بیاہ کے بعد وہ میراثن کو محل میں لے آیا۔" انہوں نے سنانا شروع کیا۔

"محل ایک طلسماتی دنیا تھی میراثن کے لیے' شان دار خواب گاہیں' بے مثال غلام گردشیں' گلاب باغات'

www.Paksociety.com

پھل، پھول، چرند پرند، جلترنگ بجاتے جھرنے، آبشاریں، بیش قیمت پوشاکیں، بکھرے جواہرات۔ کیا تھا جو میرانی کی رسائی میں نہ تھا۔"

"آج کل بھی ان لوگوں کی رسائی میں سب کچھ ہوتا ہے۔" بے اختیار الفاظ اس کے منہ سے نکلے۔ نگران کے گھورنے پر وہ فوراً خاموش ہو گیا۔

"مگر میرانی بجائے خوش رہنے کے اداس اور دکھی رہنے لگی۔" انہوں نے کہا۔

"بڑی تھینک لیس (ناشکری) میرانی تھی بھئی۔" ایک اور لقمہ اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"بادشاہ اس کی دل جوئی کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ ہر اس چیز کا اہتمام کرتا جس سے اس کا دل خوش ہو سکتا تھا مگر میرانی بیچاری بجائے خوش ہونے کے اداس اور غم زدہ رہ کر بیمار پڑ گئی۔ اس کا حسن ماند پڑ گیا اور جس زندہ دلی پر بادشاہ مرمٹا تھا خواب ہونے لگی۔"

"اوہ سو سیڈ!" سعد کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"بادشاہ کو میرانی سے دلی لگاؤ تھا۔" بلال اس بار بھی اس کے جملے سے صرف نظر کر کے آگے چلے۔ "اس نے ملک کے کونے کونے سے حکیم، طبیب، سادھو بلا لیے تاکہ میرانی کا بہترین علاج ہو سکے مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کے مصداق، وہ بیچاری تو بالکل خاموش اور لاغر ہو گئی۔"

"پلیز اس کو مارے گا مت، مجھے ٹریجک اینڈ والی کہانیاں بالکل نہیں پسند۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"خاموشی سے سنو بے صبرے!" انہوں نے ڈانٹا۔ وہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

"جب کوئی علاج کارگر نہ ہوا تو بادشاہ نے منادی کروا دی کہ جو شخص میرانی ملکہ کا علاج کرے اور اسے تندرست کروے گا اسے ایک لاکھ اشرفیاں انعام میں دی جائیں گی۔"

"پورے ملک میں منادی نجانے کیسے ہوا کرتی تھی ایک ساتھ۔" سعد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "بہت ٹیکنیکل قسم کا سسٹم ہوگا منادی کا یقیناً۔"

"خاموشی سے سنو گدھے!" بلال نے ڈانٹا۔ "یہ ریسرچ بعد میں کر لینا۔"

"اوہ سوری!" وہ پھر سے سعادت مند بن گیا۔

"کئی لوگ آئے کوشش کی مگر بے سود میرانی ملکہ کی حالت دن بدن بگڑتی ہی چلی گئی پھر ایک روز ایک دیہاتی ادھر کو آنکلا۔ منادی کی خبر سنی اور شاہی محل کا قصد کیا۔ بادشاہ کے دربار میں پہنچایا گیا تو دیکھا بادشاہ سمیت سب درباری اداس، پریشان بیٹھے ہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ بھی ملکہ کے علاج کی خاطر آیا ہے۔ بادشاہ مایوسی کی انتہا کو پہنچ چکا تھا بولا "اتنے بڑے بڑے طبیب، حکیم، سادھو، نجانے کون کون آیا اور کچھ نہ کر سکا" یہ سادہ لوح دیہاتی کیا کرے گا۔" وزیروں، مشیروں نے مشورہ دیا کہ سن تو لیا جائے کیا تدبیر بتاتا ہے، سو اس کی بات سنی گئی اور اس کے کہنے پر راتوں رات ایک ماڈل گاؤں تعمیر کروایا گیا جس میں مٹی کے لیپے پوتے گھر، تنگ گلیاں، نیچے چوبارے، ساتھ بنائے گئے ایک مختصر میدان جس میں دیہاتی میلے کا سامان کیا گیا۔ ڈھول، تاشے والے، بھاجڑیوں والے، کھیل تماشوں والے بلائے گئے اور یہ سب کرنے کے بعد بیمار ملکہ کو تخت پر لٹا کر اس گاؤں میں لایا گیا۔ ملکہ جو لاغر تھی اور آنکھیں بند کیے لیٹی تھی کانوں میں جب بھانڈوں کی جگتیں، ڈھول تاشوں کی دھما دھم اور میراثیوں کے گانوں کی آوازیں پڑیں تو جھٹ سے آنکھیں کھول دیں، جو ایک ناچنے والی کے گھنگھرو بجے اور کسی خواجہ سرا نے تان اڑائی تو یکدم اٹھ کر بیٹھ گئی، جو سامنے کا منظر دیکھا تو جھٹ تخت سے اتر مجمع میں جا شامل ہوئی۔ اپنے ہم نسب میراثیوں کے ساتھ تالی بجا بجا جھوم جھوم مرد ڈالنے لگی۔ کچے گھروندوں اور نیچے چبوتروں پر رقص کرتی گھنے چڑھنے لگی اس کے چہرے پر لالی آئی اور آنکھوں میں مسرت۔ بیماری یوں ہوا ہوئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔

یہ منظر دیکھ بادشاہ ہکا بکا رہ گیا، جو غور کیا اور دریافت کیا تو سمجھ آیا کہ انسانی جبلت اپنے اصل کو فراموش نہیں کر پاتی۔ تاج تخت، آسائشوں کے درمیان بھی بے چین رہتی ہے، سو انسان جتنا پس منظر سے دور ہوتا ہے اتنا ہی بے چین رہتا ہے۔"

انہوں نے بات ختم کر کے سعد کی جانب یوں دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ کیا سمجھے اس ساری کہانی سے۔

"ہوں!" سعد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ "اچھا!" اس نے ان کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اچھی کہانی ہے با معنی اور سوچنے پر مجبور کرنے والی۔"

"جانتے ہو یہ قصہ میں نے تمہیں کیوں سنایا ہے؟"

"کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو پھر ذرا غور کرو، دوست بناتے ہوئے اس کے پس منظر کا خیال رکھنا چاہیے یا نہیں؟"

"آپ رکھتے ہیں؟" اس نے میز پر رکھے گلاس کو گھماتے ہوئے نظریں اٹھا کر ان سے سوال کیا۔

"یقیناً۔" وہ مسکرائے۔ "کوشش ضرور کرتا ہوں، کبھی آغاز میں دھوکا کھا جاؤں تو بعد میں ایسے لوگوں میں سے میرانی پکڑ لینے کی صلاحیت ضرور رکھتا ہوں۔"

"گریٹ!" سعد نے بلند آواز میں کہا۔ "مگر اتفاق سے یا شاید بد قسمتی سے میں انسانوں کی ایک مختلف کیٹیگری سے تعلق رکھتا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں۔" انہوں نے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا ہوا تھا اسی لیے ان کی آواز دبی دبی تھی۔ "اسی لیے تمہیں یہ کہاوت سنائی ہے۔"

"تھینک یو۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اگرچہ اس کے سننے کے بعد بھی افاقہ ہونے کا امکان کم ہے۔" وہ مسکرایا۔

"سعد!" وہ دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ اسے عقب سے ان کی آواز آئی۔

"جی!" وہ رکا۔

"یہ مت سمجھنا کہ میں تمہاری ماں کو ڈی گریڈ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔" انہوں نے یوں کہا جیسے کسی انجانی ان دیکھی پر معذرت کر رہے ہوں۔

"آپ فکر مت کریں۔" اس نے مڑے بغیر کہا۔ "میں نے ایسا نہیں سمجھا۔ آپ ابراہیم کے بیک گراؤنڈ کی بات کر رہے تھے۔" اس نے دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھا۔

"اینڈ فار یور انفارمیشن، پنجاب قسم کے کسی پہلوان کی فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ تن سازی اکھاڑے میں نہ سہی جم میں سہی۔" اس نے مڑ کر ان کی جانب دیکھا ہولے سے مسکرایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

✲ ✲ ✲

فضا میں حد سے زیادہ سکوت تھا۔ وہ گرمیوں کی ایک طویل تھکا دینے والی دوپہر تھی۔ باہر صحن میں دن روشن تھا، بے حد روشن مگر اندر اس چھوٹی سی کوٹھڑی میں نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہلکی سی خنکی بھی تھی۔ چاچی صابرہ نے کوٹھڑی کا پکا فرش دھلوایا تھا اور اس کا پنکھا فل اسپیڈ پر کھلا چھوڑ دیا تھا۔ جب ہی یہ کوٹھڑی نیم تاریکی اور خنکی کی وجہ سے مدہوشی سی طاری کیے دے رہی تھی۔ اس نے بان کی کھری چارپائی پر لیٹے لیٹے نیچے ٹھنڈے فرش پر بغیر کسی بستر کے بے خبر سوئی چاچی صابرہ کو دیکھا اور مزید بور ہو گئی۔

"وقت ہے کہ گزر کے ہی نہیں دے رہا۔" اس نے سوچا اور پھر سامنے کی دیوار کے روشن دان میں جڑے

رنگ برنگے شیشوں کے ڈیزائنوں پر غور کرنے لگی۔ ہاتھ میں پکڑے کاغذوں کو رول کر کے آنکھ سے لگا کر دیکھنے پر ان شیشوں کا منظر اسے کسی کیلیڈو سکوپ جیسا لگا اور اس کی بوریت میں قدرے کمی آنے لگی۔

پندرہ منٹ بعد وہ اس دلچسپی سے بھی بور ہو چکی تھی۔ موبائل کی اسکرین آن کر کے وقت دیکھنے پر علم ہوا کہ ابھی سردار چاچا کے دیے ٹائم میں ایک گھنٹہ ستر منٹ باقی تھے۔

وہ تنگ آ کر دالان سے گزرتے باہر برآمدے میں آ گئی جس کی جالی دار دیوار پر موٹی موٹی چقیں تنی تھیں۔ ان کا نیلا استر کہیں کہیں سے پھٹا ہوا تھا۔ وہ پھٹی ہوئی چقوں کے گول سوراخوں سے چھتے سورج کی روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔

چاچی صابرہ کی خاص ملازمائیں ریحانہ اور بختو برآمدے میں بچھی چارپائیوں پر گھوڑے بیچ کر سوئی ہوئی تھیں۔

وہ برآمدے کی جالی کا دروازہ آہستگی سے کھول کر باہر آ گئی۔ دھوپ سے بھرے صحن کو عبور کر کے وہ باورچی خانے میں اندر داخل ہو گئی۔ یہاں بھی نیم تاریکی چھائی تھی۔ اس نے ٹوکری میں سے دو آلو لیے اور اپنے لیے چپس بنانے لگی۔

چپس کاٹ کر تیل سے بھری کڑاہی میں ڈالے ہی تھے کہ اسے باورچی خانے کی گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے باہر سے دو بچوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ اس نے وہ کھڑکی کھول دی۔ باہر بنے اونچے تھڑے پر وہ دونوں صرف جانگیہ پہنے بیٹھے تھے اور ان کے ہاتھوں میں برف کی رنگ برنگی سکرین کھلی قلفیاں تھیں جنہیں وہ گفتگو کے دوران مزے سے چوس رہے تھے۔ اسے ان بے پروا مگن کھلنڈرے انہماک سے قلفیاں چوستے بچوں پر لمحہ بھر کے لیے رشک آیا۔ ”کیسی بے فکر زندگی ہے۔“ اس نے سوچا اور چپس تلتے ہوئے ان کی گفتگو کی طرف توجہ مبذول کر دی۔

”اج باندر والے نے فیر آنا اے، جمعرات دی جمعراتی آوندا اے نا۔“ ایک بچے کی بات پر اس کے کان مزید متوجہ ہوئے۔

”اوہدی باندری بیمار اے۔ اوسدی لت نئیں سی ٹردی۔“ (اس کی بندریا بیمار ہے اس کی ٹانگ ٹھیک سے نہیں چلتی۔) دوسرے بچے نے قلفی کے پگھلے پانی کو اپنے ہاتھ پر سے چوستے ہوئے ماہرانہ رائے دی۔

”نوی باندری لیاوندا اے تے فیروی پنج پنج روپے لے لیندا اے۔“ (لنگڑی بندریا لاتا ہے پھر بھی پانچ پانچ روپے لے کر تماشا دکھاتا ہے) دوسرے نے تبصرہ کیا۔

”لے فیر منڈے جاندے نیں پے گراونڈے، چل اسیں وی چلیے۔“ (لو پھر لڑکے اس گراونڈ کی طرف جا رہے ہیں، چلو ہم بھی چلیں)

پہلے لڑکے نے قلفی کا تنکا اچھی طرح چوسنے اور پھر اسے اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد کہ اس پر دودھ کا قطرہ باقی تو نہیں رہ گیا، اسے نالی میں پھینکتے ہوئے کہا اور اٹھ کر دوڑ پڑا۔ دوسرا بھی اپنا تنکا چباتا اس کے پیچھے بھاگا۔

ماہ نور کے چپس تیار ہو چکے تھے۔ اس نے انہیں پلیٹ میں نکالا ہی تھا کہ ہانپتی کانپتی چاچی صابرہ باورچی خانے کا دروازہ تیزی سے کھول کر اندر داخل ہوئیں۔

”ہائے ہون ہو گئے! تجھے کس نے پھاڑ ڈالا تھا گرمی میں ادھر آنے کا نی ریحانہ! انی بیتے!“ وہ باہر کی طرف منہ کر کے بلند آواز میں بولیں۔ ”نی نسی ستیاں مراں ہی رہو مہمان وچاری آپی گرمی وچ کڑھدی آ تو ل دی رہی۔ تہانوں پتا دی نئیں چودھری صاحب نوں خبر ہو گئی تے لگ سمجھ جائے گی تہانوں۔“ (تم سوتی ہی رہ گئیں اور مہمان بی بی کو گرمی میں خود آلو تلنے پڑے، چودھری صاحب کو خبر ہو گئی تو تم کو سمجھ لگ جائے گی)

”چاچی جی! کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ لوگ سو رہے تھے اور مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کچھ نہیں سوجھا تو یہاں آ گئی

چپس بنانے۔ پلیز کسی کو مت ڈانٹیں۔ مجھے ضرورت ہوتی تو میں خود ان کو جگا لیتی۔“ ماہ نور اس واویلے پر بالکل ہی سٹپٹا گئی۔

”ہاں صدقے جاؤں! تجھے کہاں عادت ہے اتنی گرمی میں ایسے تپتے ہوئے باورچی خانے میں کام کرنے کی۔ اپنا چہرہ دیکھو! کمہلا گیا ہے بالکل۔ چلو شاباش نکلو ادھر سے۔ ادھر فارم ہاؤس کا آرام چھوڑ کر تو کا ہے کو ادھر آ گئی، گھر یہاں بیبا آرام کہاں۔“ چاچی صابرہ کے لہجے سے مامتا ٹپک رہی تھی۔ وہ زبردستی اسے وہاں سے نکال کر دالان میں لے آئیں اور بختو کو ٹھنڈا ٹھار شربت بنانے کو دوڑا دیا۔

”چاچی! پانچ بجنے والے ہیں۔ سردار چاچا نے کہا تھا کہ پانچ بجے آتا ہے تماشے والا نے۔“ اس نے انہیں یاد دلایا۔

”ہاں تو۔“ چاچی کو کوئی جلدی نہیں تھی۔ ”آپے بھجوا دیں گے کھاری کو تجھے لینے کے لیے جب آئے گا وہ باندر والا۔“

”مگر گلی کے بچے تو چلے بھی گئے۔“ وہ یوں بولی جیسے ان ہی بچوں کی طرح بھاگ جانے کو بے چین ہو۔

”اوہ وہ تو بچے ہیں، ان کا تو کام ہی سارا دن ادھر ادھر دوڑ پھرنا ہے۔ تو شربت پی سکون سے۔ دیکھ! آلو کھا کے اوپر سے فوراً ہی نہ ٹھنڈا شربت پی لینا گلا گھٹ کرے گا۔“

لیکن ماہ نور کا سارا دھیان کھاری کی آواز کی طرف تھا۔ کب وہ ادھر آتا ہے اور اس کو بلا کر اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

اسی بے دھیانی میں وہ شربت کے دو گلاس اور چپس کی پلیٹ ختم کر چکی تھی، جب باہر سے کھاری کی چیختی ہوئی آواز آئی۔

”بی بی جی! شہوانی بی بی کو بھیجو، باندر والا آ گیا اے۔“

وہ تیزی سے اٹھی اور چاچی کی ”ہے ہے“ کی پروا کیے بغیر باہر نکل گئی۔ اس کا شوق اور دلچسپی دیکھ کر کھاری دانت نکوستا اس کے آگے چلا۔ یہ وہی میدان تھا، وہی مجمع اور وہی تماشا۔ ڈگڈگی بجاتا تماشے والا بندر کو ہدایات دے رہا تھا۔

”اس کے سسرال والوں نے اسے متوقع پروٹوکول نہیں دیا، اسے ناراض ہو جانا چاہیے۔“ بندر بہت مہارت اور خوبی سے ناراضی کا تاثر دیتا ایک چوکی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گیا۔ ”اب بندریا منانے جائے گی۔ بندر اس کو ڈنڈے مارے گا، بندر تو صاحب سرکار ہے۔“

وہ سارا تماشا جو اس نے پچھلی مرتبہ اتنی محویت اور شوق سے دیکھا تھا، بالکل اسی طرح اس کی نظروں کے سامنے دہرایا جا رہا تھا۔ بچے بوڑھے اسی طرح تالیاں بجا بجا کر داد دے رہے تھے۔ لوگوں کے قدموں کی دھمک سے زمین کی گرد اڑ اڑ کر فضا میں بکھر رہی تھی۔ دسیوں بار دیکھے گئے تماشے کو ایک دفعہ پھر دیکھتے ہوئے بھی سب چہروں سے شوق، تجسس اور خوشی ہویدا تھی، مگر ماہ نور کا جسے اس تماشے کا اتنے دن سے شدت سے انتظار تھا، دل نجانے کیوں مایوس اور ناخوش تھا۔ وہ مجمعے سے پیچھے ہٹتے ہٹتے میدان کے پیچھے تعمیر شدہ دیوار کے ساتھ جا کر لگ گئی۔

”بلاواں باندر والے نوں بی بی جی! چودھری صاحب آکھیا بی بی نے باندر والے نوں ملنا اے۔“ کھاری دانت نکوستا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

”نہیں۔“ ماہ نور نے بدقت سر ہلایا۔ ”مجھے نہیں ملنا اس سے۔“

”اوہنے ٹر جانا اے، مل لو۔“ کھاری حیران ہوتا بولا۔ ”چودھری صاحب نے بندہ گھل کے یا اینوں ایدھر

www.paksociety.com

نیں تے ایہہ نے تے ٹر جانا سی بابے منگورے میلے تے۔" (چوہدری صاحب نے بندہ بھیج کر اسے ادھر بلایا ہے ورنہ اس نے تو اب بابا منگو کے میلے پر چلے جانا تھا) کھاری نے جتایا۔

"نہیں نا کھاری! انہیں ملنا۔" ماہ نور نے سختی سے کہا۔

"بوری دانیاں دی تے پنج سو روپیہ گھل کے منگایا اے چوہدری صاحب نے۔" (گندم کی بوری اور پانچ سو روپیہ دے کر چوہدری صاحب نے اسے ادھر بلایا ہے) کھاری نے مزید انکشاف کیا۔

"او بائی! پھر وہ تماشا ختم کر کے پیسے چنتے تماشے والے سے مخاطب ہوا۔

"ایویں ٹھنڈے ٹھنڈے نہ ٹر جائیں بی بی ہوراں دی گل سن کر جانا ای۔" (ایسے ہی مت چلے جانا بی بی جی کی بات سن کر جانا ہے)

کھاری نے تحکمانہ انداز میں اسے جتایا۔ وہ نوٹ اور سکے اٹھاتا ہوا گردن اٹھا کر ادھر دیکھنے لگا اور اثبات میں سر ہلا کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوا۔

"تم وہ تو نہیں، جو پچھلی بار یہاں آیا تھا۔" جب وہ اپنا سامان پیک کر کے ادھر آیا تو ماہ نور نے بے اختیار سوال کیا۔

"او ہو! ای اے بی جی! ایس دی باندری لوٹا اے، تے باندر دی اک اکھ ڈھنگی اے۔" (وہی ہے بی بی جی! اس کی بندریا کی ٹانگ چھوٹی ہے اور بندر کی بھی ایک آنکھ ٹیڑھی ہے) کھاری نے ایک دفعہ پھر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ "ایہی نشانی اے باندر تے باندری دی۔" (یہی نشانی ہے بندر اور بندریا کی۔)

"تم چپ کرو کھاری!" ماہ نور نے اسے ڈپٹا اور بندر والے سے مخاطب ہوئی۔ "ہاں تم بتاؤ، تم وہ نہیں ہو نا جو پچھلی مرتبہ آیا تھا؟"

جواب میں اس نے اپنی بڑھی ہوئی شیو سہلائی، کان میں انگلی ڈال کر کھجانے لگا۔

"کدوں؟" (کب) پھر اس نے پوچھا۔

"اس سے پچھلی مرتبہ جب تماشا یہاں اس گاؤں میں ہوا تھا۔" ماہ نور نے اپنے جملے کے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"اسی ای آوندے آں، ساڈا ای پھیرا ہوندا اے بی بی صیب!" اس نے نشے بھری آواز میں جواب دیا۔

"پچھلی مرتبہ، یاد کرو پچھلی مرتبہ۔" ماہ نور نے لفظ چبا چبا کر ادا کیے۔

"اوبی بی صیب! ایس علاقے وچ ہور کوئی باندر نہیں رکھدا ای نہیں۔ مندا پینڈا اے، سائیں حرکے ہور نہیں آندا سی!" وہ تھوڑا ہوش میں آتا بولا۔ (او بی بی صیب! اس علاقے میں کوئی بندر رکھتا ہی نہیں نقصان ہو جاتا ہے۔ یہاں کسی نے نہیں آنا)

"بیل ودیو۔" ماہ نور نے غصے سے کہا۔ "جاؤ دفع ہو جاؤ، مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے نہ ہی کوئی کام ہے۔"

"او چل بائی چل" (او چلو بھائی چلو) کھاری کو اچانک یاد آیا وہ محویت سے ساری گفتگو سنتا چونک کر بولا۔ "شکل گم کرائیں، ایویں ساڈا ٹیم برباد کیتا تے راہ جاندے دی بوری دانیاں دی تے روپیہ پنج سو کپ لیا۔" (شکل گم کرو اپنی، خوا مخواہ ہمارا ٹائم برباد کیا اور مفت کی گندم کی بوری اور پانچ سو روپیہ بھی لے اڑا۔)

"چلو پھر بی بی جی چلیے۔" اس نے مشن میں ناکام سپاہی کی طرح ہارے ہوئے لہجے میں ماہ نور کو مخاطب کیا۔ ماہ نور سر ہلا کر اس کے پیچھے چل دی۔

"ایہہ نشے دے مارے لوگ ہوندے نیں، جنہوں سوجھدی اے جنور پھڑ کر ٹر پیندا اے۔ انہاں نوں آپ دی نہیں پتا ہوندا پیسلاں کون گیا سی تے فیر کون گیا۔" (یہ نشے کے مارے لوگ ہوتے ہیں، جسے خیال آتا ہے

جانور لے کر چل پڑتا ہے۔ انہیں خود بھی نہیں پتا ہوتا پہلے کون گیا تھا اور پھر کون گیا تھا)

مختلف گلیوں میں ماہ نور کی رہنمائی کرتے ہوئے کھاری اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔

"او توں شکلاں وی اکو جیئے ہوندے نیں۔ ورے دے ورے تے تماشہ ہوندے نیں۔ جنور اس طل جنور ای بن جاندے نیں۔ انہاں دیاں شکلاں نہیں پچھانیاں جاوندیاں (اوپر سے شکلوں کے بھی ایک جیسے ہوتے ہیں، سال سال بعد تو تماشے ہوتے ہیں۔ جانوروں کے ساتھ جانور ہی بن جاتے ہیں، ان کی شکلیں نہیں پہچانی جاتیں۔)

وہ بولے جا رہا تھا اور ماہ نور صرف سن رہی تھی۔ اس کا ذہن اسی بات میں الجھا ہوا تھا کہ پچھلی مرتبہ والا تماشے والا کیوں نہیں آیا اور اگر نہیں بھی آیا تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اسے تو کرتب دیکھنا تھا، کسی سے بھی سہی۔ وہ کیوں اس تماشے والے کو دیکھ کر اتنے غصے میں آگئی تھی۔ اس نے اس سے تماشے کے بارے میں کیوں کچھ نہیں پوچھا۔

"گو دھر ہور وی ودے کرتب باز آوندے نیں بی بی جی بابے منگو دے میلے تے۔"

گھر کے دروازے پر پہنچ کر کھاری نے سرگوشی کے سے انداز میں اسے بتایا۔ "تسی چوہدری صاحب تے اکھو گڈی دیہن اودھر چلاں گے، تسے دل خوش ہو جاوے گا تماشا۔"

(بابے منگو کے میلے پر اور تماشوں والے بھی آتے ہیں۔ آپ چوہدری صاحب سے کہیں ہمیں گاڑی دے دیں، میلہ دیکھنے چلیں گے، تماشے سے آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔)

وہ کوئی جواب دیے بغیر گھر میں داخل ہو گئی۔ چاچی صابرہ صحن میں چارپائی ڈالے پیڈسٹل فین چلائے شان سے بیٹھی تھیں۔ دائیں بائیں تین چار ملازمائیں بیٹھی گاؤں بھر کی چیدہ چیدہ خبریں سنا رہی تھیں۔

ماہ نور تیزی سے اندر داخل ہوئی اور سلام کر کے اندر جانے لگی۔

"دیکھ آئی تماشا دھی رانی؟" چاچی صابرہ نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔

"جی۔" وہ کہہ کر تیزی سے اندر چلی گئی۔

"لے۔ تماشا دیکھ کے تو اس کا مزاج ہی خراب ہو گیا۔" چاچی نے حیرت سے کہا۔

"دھر آ کر کے دکھانا تھا بی بی جی!" ایک ملازمہ نے کہا۔ "اب ایہہ نہیں، بھیڑ میں کھڑے دیکھنا تھا اس وچاری نے۔"

"کہا تھا چوہدری صاحب نے کہ دھر ابلا لیتے ہیں فارم ہاؤس پر باندر والے کو پر یہ کہتی تھی کہ نہیں اس طرح مزا نہیں آئے گا۔" چاچی صابرہ نے منہ بنا کر جواب دیا۔

ماہ نور تھوڑی دیر بعد اپنا بیگ اٹھائے باہر نکلی۔ "چاچی جی! کھاری سے کہیں مجھے فارم ہاؤس چھوڑ آئے۔"

"لے دس، ایہہ نہیں افراتفری میں چھوڑ آئے فارم ہاؤس؟" چاچی نے حیران ہو کر کہا۔ "اور کھاری تو دفعہ بھی ہو گیا ہو گا کبھی کا ہلوا دے بلوا (چھلاوہ) ہے اس کا کوئی پتا چلتا ہے؟"

"چوہدری صاحب کو فون کرو کال بی بی جی۔ ڈرائیور گڈی بھیج دیں تو بی بی چلی جائے۔" ایک مصاحب بولی۔

"تو پھر اتنی جلدی کیا ہے؟" چاچی صابرہ کو یقینا "اس عجلت پر اعتراض تھا" آج رات اور ادھر گزار لے میں نے تیرے واسطے گڑ والے چاول پکوائے ہیں گری بادام میوہ ڈال کر، آلو گوشت کے ساتھ تندوری روٹیاں لگوائی ہیں۔"

"نہیں چاچی پلیز آپ کھاری کو بلوا دیں مجھے فارم ہاؤس جانا ہے۔"

اس نے قطعیت سے کہا اور یہ تو چاچی صابرہ اتنے سے دنوں میں سمجھ ہی چکی تھیں کہ اس لڑکی کے دماغ میں ایک بار جو بات آجائے وہ اس پر عمل کر کے ہی چھوڑتی تھی۔ سو انہوں نے مزید بحث کرنے کے بجائے بلتو کو بھیج دیا۔

اور کمہاری کے آتے ہی وہ فوراً انہیں سلام کر کے فوراً نکل گئی تھی۔ انہیں افسوس ہوا کہ وہ خصوصی کھانا جو انہوں نے اس کے لیے پکوایا تھا اس کی بے قدری ہو گئی۔

❁ ❁ ❁

"میں تمہیں کبھی ڈسکنگ سے سمجھ نہیں پاؤں گا' یہ طے ہے۔" ابراہیم نے ایک خراب ٹریڈ مل کی خرابی ڈھونڈنے کی خاطر باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"کوشش بھی مت کرنا خوامخواہ الجھ جاؤ گے۔" سعد نے مسکرا کر جواب دیا اور کرسی پر ٹانگیں پھیلا کر نیم دراز ہو گیا۔

"الٹی سیدھی حرکتیں تم کرتے ہو اور تمہارے بابا جان الزام مجھ پر دھرتے ہوئے مجھے اپنے ناپسندیدہ ترین افراد کی گنگوری کی جو انہوں نے ڈگریاں بنائی ہوئی ہیں اس میں نیچے سے نیچے ترین کی ڈگری میں شفٹ کرتے جاتے ہیں۔" ابراہیم نے پلاسٹک چڑھے تار کو دانت میں پھنسا کر اس کا پلاسٹک ادھیڑتے ہوئے کہا۔

"آئی ایم رئیلی سوری۔" سعد نے آنکھیں موندے جواب دیا۔ "مگر تمہیں پتا ہے نا کہ دوست ہی دوست کے کام آتے ہیں۔"

"یار! یہ کس قسم کی کوآپریشن ہے، جو تم مجھ سے چاہتے ہو۔" ابراہیم جھنجلا کر بولا۔ "اب اپنی نئی فرمائش پر غور کرو، یہ کوئی حرکت کرنے والی بات ہے جو تم کرنا چاہتے ہو۔"

"حرکت تو ہے۔" سعد نے اسے چڑایا۔ "بغیر حرکت کیے تو یہ کام ہونا نہیں' پھر کرنے والی کا کیا سوال ہے۔ تمہارا اعتراض ریجیکٹ ہوا۔"

"ایسا کرو، ہم کسی صوفی میوزک بینڈ کو جوائن کر لو۔ تمہارے بابا جو تمہیں مراثیوں اور میراثنوں کی کہانیاں سناتے ہیں' اس میں پتا نہیں کون سی لاشعوری حکمت کارفرما ہے۔" ابراہیم ٹریڈ مل کے نقص سے مایوس ہو کر اس کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"شک نہ کر یار! میرے ابا جان ایک اعلا نسل خاندان کے وارث ہیں۔ ازلوں سے جس کا تعلق تجارت و کاروبار سے ہے۔ یہ جو بارٹر سسٹم تھا نا اولین تجارت کا سسٹم' اس کے بانی بھی ہمارے آباؤ ہی تھے۔" ابراہیم کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"پھر یہ تمہاری والدہ صاحبہ کے خاندان کا قصور ہو گا۔" اس نے بمشکل اپنی ہنسی قابو کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں شاید اسی وجہ سے تو مجھے وہ طویل کہاوت سننی پڑی' جو میں نے تمہیں سنائی۔ تمہیں پتا تو ہے ہی کہ مدر ماضی کی ایک مشہور مغنیہ رہ چکی ہیں۔" سعد نے کہا۔

"ویسے تمہارے بابا کو زیب نہیں دیتا کہ تمہیں والدہ صاحب کی وجہ سے میراثنوں والی کہانیاں سنائیں۔ اگر وہ میراثن تھیں مطلب۔ اگر انہیں فن موسیقی سے شغف تھا' ان کا انتخاب بطور شریک حیات کے تمہارے والد صاحب نے کیوں کیا اور اگر کر ہی لیا تھا تو اس انتخاب کے نتیجے میں تمہارے ظہور کے قصوروار پھر بھی تم ٹھہرائے نہیں جا سکتے۔" ابراہیم نے جیسے فیصلہ صادر کرتے ہوئے کہا۔

"وہ اس اتفاق کو قصوروار نہیں ٹھہراتے بھائی! جو ان کے اور اماں جان کے ملاپ کا باعث بنا۔" سعد نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ ان جینز' جرثوموں کو قصوروار ٹھہراتے ہیں' جو والدہ صاحبہ کی طرف سے مجھ تک بدرجہ اتم منتقل ہو گئیں' اسی لیے مجھے میراثن کا قصہ سنایا گیا۔"

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening ,or you find any issue in using site send your complaint at
admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121
www.Paksociety.com

"تو اس میں بھی تو تمہارا کوئی قصور نہیں یار!" ابراہیم نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "کیوں تمہارے والد صاحب کے اپنے جڑواں اتنے اسٹرونگ نہیں تھے کہ تم تک منتقل ہو کر تمہیں لومڑی کی طرح عیار، خرگوش کی طرح چست اور الو کی طرح ذہین مخلیٖن بندر صفت تاجر بنا دیتے جس کو ٹوپیاں بیچنے کا گر آتا ہو۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" سعد نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھ میں دونوں کے جڑواں بڑے توازن کے ساتھ منتقل ہوئے ہیں۔ جس حد تک میراثی ہوں اسی حد تک ذہنی طور پر خاصا کاروباری بھی ہوں۔" وہ مسکرایا۔ "میری ڈگریز دیکھو، شروع سے اکنامکس، ٹریڈ اینڈ بزنس اور فنانس اینڈ مارکیٹنگ جیسے مضامین میں میرا دل زیادہ لگتا اور دماغ زیادہ چلتا رہا ہے۔"

"پھر تمہارے بابا جان کو اعتراض کس بات پر ہے؟" ابراہیم نے تعجب سے پوچھا۔

"بس وہ چاہتے ہیں کہ میرا سارا کا سارا دھیان ادھر ہی کی طرف لگ جائے اور یہ میں نہیں کر سکتا۔" سعد نے اپنی پینٹ پر سے نادیدہ مٹی جھاڑتے ہوئے کہا۔ "میں جتنا ٹائم ان کے لیے منافع بخش اور کامیاب بزنس معاہدوں پر لگاتا ہوں، اتنا ہی وقت اپنے دوسرے مشاغل میں مصروف رہنا پسند کرتا ہوں، بغیر کسی دخل اندازی یا بحث مباحثے کے اور یہ ہی ایک بات ہے، جو ان کی سمجھ میں نہیں آرہی یا پھر وہ اسے تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔"

"خیر، جو بھی ہے۔ مجھے تم دونوں باپ بیٹوں کی فلاسفی بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔" ابراہیم نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یار! تم لوگوں کے پاس اتنا بے شمار پیسہ ہے۔ آرام سے پرتعیش زندگی گزارو۔ وہ ہیں کہ اور اور رنانے کے چکر میں دن رات کا آرام حرام کیے ہوئے ہیں اور تم ہو کہ اپنے سر پھرے مشاغل میں اپنا آرام و سکون برباد کیے دیتے ہو۔ ایک بات تو بتاؤ۔" ابراہیم نے سعد کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں پوچھو۔" سعد نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔

"یہ جو تم لوگوں کے بینک اکاؤنٹس اثاثوں، پیسوں سے بھرے پڑے ہیں، ان کا کرتے کیا ہو؟"

سعد نے بھرپور قہقہہ لگایا اور پھر مسکراتے ہوئے ابراہیم کی طرف دیکھنے لگا۔ "ان کو ہم دونوں ہاتھ سے استعمال کرتے ہیں، وہ اپنے ذہنی سکون کے لیے اور میں اپنے ذہنی سکون پر۔ یہ اور بات ہے کہ ہم دونوں کے ذہنی سکون کے پیمانے الگ الگ ہیں۔"

"اوفو یار! اگر تم اپنے ذہنی سکون کے پیمانے بھرنے کے چکروں میں مجھے بھی گھسیٹ لیتے ہو اور بعد میں تمہارے والد صاحب میری کلاس لیتے ہیں کہ ان کے فرزند ارجمند کو بگاڑنے میں سارا کا سارا ہاتھ میرا ہے۔" ابراہیم نے جھنجھلا کر کہا۔

"بات یہ ہے جگر!" سعد نے مسکرا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ سب ایسے ہی چلتے رہنا ہے۔ تو میرا عزیز ترین دوست ہے، کبھی مہینوں میں ایک آدھ بار اگر وہ تیری کلاس لے ہی لیتے ہیں تو بس اچھے بچوں کی طرح سن لیا کر، تیرا کیا جاتا ہے یار!"

اس نے ہاتھ بڑھا کر ابراہیم کو بھی اٹھایا اور گیٹ کی طرف چل دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ پندرہ بیس منٹ میں ہی گھر سے سردار چاچا کے فارم ہاؤس تک پہنچ گئی تھی اور یہاں پہنچنے کے بعد گھنٹہ بھر سے کافی سے زیادہ بور ہو چکی تھی۔ سردار چاچا کسی کام سے گاؤں سے باہر گئے ہوئے تھے اور اس وقت یہاں صرف ملازمین کی حکومت تھی۔ کھاری اسے فارم ہاؤس تک پہنچانے کے راستے میں ڈراتا رہا کہ وہ فارم ہاؤس میں تمہارے گی اور وہاں پر کبھی کبھی انسان دوست بھوت بھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ وہ اندر سے ڈری ہوئی تھی اور اس کا

دل اب واپس اپنے گھر لوٹ جانے کو بے چین تھا۔ لیکن جب تک سردار چاچا نہیں آجاتے، وہ یہاں سے جا بھی نہیں سکتی تھی۔

بہت دیر تک وہ طویل برآمدے میں بچھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی سامنے کا منظر دیکھتی رہی۔ تاحد نظر سبزہ ہی سبزہ تھا۔ اونچے پیڑ اور سرسبز درخت، رنگ برنگ پھول جن میں سے بہت سوں کے ناموں سے بھی وہ واقف نہیں تھی۔ یہ عمارت شدید رنگ کے پتھروں سے بنی تھی۔ محرابی چھتوں، پتھر کے فرش اور لکڑی کے ستونوں پر کھڑا وہ برآمدہ اسے بے حد پسند تھا، مگر اس وقت شاید اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ پھر ادھر ادھر پھرتی جنت بی بی اس کو تنہا بیٹھے دیکھ کر ادھر آگئی۔ وہ اپنے ہاتھوں کو سہلا رہی تھی جن پر غالباً کوئی تیل لگا ہوا تھا۔

"کیا ہوا جنت بی بی؟" ماہ نور نے دھیان ہٹانے کو پوچھا۔

"کچھ نہیں ہوا جی۔" جنت نے ہاتھوں سے دھیان ہٹا کر کہا۔ "سبزیاں اور پھول توڑنے والے ہاتھ ہیں جی! زیادہ تکلیف ہو تو تیل مل لیتے ہیں۔"

ماہ نور نے آگے بڑھ کر جنت کے ہاتھ پکڑ لیے۔ جنت ہونق بکا رہ گئی۔

"یہ محنت کش کے ہاتھ ہیں جنت بی بی!" ماہ نور نے بے اختیار کہا۔

"یہ ہاتھ کھردرے اور بھدے ہیں جی۔" جنت نے جیسے جھینپ کر اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

"نہیں یہ بہت خوب صورت ہاتھ ہیں۔" ماہ نور نے کہا۔ "کوئی دوسرے ہاتھ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

جنت کے لیے یہ ایک نئی صورت حال تھی۔ وہ مالکوں کا غصہ، ڈانٹ اور ناراضی سہنے کی عادی تھی۔ اتنی نرمی اور اتنی اپنائیت اس کے لیے ایک بالکل نئی بات تھی۔

"ہاتھ تو آپ لوگوں کے خوب صورت ہوتے ہیں جی، مالکوں کے۔" جنت کے منہ سے الفاظ اٹک اٹک کے نکلے۔ گیٹ پر گاڑی کا ہارن بجا۔ جنت یکدم اپنے ہاتھ چھڑا کر عالم گھبراہٹ میں اپنی چپل ڈھونڈنے لگی۔

"کہاں چلیں؟" ماہ نور نے اس کی گھبراہٹ کو حیرت سے دیکھا۔

"چودھری صاحب آگئے جی، میں چلوں۔" وہ چپل پاؤں میں اڑسا کر چادر کی بکل مارتی پچھلی طرف غائب ہو گئی۔

ماہ نور نے گیٹ کی طرف دیکھا۔ تین چار گاڑیاں ڈرائیووے پر کھڑی تھیں اور سردار چاچا سمیت کئی لوگ ادھر ادھر کھڑے نظر آرہے تھے۔ وہ اٹھ کر اندر طویل ہال نما کمرے میں آگئی۔

اسی رات اس نے سردار چاچا کو بتایا کہ اسے بابے منگو کا میلہ دیکھنا ہے۔ اس کی یہ نئی فرمائش سردار چاچا کے لیے حسب معمول باعث حیرت بنی تھی مگر وہ مسکرا دیے۔

"بابے منگو کا میلہ تو تین دن تک جاری رہتا ہے بیٹا جی!" انہوں نے کہا۔

"چلیں آپ ایک ہی دن کے لیے جانے کی اجازت دے دیں۔" وہ بچوں کی طرح ضد کر کے بولی۔

"ویسے تمہیں بتایا کس نے بابے منگو کے میلے کے بارے میں؟" سردار چاچا نے اچانک پوچھا۔

وہ بے اختیار کھاری کا نام لینے لگی تھی مگر پھر اس نے فوراً الفاظ زبان تلے دبا لیے۔ کھاری ہی تو اس میلے کی سیر کے دوران اس کا راہبر بننے والا تھا اور اس کا نام لے دینے سے کیا معلوم اس کی شامت آجاتی۔

"تماشا دیکھنے والی بیبیوں نے بتایا آج۔" اس نے فوراً بات گھڑی۔ "وہ کہہ رہی تھیں کہ بندر کے تماشے والے وہاں بھی آتے ہیں۔"

"ہوں۔" چاچا سردار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اچھا چلو انتظام کر دیتے ہیں تمہارے وہاں جانے کا۔"

"تھینک یو سو مچ چاچا جی!" وہ خوشی کے عالم میں بولی۔

"مینشن ناٹ۔" چاچا سردار مسکرائے۔

"کبھی کبھار ہی لگتا ہے کہ آپ پڑھے لکھے بھی ہیں۔" ماہ نور نے شرارت سے کہا۔
"جیسے کبھی کبھار لگتا ہے کہ تم پڑھی لکھی نہیں ہو۔" انہوں نے برجستہ جواب دیا۔
"مثلاً "کب؟" یہ اس کے لیے نئی بات تھی۔
"مثلاً" جب تم بندر کے تماشے والے کے لیے سرگرداں دکھائی دیتی ہو۔" وہ مسکرائے۔ "مجھے گاؤں کی ایک عام سی میلے کپڑوں، میلے بالوں والی ان پڑھ لڑکی کا خیال آجاتا ہے، جس کی ماں باپ سے فرمائشیں بس ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

ماہ نور جھینپ گئی۔ "میں معذرت خواہ ہوں اگر آپ کو میری فرمائش اچھی نہیں لگی۔"
"ارے "ایسی کوئی بات نہیں ہے پتر جی!" سردار چاچا مسکرائے۔ "بلکہ مجھے اچھا لگتا ہے مجھے ماں باپ سے چھوٹی چھوٹی سیدھی سادی فرمائشیں کرتی بیٹیاں اچھی لگتی ہیں۔"
ماہ نور مسکرا دی۔
"اللہ نے مجھے اولاد نہیں دی، میں اس کی رضا میں راضی ہوں، لیکن میرے دل میں بیٹے سے زیادہ بیٹی کی تمنا رہی ہے۔ اسی لیے جب تم کسی چیز کی فرمائش کرتی ہو تو دل چاہتا ہے ایک دم پوری کروں۔" سردار چاچا کہہ رہے تھے۔
"اور وہ کھاری کم بخت کہہ رہا تھا۔ کیا پتا چوہدری صاحب اس فرمائش پر غصے میں آجائیں۔" ماہ نور نے دل میں سوچا۔
"چلو پھر میں بندوبست کرتا ہوں تمہارے جانے کا، تم اپنی تیاری کرو۔" سردار چاچا نے کہا۔
"میری تیاری؟" وہ چونک کر بولی۔ "میری کیا تیاری ہونا ہے چاچا جی!"
"ارے بھئی تم لوگ آج کل اپنے لوازمات کے بغیر نہیں نکلتے نا کہیں، وہ تمہارے کیمرہ، وہ آئی پوڈ، وہ آئی فون۔" سردار چاچا ہنس رہے تھے۔
ماہ نور بھی بے اختیار ہنس دی۔
"فکر نہ کریں، میرے پاس ایسے کوئی لوازم نہیں، ایک سیدھا سادہ موبائل فون ہے، اسی کو سب مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہوں، ویسے بھی اس قسم قسم کی ٹیکنالوجیز سے میری جان جاتی ہے۔" اس نے کہا اور اٹھ کر باہر کو چل دی۔
"کھاری کو میرے ساتھ کردیجیے گا چاچا جی راہ نمائی کے لیے۔" جاتے جاتے اسے یاد آیا۔
"ٹھیک ہے۔" چاچا جی ہنس دیے۔ "وہ تو بہت خوش ہوگا۔ اسے ایسے مشغلے بہت پسند ہیں۔" ماہ نور مسکرا کر باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

"میرے ایک ہاتھ میں تمہارے لیے پھول ہوں گے اور دوسرے ہاتھ میں کنگ سائز گفٹ باکس، پھر میں تمہارے گھر کا دروازہ کس طرح کھٹکھٹاؤں گا؟"
سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے ہوئے اسے کچھ عرصہ پہلے کی اپنی بات یاد آئی اور وہ مسکرا دیا۔ اس کے سامنے فلیٹ نمبر 209 کا دروازہ تھا۔ اس نے پھولوں کا گلدستہ دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا اور دروازے پر لگا کنڈا کھٹکھٹایا۔ اندر جامد خاموشی تھی۔ اس نے ایک نظر کال بیل کے ٹوٹے بٹن پر ڈالی، جسے چھونے پر ایک بار اسے زبردست کرنٹ لگا تھا۔ وہ اسے دوبارہ آزمانے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔

"کون؟" خاموشی ٹوٹی۔
"میں!" اس نے مختصر جواب دیا اور دروازہ وا ہو گیا۔
"میں" کا لفظ مکمل جا سم سم ثابت ہوا آج۔" اس نے اندر داخل ہو کر ہاتھ میں پکڑی دونوں چیزیں میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "شکر ہے آپ نے میری آواز پہچان لی۔"
"یہاں آتے ہی کتنے لوگ ہیں۔" وہ زنجیر میں لٹکی عینک ناک پر دھرتے ہوئے بولیں۔ "جو مجھے پہچان اور شناخت میں دقت ہو۔"
"ہاں یہ بھی ہے۔" سعد کو یمی آنٹی کی خشمگیں نگاہوں اور کھردرے لہجے سے ہمیشہ ہی سے ڈر لگتا تھا اس لیے وہ ان سے مختصر ترین بات کرنے کی کوشش کرتا تھا۔
"کیا ہوا وہ کارپینٹر؟" یمی آنٹی نے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنے سلائی کے سامان کے ڈبے میں ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا۔ "کھڑکی کا آخری قبضہ بھی اب ناکارہ گیا ہے، آج گری کہ کل گری، سمجھو۔"
"اوہ، وہ ابھی تک نہیں پہنچا؟" سعد کو افسوس ہوا۔ "میں ابھی پتا کرتا ہوں۔" اس نے اپنا سیل فون جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔ کارپینٹر کا نمبر ڈھونڈتے ہوئے اس نے ایک نظر یمی آنٹی پر ڈالی۔
"وہ سو رہی ہے یا جاگی ہوئی ہے؟" اس نے مختصر ترین الفاظ استعمال کیے۔
"جاگی ہوئی ہے، مگر سونے کی ایکٹنگ کر رہی ہے۔" وہ سوئی دھاگوں اور موتیوں میں الجھی ہوئی بولیں۔
سعد نے گہرا سانس لیا اور پھر کارپینٹر سے بات کرنے لگا۔ اسے کھڑکی کی صورت حال سے مکمل آگاہ کر کے جلد آنے کا کہا اور پھر مزید کوئی بات کیے بغیر سامنے والے کمرے کی طرف بڑھا۔
"تم اسے سمجھاتے کیوں نہیں کہ دنیا کی حقیقتیں آنکھیں بند کر کے بستر پر پڑے رہنے سے بدل نہیں جایا کرتیں۔" یمی آنٹی کی آواز نے اس کے قدم روک دیے۔
"تمہاری بات تو سمجھتی ہے نا وہ۔" وہ کہہ رہی تھیں۔ اس نے مڑ کر ایک نظر ان کی طرف دیکھا، پھر اس کی نظر میز پر رکھے پھولوں اور گفٹ باکس پر پڑی۔ وہ یمی آنٹی سے بچنے کے چکر میں یہ دونوں چیزیں یہاں ہی بھول چلا تھا۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دونوں چیزیں اٹھائیں اور اتنی ہی سرعت سے کمرے میں داخل ہو گیا۔
توقع کے عین مطابق وہ بیڈ پر آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ اس کے بیڈ کی پشت پر موجود کھڑکی کے شیشوں سے باہر دور تک پھیلا سبزہ نظر آرہا تھا۔ سرو قامت درخت اور ان کے ہوا کے ساتھ لرزتے پتے بھی۔ اس نے باہر کے منظر سے نظریں ہٹا کر بیڈ پر پڑے وجود کی طرف دیکھا۔ بیڈ پر حسب معمول سفید چادر بچھی تھی اور اس کے نچلے دھڑ پر بھی سفید چادر پڑی تھی۔ اس کے سیاہی مائل براؤن بال کھلے تھے اور اس کے چہرے اور تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا کمزور چہرہ زردی مائل تھا اور اس کے جبڑوں اور رخساروں کی ہڈیاں پچھلی دفعہ کی نسبت زیادہ ابھری ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کی صحت پہلے سے زیادہ گر چکی تھی۔ سعد نے ایک نظر میں اندازہ لگایا۔
"میں اس ادھورے وجود کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتی، مجھے موت کے ابدی اندھیروں سے محبت ہونے لگی ہے۔" سعد کو اس کی کہی بات یاد آگئی۔
وہ اس کو بغور دیکھ ہی رہا تھا، جب اس نے اچانک بند آنکھیں کھول کر سعد کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لمحہ بھر کو ظاہر ہوئی۔
"مجھے پتا چل جاتا ہے، جب تم آتے ہو۔" وہ کہہ رہی تھی۔
"ہاں!" وہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ تمہیں پتا چل جاتا ہے، مگر میں حیران ہوں کہ کیسے پتا چل جاتا ہے۔"

"بتاؤں کیسے؟" وہ ایک بار پھر ذرا سا مسکرائی۔
"ہاں پلیز ضرور بتاؤ۔" وہ نرمی سے بولا۔
"تمہاری...." اس نے کہنیوں کے سہارے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ سعد نے سرعت سے اٹھ کر اس کے پیچھے تکیے سیدھے کیے تاکہ وہ ٹیک لگا سکے۔
"تھینک یو۔" وہ اٹھ کر بیٹھنے میں ہی ہانپ سی گئی تھی۔
"ہوں۔" سعد نے واپس اپنی جگہ پر بیٹھ کر اس کی طرف دیکھا۔
"اب بتاؤ میرے آنے کا تمہیں کیسے پتا چل جاتا ہے؟"
"تمہاری موجودگی بہت اسٹرونگ ہے۔ محسوس ہو جاتی ہے چاہے آنکھیں کھلی ہوں یا نہیں۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
"اچھا!" سعد نے حیرت کا اظہار کیا۔ "وہ کیسے؟"
"پتا نہیں۔" اس نے سر تکیے سے ٹکاتے ہوئے کہا۔ "بس تم ایسے ہی لوگوں میں شامل ہو جن کی موجودگی خود بخود محسوس ہو جاتی ہے۔"
"اچھا!" سعد نے یوں سر جھٹکا جیسے کچھ سمجھ نہ پایا ہو۔ "مجھے فلسفیانہ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔"
"یہ فلسفیانہ نہیں بہت سادہ اور آسان سی بات ہے۔" وہ مسکرائی۔
"خیر۔" سعد اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے میز پر رکھے پھول اٹھائے۔
"تمہیں ٹیولپس پسند ہیں نا۔" اس نے سامنے رکھا۔
"ہاں خاص طور سے پنک اور بلو۔"
"اور ہیزل نٹ چاکلیٹس بھی۔" سعد نے ربن سے بندھا ڈبا اٹھایا۔
"بالکل۔"
"میں جب اس طرف آرہا تھا تو راستے میں ایک فلورل شاپ سے مجھے یہ ٹیولپس مل گئے اتفاق سے پنک اور بلو دونوں۔" سعد نے ڈبے کا ربن کھولا۔
"اور اتفاق ہی سے تمہیں یہ ہیزل نٹ چاکلیٹ مل گئے چاکلیٹس کے بیسٹ برانڈ میں۔" اس نے ڈبے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
ڈبا کھولتے سعد کے ہاتھ لمحہ بھر کے لیے رکے اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔
"ہاں اتفاق سے۔" اس نے نظریں جھکا کر ڈبے کا ڈھکن کھولا اور اس میں ترتیب سے رکھے چاکلیٹس پر نظر ڈالی۔
"کیسے ہیں؟" اس نے آگے بڑھ کر ڈبا اس کی گود میں رکھ دیا۔
"وہ سب بہت اچھا ہوتا ہے اور مجھے خوشی دیتا ہے جو تم میرے لیے لاتے ہو اور میرے لیے کرتے ہو۔" اس نے ترتیب سے رکھے خوشنما ریپرز میں لپٹے چاکلیٹس کی قطار پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ تم کرتے ہی اس لیے ہو کہ میں خوش ہو جاؤں۔"
سعد خاموش رہا۔
"مگر تم ایسا کیوں کرتے ہو اس سوال کا جواب نہ مجھے تم سے اب تک مل سکا ہے نہ میں خود جان پائی ہوں۔"
"کوئی ضرورت بھی نہیں ہے جاننے کی۔" سعد نے پھول اس کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھے شیشے کے گلاس میں رکھتے ہوئے کہا۔ "ہر بات کی وجہ جاننا ضروری نہیں ہوتا اگر کسی بات سے خوشی ملتی ہے تو کھل کر خوش ہونا

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers. If site is not opening ,or you find any issue in using site send your complaint at
admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121
www.Paksociety.com

چاہیے۔ کیوں اگر کیسے جیسے سوالوں میں پڑ کر اپنی خوشیاں برباد نہیں کرنی چاہئیں۔"

وہ کچھ دیر ہاتھ گود میں رکھے سوچتی رہی۔ "لیکن مجھے یہ بھی تو لگتا ہے کہ تم ایسا مجھ پر ترس کھا کر کرتے ہو جیسے تمہیں مجھ پر رحم آ رہا ہو۔" اس نے کہا۔

"کیوں؟" سعد نے اس کی گود میں رکھے چاکلیٹس میں سے ایک اٹھا کر اس کا ریپر کھولتے ہوئے کہا۔ "ایسی کون سی بات ہے جس کی وجہ سے مجھے تم پر ترس آئے گا؟ کون سا ایسا ظلم ہے جو تم پر ہوتے ہوئے دیکھ کر مجھے رحم آئے گا؟"

"یہ میری معذوری، یہ میری بے بسی، یہ میری لاچاری اور بے چارگی۔" اس نے اپنی ٹانگوں پر سے سفید چادر اتارتے ہوئے کہا۔

"خیر! یہ تو خوامخواہ کی بے چارگی اور خود ترسی ہے، جو تم اپنے اوپر طاری کیے ہوئے ہو۔" سعد نے چاکلیٹ منہ میں ڈال کر ریپر ڈسٹ بن کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ وہ اسی طرح نیم دراز سعد کی طرف دیکھتی رہی۔

"بات یہ ہے سارہ خان!" کچھ دیر بعد سعد نے چادر واپس اس کی ٹانگوں پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "حادثے بہت سوں کے ساتھ ہوتے ہیں ہم میں سے ہر ایک کو کسی بھی وقت کسی بھی کوئی انہونی ہو جانے کے لیے تیار رہنا چاہیے کیونکہ ہم انسان اسی دنیا کے باسی ہیں اور حادثے، سانحے، واقعے انسانوں کے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔" وہ یک ٹک اس کی طرف دیکھتے سن رہی تھی۔

"مگر ایک انسان دوسرے سے مختلف اور بہتر تب ثابت ہوتا ہے، جب وہ خود پر گزرنے والے حادثوں اور سانحوں سے خود کو برتر ثابت کرے۔ تم نے وہ مشہور بات تو سنی ہوگی جسے "Why me" کا عنوان دیا گیا ہے۔" سعد نے دیکھا وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"ایک شخص نے دنیا میں بھرپور زندگی گزاری۔ عیش عیاشی، آسائشات سے لطف اندوز ہوا۔ جس میدان کو اپنے لیے چنا اس میں ٹاپ پر چلا گیا، لیکن پھر اس کو ایک ناقابل علاج بیماری نے آن گھیرا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تم نے کبھی خدا سے یہ سوال کیا کہ اس نے تمہیں ہی کیوں اس بیماری میں مبتلا کر دیا تو جانتی ہو اس نے کیا جواب دیا؟"

سعد نے سارہ کی طرف دیکھا، جو ایک بار پھر نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"اس نے جواب دیا کہ جب میں دنیا کی آسائشات سے لطف اٹھا رہا تھا، جب میں زندگی کا ہر لمحہ عیش میں گزار رہا تھا، جب میں اپنے میدان میں کامیابیوں کے نقطہ عروج پر پہنچ گیا، اس وقت تو میں نے کبھی خدا سے نہیں پوچھا کہ اس دنیا میں موجود اتنے سارے لوگوں میں سے اس نے مجھے ہی کیوں اتنی کامیابیاں دیں، پھر اب میں یہ سوال اس سے کیسے کروں؟"

سعد نے بات ختم کرتے ہوئے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا، وہ ذرا بھی متاثر نظر نہیں آ رہی تھی۔

"اور دوسری طرف وہ لوگ بھی ہیں کہ جب وہ کسی حادثے سے دوچار ہوتے ہیں تو ڈٹ کر اس کا مقابلہ کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ "They are above it"" سعد نے ایک اور پوائنٹ اسے سنایا۔

"یہ بڑی بڑی باتیں مجھے متاثر نہیں کرتیں۔" سعد کی طویل بات کے جواب میں سارہ نے کہا۔ "یا پھر شاید میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" اس نے اپنی گود میں دھرے اپنے ہاتھوں کے ناخنوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جو شخص "Why me" کا جواب دے رہا تھا، اس کی زندگی آسائشوں میں گزری، من مرضی کی زندگی، کامیابیوں کے نقطہ عروج پر پہنچ جانے کی کہانی بھی اسی کی ہے۔ مگر وہ لڑکی جس نے آنکھ کھولتے ہی سرکس کے

ہو کر ہاتھی، شیر، گھوڑے، مداری اور تاروں پر چلتے لڑکے لڑکیاں اپنے اردگرد دیکھیں۔ جس کو ہوش سنبھالتے ہی نئے نئے کرتب سوچنے اور سیکھنے پر لگا دیا گیا ہو، ایسے کرتب، جو دوسروں کو زیادہ سے زیادہ تفریح دے سکیں، وہ خود کبھی ایسی کسی حرکت سے لطف اندوز ہوتی ہے یا نہیں، یہ کسی کا دردِ سر نہ ہو۔ جو لوہے کے کانٹوں پر لیٹتی، جادو کے زور پر خالی بکس میں اچانک بند پڑی ملتی، جو تنی ہوئی رسیوں پر چلتی، جو شیروں کے درمیان جیتی جاگتی کھڑی رہتی اور پھر موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلاتی، کبھی ہاتھ چھوڑ کر کبھی بازو پھیلا کر، تو اسے کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا ملتا۔ جس کی خواہشات کا پیدا ہوتے سے پہلے ہی گلا گھونٹ دیا گیا ہو، وہ جب کسی حادثے کا شکار ہو کر ٹانگیں، بازو تڑوا کر بستر معذوری کے لیے پڑ جائے تو کیا اس کا دل یہ سوال نہیں کرے گا کہ "Why me"

اس نے سر اٹھا کر سعد کی طرف دیکھا۔

"اور رہی I am above it والی بات تو یہی لڑکی جب حادثے کا شکار ہو جائے اور اس کی روزی روٹی کا آسرا اس کے بازو اس کی ٹانگیں کرچی کرچی ہو جائیں، اس کے کھانے اور پہننے کا آسرا ختم ہو جائے، اسے اس چھوٹی سی دنیا سے بھی نکال باہر کیا جائے، جہاں اس نے ایک عمر گزاری ہو۔ محض اس لیے کہ اب وہ ایک عضو معطل بن کر رہ گئی ہے تو وہ کس چیز کے بل بوتے پر مقابلہ کرے گی، ایسا مقابلہ جس کے جیت جانے پر وہ فخر سے سر اٹھا کر کہہ سکے۔

"میں اس سب سے ماورا ہوں۔"

"ہوں۔" سعد غور سے اس کی بات سننے کے بعد بولا۔ "ایک بات بتاؤں؟" پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔

"خود ترسی ایک چیز ہے جس میں اگر کوئی ایک دفعہ مبتلا ہو جائے تو اس کا نکلنا بہت مشکل ہے۔" وہ اپنی بات کا جواب سنے بغیر کمرے سے باہر نکلنے لگا۔

"یہ خود ترسی نہیں ہے، حقیقت ہے۔" اسے اپنے عقب سے آواز آئی۔ "اور وہ خدا ترسی ہے، جو تمہیں یہاں لے آئی ہے، جو تم سے ہمیں ہیلپ نوٹ کرواتی ہے، جو تم سے میرے لیے ایسی باتیں کرواتی ہے جن کو سن کر میں، جو تمہارے بقول خود ترسی میں مبتلا ہوں، اس سے باہر نکل آؤں اور جینا تم چاہتے ہو، ویسے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جی سکوں۔ مگر سچ یہ ہے سعد! کہ تم اور تمہارے جیسے لوگ ایسی باتیں اس لیے کر سکتے ہیں کہ تم ان حالات سے نہیں گزرے جن سے میں گزری ہوں۔"

سعد نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی خوابناک آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

"کہہ دینا آسان ہوتا ہے سعد! کرنا بہت مشکل۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"پھر بھی میری رائے وہی ہے، جو میں نے اب سے کچھ دیر پہلے دی۔" سعد نے اس بار یہ بات قدرے سخت لہجے میں کی۔

"اور یہ بات یاد رکھو کہ مجھے تمہارا یہ کہنا کہ میں تم پر ترس کھاتے ہوئے یہاں آتا ہوں اور تم سے ہمدردی جتاتا ہوں، مجھے بہت برا لگتا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "کسی کے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہوتا سارہ خان! ہمدردی اور خدا ترسی تو ایک بڑی رقم کے چیک کے ذریعے چٹکی بجاتے میں بھی کی جا سکتی ہے۔"

"تو تم یہ سب کیوں کرتے ہو؟ اس سوال کا بھی تو کوئی جواب ہوگا؟" اس نے عجیب سی کیفیت میں یہ لفظ بولے تھے۔

"ہاں اس کا جواب ہے، بالکل ہے۔" سعد نے دو قدم پیچھے جاتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے بہت عزیز ہو۔"

وہ سارہ کا ردعمل دیکھے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

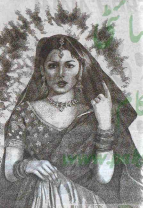

رخسانہ نگار

دل تک سفر

جیسے ہی ارسلان میاں اپنا سفری بیگ کندھے سے لٹکائے اور سوٹ کیس گھسیٹتے گھر کے کھلے صحن سے اندر داخل ہوئے' بے اختیار ٹھٹک کر رہ گئے۔

لڑکیاں چمکیلے کپڑے پہنے دائرے میں بیٹھی ڈھولک کے ساتھ تالیاں پیٹتے ہوئے جانے کون سا گیت گا رہی تھیں۔ یوں بھی نگر نگر پھر آنے کے بعد اتنی اجنبی زبانیں کانوں میں رس گھول چکی تھیں کہ فوری طور پر اپنی زبان کے مانوس الفاظ بھی اجنبی لگنے لگے۔ چند سیکنڈ غور کرنے کے بعد بھی جب گیت کچھ خاص پلے نہیں پڑا تو انہوں نے اس پر دو حرف بھیج کر اگلے منظر پہ دھیان دیا۔ سامنے ہی تو منیا کی خالہ زیتون سرخ بھڑکیلے بنارسی سوٹ میں اسی رنگ سے منہ کو لتھیڑے ہوئے خوب ہنس رہی تھیں۔

ان کے ساتھ شاید کوئی دلہن بیٹھی تھی بلکہ شاید نہیں یقیناً" وہ دلہن ہی تھی' جسے زیتون خالہ باقاعدہ بغل میں دبوچے بیٹھی تھیں۔ پہلی نظر میں تو ارسلان میاں یہ سمجھے کہ زیتون خالہ نے عقد ثانی کرلیا ہے مگر خالو حیات کی موجودگی میں نکاح پہ نکاح ایک گناہ عظیم!

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے خالو حیات ان آٹھ ماہ میں اس دار فانی سے اٹھ چکے ہوں تو عدت کے چار ماہ دس دن نکل کر زیتون خالہ کا شرعی حق بنتا ہے عقد ثانی۔"

وہ خود ہی سر ہلا کر رہ گئے۔ اگلا مرحلہ البتہ انہیں خاصا دشوار لگا کہ اب زیتون خالہ سے خالو حیات کی موت کا افسوس کریں گے یا ان کے عقد ثانی کی مبارک دیں گے۔ مگر ان کی بغل میں جو دلہن منہ چھپائے بیٹھی ہے' وہ کون ہے۔ اگلا سوال اور بھی الجھن کا باعث تھا۔

"لو بھی مبارک ہو' دیکھو' سیلانی بھائی بھی بہن کی خوشی میں شامل ہونے کے لیے آگئے۔ اس سے بڑی خوشی اور کیا ہوگی۔" کسی نے ان کو دیکھ کر آواز لگائی۔

"بہن کی خوشی؟" وہ شاک میں کھڑے رہ گئے۔

"لیکن زیتون خالہ ان کی بہن کب سے ہو گئیں بھلا؟ عجیب احمق تھا جملہ کہنے والا بھی۔"

"نہیں' یہ تو شاید اس دلہن کے بارے میں کہا گیا ہے۔" دوسرا خیال فوراً ہی کوندا۔

"میری بہن؟ مگر میری تو کوئی بہن نہیں تھی۔ تو اس کا مطلب ہے ابا مرحوم نے کہیں خفیہ دوسری شادی کر رکھی تھی۔ ان ہی کی یہ بقیہ نشانی ہوگی جسے اس شریف خاندان نے سینے سے لگا لیا مگر میں تو اس لڑکی کو بہن قبول نہیں کروں گا۔ کوئی تو تُکی ہی نہ ہو۔ ابا میاں کے جھوٹے نکاح کی کہانی گھڑی ہو۔ یہ باقی سب تو احمق ہیں میں نے تو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔"

وہ "بہن" کا تیا پانچہ کرنے فیصلہ کن انداز میں آگے بڑھے۔

"ارے جگہ دو کمبختو! بہن کے پاس بھائی کو۔" اب کے زیتون خالہ نے جانے کن کمبختوں کو پرے دھکیل کر اپنے قریب ارسلان میاں کی جگہ بنائی۔

وہ خشمگیں نظروں سے دلہن بنی بہن کو گھورتے بیٹھ گئے۔

"منیا! دیکھ تو سیلانی بھائی بھی آگئے تیری خوشی میں شامل ہونے۔" زیتون خالہ نے دلہن کے کان میں باآواز سرگوشی کی۔

www.Paksociety.com

"وہ تو تیرے کی۔ تو یہ ضیا ہے اور میں کیا سمجھا۔" مدثر چچا کی بیٹی جسے نہ کبھی بس سمجھا نہ کزن نہ دوست ...... وہ تو دونوں گھروں کی بس ضیا تھی اور آج دلہن۔

ان کی دور رس میں گھوڑے دوڑاتی سوکھی گھاس چرتی عقل بالآخر ان کی کھوپڑی میں واپس آ ہی گئی۔ وہ سفر کی ساری تکان بھول کر کھل کر مسکرائے۔ ڈھولک کے گیت بھی یکایک ان کی سمجھ میں آنے لگے تھے اور سب کے ٹھٹھے بھی۔

"اپنے توقیر کی دلہن بنا رہی ہوں میں اپنی ضیا کو۔" زیتون خالہ نے بڑے فخر سے اعلان کیا۔

"مبارک ہو خالہ پھر تو آپ کو۔" ارسلان میاں نے خوامخواہ ہنس کر مبارک باد دی۔

"اے تم بھائیوں کو بھی مبارک آج آخری بہن کے فرض سے بھی سبک دوش ہوئے سمجھو۔"

"توقیر آگیا جرمنی سے؟" ارسلان کو صد شکر بروقت یاد آگیا کہ زیتون خالہ کا اکلوتا فرزند جرمنی میں ہوتا ہے ورنہ تو وہ کسی اور ہی ملک کا نام لیتے۔ انہیں خود کئی دنوں سے محسوس ہو رہا تھا کہ انسانوں، جذبوں، رشتوں کے آپس میں تعلق کو ملاتے ہوئے ان کا حافظہ ٹھیک ٹھاک غچہ دینے لگا ہے۔

"آج تو منگنی ہے۔ چار ماہ بعد توقیر کے جرمنی سے آتے ہی شادی ہے۔ اب تم ان چار ماہ میں کہیں بوریا بستر باندھ کر نہ چل پڑنا بلکہ میری مانو تو اس بار تم بھی کسی کھونٹے سے بندھ جاؤ۔ یہ نگر نگر بنجاروں کی طرح پھرنا چھوڑ دو۔ سب بہن بھائی لمحہ کانے لگے اب تو ان کے بچے بھی تمہارے کندھوں کو آنے لگے ہیں۔" زیتون خالہ نے ٹھیک ٹھاک لیکچر دے ڈالا۔

"جی خالہ!" وہ حسب معمول سر ہلا کر بولے۔

"خالہ! رسم کریں کافی وقت ہو رہا ہے پھر لائٹ چلی جائے گی۔ جنریٹر بھی ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔" دونوں بھائی اور بھابھیاں ارسلان کے پاس آکر بیٹھ گئے اور بھتیجے، بھتیجیاں پر شوق نگاہوں سے انہیں دیکھتے ارد گرد منڈلاتو رہے تھے اور حسب عادت وہ اس بار پھر سب کے فردا فردا نام بھول چکے تھے اور اب خود سے بلانے میں پہل کرنے کے بجائے منتظر تھے کہ وہ ایک دوسرے کو پکاریں تو ان کی یادداشت کو تازگی کا چھینٹا لگے۔

خالہ نے خوب اونچی آواز میں بسم اللہ پڑھ کر ضیا کو خوب صورت سی سونے کی انگوٹھی پہنا دی۔ سب نے زور و شور سے مبارک باد دی۔

مگر یہ کیا۔ انگوٹھی تو پہناتے ہی دھپ سے انگلی سے پھسل کر نیچے گر گئی۔

"اوئی اللہ! یہ کیا بدشگونی ہوئی۔ انگوٹھی کیوں گر گئی انگلی سے۔ خالہ! آپ ٹھیک نہیں لیا تھا؟" کوئی بولی۔

"اے میں تو صحیح ناپ دے کر آئی تھی۔ اس کمینے سنار کو جانے کیا ہوا۔" کسی نے جلدی سے انگوٹھی اٹھا کر دی۔ خالہ نے جھٹ سے پھر پہنا دی اور ساتھ ہی ضیا کی مٹھی بھی بند کردی حفظ ماتقدم کے طور پر۔

سب مبارک سلامت کے شور میں لگے تھے اور ارسلان کو اب نہانے کی طلب ہو رہی تھی۔ سو چپکے سے ان کے بیچ سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔

☆ ☆ ☆

"یہ کیا؟" وہ دروازے میں ہی بت بن گئے۔ سارے کمرے کی دیواروں پر کترینہ کیف، کرشمہ کپور اور نہ جانے کون کون سی انڈین بلاؤں کی قد آدم تصویریں لگی تھیں۔ ان کے نرم گداز بیڈ کی جگہ تین سنگل بیڈ قطار میں لگے تھے۔ ایک طرف پڑی ڈریسنگ ٹیبل پر چوڑیوں، جیولری اور میک اپ کا ڈھیر پڑا تھا۔

"شاید منگنی کی تقریب کی وجہ سے یہ کمرا مہمان لڑکیوں کو دے دیا گیا ہو۔" وہ کچھ سوچ کر آگے بڑھے کہ الماری سے اپنا کوئی سوٹ نکالیں تو ساری الماری میں گویا رنگوں کی بہار اتری ہوئی تھی رنگ برنگے خوب صورت نسوانی پہناوے تھے۔ ایک میں خوب صورت جوتوں کے ڈھیر اور دوسرے میں بہت سا نسوانی سامان۔

انہوں نے زور سے الماری بند کردی۔

"تو میرے کپڑے کہاں گئے؟" وہ گم صم سے کھڑے رہ گئے۔

"اوپر کے چوبارے میں رکھوا دیا ہے ہم نے تمہارا سارا سامان بھیا! تم تو سال کے ڈیڑھ مہینے یہاں ٹکتے ہو۔ ہمارے بچے اب بڑے ہوگئے ہیں سب ہی کو الگ کمروں کی ضرورت ہے۔ تینوں بچیوں کو یہ کمرا دے دیا۔ اب جوان ہوتی بچیوں کو تو ہم چوبارے میں نہیں ٹانگ سکتے تھے نا۔"

بڑی بھابھی کچھ ہی دیر میں ان کو تلاشتی پہنچیں تو سارا قصہ کھول کر رکھ دیا۔

"مگر چوبارے کے ساتھ تو کوئی باتھ روم بھی نہیں۔" وہ منمنائے۔

"یوں تو باہر کا غسل خانہ ایک دم چالو حالت میں ہے تھوڑی صفائی میں ابھی کروا دیتی ہوں۔ پھر بھی تم ماشاء اللہ جوان جہان ہو۔ چار سیڑھیاں اتر تو نیچے کے واش روم استعمال کرلو۔" انہوں نے مسئلہ چٹکیوں میں حل کر دیا۔

اور چوبارے میں ان کا سامان کچھ ایسی بے سروسامانی کی حالت میں پڑا تھا کہ ان کا جی چاہا فوراً یہاں سے بھاگ جائیں مگر اس بار تو وہ نگر نگر کی مسافت سے بھاگ کر گھر کو آئے تھے کہ اب کے چھ، آٹھ ماہ گھر سے نہیں نکلنا۔ تو اب کہاں جائیں۔

بیڈ کا کاٹھ کباڑ ادھر ادھر ہٹا کر کچھ بیٹھنے کی جگہ بنائی اور سوچنے لگے یہ سب کیسے ہو گیا۔ گھر میں تو ان کا بھی دونوں بھائیوں کے ساتھ برابر کا حصہ تھا پھر انہیں یوں کاٹ کر الگ کیوں کر دیا گیا۔ اس لیے کہ انہوں نے شادی نہیں کی؟

مگر اس میں ان کا قصور؟

اکیس سال کے تھے جب قومی ہاکی ٹیم میں سلیکٹ ہوئے۔ چار ٹورنامنٹ کھیلے اور پھر جہاں نوردی کی ایسی چاٹ لگی کہ ہر سال نئے سے نئے ملک گھومنے کا قصد کیے لاما مرحوم کی چھوڑی اپنے حصے کی جائیداد میں سے موٹی رقم کیتے اور چل پڑتے۔ تینوں بھائیوں کے نام دو دکانیں تھیں اور ابا کی زرعی اراضی بیچ کر تینوں کے حصے میں پندرہ پندرہ لاکھ آئے، وہ دونوں تو جاب بھی کرتے تھے۔ ارسلان نے تو چند ماہ نوکری کی اور پھر اس مشقت سے بھاگ نکلے۔ اب تو پیروں میں ایسے پہیے لگے تھے کہ بمشکل دو تین ماہ گھر میں ٹکتے اور پھر سیاحت کو نکل پڑتے۔ ارسلان میاں سے وہ سیلانی بھائی بن گئے اور غائبانہ ابن بطوطہ!

مگر سردست تو اس کمرے کی حالت زار تھی۔ نہ اماں مرحومہ زندہ تھیں نہ کوئی بہن کہ جا کر اس کے پاس رونا روتے۔ وہیں جگہ بنا کر جو لیٹے تو بے سدھ ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح سارے گھر میں ڈھنڈیا مچی تھی کہ ضیا کی انگوٹھی کہیں کھو گئی۔ پورا گھر چھان مارا مگر انگوٹھی نہیں ملی۔ زیتون خالہ کو خبر نہ پہنچے ورنہ خوب واویلا کریں گی۔ سب کی یہی کوشش تھی۔

ضیا کی بھابھی اور بہن دونوں کو سخت غصہ تھا ضیا کی لاپروائی پر۔

"ایک تو خدا خدا کر کے رشتہ ہوا وہ بھی ایسا شاندار اور اس ناقدری کو کوئی قدر ہی نہیں۔ ذرا جو ذمہ داری دکھائی ہو۔" آپا اور بین بولے جا رہی تھیں۔

ارسلان نے رضیہ کو آگے لگایا اور اوپر لے جا کر چوبارے کی صفائی کروائی۔ سامان ٹھکانے لگوایا مگر وہاں تو کوئی کپڑوں کی الماری بھی نہیں تھی۔ کپڑے کہاں رکھے جاتے۔

"اسی لیے تو سب آپ سے بولتے ہیں شادی کر لیں۔ سب کچھ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ ہوئی ہوتی شادی تو کسی کی مجال تھی کہ آپ کا سامان اٹھا کر اوپر پھینک دیتا۔" وہ ان پڑھ رضیہ اس گھڑی انہیں سیانی لگی مگر اب یہ باتیں فضول تھیں۔ شادی کا صفحہ وہ بہت پہلے اپنی زندگی سے پھاڑ چکے تھے۔ شادی کا مطلب تو

www.paksociety.com

ذمہ داری تھا اور وہ تو خود اپنی ذمہ داری اٹھانے سے قاصر تھے، کسی دوسرے کی کیا اٹھا پاتے بھر بچے ہو جاتے تو ان کے ایک ہزار بکھیڑے۔

وہ مت پہلے کانوں کو ہاتھ لگا چکے تھے۔

ضیا شاید اپنی انگوٹھی تلاشتی ان کے کمرے تک پہنچی تھی۔

"سیلانی بھیا! کپڑے کہاں رکھیں گے؟" وہ تشویش سے بولی۔

"کیا سیلانی بھیا، سیلانی بھیا لگا رکھی ہے۔ سیدھا ارسلان بھائی نہیں کہہ سکتیں؟" وہ جو تپے بیٹھے تھے اس پر الٹ پڑے۔

"مگر آپ یہاں رہیں گے کیسے؟ یہاں تو۔"

"کیوں یہاں کھٹمل ہیں یا بچھو؟" وہ چڑ کر بولے تو وہ خاموشی سے چلی گئی۔

اور اس بات کا پتا انہیں اگلی رات ہی چل گیا جب برسات کی پہلی موسلا دھار جھڑی لگی اور وہ مزے سے بستر میں دبکے سو رہے تھے۔ جگہ جگہ سے ان پر باران رحمت براہ راست برسنے لگی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھے۔ پی آر سے بنی چھت جگہ جگہ سے ٹپک رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں ان کا بیڈ اور پورا کمرا چھوٹے سے تالاب کا منظر پیش کرنے لگا۔ وہ ایک کونے میں پریشان سے دبک کر بیٹھ گئے۔

☆ ☆ ☆

"بھئی نیچے کے پورشن میں سارے کمرے بھرے ہیں، بندوں سے بھی اور سامان سے بھی۔ دوسرے میں چھلے کے بیوی بچے سامان۔ اب تم یوں کرو، رہنا ہے تو تیسری منزل پر اپنے لیے ایک پورشن ڈال لو۔ ہم سب نے بھی اچھا خاصا پیسہ لگایا ہے، ابا میاں کے اس گھر کو رہنے کے قابل بنانے کے لیے۔" دونوں بھائیوں نے مختلف الفاظ میں ایک ہی طرح کا مدعا کہہ ڈالا۔ شاید وہ سب سمجھ رہے تھے کہ وہ چند روز میں دنوں میں پھر سے نکلنے کی کریں گے مگر جانے ان کے کیا ہوا تھا کہ دل گھر سے جانے کو راضی نہیں تھا مگر رہنے والی بھی تو کوئی صورت نہ تھی۔

ضیا کی انگوٹھی نہ ملی۔ نورین آپا نے زیتون خالہ کے خوف سے نئی انگوٹھی بنوا دی، مگر وہ بھی چند دنوں میں ڈھیلی ہو کر کہیں کھو گئی۔ سب سے خوب پھٹکار پڑی۔

یوں بھی تو قیر کے آنے میں تین ہی تو مہینے تھے، پانچ مئی۔ ضیا تو پہلے بھی سارے خاندان میں پست قامت سمجھی جاتی تھی۔ اب دن بدن دبلی بھی ہوتی جا رہی تھی۔ ہر سائز اسے ڈھیلا ہوتا جا رہا تھا۔

"سیلانی بھیا! آپ میرے کمرے میں آ کر رہ لیں۔ میں اوپر چوبارے میں رہ لوں گی۔ یوں بھی تین ماہ بعد تو میں نے چلے ہی جانا ہے۔" ضیا ان کے پاس آ کر سنجیدگی سے بولی۔

"ہیں! تم اکیلی اوپر کہاں رہو گی؟" وہ فوراً انکار نہ کر سکے۔

"اسعد کی بیٹی تو میرے ساتھ ہی سوتی ہے تو اکیلی کیوں؟" وہ فوراً بولی تو ارسلان سے اب انکار نہ ہو سکا۔ ضیا نے رضیہ اور اس کی بیٹی کو ساتھ لگا کر اوپر نیچے کا سامان شفٹ کر دیا۔ یوں وہ ضیا کے کمرے میں شفٹ ہو گئے۔

وہ تو شکر تھا ابھی دونوں گھروں میں دیوار نہیں اٹھی تھی۔ بیچ میں بس کھلا سا صحن تھا۔ ارسلان کے تو اور مزے ہو گئے۔ دونوں بھابیاں انہیں کھانے پر بلانا بھول بھی جاتیں تو ظہیر بھیا کی بیوی نازیہ بہت پیار سے انہیں کھانے پر بلانے آ جاتی۔ وہ بھول جاتی تو ضیا تو تھی ہی تین مہینوں کے لیے۔

گھر میں ضیا کی شادی کی تیاریاں زور و شور سے چل رہی تھیں۔

"تم اب کے ٹک گئے ہو تو شادی وادی بھی کر لو۔" بڑی بھابی ضیا کے جوڑے ٹانکتے ہوئے کچھ جتا کر بولیں پھر تو سب ہی ایک زبان ہو گئے۔

وہ گھبرا کر باہر نکل آئے۔

"شادی کر لیں تو کیا بیوی کو ضیا کے کمرے میں رکھیں گے۔ پہلے تو یہ مدثر چچا کا پورشن تھا۔"

"مگر میں شادی کے بارے میں کیوں سوچ رہا ہوں۔" وہ جھلا کر ایک دوست سے ملنے چل پڑے۔

☆ ☆ ☆

توقیر تین مہینوں سے پہلے ہی گھر آ گیا مگر اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ۔ پہلے تو سارے خاندان میں سانپ سونگھا پھر جو زیتون خالہ پر لعن طعن اور پھٹکار شروع ہوئی۔ ضیا اور بھی اس شور و غل میں کہیں گم ہو گئی۔

وہ تو جیسے گھلتی جا رہی تھی۔ جب بھی ارسلان اسے دیکھتے تو کچھ چونک اٹھتے۔ وہ پہلے سے بھی کمزور اور پست قامت دکھتی۔

"کہیں اسے کوئی خوف ناک بیماری تو نہیں۔" وہ پریشان ہو کر سوچتے۔

سات دن سے اسے بخار تھا جو نہ اتر رہا تھا نہ کم ہو رہا تھا۔ سب ضیا کو ہسپتال لے کر دوڑے۔ اسے وہاں داخل کر لیا گیا اور اب مختلف ٹیسٹ ہو رہے تھے۔

ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ بھی ہسپتال جائیں یا گھر پڑے رہیں۔

"اب بے چاری نے اپنا کمرا بھی دے دیا اس خیال سے کہ تین ماہ بعد تو اس نے بیاہ کر چلے ہی جانا ہے۔ سب کہتے ہیں وہ توقیر کو بہت پسند کرتی تھی، اس کی بے وفائی نے ضیا کو روگ لگا دیا۔" انہیں توقیر پر جی بھر کر غصہ آیا۔

الماری کے اوپر پرانی کتابوں اور کتابچوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ یونہی کرسی رکھ کر کھنگالنے لگے کہ کتابوں کے پیچھے ایک صندل کا ڈبا جھانک رہا تھا۔ انہوں نے وہ گرد آلود ڈبا اٹھایا اور نیچے رکھ کر کھولنے لگے۔ ڈبے پر چھوٹا سا تالا لگا تھا۔ پہلے تو پرائیویسی کے خیال سے واپس رکھنے لگے مگر یہ دیکھ کر رہ نہ سکے کہ تالا کھلا تھا۔

ڈبا کھلتے ہی وہ جیسے دنگ سے رہ گئے۔

مور کے دو رنگین پر۔

انہیں یاد تھا۔ نویں کلاس میں تھے وہ جب انہوں نے ضیا کو یہ پر لا کر دیے تھے۔ ایک چھوٹی سی سنہری بالوں والی گڑیا جس کی ٹانگ ارسلان نے توڑی تھی۔ آخری بار جب وہ اسپین سے آئے تھے تو ضیا کے لیے بڑے بے حد خوب صورت ٹاپس لائے تھے، وہ بھی اس میں موجود تھے۔ ارسلان کے دو رومال، ایک ان کے پسندیدہ پرفیوم کی خالی شیشی، ضیا اور ان کے ایک بچپن کی اور ایک لڑکپن کی پرانی تصویریں اور جو پچھلی

عید پر انہوں نے ضیا کو چوڑیوں والی نہیں ساری موجود تھیں اور سب سے نیچے وہ دونوں ڈھیلی انگوٹھیاں ضیا کی منگنی کی اور دوسری جو نورین آپا نے بعد میں لے کر دی تھی۔

تو ضیا نے جان بوجھ کر یہ انگوٹھیاں خود سنبھال چھپائی تھیں اور جب وہ سارے گھر کے آگے رونا رو چکے تھے کہ چوبارے میں رہنا مشکل ہے تو کیسے ضیا نے خاموشی سے اپنا کمرا انہیں دے دیا۔

انہیں یاد آیا۔ وہ جب بھی لمبے سفر سے گھر لوٹتے تھے تو ہر بار ضیا انہیں سامنے سیڑھیوں پر بیٹھی دروازے کو تکتی ملتی تھی اور اس کی نظریں کیسی پیاسی ہوتی تھیں۔ وہ اس وقت تو جان نہیں سکے مگر اب۔

"اور میں جو پوری دنیا کے صحرا، سمندر، دکھ، گر کبھی مسافتیں عبور کر گیا۔ ایک دل تک سفر نہیں کر سکا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ اس نے اپنے دل میں جو دریافت شدہ دنیا آباد کر رکھی ہے اس کے کولمبس تو وہی ہیں اور وہی انجان بنے رہے۔ ہو یہ روگ تھا اس کے دل کو جو ہر بار وہ مجھے گھلتی نظر آتی تھی اور کہہ نہیں پاتی تھی اور اس بار کیا ہوا تھا میرے دل کو میرے پیروں کو جیسے کسی نے باندھ لیا تھا۔ تو یہ ضیا کا دل تھا۔" انہوں نے مسکرا کر ڈبا بند کر کے وہیں رکھ دیا۔

"کہاں جا رہے ہو ارسلان!" بڑے بھیا انہیں باہر جاتے دیکھ کر بولے۔

"بھیا! جبار ٹھیکے دار کے پاس جا رہا ہوں، اوپر نیا پورشن بنوا رہا ہوں نا، اب کب تک ساری دنیا کی گرد چھانتا رہوں گا۔"

وہ اتنے اطمینان سے بولے جیسے یہ بہت معمولی بات ہو اور بڑے بھیا تو کتنی دیر اپنا کھلا منہ بند بھی نہ کر سکے۔

"اور جب ان سب کو پتا چلے گا کہ میں ضیا سے۔ نہیں پورشن مکمل ہونے تک تو نہیں۔"

وہ خود ہی اپنے سرپرائز پر مسکراتے باہر کی طرف چل پڑے۔

☆

ثمینہ عظمت علی

شہرِ عشق

اس نے جب پہلی بار اسے دیکھا تو وہ گنگ رہ گیا۔ ایسا بے مثال حسن اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ ہوا کا جھونکا تھی' تند بہار تھی اس کی غزال سی آنکھیں حشر ڈھارہی تھیں۔ زلفیں تھیں کہ رات سے بڑھ کر تھیں' لب ایسے کہ گلاب جل جائیں' ایسا توبہ شکن حسن تھا کہ اسے یقین ہو گیا کہ بڑے بڑے شاعر اسی کے بارے میں سن کر شعر کہتے ہیں اور اس سے ملنے کی حسرت سدا اپنے دل میں رکھتے ہیں اور اسی انتظار میں رہتے ہیں کہ کب وہ بولے تو وہ اس کے لبوں سے پھول جھڑتے ہوئے دیکھیں۔

ابھی اس کی آنکھیں اس کی دید سے سیراب بھی نہ ہوئی تھیں' ابھی وہ دھڑکتے دل کو سنبھال بھی نہ پایا تھا کہ وہ حسینہ طرح دار اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور اس کی آنکھوں کو وہ سونا پن عطا کر گئی کہ نظارے سارے اس جہان کے مدھم ہوئے اور بس اس کا چہرہ بسا رہ گیا۔ بے شمار دن وہ مثل مجنوں سرگرداں و پریشاں پھرتا رہا۔ گلی گلی کی خاک چھانی' بے یارومددگار پھرا کہ کہیں سے کوچہ یار کا پتا مل جائے۔

آخر ایک دن اسے وہ دولت کدہ مل ہی گیا مگر اسے ڈھونڈ کر وہ اور پریشان ہوا۔ بے شک وہ اس کے بازو حسن کا گداگر تھا لیکن اس پرشکوہ عمارت کہ جو منہ کھول کر اپنی امارت کا اظہار کر رہی تھی' کو دیکھ کر پژمردہ ہو گیا۔ کہاں یہ محل اور کہاں اس کا جھونپڑا۔ کہاں وہ ماہ پارہ کہ صورت ہی نہیں' حیثیت کی بھی شہزادی تھی اور کہاں یہ کہ گو صورت شہزادوں جیسی پائی تھی' لیکن قریہ سیم و زر سے کبھی اس کا گزر نہ ہوا تھا۔

کئی دن نیند اس کی آنکھوں سے اوجھل رہی۔ ساری رات وہ رت جگا کرتا اور کھلے آسمان تلے تاروں کو تکتا رہتا۔ سودائیوں کی طرح چاند کو دیکھتا رہتا۔ چاند کا تمنائی ہو ہوا تھا یہ رت جگا تو اس کا مقدر تھے' دل سے اٹھتی میٹھی کسک اس کا نصیب تھی۔ بہت چاہا کہ اس پری چہرہ کو فراموش کر دے لیکن بے سود۔ ان ہی سوچوں و فکروں میں وہ نہ جانے کتنے دن غلطاں و پیچاں رہا۔ آخر کار ایک دن اٹھ کھڑا ہوا۔ اس طرح اٹوائی کھٹوائی لیے پڑا رہنا مردوں کا شیوہ نہیں اور وہ بھی عاشق مرد' ہار ماننا سرشت عشق نہیں۔ اور ہار بھی وہ جو کھیل کا آغاز ہونے سے پہلے ہی مان لی جائے۔ عشق تو آتش نمرود میں بے خطر کود اکرتا ہے۔ عشق کے کوچے میں تو فرعون بھی گدا ہے۔ تو وہ کیوں اپنی تنگ دستی کا یوں خود ہی مذاق اڑائے۔ انہی خیالوں نے اس کے اندر نئی توانائیاں بھر دیں۔ کچھ کر گزرنے کے عزم نے اسے نڈر بنا دیا۔

وہ حسین تھی تو کم یہ بھی نہ تھا۔ وہ محل میں رہتی تھی تو وہ اپنے زور بازو سے ایک گھر بنانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ کافر ادا تھی تو یہ بھی لفظوں سے اصنام گری کیا کرتا تھا' دولت اس کے در کی باندی تھی تو لفظوں کے جگنو اس کے گرد ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ اس کے دربانوں کے ہاتھوں میں تیز دھار تلواریں تھیں تو اس کے پاس قلم کا جادو تھا۔ اس کے پاس ہیرے موتی جواہرات تھے تو اس کے پاس سچے جذبات کے بیش بہا جواہر تھے۔

اس نے اپنا حال کہنے کا فیصلہ کیا اور اس کا ذریعہ صدیوں سے محبت کرنے والوں کے ہاں رائج خط سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا۔ چاہتا تو تھا کہ اطلس و کمخواب پر مشک و زعفران سے اپنی محبت کا اظہار کرے لیکن یہ اشیا اسے میسر تھیں نہ رائج۔ تلاش و بسیار کے بعد ایک خوبصورت رنگ کاغذ پر ایک خوش رنگ قلم سے کہ جس کی روشنائی میں افشاں گھلی ہوئی تھی' اس نے اپنی داستان عشق کا آغاز و اظہار کرنا چاہا۔

پہلے تو سوچا کہ اس حسن کی مدح سرائی کرے اور اپنے وحشت و جنوں کا قصہ کہے' اشعار لکھے' قصیدے لکھے لیکن پھر زبان غیر سے شرح آرزو کرنے کا خیال ترک کیا۔ بڑے بڑے لفظوں کے پل تعمیر کرنے سے گریز کیا کہ اس ماہ پارہ' سیمیں بدن کو دشواری نہ ہو اور چند سادہ الفاظ میں اپنی محبت و الفت کا گہرا اظہار کیا۔ کاغذ کو خوشبو میں بسایا اور مکتوب' محبوب کو روانہ کر دیا۔

www.paksociety.com

جب اس حسینہ بے پروا کو وہ محبت نامہ موصول ہوا تو وہ اپنی خوبصورت خوابگاہ میں آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ گیسوئے تابدار فرش کو چھو رہے تھے اور ایک خادمہ کھڑی اس زلف کے پیچ و خم سنوار رہی تھی اور خود وہ شیریں سخن ٹیلی فون کا ریسیور کان سے لگائے کسی سے محو گفتگو تھی۔ جب ایک خادم نے اسے وہ مکتوب لا کر دیا تو وہ اس دخل در معقولات پر سخت خفا ہوئی۔ سونے پہ سہاگہ وہ رنگین لفافہ جسے اس نے بڑے پر غرور انداز میں الٹ پلٹ کر دیکھا اور ایک طرف ڈال دیا۔

"بھلا آج کل کے ٹیلی فونک دور میں یہ خط وغیرہ لکھے جاتے ہیں' ہونہہ! حیرت ہے "آج بھی ایسے فارغ لوگ موجود ہیں۔ بھلا یہ بھی خط لکھنے کا اور پڑھنے کا زمانہ ہے؟ نمبر گھماؤ' بات کرو بس۔"

اور جب اسے معلوم ہوا کہ اس پتھر دل نے اس کے پیار کے پہلے خط کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے' نہایت رنجیدہ ہوا۔ اسے اس سے اس قدر کج روی کی توقع نہ تھی۔ "ایک بار پڑھ تو لیا ہوتا۔" اس نے آزردگی سے سوچا۔

کچھ دن اسی افسردگی میں گزر گئے لیکن یوں پہلے ہی مرحلے پر ٹوٹ جانا بھی تو سرشت عشق نہ تھی۔ اس نے خود کو دوبارہ حوصلہ دلایا اور ایک بار پھر اسی کانٹوں بھری رہ گزر پر چلنے کو تیار ہو گیا۔ لیکن اس بار حالات سخت تھے۔ اسے وہ آلہ حاصل کرنا تھا' جس کے بل پر وہ اس حسن کو اس کے تغافل سے بیدار کر سکے۔ باہر اس نے دیکھا کہ جابجا ایسی جگہیں موجود تھیں جہاں سے ٹیلی فون کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اسے یوں سربازار اپنی محبت کا تماشا کرنا مقصود نہ تھا۔ نہ ہی وہ اپنے محبوب کی بدنامی چاہتا تھا' سو اس نے دن رات محنت شروع کی' بچت کی' درخواست دی' دفاتر کے چکر لگائے اور آخر کار اپنا ٹیلی فون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ اسے اپنے فن پر پورا بھروسا تھا۔ یقیناً" وہ ایسی گفتگو کرے گا کہ اس ظالم پر اثر کرے گی۔ دھڑکتے دل اور کانپتی انگلیوں کو سنبھالتے ہوئے اس نے نمبر ملایا لیکن نمبر مصروف تھا۔

آنے والے نجانے کتنے دنوں تک یہی صورت حال رہی۔ وہ پریشان ہو گیا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ کبھی اندیشے ستاتے کہ نہ جانے اتنی اتنی دیر وہ کس سے باتیں کرتی ہے۔ پھر نمبر ملایا۔ یا تو کوئی فون اٹھاتا ہی نہ تھا' یا پھر مصروف ملتا تھا۔ وہ سخت اضطراب میں مبتلا ہو گیا۔ کئی دن افتاں و خیزاں پھرتا رہا اور آخر کار اس پر یہ عقدہ بھی کھل گیا۔ وہ پری چہرہ ایک اور جہان میں داخل ہو چکی تھی۔ کسی اور دنیا کی اسیر بن چکی تھی۔ اس کا ٹیلی فون مستقل مصروف رہنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ انٹرنیٹ کی دنیا کی باسی بن چکی تھی۔

"ہیلو۔۔۔؟ کون بات کر رہا ہے؟ آپ کون؟ کس سے بات کرنی ہے؟" جیسے سوالات اس کے لیے دقیانوسی بن چکے تھے۔ اب "ہائے وانا چیٹ؟" اور "اے ایس ایل" کی عادی تھی۔ چیٹ کرنا ہے کرو ورنہ بائے۔

"ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں۔"

چیٹ روم بھرا پڑا ہے۔ اور یہ کیا کہ بس آواز ہی سنتے رہو اور ملنے کی بات ہو تو دم نکلنے لگے۔ یہاں تو چہرہ دیکھنے کا دل چاہا اور بس نظر آ جائے۔ ای میل کرو تو سیکنڈ لگے۔ صرف یہی نہیں' محض تین بار ڈبلیو استعمال کر کے کسی بھی جہاں میں پہنچ جاؤ۔ رنگین' البیلا انوکھا۔

نہ ٹیلی فون کی طرح یہ ڈر کہ "ہائے اللہ! کوئی آ رہا ہے۔"

کھلے عام بیٹھے کسی گلفام کے ساتھ جھوٹی سچی محبت کی پینگیں بڑھاتے رہو اور بڑی بوڑھیاں نہایت محبت سے فرمائیں کہ "بچی پڑھ رہی ہے۔" آخر پہلے پہل یہ جادوئی مشین پڑھائی ہی کے نام پر تو گھر میں آتی ہے۔

سو وہ بری طرح سے اس جہان میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ عاشق زار یہ جان کر سخت ملول و رنجیدہ ہوا۔ ابھی پچھلے سفر کی تھکن ہی نہ اتری تھی کہ ایک اور کوہ سامنے آ گیا' پہلے سے کٹھن' پہلے سے بھی کڑا اور دور۔

پہلے پہل اس نے سوچا کہ اس جنون کو خیرباد کہے لیکن جنون بھی کبھی اس طرح جاتے ہیں' نامراد تو بس سرشت عشق نے ایک بار پھر سر اٹھایا اور محنتوں' صعوبتوں' بچتوں' کمیٹیوں اور کوتیوں کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ پہلے کی طرح اب بھی اس نے بازار میں اس کا بے حد استعمال دیکھا' انٹرنیٹ کیفے دیکھے لیکن اسے وہاں کا ماحول پسند نہ آیا کہ وہاں بیٹھ کر اپنی پاکیزہ محبت کو آلودہ کرے۔ وہ اسے زمانے سے تو کیا' خود سے بھی چھپانا چاہتا تھا۔ اس معصوم کا ذکر وہ خود سے بھی کھل کر نہ کرتا تھا۔

اس بار کا سفر زرا طویل تھا لیکن آخر کار یہ آبلہ پائی تمام ہوئی اور وہ اس جادوئی ڈبے کے سامنے بیٹھا اسے گھور رہا تھا جس نے مشرق تا مغرب ٹیکنالوجی کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ آخر کار اس نازنین کو برقیاتی پیغام بھیجا۔ وہ دور جدید کی اس ایجاد پر حیران بھی تھا اور مسرور بھی۔

قسمت نے اس بار بھی اس کا ساتھ نہ دیا اور اس کا ہر پیغام اس پیغام کے ساتھ واپس آیا کہ اس نام' اس پتے کا کوئی صنم نہیں۔

بہت دنوں کی کوشش کے بعد یہی اندازہ ہوا کہ وہ مہ جبیں اس کا استعمال ترک کر چکی ہے۔ کیوں؟ وہ ٹھیک تو ہے؟

اسے اندیشوں نے آ گھیرا۔ اب مزید کیا آ گیا جس کی وجہ سے اس نے یہ مشغلہ متروک کیا۔ بہت جھنجلایا۔ دوبارہ کوشش کی' ناکامی ہوئی۔ سوچا کہ معلوم کیا جائے کہیں آئی ڈی ہی بدل نہ دی ہو اور یوں ایک بار پھر اسے نئی خبر موصول ہوئی۔

وہ سیماب صفت اس مشغلے سے بھی اکتا چکی تھی' بجلی کی آنکھ مچولیاں' سرور (server) کی کارستانیاں' آئی ایس پی کی بدعنوانیاں' ان سب نے مل کر اس نازک کو پریشان کر ڈالا تھا اور ان سب جھمیلوں کی کیا ضرورت تھی جب دنیا اس کے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ساری کائنات ایک چھوٹی سی ماچس کی ڈبیا میں بند ہو گئی ہو۔ اب وہ اپنے موبائل سیٹ کی دھنیں بدل بدل کر خوش ہوتی رہتی۔ رابطے کمپیوٹر سے بھی آسان سٹ کر رہے میں بند ہو کر بیٹھنے کی تکلیف نہ بجلی کی مصیبت نہ ایک مخصوص ٹائم کا پابند ہونا۔ بس کہیں بھی' کسی بھی وقت۔ سارے جھنجھٹ ختم ہو چکے تھے۔

اس بار اس پہلی نظر کے عاشق نے بیٹھ کر پہلی بار سنجیدگی سے اس دنیا کے بارے میں سوچا جو آواز کی رفتار سے بھی تیز بدل رہی تھی۔ دنیا کہاں جا رہی ہے؟ اب آگے کیا ہو گا؟ اور کون سے کرشمے ہوں گے؟ دنیا تو صدیوں سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے لیکن یہ گزشتہ چند سال؟ خدایا انہوں نے تو کروٹ الٹ کر رکھ دیا ہے۔ کیا ہم یوں ہی آنکھیں بند کیے ایک ایک چیز کے پیچھے دوڑتے رہیں گے۔

رشتے' محبت' خلوص' میل ملاقات سب خواب ہوئے۔ وہ رت جگے کر کے لکھے گئے خط' وہ خون سے لکھے گئے نامے' وہ خوشبو میں بسے پیغام کہ جن کو ناکامی کے بعد بھی کوئی جلا نہ پاتا تھا' اب خواب ہوئے اور اب سارے زمانے کا سارے زمانے سے ایک ایس ایم ایس کا تعلق رہ گیا؟

وہ وقت کی اس چال سے سخت اداس ہوا اور فیصلہ کیا کہ غم جاناں کہ جس نے اسے غم دوراں میں مبتلا کر دیا تھا' اب ترک کر دیا جائے۔ اس نے اپنے نفس کو سمجھایا کہ اب مزید اس دوڑ میں شامل ہونے سے بہتر ہے کہ اس راہ سے کنارا کشی اختیار کر لی جائے۔ نہ جانے اس جنون کی وجہ سے اور کیا کیا رنگ دنیا کے دیکھنے پڑ جائیں۔ اس کے لیے اس کی چھوٹی سی دنیا ہی اچھی ہے۔

یہ فیصلہ کر کے وہ دوبارہ اپنی دنیا میں مگن ہو گیا لیکن یہ سب عارضی ثابت ہوا اور اس کے دل نے خود اس پر ثابت کر دیا کہ ابھی دنیا سے پیار و محبت ختم نہیں ہو گیا۔ ایسا ہوتا تو وہ خود اپنے محبوب کو فراموش کر چکا ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا اور عشق کی آتش تھی کہ بجھائے نہ بجھ رہی تھی اور یہی تو عشق کی سرشت تھی۔

وہ ایک بار پھر اس حسن بے خبر سے رابطہ کرنے کو

بے چین ہوا۔ لیکن صد افسوس کہ اس بار بھی اسے ناکامی ہوئی اور بار بار مختلف قسم کے پیغامات ملتے رہے جن کا مفہوم یہی تھا کہ رابطہ ممکن نہیں۔ اب اس نے ایک موبائل فون لیا اور اس بار اسے زیادہ دشواری نہ ہوئی کہ ایک تو عادی ہو گیا تھا دوسرے طلب کی زیادتی نے رسد کی قیمتیں کم کر دی تھیں۔ لیکن اس کے ایس ایم ایس بھی اس کی طرح منزل مقصود پر نہ پہنچ سکے ہر بار نمبر غلط ثابت ہوتا رہا۔ اس کا دل بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ ہر بار ذلت، ہر بار ناکامی... یاالٰہی! یہ ماجرا کیا ہے۔ ابھی وہ ان سوچوں میں ہی بیٹھا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ کھولا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک ڈاکیہ در پر کھڑا ہے۔

✲ ✲ ✲

آج اس کا دل بے حد دکھا ہوا تھا۔ اس کے جذبات بری طرح مجروح ہو چکے تھے۔ وہ اوندھی پڑی ہوئی سسکیاں لے رہی تھی۔ زمانے نے اسے خوب خوب ستایا تھا۔ اس کی معصومیت کا مذاق اڑایا تھا۔ اس کے لیے تو دنیا بازیچہ اطفال تھی اور وہ خود بھی ایک طفل ناداں کی حیثیت سے اس کے مزے اڑا رہی تھی۔ وہ نہ جانتی تھی کہ اس کی تفریحی حرکتیں یوں اس کی ذات کو پامال کریں گی اور اس کے لیے یہ سب محض تفریح بھی نہ تھی۔ اس نے دل سے ایک محبوب کی تمنا کی تھی اور اسے تلاشنا چاہا تھا لیکن ہر بار اسے دکھ دیا گیا پہلے ٹیلی فون پر اسے بے وقوف بنایا گیا۔ وہ اتنی سادہ تھی کہ ہر آواز دل نواز کو اپنا سمجھ بیٹھی۔ کسی نے اسے اپنی منزل کہا، کسی نے خوب صورت لہجے میں شعر سنائے اور وہ ہواؤں میں اڑنے لگی، لیکن دھڑام سے اس وقت گری، جب وہ سب جھوٹے اور ریاکار نکلے۔

کچھ دن تک وہ اداس رہی پھر اس کے پاس کمپیوٹر آیا اور وہ ایک نئی دنیا کی سیر کرنے لگی۔ یہاں اس کے جذبات کا مزید تماشا بنایا گیا۔ جھوٹے نام جھوٹی پہچانوں سے اسے بے وقوف بنایا گیا۔ بعد میں اس نے جانا کہ یہاں کچھ معلوم نہیں کہ اٹھارہ سال کی لڑکی اصل میں اڑتیس سال کا مرد ہے یا چالیس سال کا مرد اصل میں چودہ سال کا بچہ ہے۔ کون کیا ہے؟ کہاں ہے؟ سب جھوٹ ہے۔ اس کی طبیعت مزید مکدر ہوئی جب اس نے یہ جانا کہ یہاں تقریباً سارے لوگ بیمار ہیں۔ کسی عمر یا کسی صنف سے تعلق سے قطع نظر ان کا مطمع نظر محض جنسی آسودگی ہے، چاہے وہ اسکرین پر لکھے لفظوں ہی سے کیوں نہ حاصل ہو۔

اس نے اس پر لعنت و ملامت کرتے ہوئے اسے بھی ترک کر ڈالا اور دنوں اداس رہی۔ اب اداسی کے ساتھ ساتھ پشیمانی اور پچھتاوا بھی تھا۔

کچھ دن بعد جب حالات معمول پر آنے لگے تو اس انوکھے لاڈلے کو کھیلن کے لیے نیا چاند مل گیا۔ آسودہ حال تو تھی ہی۔ کوئی نعمت ایسی نہ تھی کہ جس کی طرف نظر کرتی اور اسے حاصل نہ ہوتی۔ سو اب وہ اس نئے کھلونے کے ساتھ پھر سے مگن ہو گئی اور اس مشغلے میں ایسا محو ہوئی کہ سب غم و الم بھول گئی۔ اب وہ تھی اور اس کا موبائل فون تھا۔

پہلے دنیا اس کے کمرے میں تھی اب مٹھی میں آگئی تھی۔ بات کرنا، پیغام بھیجنا، کھیل، الارم، خبریں، دھنیں۔ اس چھوٹی سی ڈبیا میں کیا کیا نہ تھا۔

پچھلے غموں کا ازالہ ابھی نہ ہو پایا تھا کہ نئی مصیبتیں کھلنے لگیں۔ وقت بے وقت اور ہر پل، ہر جگہ اس کے بجنے سے وہ اکتانے لگی۔ کسی کام پر ارتکاز نہ رہا۔ راتوں کی نیندیں اڑنے لگیں۔ مس کالز نے اس کا جینا حرام کر دیا اور وہ پیغامات جنہیں پڑھ کر وہ شروع میں محظوظ ہوا کرتی تھی اب بور کرنے لگے۔

کچھ پیغامات ایسے بھی ہوتے کہ جنہیں پڑھ کر وہ سوچتی تھی کہ پڑھنے سے پیشتر ہی مٹا دیتی تو اچھا تھا۔ ایک بار پھر اسے بے حجاب الفاظ کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا پھر موبائل کمپنی تھی کہ سارا دن نہ جانے کون کون سے ڈھکوسلے دیتی رہتی، جن میں کچھ اصل نہ تھا۔ انا صارفین ہی لٹتے رہتے۔

آئے دن کبھی انڈین گانوں کی رنگ ٹونز حاصل کرنے کی پیشکش آتی تو کبھی کسی لاٹری کی۔ کبھی موسم

کا حال تو کبھی قسمت کا حال۔ ان وقت بے وقت دخل در معقولات سے وہ سخت بیزار ہو رہی۔

اور آج تو اس تابوت میں آخری کیل ٹھونک گئی جب گھر آتے ہوئے چند لوفروں نے اس سے اس کا سیل فون چھین لیا۔ گو کہ وہ اس سے بیزار تھی اور اب تو اکثر اوقات اسے بند ہی رکھتی اور قریب تھا کہ اس کا استعمال کلی طور پر چھوڑ دیتی کہ یہ واقعہ ہو گیا جس نے اسے سخت رنجیدہ کر دیا اور قوم کے جوانوں کا اب یہ حال تھا کہ جنہیں ستاروں پر کمند ڈالنی تھی سڑکوں پر لوٹ مار کر رہے تھے۔

یہ سب باتیں سوچ سوچ کر اس کا سر بے حد دکھ رہا تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ ایک نیند آور گولی لے تاکہ اسے کچھ سکون حاصل ہو جیسے ہی اس نے دراز کھولی اسے ایک لفافہ نظر آیا، جو قدرے بوسیدہ ہو چکا تھا۔ اس نے بے اختیار اسے اٹھا لیا۔ خوبصورت رنگوں سے بنے لفافے نے اسے اس وقت عجیب طرح سے اپنی طرف کھینچا۔ اس میں سے پرانے پھولوں اور پرانے کاغذ کی ملی جلی خوشبو آئی جس نے اس کی حسیات کو بے حد متاثر کیا۔

وہ بے اختیاری سے اسے کھول بیٹھی۔ خود بخود اسے یاد آیا کہ جب وہ چھوٹی تھی تو اکثر اپنے دادا جان کے کتب خانے میں جا کر ان کے پاس بیٹھتی تھی جہاں بے حد نادر و نایاب کتابیں موجود تھیں، وہاں پرانی کتابوں سے کہ جن کے صفحات سے ایسی ہی خوشبو آیا کرتی تھی، جو اسے بے حد پسند تھی لیکن پھر جہان رنگ و بو نے اسے اس طرح اپنی جانب مائل کیا کہ وہ سب فراموش کر بیٹھی۔

اسے اس وقت اس کاغذ نے ان کتابوں اور دادا جان کی یاد دلا دی اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اسے یاد آیا کہ یہ وہی لفافہ تھا، جسے اس نے لاپروائی سے پھینک دیا تھا اور شاید ملازمہ نے یہاں ڈال دیا تھا۔ اسے اپنی بے اعتنائی یاد آئی اور اسے افسوس ہوا۔ اب وہ دھیرے دھیرے خط پڑھنے لگی۔ کتنی خوب صورت لکھائی تھی۔ ایسا فونٹ تو کمپیوٹر کے ... کسی بھی سافٹ ویئر میں نہ تھا اور کتنے سادہ اور بے ریا الفاظ تھے۔ نہ بے کار کی ہائے ہیلو نہ شرم و حیا سے عاری الفاظ۔ نہ ملاقات پر اصرار نہ معنی خیز گفتگو۔ بس ایک سحر تھا جس نے اسے اپنی جکڑ میں لے لیا۔

اسے محبت کا یوں سادہ سا اظہار بے حد بھایا۔ اس نے جانا کہ کاغذ، قلم اور اس قلم سے نکلے الفاظ کا انسان کے دل سے جو رشتہ ہے، وہ اتنا مضبوط ہے کہ کوئی اور تعلق اس کا نعم البدل ہو نہیں سکتا۔ ڈاکیے کے دروازے پر آنے سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ کسی اور سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ محبت ہے، جو کانوں سے سنی نہیں جا سکتی مگر ہاتھوں سے چھوئی جا سکتی ہے، دل سے محسوس کی جا سکتی ہے۔

ہاتھ میں قلم کی روانی اور کاغذ پر اس کی حرکت سے جو ردھم بنتا ہے، وہ انگلیوں کی ٹک ٹک سے نہیں بن سکتا۔ لفافہ چاک کر کے دھڑکتے دل کو سنبھالتے محبوب کا خط کھولتے ہوئے، جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ کسی کلک سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ان محبت ناموں کو تکیے کے نیچے، کتابوں کے درمیان، ڈائری میں رکھنے اور پھر بار بار دیکھنے اور آنکھوں سے لگانے میں کتنا لطف ہے۔ اس کا دل بے اختیار ان لفظوں کی سچائی پر ایمان لے آیا۔ اس نے اسے اپنی آنکھوں سے لگایا تو اس کے لمس نے مزید ایمان پختہ کر دیا۔

برسوں بعد اس نے آخر کار کاغذ اور قلم سے دوبارہ رشتہ جوڑا اور اس کا جواب لکھنے لگی۔ محبت کا جواب محبت سے دینا بھی سرشتِ عشق ہی تو ہے۔

www.Paksociety.com

سائرہ رضا

دل و نظر کے سلسلے

"میں اکیلی سواری اور تم مجھ سے ڈیڑھ سو روپے مانگ رہے ہو، شرم نہیں آتی۔" وہ دھاڑی۔

"لاری اڈے سے گھر تک اتنے ہی بنتے ہیں جی! لمبا سفر ہے اور سی این جی مہنگی ہے جناب!" اس نے منتی لہجے میں دلیل دی۔

"تو میں نے مہنگی کی ہے کیا؟" اس کی دلیل اس نے فوراً رد کردی۔

"اب یہ رکھو اور بھاگو۔"

"میں نے سو روپے نہیں لینے۔" وہ منہ بسور کر حتمی بولا۔

"ہوں!" اس نے پر سوچ انداز میں اسے دیکھا۔ "ٹھیک ہے! ڈیڑھ سو ہی دوں گی۔ مگر یہ سارا سامان میرے ساتھ گیٹ کے اندر رکھواؤ۔"

"نہیں جی! آپ اندر لے جا کر مجھے اپنے بھائیوں سے پٹوا بھی سکتی ہیں۔"

"تم پاگل دے پتر۔ عقل کے دشمن! تمہیں پتا ہے میں اسکول میں پی ٹی ٹیچر ہوں اور مجھے کراٹے بھی آتے ہیں۔ تمہیں پٹوانے کے لیے میں اپنے بھائیوں کی مدد لوں گی؟ وہ مجھ سے دس سال چھوٹا ہے اور مجھ سے اب تک پٹتا ہے۔ ویسے یہ بتاؤ۔!" وہ اچانک مشکوک ہوگئی۔

"تم کتنے سال کے ہو اور تمہارا شناختی کارڈ اور لائسنس تو بنا ہوا ہے نا؟"

"جی استانی جی! بنا ہوا ہے سب بنا ہے۔" نہ جانے کیا سوچ کر وہ اتر آیا اور گیٹ سے سامان اندر رکھنے لگا۔

مکمل ناول

"آرام سے۔ احتیاط سے۔" وہ پیسے نکالتے ہوئے بولی۔

"چلو بھاگو۔ لو یہ رہے تمہارے پیسے۔ لیکن سنو! ذرا اپنا لائسنس دکھاؤ، مجھے تم پر شک ہے تمہاری عمر نہیں ہے۔" اس نے سر ہلا کر فیصلہ دیا۔

"وہ استانی جی!" اس نے سر پیٹ لیا اور کرتے کی بغلی جیب سے ہرا کاغذ اس کی جانب بڑھایا۔

"ہوں تمہارا ہے؟"

"نہیں جی! میرے جڑواں بھائی کا ہے۔ اس کی عمر ہو گئی تھی تو بن گیا۔ اگلے سال میرے لیے بنادیں گے۔ گھر میں رکشہ اس سے اچھا چلاتا ہوں۔ وہ نکما روٹیاں توڑتا ہے اور میں پائی پائی اماں کے ہاتھ پر رکھتا ہوں۔ اب تو جانے دیں۔" اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"اچھا! اس کا مطلب ہے تم اچھے لڑکے ہو چلو۔ اب تم رکھو سو روپے اس نے لال نوٹ آگے کیا۔

"شکر... جی! وہ بھونچکا رہ گیا۔ "گو ر یہ ہیں۔ اور یہ ہیں اور یہ۔" اس نے پائنچے کو الٹا۔ موزے کے اندر سے بیس کا ایک نوٹ اور دیا۔ "بھاگ جاؤ۔"

"شکریہ جی۔" وہ سچ مچ بھاگ نکلا۔ مبادا موڈ بدل جائے۔ اس نے گیٹ بند کیا۔

اب گھر کے اندر تک سامان اسے خود لے کر جانا تھا۔ اتنا بہت سارا میلے کپڑوں کا گٹھڑ، شانوں پر پانی کی بوتل اور بڑا ہینڈ بیگ، ہاتھ میں اسکواش ریکٹ اور دو عدد کیسے۔ ارد گرد نگاہ کی کوئی نظر نہ آیا۔ گھر کے پچھواڑے جاتی گلی پر اسے دھلے کپڑے تار پر لہراتے نظر آئے۔

"اس کا مطلب ہے آج گھر میں گرینڈ واشنگ مشین لگ چکی ہے، ہائے میری قسمت۔" اس نے سر پر ہاتھ مارا اس نے اپنے سفید لباس کو دیکھا، پھر نیچے پڑے کپڑوں کے گٹھڑ کو، تھکن عود کر آئی۔ اب اس کے پاس ایک بھی دھلا سوٹ نہیں تھا۔ وہ ایسے چل رہی تھی، جیسے پیروں پر بھاری پتھر بندھے ہوں، ساری شگفتگی اور طراری دھیمی پڑ گئی۔

"نہیں روپے اور دے دیتی تو بے چارہ سامان اندر رکھ دیتا۔" وہ پچھتائی۔ "کم عمر سا تھا بے وقوف سا۔" وہ بیگ اٹھانے جھکی۔

"کہہ رہا تھا بھائی کا لائسنس اور شناختی کارڈ ہے۔ ہاں میں... بھائی کے کاغذات پر رکشہ چلا رہا ہے۔ اور بھائی بھی... ہائیں! جڑواں بھائی... ہائے! میں الو بن گئی وہ تیرے کی۔" وہ وہیں اکڑوں بیٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

"تم کب آئیں؟" رومانہ اور مونا ہاتھ میں کچرے کے شاپر لیے باہر نکلیں۔

"ہاؤ!" وہ کھڑی ہو گئی۔ "زمانے گزرے، صدیاں بیتیں۔"

"تمہارے دنیا میں آنے کا نہیں پوچھا۔ گھر میں قدم کب رکھے؟" مونا نے کچرے کے تھیلے دروازے کے باہر ڈسٹ بن میں ڈالے جبکہ رومانہ غور سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ پیر میں جاگرز، سفید یونی فارم گہری سبز جیکٹ... سر پر سفید دوپٹہ اور اس پر سبز کیپ، منہ لال سرخ۔

"تمہیں واشنگ فینٹل کے کم از کم بارہ سیشن لینے ہوں گے۔ گراؤنڈ سے سیدھے گھر آرہی ہو۔ سچ سچ بتاؤ!" اسے تاسف سے دیکھتے ہوئے رومانہ بولی مونا بھی سامنے آگئی۔

"اور تمہارے منہ پر بلیک ہیڈز نہیں ہیں۔ یہ تیل کے کالے کنویں ہیں۔"

"تو تم کس مرض کی دوا ہو؟" وہ غرائی، رومانہ سارے گھر کی بیوٹیشن تھی۔

"مجھ سے کوئی امید نہ رکھو۔ مجھے ان کنوؤں میں ڈوبنے کا کوئی شوق نہیں۔" وہ بے مروتی سے بولی۔

"تم میری بہن ہو۔" اس نے دہائی دی۔

"منہ دھو رکھو۔ دھو کر بلکہ رگڑ کر میرے پاس آنا۔" وہ اندر بڑھ گئی۔

وہ اندر داخل ہوئی۔ دادی امی تخت پر قبلہ رو بیٹھی تھیں سامنے لوہن بکن میں امی دال کو بگھار لگا رہی

تھیں۔ تائی امی ڈھیر سارے ٹماٹر، پیاز، کھیرے لیے سلاد بنا رہی تھیں۔ مونا، رومانہ، عطیہ اور ثانیہ گھری سنائی اماں کے نئے (دیکھوں کہ اس نے پہلے تو دیکھے نہیں تھے) سوٹ پہنے بڑی پرسکون بیٹھی تھیں۔ دراصل جس دن لڑکیاں، اسی کے ساتھ مل کر کپڑے دھوتیں، اس دن کھانا امی اور تائی امی بناتیں۔ دال چاول، سلاد، تلے پاپڑ اور اچار، ساری لڑکیاں اپنی امیوں کو زیادہ محنت والے کام نہیں کرنے دیتی تھیں۔ تائی امی نے اسے بطور ویک، جو تھکی ہاری السلام کر کے جیکٹ کیپ جاگرز، موزے گندے سے بدبودار اور دوپٹہ اتار کر رکھ رہی تھی۔

"امی! میری پیاری ماں!" اس نے فلمی انداز میں دہائی دی۔

"پہلے پیر تو دھو لو جا کر۔" مونا نے دوپٹہ ناک پر رکھ کے نزاکت سے غسل خانہ دکھایا۔

"ہاں... ہاں جاؤ!" تائی امی نے بیٹی کی ہاں میں ملائی۔

"اپنی ماں سے گلے تو مل لوں میں۔" وہ پھر آگے ہوئی۔

"ماں کو زندہ رہنا ہے۔ تم جاؤ ہاتھ پیر دھو لو۔ زندہ رہی تو گلے بھی مل لوں گی۔" امی نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"کیا میں واقعی اتنی گندی لگ رہی ہوں؟" وہ ماں کی گواہی کے بعد بھی بے یقین تھی۔

"اس حلیے کے لیے ابھی کسی بھی زبان میں کوئی لفظ ایجاد نہیں ہوا۔ آپ یقین کریں۔"

چاروں جانب سے دھکے ملنے پر وہ بادل نخواستہ غسل خانے میں گھس گئی۔

"آپ نہا کر ہی آنا۔" امی نے ہانک لگائی۔ "ثانیہ! بہن کے کپڑے نکال دو۔"

تائی امی نے چھری روک کر سامان کے ڈھیر کو دیکھا۔ گٹھڑ، لوہے کا صندوق، اس کا وزن بتاتا تھا، اس بار پھر ٹرافیوں کا ڈھیر تھا۔ میڈلز اور اسنو سے بھرا سیاہ لوہے کا صندوق، البتہ ایک نیا بکسا بھی تھا کور چڑھا

پہلے نہیں دیکھا تھا، وہ بغور اسے دیکھنے لگیں۔ دراصل وہ جب جب اسکول ٹرپ پر جاتی، واپسی پر ہر ہر بندے کے لیے تحائف لاتی تھی۔

"ریڈیو، اور نہوں! عجب کون سنتا ہے اب تو وہ مرن جوگا آئی پوڈ لیے گھومتے ہیں۔ کمپیوٹر وہ تو پہلے ہی ہر کمرے میں دھرا ہے۔ چھوٹا بکسا۔ اوہوں... کیا ہے اس میں؟" انہوں نے کوئی الٹی چیزیں سوچ لیں۔ انیسویں چیز بہت زور دینے پر بھی دھیان میں نہ آئی۔ آتی بھی کیسے۔

وانیہ عبداللہ اس بار ہار موتیم لے کر آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آدھے گھنٹے تک رگڑ رگڑ کر نہا کر وہ کاسنی اور گلابی پرنٹ کا اسٹائلش لمبا کرتا اور کھلا پاجامہ پہن کر باہر آئی۔ شانوں سے ذرا نیچے آتے بال دھل کر نکھر گئے تھے۔

"آپی! کہاں کہاں گئی تھیں؟" عطیہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

"مبہت جگہ... دور... دور۔" اس نے چاولوں کا پہاڑ بنالیا، اس پر لال مسور کی دال دو لگا اتنا گرا ڈالی کہ چاول چھپ گئے، اب اوپر سلاد ڈال، چھپ گئی، پھر پاپڑ اب سلاد غائب، اچار کے لیے جگہ نہیں تھی سو الگ کٹوری میں لیا۔ ننھی سی پلیٹ میں رات کے پالک گوشت کی باقیات تھیں۔ اس نے وہ بھی قریب کر لی۔ پانی کی بوتل اپنے پاس کی تو امی نے گلاس بھی سرکایا اور تنبیہی نگاہوں سے ہدایت کی۔ بوتل سے منہ لگانے کی بدعادت تھی۔ مونا نے حسرت سے اسے دیکھا جو چمچے کے تکلف بغیر کھا رہی تھی اور مونا کی پلیٹ کے کونے پر خفا سے چاول، ان پر شرماتی دال، ٹمٹماتا پھیلتا چھوٹا ڈھیروں سلاد اور ایک پاپڑ کا چوتھائی ٹکڑا حق ہے۔ وہ سارا سال ڈائٹنگ پر رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ (نادر ہے کوشش) ڈیڑھ گھنٹے بعد آ کر اس نے بھی ایسا ہی ایک ڈھیر کھا جاتا تھا۔ وہ اپنی اماں کی طرح چھوٹے قد

www.Paksociety.com

کی (بقول رومانہ "آنٹے کی بوری بنے گی ان شاء اللہ۔") بے حد گوری لڑکی تھی' اپنی لال کی اکلوتی صاحبزادی۔ بھائیوں کی اکلوتی بہن "ابا کے لیے وہ نہ تو اکلوتی تھی نہ لاڈلی۔ وہ چھوٹے بھائی کی پانچ بیٹیوں کو بھی اپنی بیٹی ہی سمجھتے تھے۔ سب سے یکساں پیار۔ تائی کو یہاں اختلاف تھا۔ وہ چاہتی تھیں 'تایا اپنی بیٹی کو اکلوتی بیٹی ہی سمجھیں اور اہمیت دیں' جبکہ بیٹوں کے لیے ان کا فرمان اور تھا کہ وہ تایا کی پانچ بیٹیوں کو مونا سے بھی زیادہ سگی بہنیں سمجھیں' مگر یہاں الٹ تھا' وہ اپنی ایک اکلوتی بہن کے علاوہ دنیا کی کسی بھی لڑکی کو بہن نہیں مانتے تھے۔

تائی امی نے سر پیٹ لیا' نہ جانے ان کی سوچیں بدلی تھیں یا نہیں' ان کا پہرہ بہر حال بہت سخت اور فعال تھا۔ ان پانچوں کو وہ گھول کر پلا چکی تھیں کہ تم لوگوں کے دو نہیں' سات بھائی ہیں۔

"شکر کہ راکھی کا تہوار ہمارے ہاں رائج نہیں' ورنہ تائی بندھوا لیتیں یار۔"

تانیہ نے سالوں پہلے کہا تھا۔ تائی کو تانیہ سے اب کوئی پرخاش نہیں تھی۔ وہ شادی شدہ اور گھر بار والی ہو چکی تھی۔

تھکی ہاری وانیہ چاولوں کے اس ملغوبے کو کھانے کے بعد چائے کا تیز میٹھا اور زیادہ دودھ بلکہ دودھ ہی دودھ ملا مگ چڑھا کر وہیں انٹا غفیل ہو گئی۔ رات ابا کے آنے پر اسے ہلایا جلایا گیا' مگر بے سود۔ رات گئے رومانہ اور چھوٹے بھائی عبید نے اسے تقریباً "ڈنڈا ڈولی" حالت میں تھوڑا اچھالا' تھوڑا دھکا اور زیادہ گھسیٹ کر لڑکیوں کے مشترکہ کمرے تک پہنچایا۔ دادی بے حد تاسف سے اتنے بڑے لاشے کو تک رہی تھیں۔

تائی تھوڑی پر انگلی ٹکائے مصنوعی حیرت اور جتاتے طنز کے ساتھ ہنکارے بھرتی پائی گئیں۔ امی البتہ سوچتی رہیں 'سب نے وہی کھانا کھایا تھا' وانیہ کو نشہ کس چیز کا تھا۔

"مہینے بھر کا ٹور تھا امی! آپ کی نیندیں کہاں پوری ہوئی ہوں گی' اذانوں سے پہلے تو وہ ڈرل کے لیے اٹھتی ہوں گی اور پھر مقابلے کی تیاری' ٹینشن الگ۔ ذمہ داری بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔"

بڑے معید نے تبصرہ کر کہا۔ امی سر ہلا کر رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

وانیہ ہمیشہ سے سحر خیز تھی۔ وہ حسب عادت اذانوں سے پہلے خود بخود اٹھ گئی۔ جسم بے حد ہلکا پھلکا تھا' مگر بستر میں لیٹے رہنے کی خواہش ہنوز تھی۔ اذانوں کی آواز سن کر وہ بستر سے نکل آئی۔ نماز پڑھ کر وہ مونا اور ثانیہ کی بے حد محنت اور توجہ سے بنائے گئے لان میں ٹہل رہی تھی۔ پہلے یہاں سرخ اینٹیں رکھ کر کچے کو ختم کیا گیا تھا' مگر ان دونوں کی خواہش پر یہاں لان کے لیے گوڈی لڑکوں سے کروائی گئی اور اب اس سے زیادہ خوب صورت احاطہ پورے محلے میں کسی کا نہیں تھا۔ کھلے ہی کھلے امرود انار' کینو' گلاب' موتیا' چنبیلی۔ آج کل گیندے کی بہار تھی' خوشبو ہی خوشبو۔

"بیٹا جی!" ابا نے اس کے شانے کو چھوا۔ وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔

"ابا جی!" وہ ان کے سینے سے لگ گئی۔

"ہمارا انتظار نہ کیا اور نہ آنے کی اطلاع دی۔"

"سرپرائز!" وہ بازو اٹھا کر اٹھلائی۔

"اچھا لگا۔" وہ مسکرائے۔ "کیسا رہا ٹور؟"

"ہمیشہ کی طرح بلکہ اس سے بھی بہتر۔ آپ حیران رہ جائیں گے۔" اس نے جتایا۔

"نہیں ہوں گا' مجھے عادت ہو گئی ہے۔" وہ بھی شوخی سے بولے۔

"ویری گریٹ!" مسکرائی۔

"مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آسان ہو گئیں"

"ابا جی!" وہ چیخی۔ "دس از ناٹ فیئر۔ آپ کو پتا ہے لوگ میرا نام تک ہی جانتے ہیں مس عبید اللہ' بس۔" وہ رعب آمیز لہجے میں بولی۔

"زندگی دو پہلوؤں کے ساتھ جیتی ہے۔ کالا رنگ نہ ہو تو سفید کی برتری یا خوبی کیسے پتا چلے گی۔ ہر خوشی غم کا الٹ ہوتی ہے۔ ہاں کا دوسرا جواب نہیں ہوتا ہے' تم خفا کیوں ہو گئیں؟" وہ متانت سے بولے۔

"یہ تو بہت مایوسانہ سوچ ہے ابا۔ انسان ایسا سوچے تو پھر آنکھ ہی نہ کھولے کہ بند بھی کرنی ہو گی۔ زندگی جینا یہ ہے کہ آپ ہر پہلو کو ساتھ لے کر چلیں۔" وانیہ عبید اللہ اپنی رائے کے اظہار میں واضح تھی۔

اب وہ دونوں ٹہل رہے تھے۔

"اور یہ بتائیں آپ صبح صبح اتنی بھاری فلسفیانہ ۔۔۔ وہ بھی آپ کے احترام میں ورنہ احمقانہ۔" اس نے منہ بگاڑا' ابا کھل کر ہنس دیے۔

"باتیں کہاں سے لائے ہیں؟ رات سوئے نہیں کیا؟ کوئی کتاب پڑھتے رہے؟"

"پڑھنا ہی سمجھو' مگر خود سے پڑھ رہا ہوتا تو تھک جانے پر بند کر دیتا کہ باقی آئندہ۔ آپ کی امی جان پڑھا رہی تھیں۔ ہماری آنکھیں نیند سے بند ہوئیں تو چھپاکے مارنے کا مشورہ دیا۔ اب بیٹا! آپ سے کیا پردہ' وہ ہاتھ میں ڈنڈا لے کر بیٹھی تھیں۔"

"ابا جی!" وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر رکوع کی حالت میں جھکی ہنستی چلی گئی۔

"صبح صبح اتنا جھوٹ۔"

"جھوٹ کہاں؟ ہماری حالت ایک نالائق شاگرد کی سی تھی۔ تم تصور کی آنکھ سے دیکھو تو۔" وہ زیر لب مسکراتے آگے بڑھے۔

"وہی تو دیکھ رہی ہوں۔" وہ پھر ہنس پڑی۔

"ابا جی میرے پیارے ابا جی!" اس نے پشت سے ان کی کمر کو جکڑ لیا اور دو اسکٹ سے گال رگڑے۔ "اندر چلیں! چائے پیتے ہیں۔ میں بڑے مزے کے ہوم میڈ دیسی بسکٹ لائی ہوں' پنڈی کے ایک گاؤں سے اور آپ کے اور تایا ابو اور دادی امی کے لیے ہڈیوں کے درد کا کشتہ جسے کھا کر آپ کشتوں کے پشتے لگا دیں گے۔"

"کیا لگا دیں گے؟" ابا چونکے۔

"اچھا! جو بھی لگاتے ہیں وہی۔۔۔ آپ آگے تو بڑھیں۔۔۔ سرپرائز ہی سرپرائز۔" وہ انہیں شانوں سے دھکیلتے ہوئے اندر بڑھ گئی۔ جہاں امی' دادی امی کے سامنے چائے رکھ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر مسکرائیں۔ پھر ہونٹ سکیڑ لیے۔ رات اسی بات پر بحث ہوئی تھی۔ وانیہ کی ساری من مانیوں کے پیچھے خفیہ ہاتھ ابا ہی کا تھا۔

"میں پیاری ماں!" اب اس نے انہیں پشت سے جکڑ لیا۔

"چھوڑو وانیہ! چھوڑو۔" وہ جھنجلائیں۔

"ارے! چائے گر جائے گی۔"

"اور یہ یقیناً میرے لیے ہو گی۔" وہ مگ لے کر دادی کے تخت پر بیٹھ گئی۔ وہ کچھ دیر منہ پھلا کر بیٹھی رہیں' مگر پھر جب زنبیل (وانیہ کا ہینڈ بیگ جس

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
بساط دل	آمنہ ریاض	500/-
زرد موسم	راحت جبیں	600/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	400/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چوہدری	250/-
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	500/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	500/-
پھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار	250/-
چگیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	300/-
میں سے محبت	فرزانہ عزیز	200/-
دل اسے ڈھونڈ لایا	آسیہ رزاقی	350/-

ناول منگوانے کے لیے فی کتاب ڈاک خرچ 30/- روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32216361

ان کے ابا کی بین اور ناگوار کہ موچیں ان کے تبا ہی کی۔"

خالہ جی جیسے ماضی میں کھو گئیں۔

"آنٹی جی! دس دن بعد بھی کسی نے بتایا یا آپ نے خود اندازہ لگایا تھا؟" وانیہ کے اندر کی استانی بیدار ہو گئی۔

"آئے ہائے پتر جی! اپنے سرتاج کو تو عورت پہچان ہی لیتی ہے۔"

وہ جیسے اس کی کم عقلی پر ہنسیں۔ "دل میں سوچا، کتنی بھولی بھالی ہے۔ ہوں اچھی ہے۔"

بیڈ کے نیچے سے آواز نکلی جیسے غبارہ رکھے رکھے اچانک دھاگا کھل جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ سب نے چونک کے ادھر ادھر دیکھا۔ یہاں سے مونا کا کردار شروع ہوا۔ وہ ایسے کھانسی جیسے دائمی ٹی بی کی مریض ہو۔ کھانستے کھانستے زمین پر بیٹھ گئی اور رومانہ کے پیر کی چھوٹی انگلی پر جان لیوا چونٹی کاٹی۔ رومانہ تڑپی۔ اس کا سر پوری طاقت سے بیڈ سے ٹکرایا۔ خالہ جی نے بیڈ کا ہلنا محسوس کیا اور سائیڈ پر رکھے لیمپ باقاعدہ ہلے۔

"استغفراللہ توبہ توبہ۔ اچلو درود پڑھو۔ زلزلہ آرہا ہے۔ ہائے ربا! میرا تو سارا خاندان اس چھت کے نیچے بیٹھا ہے۔ ہائے میرے مولا۔"

وہ ہاتھ سے سونے کی چوڑی اتارنے لگیں۔

"ہائے! اسے آج ہی خیرات کروں گی، بس تو آفت ٹل دے۔"

"آپ فکرمند نہ ہوں آنٹی جی! ہم نے گھر زلزلہ پروف بنوایا ہے۔ یہ ہمارے نئے کمرے ہیں۔" مونا پھر آگے بڑھی۔

"اچھا... یہاں کچھ نہیں ہوگا؟" وہ بے یقین تھیں۔

"جی بالکل! ورنہ ہم اتنے پرسکون کیسے ہوتے؟" اس نے دلیل دی۔

"ہاں! یہ تو پھر ہے۔" وہ بیڈ پر پڑی چوڑی کو دیکھنے لگیں۔

"چل پھر پہن لیتی ہوں۔"

"مونا بیٹا! مہمانوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آجاؤ۔ مرد باہر والی بیٹھک میں چلے گئے ہیں۔" امی نے پکارا۔

وہ سب بہت سنبھل کر نیچے اتر آئیں۔ اندر عورتیں بے اشتیاق سے وانیہ کو تک رہی تھیں۔

"قد تو لمبا ہے۔ ہمارا جرار لمبا ہے نا۔ رنگ تھوڑا دبتا ہوا ہے۔" اونچا تبصرہ۔

"ہائے، آنٹی! یہ آپ کی شکل لگ رہی ہے؟"

پندرہ سال کا بچہ آتش دان تک آگیا۔ دادی، تائی اور امی ایک ساتھ سہم گئیں۔

"جی بیٹا!" وانیہ کا اعتماد بحال ہوا۔

"اور یہ سچ مچ کے شہباز شریف ہیں؟"

"نہیں بیٹا! ان کی تصویر ہے۔" وانیہ کی رگ ظرافت پھڑکی۔

"میرا مطلب ہے یہ واقعی ہیں؟" اب وہ ہچکچایا۔

"وہ میں نے آج تک ٹی وی پر نظر آنے والے کسی بندے کو زندہ نہیں دیکھا۔ آپ ان سے انعام لے رہی ہیں۔ کیوں؟"

"میں اسکول میں اسپورٹس انچارج ہوں۔ اس وقت وہ پرائز دے رہے ہیں۔ سب سے زیادہ انعامات ہمارے اسکول کو ملے تھے۔"

اس نے بچے کو تفصیل سے بتایا۔ کچھ حیران ہوئے، بیٹیاں صرف استانی سن کر بھاگی آئی تھیں۔ باقی ان کے پیچھے خوشی خوشی۔ خالہ جی نے البتہ اور کچھ نہ سنا نہ سمجھا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے کئی ایرانی سرکس گھوم گیا۔ شادی کے شروع کے دنوں میں جرار کے ابا جی نے دکھایا تھا۔ سفید پلاسٹک کی جلد والی لڑکیاں کھینچ کر جسم کے بالکل چھپائے چھوٹی آنکھیں چست لباس جو پلک جھپکتے ادھر سے ادھر نیچے سے اوپر ہوتی تھیں۔ انہوں نے وانیہ کو سر سے پیر تک یوں دیکھا جیسے اس پر اچانک کانٹے اگ آئے ہوں۔ وہ کبھی اسے دیکھتیں، کبھی پڑھی لکھی بیٹیوں کو جو ہو چکی بیٹھی ماں کے عین مطابق ہی تصور بنا رہی تھیں۔ خالہ جی کو پشت پر شریکوں کی نگاہیں صاف محسوس ہو رہی

تھیں۔

دادی نے دانت پیسے۔ اپنے بیٹے عبید اللہ کو دل ہی دل میں کوسا جس نے ڈرائنگ روم کو بیٹی کے اول جماعت سے لے کر ایم بی کے میڈلز سے سجا رکھا تھا۔ امی بے تاثر خاموش تھیں۔ رہ گئیں تائی، وہ غصے سے بل کھا رہی تھیں۔ "اچھا چھا رشتہ اف!"

وانیہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ اب وہ اپنے گھر کی تینوں خواتین کو گھور رہی تھی۔ (ہزار بار کہا، وہ خالی استانی نہیں ہے۔ مگر...) باہر کھڑی رومانہ چکراتے سر کے ساتھ دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

"سب بے سود ہے کار، ابھی وانیہ چکر میں پھر ثانیہ اور باقی اور دوسرا نہیں ہائے میں مرگئی۔" "اسے یکدم دھیان آیا۔ سر پر پیر رکھ کر بھاگی۔

"ہائے میری بہن! میری پیاری بہن ہائے۔" اس نے پٹ کھولا۔ الماری میں بند ثانیہ گول گیند بنی فرش پر آرہی۔

وانیہ غصے سے بل کھا رہی تھی۔ اس کے دانت پیسنے کی آواز باقاعدہ سنائی دے رہی تھی۔

"امی! آپ کے خدشات معیارات گدھے گھوڑے کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔ ابا کے کہنے پر میں خاموشی سے سب کرتی رہی۔ یہ حالت دیکھیں! آپ اس کی۔ لاش برآمد ہوتی تو پھر؟ یہ گھر میں چھپن چھپائی کس چیز کی شروع ہو جاتی ہے؟"

"آنے والے پھر دوسری چھوٹیوں کو پسند کر لیتے ہیں۔" تائی جی نے جیسے اسے آئینہ دکھایا۔

"تو پھر؟" وہ سینہ تانے تائی کے منہ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"تو پھر بی بی! یہ کہ بڑی پھر بیٹھی رہ جاتی ہیں۔ ماں باپ کے سینے پر مونگ دلنے کو۔"

"تو ماں باپ کے سینے پر نا؟ واٹس رانگ ود یو؟ نیل می۔" اس نے بدتمیزی سے ان کے چہرے کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ "آپ اپنی یہ تمام ہمدردی اپنے پاس رکھیں اور دادی! لڑکا پسند کرنے سے پہلے آپ ذرا عقل سے دولہن تو پسند کر لیں۔ بھانت بھانت کے لوگ اٹھتے

کر کے ہاکی کے لیے آجاتی ہے۔ آپ نے انہیں بتانا تھا کہ لڑکی پی ٹی ٹیچر ہے اور گراؤنڈ میں بھاگتی ہے۔ ٹریک سوٹ میں جاگنگ کرتی ہے اور اسے انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے دس الگ طرح کی سیٹیاں بھی بجانی آتی ہیں... ایسے۔"

وانیہ کا غصہ انتہا پر تھا۔ اس نے تیز چبھتی سیٹی بجا کر دکھائی۔ دادی نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔ امی گمبھیر صورت حال میں بھی معید اور عنید مسکرا اٹھے۔

"بیٹا! وہ دولن بھی اچھی ہے اور لوگ بھی اچھے تھے۔ سیدھے سادے، صاف دل، لڑکا تو بہت اچھا تھا۔" امی کے لہجے میں ملال گھل گیا۔

"آل رائٹ! وہ دھیمی ہوئی، رومانہ کی گود میں اس کی بھی تو کر رہی ہے۔"

"میرا نام نہ لو! مجھے شادی نہیں کرنی۔" رومانہ خفا لہجے میں بولی۔

"ہاں! تم جوگن بن جاؤ۔" وانیہ بولی۔

"ہم لوگوں کے فیصلے... میرے بیٹے کی لوائی کھا گئیں۔" دادی نے آخری حربے کے طور پر آنکھوں پر پلو رکھ لیا۔

"بائیں!" وانیہ نے ضبط کرنا چاہا۔ "کون سی جوانی بھلا؟ ہمیں تو یہی ابا ملے ہیں۔ جھکے کندھے، سر پر سفید بال، داڑھی بھی سفید۔ شوگر، بلڈ پریشر کے ساتھ۔ ہم نے تو ابا کو کبھی جوان دیکھا ہی نہیں۔ ہونہہ!" غصے کے مارے اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ اب کی بار معید اور عنید فلک شگاف قہقہہ روک نہ پائے۔

رومانہ کی مدھم ہنسی بھی شامل ہو گئی۔

"وانیہ! خدا کے لیے چپ کر جاؤ۔" امی نے بحث سمیٹنی چاہی۔

"اگر وہ اتنے اچھے لوگ ہیں تو ثانیہ کے لیے بات کروا دیں امی! نصیب سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ ہم بھی کسی کے منہ کا نوالہ نہیں چھین سکتے۔ ہر چیز طے ہے۔ لکھی رکھی ہے۔ ہٹ دھرمی چھوڑ دیں۔" وہ سائیت سے کہتے ہوئے امی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ان کے شانوں پر بازو پھیلا لیے۔

www.Paksociety.com

"اچھا دیکھتی ہوں۔" امی مدھم بولیں۔
"کیا کل ہو گئی ہو رہانہ بیگم!" دادی کو جلال آیا۔
امی نے نگاہیں اٹھا کر تائی کو دیکھا۔ وہ فوراً" گردن موڑ کر انڈور پلانٹ تکنے لگیں۔ بڑا بے نیازی کا تاثر تھا۔

☼ ☼ ☼

"سارا بخار خوف کی وجہ سے ہے۔" شایان ڈاکٹر کو چھوڑ کر دوائیں لیے اندر داخل ہوا۔ تائی کی پرسکون حالت میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ وہ دانیہ کے نزدیک کرسی پر بیٹھا دوائی نکال کر سمجھا رہا تھا۔ کیا خبر' جانے کب وہ بھی بڑے عمران کی طرح دانیہ کی مالا جپنے لگتا۔
عمران جسے ڈانٹ ڈپٹ' دھمکا گاؤ اور دوسرے بچے جھوٹے حربے استعمال کر کے انہوں نے اپنی بھانجی کے ساتھ کھپایا تھا۔ عمران بھائی درمیانے قدوقامت کے گلگے سے بڑے شریف اور نیک نوجوان تھے۔
انہیں دانیہ بچپن سے اچھی لگتی تھی۔ دونوں اکٹھے کھیلے کودے۔ ساتھ ساتھ بڑھے' پھر کالج الگ ہوا تو دلچسپیاں الگ ہوئیں۔ ان کا قد رک گیا۔ بس پڑ گیا تھا' مگر دانیہ سود کے قرضے کی طرح بڑھتی چلی گئی۔ عمران بھائی کی دسترس سے دور بہت دور ورنہ شاید وہ ہاتھ بڑھا کر اچک ہی لیتے۔
"ارے تاڑ کا درخت ہے۔" عورت مرد سے دبتی ہی اچھی لگتی ہے۔ ارے! لو کیا ہمیشہ سر اٹھا کر اسے دیکھے گا اور وہ سر جھکا کر؟ لوگ مذاق اڑائیں گے۔"
"کہاں میں موٹے سول کا جوتا پہنوں گا" وہ فلیٹ چپل۔" عمران بھائی نے بہت سوچا سمجھا حل بتایا۔
"بیٹے! مجھے کیا اعتراض' تم مستقل اسٹول بنوا لینا' بلکہ لکڑی کی ٹانگیں آرڈر پر بنوا لو مگر تمہاری مضحکہ خیز مجھے گوارا نہیں۔" عمران بھائی کی تھوڑی سینے کو لگ جاتی۔
"ہاں! اچھی لگتی ہے۔" وہ بے بسی کا اظہار کرتے۔
"ہاں اچھا تو قطب مینار بھی ہے' وہیں انڈیا چھوڑ آئے نا؟ ساتھ لیے لیے نہ پھرتے؟ مینار پاکستان دیکھنے جاتے ہیں۔ کبھی کسی کو گھر منگواتے دیکھا؟" وہ مبالغہ کی انتہا کر دیتیں۔
"کہاں! اب اتنی بھی نہ کریں۔" مونا کے لیے یہ گفتگو مزے کی ہوتی' مگر اس کی بھی بس ہو جاتی' مونا کے تعلقات بڑے ستھرے تھے۔ وہ اِدھر کی بات اُدھر نہ کرتی' نہ اُدھر کی اِدھر۔ اسے اپنے دونوں رشتے پیارے تھے۔ ایک جانب ماں اور دوسری جانب بہت اچھی' پیاری صحبت کرنے والی کزنز' بہنیں' دوستیں' اس نے کبھی میر جعفر کا کردار ادا نہ کیا۔
"پتا نہیں آپ کو کیا پرخاش ہے' اتنی تو اچھی ہے۔" اس نے صفائی کے لیے لب کھولے۔
"اے لڑکی! بس ایک لفظ نہیں۔ اور یہ بیان اپنے باپ کے سامنے نہ جھاڑ دینا۔ مبادا خود ہی نکاح پڑھا دیں۔ اس کا دماغ خراب نہ کرو۔ تمہاری خالہ کی زہت ہی اچھی رہے گی۔ گوری چٹی' مناسب قدوقامت' پڑھی لکھی اور۔"
"وہ آٹے کی بوری بن جائیں گی دو سال بعد۔" مونا نے منہ بنایا۔
"ہاں تو گندم کی بالی بن کے کب تک رہتا ہے کوئی' دیکھا کبھی؟" تائی جی نے ناک سے مکھی اڑائی۔
"آپ کی مرضی۔" وہ بے زار اٹھ جاتی۔
عمران بھائی مایوس کمرے میں چلے آتے۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح چھوٹی پھپھو اپنے اکلوتے بارہ سالہ بیٹے اسامہ کے ہمراہ جلوہ افروز ہوئیں۔ دانیہ سے ملنا تھا اور ثانیہ کا انتظار پہلے تو سارا قصہ سننے بیٹھی تھیں۔
"جب تک یہ لوگ اندر بیٹھی تھیں۔ میں لاک کو اندر سے ذرا سا پکڑے ساکت بیٹھی رہی' مگر جب یہ لوگ باہر نکلنے لگیں تو پتا نہیں کس کا دھکا لگا' دروازہ مقفل ہو گیا۔ میں اسی وقت شور مچانے لگی' مگر کسی نے سنا ہی نہیں۔ رومانہ بھی ان کے پیچھے نکل گئی میں بس ہاتھ مارتی رہی' امی' باجی' مونا' رومانہ ہائے بھائیو! بس پھر یاد نہیں۔ قبر بھی ایسے ہی ہو گی ہائے۔" اس کی

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers. If site is not opening ,or you find any issue in using site send your complaint at
admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121
www.Paksociety.com

آواز خوف زدہ ہو گئی۔

"تو اعمال اچھے رکھنے چاہئیں، قبر پھولوں کا بستر لگے گی۔" وانیہ نے سرسری لہجہ اپنایا' وہ اس کے خوف کو زائل کرنا چاہتی تھی۔

"میں آج کے بعد کوئی نماز قضا نہیں کروں گی۔" ثانیہ نے عہد کیا۔

"آج سے پہلے بھی نہیں کرنی چاہیے تھی۔" رومانہ بولی۔ وہ بہت باقاعدگی اور دل جمعی سے نماز پڑھتی تھی۔

"اس کا کوئی چکر ہے۔ یہ وظیفے کرتی ہے۔" مونا نے بتایا۔ رومانہ نے نوکمنٹس کا تاثر دیا۔

"ہونہہ! یہ سب تمہاری اماں کا پھیلایا ہوا فضیحتہ ہے۔" رومانہ نے چبا چبا کر کہا۔ "تمہارے ابا کے پانچ بیٹے میرے ابا کی پانچ بیٹیاں۔ ایک دوسرے سے کھپا دیے مگر نہیں... چراغ تلے اندھیرا۔ خبردار! جو تمہاری اماں نے آئندہ ہمارے لیے کوئی رشتہ بتلایا۔" اس نے نکلھا چاقو کی طرح مونا کی پسلی میں گھونپا۔

"ہائے! میں مرگئی ظالم۔"

"تمہاری ماں ایک سنگ دل' جابر' بے حس حکمران ہے۔" وہ الٹے قدم پیچھے ہٹتی مونا کی طرف مسلسل بڑھی۔

"تو اس میں میرا کیا قصور۔" مونا منمنائی۔

"اور تم اس کی کابینہ کا ناکارہ پرزہ۔ جعلی ڈگری کا وزیر۔ اس کا جواب روز حشر دینا پڑے گا۔ اور سب سے بڑے قصوروار میرے شریف النفس' بے ضرر تایا جی ہیں جو صدر ہوتے ہوئے بھی اپنے اختیارات کا استعمال نہیں کرتے۔"

"58,2B ختم ہو چکی۔" وانیہ نے لقمہ دیا۔

"نظریہ ضرورت استعمال میں لاؤ۔" رومانہ نے دیوار سے چپکی مونا کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"پھپھو! مجھے بچائیں!" مونا بے بس ہو گئی۔

"یاد رکھو! تم نے ہمیں بھابھی نہیں بنایا' ہم بھی تمہیں نہیں بنائیں گے۔" اس نے دھمکی دی۔

"مجھے بچے گود لینے کا شوق نہیں۔" مونا نے رومانہ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے دھکیلا۔ معید' مونا سے تین برس چھوٹا تھا۔ تائی دل ہی دل میں عہد کر چکی تھیں' بلکہ دادی اور دونوں پھپھوؤں یہاں تک کہ ریحانہ بیگم کے سامنے بھی وہ برملا کہہ چکی تھیں۔

"نہ لینی ہے' نہ دینی ہے۔" اس کے پیچھے لمبی مگر روایتی اسٹوری تھی۔

تائی کا اپنا ذہن بنا ہوا تھا کہ وہ اپنی چھوٹی بہن کو دیورانی بنائیں گی' بہن کے جیسی گوری۔ شوہر نے مسکرا کر رضامندی دی۔ ساس بھی خاموش رہیں' مگر عبید اللہ صاحب کو دور پرے کی رشتہ دار ریحانہ بیگم بھا گئیں۔ براہ راست ابا سے بات کی اور انہوں نے بیگم کو آگے کر دیا۔

"عبید کا رشتہ طے کر آیا ہوں یعقوب کی بیٹی ریحانہ سے۔ تیاری کا وقت مانگا ہے اس نے۔ میں بھی خاموش ہو گیا' ہمارے گھر اللہ کا شکر سب ہے' مگر بچی والے کی سو مصلحتیں۔ تم تیاری رکھو۔"

عصمت بیگم کچھ کہنا چاہتی تھیں' مگر وہ بہت دو ٹوک اور دبنگ انسان تھے۔

"سوچا تھی اپنی بہن کے لیے۔"

"تو کیا منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھی تھی' پہلے کہتی۔ اب میں زبان دے آیا ہوں۔ بس۔" وہ زور دے کر بولے۔ تائی جی تو تائی جی' دادی تک سہم گئیں... یہاں تائی کے گھر شایان ہونے والا تھا۔ وہ خواہش کے باوجود دیکھنے نہ جا سکیں۔ تب دیکھا جب وہ دلہن بنی سیج پر بیٹھی تھیں۔

"گندمی چمکیلی رنگت' بے حد دبلا پتلا' مگر خوب صورت سراپا' دراز قد اور بے حد لمبے گھنے بال۔ حسد و رشک کی لہر نے سارے وجود کو امربیل کی طرح ڈھانپ لیا۔ ریحانہ بیگم اتنی دلکش' سلیقہ شعار تھیں کہ ڈھونڈنے سے بھی کوئی عیب نہ ملا۔ وہ بے نیازی کے خول میں بند دیورانی کو منہ لگائے بنا گھر میں رہتیں' سب کا رویہ بہت اچھا تھا۔ ریحانہ بیگم نے خود سے اچھا بننے کی سعی کی۔ مگر وہاں ہنوز ناگواری و بیزاری تھی'

خاموش ہو گئیں۔

پہلی خاموشی جب تابی عبید اللہ پیدا ہوئی۔

"کم تر عورت بھی پیدا کی۔" مگر اس اعتراض کو جگہ نہ ملی کہ دادا' دادی کے پاس دو پوتوں کے بعد (عمران اور شایان) یہ بہت لاڈلی رہی' پھر وانیہ تو ادھر عدنان' ادھر ثانیہ تو ادھر اکلوتی مونا۔ تائی نے فیملی مکمل کر لی' مگر ادھر تائی کے ہمدردی کے لبادہ میں شور شرابا اور دادی کی فکر۔ انہی دادا' دادی کی دعاؤں سے بعد معید پیدا ہوا' پھر عطیہ' جو دو سویں جماعت میں تھی اور اس کے ساتھ جڑواں عنید۔ ادھر تائی نے مزید دو بیٹے پیدا کیے۔ معید سے سال چھوٹا کاشان اور عطیہ' عنید سے بڑا مہران۔ تائی پہلے ہی لوٹ تھیں' اب پہاڑ پر چڑھ بیٹھیں۔

دادی جب کبھی ایمان داری سے شکر ادا کرنے لگتیں کہ خدا نے پانچ بیٹیاں دیں تو شکر دو بیٹے بھی دیے۔ تو تائی نیا پہلو دکھاتیں۔

"کیا فائدہ اماں یہ چھوٹے بیٹے' بڑھاپے کی اولاد کس کام کی۔ بڑی چاروں کو بیاہ کر عبید اللہ نے ختم ہو جانا ہے' جب بیٹے کا کندھا کندھے سے ملنے ہوگا ہو گا تب تک عبید کے کندھے رہے کہاں ہوں گے۔ بیٹے تو پہلو تھی کے ہوتے ہیں۔"

دادی ان کی بات کی گہرائی میں جاتیں۔ "ہائے! بڑی بہو کتنی پکی باتیں کرتی ہے۔" وہ قائل ہو جاتیں۔

ریحانہ بیگم سوچتیں۔ "بیٹا اس لیے تو نہیں مانگا تھا کہ وہ ہماری پیدا کی ہوئی بیٹیوں کو سنبھالے۔ خدا ہمیں ہمت دے۔ ہم انہیں گھر بار کا کر دیں اپنے ہاتھوں۔ بیٹا نعمت ہے' خوشی ہے' میں تھا تو مانگ لیا' فائدہ نقصان کیسا؟" مگر وہ کہہ نہ پاتیں۔

دادی' تائی جی کے زیر اثر صبح کو جنگ لیتی تھیں۔ شوہر سے کہتیں تو وہ نظر انداز کرنے کا مشورہ دیتے' مگر کہنا آسان ہوتا ہے اور کرنا مشکل اور پھر چوبیس گھنٹے کا راگ رنگ۔ وہ خاموش تو رہتیں' مگر کڑھتی بہت۔ ان کی بیٹیاں بہت اچھی تھیں۔ بہت اچھی پیاری' باادب' باتمیز' پڑھی لکھی اور ان کے لیے اللہ کا

بہت خوب صورت تحفہ جس کا شکر وہ ادا نہیں کر سکتے تھے مگر دنیا...

ثانیہ کا رشتہ ان کی بہن نے سالوں پہلے مانگ لیا تھا۔ تبریز ان کا اکلوتا بھانجا۔ برسر روزگار' پڑھا لکھا۔ وہ پانچ سال پہلے ہی اسے چھبیس برس کی عمر میں بیاہ چکی تھیں۔ تبریز کی پوسٹنگ کوئٹہ میں تھی۔ ثانیہ سال بعد چکر لگاتی۔ ایک بیٹا' ایک بیٹی۔ سارا مسئلہ وانیہ کا تھا۔ وہ کسی صورت ہاتھ نہ آتی۔ اس کا پروفیشن۔ دادی اسے مانی منڈا کہتیں۔ وہ ہمیشہ سوچتیں' عمران اور وانیہ' مگر عمران کو رفعت بیگم نے بھانجی نزہت سے بیاہ دیا۔ ریحانہ سوچتیں شایان اور وانیہ' مگر جٹھانی منہ سے بیٹھی تھیں' بولیں تو کیا۔

"کم عمری گھریلو لڑکی لاؤں گی۔ شایان ذرا الگ مزاج کا ہے۔"

دراصل اس کے پیچھے بھی ایک اسٹوری تھی۔ وہ انجینئرنگ میں تھا۔ ویسے وہ بڑا ہی لائق فائق تھا۔ ایف ایس سی میں اس نے ٹاپ کیا۔ انٹری ٹیسٹ کے دوران نہ جانے کس نے اپنی نقل کی پرچیوں کا گولا بنایا۔ اچھالا اور نگراں کو اس کے پیروں کے پاس سے ملا۔ ایجوکیشن آفیسر پاس ہی راؤنڈ لے رہے تھے۔ اس نے قسمیں کھائیں۔ اپنے لکھے سوال منہ زبانی فرفر سنا دیے۔ اپنا بارہ سالہ بے داغ ریکارڈ بتایا' مگر بے سود' اس نے گھر آکر ایک ایک چیز توڑ ڈالی۔ اور اپنا سر جالی کے دروازے سے مار مار کر لہولہان کر لیا۔ خودکشی کی کوشش تک کر ڈالی۔

اسے نارمل زندگی میں کس طرح لایا گیا' یہ الگ داستان ہے۔ دادی کی شفقت' بھائیوں کی دوستی' وانیہ کی بے حد پرخلوص کوششیں۔ اسے سائیکاٹرسٹ تک سے سیشن دیے گئے۔ وہ نارمل ہو گیا' مگر پھر دوبارہ پڑھائی کا نام نہ لیا۔ اب مین مارکیٹ میں وہ ایک بہت بڑا انٹرنیٹ کیفے چلا رہا تھا۔ ساتھ لائبریری تھی۔ وہ عملی زندگی میں آ چکا تھا۔ مگر وجود پر چھائی اداسی اور کڑواہٹ کسی طور کم نہ ہوتی تھی۔ وہ گھر میں بھی خاموش رہتا۔ اسے اپنے اردگرد کی کچھ خبر نہ تھی۔

بے نیازی اور لاپروائی کا عالم یہ تھا کہ اس کے فرشتے تک نہ جانتے تھے کہ کوئی کیسے اس پر دن رات صبح شام مرتا ہے۔

✿ ✿ ✿

وانیہ فارغ تھی اور چھٹیاں خوب انجوائے کر رہی تھی۔ اس نے اپنے میڈلز دھو نا مانجھ کر چکا کر رکھے اور دادی کی بوسیدہ ہاتھوں پر اپنی گنگناہٹیں حاوی کر دیں۔ اس نے معید اور کاشان کے ساتھ مل کر نیا ریک بنوایا۔ اسامہ کی وہ آئیڈیل تھی۔

"میں بس آپ جیسا بننا چاہتا ہوں۔" وہ بے حد موٹا اور گورا تھا۔

وانیہ گھر کی باقی لڑکیوں سے چھپ کر گھر سے بھاگنا چاہتی تھی' بازار تک' اس نے خفیہ مشن کے تحت جائزہ لیا۔ رومانہ سلائی مشین لیے بیٹھی تھی۔ ثانیہ ڈائجسٹ پڑھ رہی تھی اور مونا فیشن میگزین لیے بیٹھی تھی' عطیہ کے پیپرز ہونے والے تھے۔ وہ عنید کے ساتھ پڑھ رہی تھی۔

"دادی!" اس نے دروازے کی جھری سے جھانکا۔

"گڈو۔ یہاں پر سین پارٹ ہے۔" بڑی پھپھو جن کی بارہ' دس اور پانچ سالہ تین عدد بیٹیاں تھیں اور ایک بار پھر وہ میدان عمل میں کود پڑی تھیں۔ تائی خاموش بیٹھی تھیں۔ امی ان کی کمر سے کوئی تعویذ باندھ رہی تھیں۔

"واؤ۔" اس نے دروازہ چوپٹ کھول دیا۔

"کیا فائدہ اس سب کا؟ تین بیٹیوں کے بعد اب بیٹا ہوا بھی تو کس کام کا؟ باپ کے کندھے سے کندھا کیسے ملائے گا؟ چھوڑ دیں یہ ڈھکوسلہ بازی۔ صبر شکر کرکے بیٹھ جائیں' پہلے تین کو ٹھکانے لگائیں گی پھر اس کو بھی پالیں گی' نری دردِ سری۔ دفع کریں۔" بے حد مسکراتے چہرے اور کھنکھناتے لہجے میں وانیہ یوں بولی جیسے کوئی خوش خبری دے رہی ہو۔

"تیرا بیڑا غرق۔ وانیہ!" دادی صدمے کی حالت میں پہلے کھڑی ہو گئیں' پھر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئیں' تائی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

بڑی پھپھو تائی امی کی اکلوتی چھوٹی بھابھی تھیں۔ ان کا دل چاہا جوتا اتار کر وانیہ کے سر پر بغیر رکے برسانا شروع کر دیں۔ حق دق تو امی بھی رہ گئیں۔

"وانیہ! بکواس بند کر۔ سوچ سمجھ کر بول! کوئی گھڑی قبولیت کی بھی۔" امی نے دہل کر اسے گھورا۔

"دعا تھوڑی کر رہی ہوں' بات کر رہی ہوں' یوں ہی بر سبیل تذکرہ۔" اس نے ڈھیٹوں کی طرح ہنس کر کہا۔

بڑی پھپھو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"مت روئیے پھوپھو! میری ساری دعائیں آپ کے لیے ہیں۔ قسم خدا کی۔" وہ بے حد خلوص سے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ "اور یہ میرے الفاظ نہیں ہیں کسی اور کے ہیں اور میں نے کسی اور کو ہی سنائے ہیں۔ مجھے بتائیے' ہر بات کہنے کی نہیں ہوتی' زندگی دائرے میں گھومتی ہے۔ آپ کو واپس آنا ہی پڑتا ہے' کیوں تائی امی؟" اس کی نرم آنکھیں سرد ہو کر دوبارہ تائی امی پر ٹھہر گئیں۔

"ان شاء اللہ آپ بامراد رہیں گی۔" اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر پھوپھو کی بھیگی آنکھیں صاف کیں اور ان کے گال کو بوسہ دے کر الٹے قدموں باہر نکل گئی۔

"بازار جا رہی ہوں۔" اس نے اطلاع دی۔

امی خاموشی سے جلتے پردہ کو تک رہی تھیں۔

✿ ✿ ✿

"وہ پورے چوبیس کی ہو گئی ہے اور مرتضیٰ تین میں لگ گیا ہے۔ تایا ابا شادی کی تاریخ مانگ رہی ہیں۔" تائی امی تایا ابو کے سامنے بیٹھی تھیں۔

"تو دے دو ناں تم۔" وہ اخبار پڑھ رہے تھے۔

"ایسے کیسے۔ دو آپ سن بھی رہے ہیں؟ مونا کی شادی کی بات کر رہی ہوں۔" وہ جھنجلا گئیں۔

"ہاں۔ ہاں! میں سمجھ گیا ہوں۔" انہیں اخبار رکھنا پڑا۔ "فون اور وہ ان سے چھٹی کا پتا کر لو' جہیز وغیرہ تو تم ناؤں سے تیاری ہو، اسکول والے بچوں کے پیپر دیکھ لینا اور وہ تمہاری بھابھی میری بہن' اسے بھی یاد رکھنا۔ ان کا اشارہ بڑی پھپھو کی زچگی کی طرف تھا۔

"اور پیسے وغیرہ مجھے بتا دینا' بس یا کچھ اور۔" انہوں نے دریا کو کوزے میں بند کرتے ہوئے ہاتھ پھر اخبار کی جانب بڑھایا یعنی بات ختم۔

"میں کسی گلی محلے کی شادی کی بات نہیں کر رہی ہوں' ہماری اکلوتی بیٹی کی شادی ہے اور آپ کو یہ اخبار سوجھ رہا ہے۔" وہ بری طرح چپ ہو گئیں۔

"ہاں۔ ہاں۔ لیکن یہ مونا ابھی کچھ چھوٹی نہیں ہے؟" وہ پر خیال انداز میں بولے۔

تائی نے سرتھی میں ہلا کر جیسے اپنے آپ پر افسوس کیا' کس دیوار سے سر پھوڑ رہی ہوں۔

"چوبیس کی ہو گئی ہے۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے' مگر ابھی گھر میں اس سے بڑی لڑکیاں موجود ہیں اور بلکہ میں تو کہتا ہوں شایان' عدنان کی ساتھ کر۔" تائی بھنا گئیں۔

"میں کوئی گورنر ہوں' جو اجتماعی شادیاں کروں؟ اور رہی گھر میں لڑکیاں ہونے کی بات تو جن کی ہیں' وہ جانیں' میری تو ایک ہی بیٹی ہے اور اس کی شادی کی عمر ہو چکی ہے۔ نہ میں نے اپنی بچی میں خود سری ڈالی کہ وہ من مانی کرے۔ جتنا پڑھایا' پڑھ لیا' اب شادی کا بولوں گی تو چپ چاپ سر جھکا دے گی۔ آپ کی بھتیجیوں کی طرح نہیں۔ ایک گراؤنڈ میں چھلانگیں مار رہی ہے۔ اس رومانہ کو شادی کرنی ہی نہیں اور ثانیہ کو بہت سارا پڑھنا ہے۔ الٹا رواج نکلا ہے۔ ماں' باپ اولاد کے فیصلوں پر سر جھکا رہے ہیں۔"

تایا نے ٹوپی اتار کر سر پر ہاتھ پھیرا۔ خوامخواہ بیوی کو چھیڑا' اب وہ اس موضوع پر بلا تکان بول سکتی تھیں۔

"خیر! تم ہمیشہ سے پرانے زمانے کی عورت ہو۔" تایا جی نے بات ختم کرنے کی عجلت میں انتہائی غلط جملہ بول دیا۔

بعد میں وہ ایک ہفتہ پچھتاتے رہے۔ تائی جو شروع ہوئیں تو الاماں۔

✿ ✿ ✿

گھر میں باقاعدہ اعلان ہو گیا کہ بچوں کے پیپرز ختم ہونے کے فوراً بعد مونا کی شادی خالہ زاد ڈاکٹر مرتضیٰ سعید کے ساتھ ہونا قرار پائی ہے۔ مونا گھبرائی شرمائی اور کچھ شرمندہ سی چپ چاپ بیٹھی تھی۔ ان سب نے البتہ خوب خوشی کا اظہار کیا۔

عمران بھائی کی شادی میں دادی جی نے کرائے پر ڈھولک منگوانے کے بجائے اپنے ذاتی دو ڈھولک خرید لیے تھے کہ ماشاء اللہ اب شادیاں ہی شادیاں ہوں گی۔ رومانہ اور کاشان ڈھولک لے کر بیٹھ گئے' سب بڑے پرجوش تھے۔ وانیہ نے پہلے انوکھا لاڈلا سنایا۔ تائی اور دادی سمیت سب نے سراہا' مہران' کاشان' معید' عنید نے وہ بھنگڑا ڈالا کہ مونا کو بولنا پڑ گیا۔

"اب بورنگ کروانے کی ضرورت نہیں' اس کمرے ہی سے تھوڑی دیر میں پانی نکلے گا۔" مہران ناچتے ناچتے مونا کے منہ پر جھک آیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ پیچھے دھکیلتی۔

آج تائی کا موڈ بھی بہت خوشگوار تھا۔

"یہ گانے چھوڑو وانیہ! مسرت نذیر کے اور دوسرے شادی بیاہ کے گیت گاؤ بیٹا!" امی نے فرمائش کی۔ تائی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ وانیہ نے ایک پل سوچا۔ رومانہ اس کے کان میں گھسی۔ مرتضیٰ کے بال ماتھے سے کم تھے۔ پورے مرتضیٰ میں یہی ایک خامی تھی ان لوگوں کے بقول' وہ اکثر اسے چھیڑتیں اور اس کا جواب سن کر دل کھول کر ہنستیں۔

"بال کم نہیں ہیں جل گئے ہیں! کشادہ پیشانی خوب صورتی اور ذہانت کی علامت ہوتی ہے۔" وہ اتراتی۔

"کشادہ پیشانی ہاہاہا' دل کے بہلانے کو غالب۔ ہاہاہا۔" وانیہ کی آنکھوں میں شرارت نے روشنیاں بھر دیں۔

"متھے تے چمکن وال میرے بنڑے دے۔"

تائی' دادی اور امی کو گانا پسند آیا۔ وہ ہلکی ہلکی تالیاں پیٹ رہی تھیں۔ مونا کے چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ

تھی۔ لڑکے اب بیٹھے ہوئے ہاتھ اوپر کر کے جھوم رہے تھے۔ رومانہ نے وانیہ کو کندھا مارا اب دونوں ہم آواز گا رہی تھیں۔

"متھے تے ناواں نال میرے ہنڑے رے۔ متھے تے کوئی نئیں لے وال میرے ہنڑے رے۔"

مونا نے پے در پے کشن دونوں پر برسانے شروع کر دیے۔ تائی جی منہ بنانا چاہتی تھیں مگر سال اپنے خوش دل قہقہے ہنسی اور واضح محبت تھی کہ وہ بھی ہنس پڑیں۔

☆ ☆ ☆

مونا سعد اور مرتضیٰ سعید کی شادی ہر اعتبار سے یادگار اور خوب صورت تھی۔ کارڈ کی چھپائی سے لے کر لین دین تک ملیش ٹرے سے لے کر امپورٹڈ کراکری اور معمولی گل دان سے فرنیچر تک تائی امی نے مونا کے لیے ضروری اور غیر ضروری سامان کا ڈھیر کر دیا تھا۔ ہر چیز ڈبل تھی۔ دونوں بھائیوں کا کاروبار مشترکہ تھا مگر عدنان نے الگ سے جو کام شروع کیا تو اس نے بھی انہیں پیسے دیے تھے پھر تائی نے ہمیشہ خود کو اور اپنے بچوں کو اعلیٰ اور اہم مقام دیا۔

دادی خود حیران تھیں کہ اتنا مال آ کہاں سے رہا ہے اور جا کہاں رہا ہے۔ اتنے بہت سارے سونے کے سیٹ، زیور ہی زیور، سادے نگوں والے انڈین، دبئی کا سونا، سوٹ سلے ہوئے سوٹ، بیڈ شیٹ کشن اتنے کہ مونا کو کہہ دیا "اب تمہیں اپنی نواسیوں، پوتیوں کے لیے بھی شاپنگ نہ کرنا پڑے گی۔"

اسراف اور نمود و نمائش تھی۔ دادی نے دبی زبان سے کہا بھی "گھر میں اور بچیاں بھی ہیں وہ۔"

تائی اتنے روکھے اور بدتمیزی بھرے انداز میں جتا گئیں۔ "میری صرف ایک ہی بیٹی ہے۔ باقی لوگ جانیں اور ان کے کام۔" بہانہ بیگم سے ان کا حسد اور بیزاری سب پر عیاں تھی مگر اتنا کھور پن اور کڑواہٹ دادی اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔

یہاں سعد اور عبید کی پڑھائی تھی۔ وہ دونوں میڈیکل میں جانا چاہتے تھے اور بہت لائق فائق تھے۔ عطیہ کتابی کیڑا تھی۔ وہ فوج میں جانا چاہتی تھی۔ ثانیہ ایم ایس سی کر چکی تھی۔ وہ لیکچرر شپ کے لیے اپلائی کرنا چاہتی تھی مگر سیٹیں محدود تھیں۔ بے حد رشوت اور بڑی سفارش۔ وانیہ ایک بہت بڑے اسکول میں اسپورٹس ٹیچر تھی۔ اپنے زمانہ طالب علمی میں بھی پڑھائی سے زیادہ کھیل کے میدان میں آگے تھی۔

☆ ☆ ☆

مونا شادی کر کے مرتضیٰ سعید کے ساتھ کراچی سدھاری۔ وانیہ اسکول۔ اس کا اسکول گھر سے گھنٹے کی دوری پر تھا۔ عام دنوں میں وہ ہر روز صبح جاتی مگر اسکول ایونٹس کے دنوں میں ہاسٹل میں بھی رہ جاتی۔ ایک بار پھر اسپورٹس ویک تھا۔ رومانہ گھر میں امی کے ساتھ رہتی۔

عمران اور نزہت بھی چلے گئے۔ بڑے دنوں سے جاری خوشگوار ہلچل اختتام پذیر ہوئی تو عام معمولات بیزار اور اداس کرنے لگے۔ تائی نے اب شایان اور عدنان کے لیے لڑکیاں دیکھنی شروع کر دی تھیں۔ دادی ساتھ نہ جاتیں، وہ صاف الفاظ میں کہہ چکی تھیں۔

"گھر کی لڑکیاں دیکھو۔"

اور تائی جی نے ان سے زیادہ صاف گوئی سے منع کر دیا۔ ہر بار رومانہ میٹھی بنی، ان کے ساتھ جاتی، بھابھی پسند کرنے۔ ثانیہ باجی کی امی سے لمبی ٹیلی فونک گفتگو ہوتی۔

"اور یہ جو رومانہ ہر جگہ ساتھ ٹنگی جاتی ہے اور وہ جو لوگ لڑکا دیکھنے آ جاتے ہیں۔ عقل کے اندھے ہوتے ہیں۔ کہتے نہیں "بی بی! تمہارے اپنے گھر میں اتنی پڑھی لکھی لڑکیاں موجود ہیں۔ شکل و صورت بھی پیاری، تم باہر کی خاک کیوں چھانتی ہو؟" وہ جل کر کہتی۔

"ہمیں کیا خبر۔" امی اکتاہٹ سے کہتیں۔ "ایک اکیلی فارغ رومانہ ہی ہے سو ساتھ چل دیتی ہے، بلکہ خوشی خوشی جاتی ہے۔ "من مانی میں تم سب بہنیں ایک سے بڑھ کر ایک ہو۔" امی سخت خفا تھیں۔

"مگر میں نے اب طے کر لیا ہے۔ اب جس کا مرضی رشتہ آیا، میں نے کر دینی ہے اور وہ تمہاری چہیتی وانیہ۔ کہتی ہے اس کے ہاتھ میں شادی کی لکیر نہیں ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ ہی توڑ دینا ہے۔" امی بے بسی سے یہی کہہ سکیں۔ ثانیہ ہنس پڑی۔

"اچھا چلیں! یہ بھی اچھا فیصلہ ہے۔ میں بھی کچھ لوگوں کو بھیج رہی ہوں۔ تبریز کے دوست کے سسرالی ہیں۔ حرا کی برتھ ڈے کی مووی دیکھی تو رومانہ، وانیہ، ثانیہ اور مونا اچھی لگیں ان کو۔ مونا کی تو بات طے تھی۔ وہ میں نے بتا دیا، ان کا چکر لگے گا۔ آپ رومانہ کے لیے ذہن بنائیں۔ وانیہ کو بھی دکھا دیں، بلکہ ثانیہ تو بھی۔ یہ الماری میں چھپانے کا احمقانہ کام بند کریں۔" وہ بے زاری سے بولی۔

"ارے!" امی بہت زیادہ خفا ہو گئیں۔ "میں نے بند کیا تھا الماری میں؟ یہ تو ان لڑکوں کے اپنے شوشے ہیں۔ لو بھلا بتاؤ! ماں کو بدنام کر دیا۔"

"ارے ماں۔ جن پر خفا ہونا ہے، وہاں آپ بولتی نہیں اور مجھ دور بیٹھی پر غصہ کرتی ہیں۔" ثانیہ نے بھی مزاج بنایا۔

"ارے نہیں بیٹا!" امی فوراً ٹھنڈی ہوئیں۔ "تمہاری دادی جی نے بھلے تمام عمر میرا ناطقہ بند رکھا مگر اتنا تو میں انہیں جانتی ہوں۔ عمران کے لیے وانیہ ان کی خواہش تھی، مگر سال تمہاری تائی کو بھاتی پسند تھی۔ کوئی بات نہیں۔ اب شایان ہے، ہر شے سے بیزار۔ کھانے سے، پینے سے، آرام بیزار۔ اسے کوئی لڑکی کیسے برداشت کرے گی۔ بس چار ماہ کی عمر ہی میں مسکرایا ہو گا۔"

امی بڑی سنجیدگی سے بولیں۔ ادھر ثانیہ کا بے ساختہ قہقہہ فلک شگاف تھا۔

"ہاں تو ہنسنے کی کیا بات ہے۔ مجھے یاد نہیں، آخری بار کب مسکرایا۔ آنے والی کیسے گزارا کرے گی؟ مگر چلو! اپنے گھر کا بچہ ہے۔ اس کا اپنا مزاج ہے مگر تمہاری تائی۔۔۔ عدنان کے لیے بھی اپنے میکے کا نام لیتی ہیں۔ شایان کے اکھڑ روکھے مزاج کو سب جانتے ہیں اس لیے اس کے لیے باہر جاتی ہیں۔ باقی تو ابھی چھوٹے ہیں، تمہاری چھوٹی پھوپھو نے کہا تھا۔ گھر کی لڑکیوں کا پہلا حق بنتا ہے۔ اول خویش بعدہ درویش۔ کاٹ کھانے کو دوڑیں تمہاری تائی جی۔"

وہ جیسے تھک گئیں۔ بس امی بڑی بیٹی سے دکھ سکھ کہتی سنتی تھیں۔ ثانیہ تسلی دینے لگی مگر بیلنس ختم ہو گیا۔

"بس ہر چیز ادھوری رہ جاتی ہے۔" امی نے تاسف سے موبائل کو دیکھا۔

☆ ☆ ☆

جب مہمان آئے رومانہ ابھی ابھی اپنی سہیلی کے گھر سے واپس آئی تھی۔ یہ سہیلی مونا کی بھی دوست تھی۔ اب پودوں کے پاس ٹہلتے ہوئے فون پر مونا کو اس کی منگنی کا سارا قصہ سنا رہی تھی۔ ڈرائیو وے پر شایان اپنی موٹر سائیکل دھو رہا تھا۔ انہماک اور دلجمعی سے۔ رومانہ اس پر سرسری نگاہ ڈال لیتی۔ وہ مونا کے قصے پر بے ساختہ ہنس رہی تھی، جب شایان نے ناگواری سے اور اندر داخل ہوتی فوجی صاحب کی امی نے بڑے پیار سے اسے دیکھا۔

"واہ! کیا جلترنگ ہنسی پائی ہے، گھنٹیوں جیسی۔" شایان موٹر بائیک اندر لے گیا۔

"کھی کھی کھی۔ پتا نہیں یہ لڑکیاں اتنا ہنس کیسے لیتی ہیں اور یہ رومانہ کی ہنسی۔" وہ اب پھر سٹ ٹاٹ کر رہا تھا۔

وانیہ امی کی گھوریوں اور ثانیہ کی دھمکیوں کے بعد بڑے ہی شریفانہ لڑکیانہ حلیے میں برآمد ہوئی۔ ایک بار ثانیہ بھی پانی کے گلاس رکھنے ڈرائنگ روم میں گئی مگر فوجی کی ماں کے لیے پہلا جھٹکا ہی زور کا جھٹکا ثابت ہوا۔

"رومانہ۔۔۔ رومانہ۔۔۔ واہ کیا ہنسی تھی۔۔۔ بہت

خوب۔"

رومانہ نے اپنے بال نوچ ڈالے۔ "ہائے! اسی وقت کیوں ہنسی یہ میری ہنسی۔ ہائے میری قسمت۔" اس نے ہاتھوں پر سر گرا لیا۔

"تو تم فون پر مونا کو مصنوعی مترنم ہنسی کیوں سنا رہی تھیں؟" وانیہ بمشکل بولی۔

"ویسے ہی میں فون پر ذرا نزاکت سے بولتی ہوں نا! یو نو اسٹائل عفیفہ ایم والا۔ ہائے! میری خراب قسمت۔" عطیہ اور ثانیہ پر ایک بار پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

"بہرحال رومانہ! اب تم جو بھی کہو۔ میں نے ہاں کر دینی ہے۔" امی نے ہنستے ہوئے اعلان کر دیا۔

"یاہو۔" ان تینوں نے نعرہ لگایا۔

"میں اس فوجی کو جان سے مار دوں گی۔" رومانہ چیخی۔

"پاک فوجی کبھی مرتا نہیں۔ وہ شہید ہوتا ہے اور شہید کبھی مرتا نہیں۔" وانیہ نے چڑایا۔

"حکومت! مجھے شادی نہیں کرنی۔ نہ یہاں نہ وہاں۔" رومانہ جھنجلائی۔

"امی کا ہوم ورک پورا ہے۔ ثانیہ نے وہاں کوئٹہ سے امی کو چارج کیا ہے۔ رومانہ تو گئی۔" وانیہ کی ہنسی پھر شروع ہو گئی۔ رومانہ نے نیچے گرا دوپٹہ شانے پر جمایا اور کھڑی ہو گئی۔

"شادی مجھے کرنی ہے۔ امی اور ثانیہ باجی کو نہیں۔ اور یہ تم سب بھی سن لو! مجھے شادی نہیں کرنی اس فوجی سے کوئی محاذ پر جا کر رہے۔ کیوں میرے ہاتھوں ضائع ہو گا۔"

وہ دروازہ اپنے پیچھے زور سے بند کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔ وانیہ نے پہلی بار چونک کر اس کے جملے اور انداز دل ہی دل میں دہرائے۔

☼ ☼ ☼

ابھی اس فوجی کا رشتہ گرما گرم موضوع تھا ہی کہ چھوٹی پھوپھو رومانہ ہی کے لیے اپنے جیٹھ کے سالے کے بیٹے کا رشتہ لے آئیں۔ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا۔ فوجی تھے لے تیرہ بھائی اور سالے کے بیٹے کے لیے پھوپھو زور دے رہی تھیں۔ وہ رشتے دار بھی لگتا تھا۔

"ارے! آگیا میرے اچانک سرخاب کے پر نکل آئے۔ سب کو مانہ ہی مانہ۔" وہ بھنا گئی۔

"وانیہ کی کریں۔"

"اس نے تمہارا نام لیا ہے، زور دے کر۔" پھوپھو نے دادی کو مسکرا کر دیکھا وہ بہت خوش تھیں۔

رومانہ بل کھا کے پیچھے مڑی۔ عنید اور مہران پڑھائی کرتے ہوئے ان کی باتیں بھی دلچسپی سے سن رہے تھے۔ وہ ان کے سر پر کھڑی ہو گئی۔

"کیسے بھائی ہو تم؟ اس ناہنجار نے میرا نام لیا۔ کیا تم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہو گے؟"

عنید تو اچانک پڑنے والی افتاد کو کچھ سمجھا ہی نہیں۔ مہران البتہ جوش میں کھڑا ہو گیا۔

"ہاں۔ ہاں۔ اس نے نام کیسے لیا۔ مم۔ میں۔ میں۔" اس کی میں میں پیچ میں اٹک گئی۔

"آرام سے بیٹھو۔" تائی نے بیٹے کو صوفے پر دھکا دیا۔ "اس کے ڈراموں میں حصہ لینے کی ضرورت نہیں۔ نام نہیں لیتا تو کیا ہم پروجی آتی؟ اچھی بات ہے، عقل تمیز ہے لڑکے میں جو سیدھے بھاؤ سے آ رہا ہے۔"

رومانہ کو چاروں جانب اندھیرا دکھائی دیا۔

وہ یک دم اونچی آواز سے روتے ہوئے اوپر کی سمت بھاگی۔ اب تک اس کی شرم جھجک 'وانیہ کا نمبر ہونا' اچانک رشتہ پسند آ جانا' یہ سب تو تھا مگر اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا۔ امی پھوپھو اور دادی تک چونک گئیں۔ اس نے کمرے میں خود کو بند کر لیا۔ وانیہ اور ثانیہ رات گئے تک دادی کے کمرے میں بیٹھی رہیں کہ وہ مشترکہ کمرا تھا۔ جب صبح رومانہ کا چہرہ دیکھا تو سوجا ہوا، پپوٹے بھاری، ہونٹ پھولے پھولے۔ وانیہ سارا دن عقل کے گھوڑے دوڑاتی رہی مگر بے سود۔ تھکی ماندی لوٹی تو رومانہ ابھی تک بستر میں گھسی ہوئی تھی اور پلکوں پر نمی تھی۔ وہ وقفے وقفے سے روتی رہی تھی۔ وانیہ نے خاموشی برقرار رکھی۔ امی اور دادی بھی بے کل تھیں، کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

"کچھ نہیں کھایا پیا اس نے۔" امی کی آواز پست تھی، مایوس، نا امید، بے چین۔

"اتنا شدید اعتراض، بنا کسی وجہ کے۔ حیران کن ہے۔" وہ آستین چڑھا کر کھانا کھانے بیٹھی۔

"ہاں تو ہی تو۔ پہلے کہتی رہی وانیہ کا حق ہے۔ میں نے کہا کون سا دس بارہ سال کا فرق ہے تم دونوں میں۔ دو سال ہی تو۔"

وانیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بہت دھیمے نوالے چبا رہی تھی۔ ماتھے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

"میں معلوم کرتی ہوں۔ آپ دونوں معاملہ کو ہاتھ میں رکھیں۔" وانیہ نے تسلی دی۔

مگر اگلے چند دن وہ اسکول میں اتنی بری طرح مصروف رہی کہ دھیان نہ رہا۔ رومانہ نے بھوک ہڑتال تب ختم کی جب امی نے اس کے سامنے ثانیہ باجی کو کوئٹہ اور پھوپھو کو فون کر کے صاف انکار کر دیا۔ حیرت انگیز صورت حال تھی۔ اگلے دن سے رومانہ پھر ہنستی مسکراتی گھریلو سرگرمیوں میں حصہ لے رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

زندگی پھر معمول پر آ گئی۔ وانیہ ٹور پر چلی گئی۔ مونا دوبارہ ملنے آئی۔ وہ آج کل امید سے تھی۔ دادی اور تائی نے رومانہ کی ہٹ دھرمی ریحانہ بیگم کی ڈھیل سے جوڑ دی۔

ان ہی دنوں شایان کو ایک فیملی نے پسند کر لیا۔ تائی اپنی زندگی کے ہر فیصلے میں آزاد تھیں۔ وہ ارد گرد کی پروا نہیں کرتی تھیں۔ انہوں نے دھوم دھام سے منگنی کا اعلان کر دیا۔ ریحانہ بیگم دل نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ آتی جاتی رہیں کہ "میرے بچوں کی خوشیوں سے حسد کرتی ہے۔" وہ اس الزام سے بچنا چاہتی تھیں۔ مونا کو منگنی سے ہفتہ بھر پہلے آنا تھا۔ ثانیہ باجی کے بچوں کی چھٹیاں تھیں لوران کا ارادہ چھٹیاں یہاں گزارنے کا تھا مگر منگنی کا سن کر انہوں نے آنا ملتوی کر دیا۔ یہ ان کا خاموش احتجاج تھا۔ گھر میں ہلچل تھی۔ جس روز وانیہ بھاگی دوڑی آئی۔ اس کا رنگ کالا اور ہاتھ پیر لکڑی کے لگ رہے تھے۔ رومانہ نے تین گھنٹے اسے انسان بنانے میں گزارے۔

"تمہاری تیاری ہے، رومانہ؟" وانیہ نے فیشل ــــــ کے دوران پوچھا۔

"میری تیاری ہی تیاری ہے۔" وہ بلا کے اطمینان سے بولی۔ وہ بڑے مگن انداز میں گنگناتے ہوئے اس کا منہ مل رہی تھی۔

اسی وقت تائی جی کے رونے کی آواز آئی۔

شایان کی ہونے والی سسرال نے رشتے سے انکار کہلوا دیا تھا۔ انہیں کسی ہمدرد نے بتایا تھا۔ "لڑکا بے حد روکھا، بدتمیز، چپ چاپ ہے۔ ایک دن میں بمشکل سات جملے بولتا ہے۔ ہنسی تو اس کے لبوں پر بھولے سے بھی نہیں آتی اور یہ اور وہ۔"

شایان کے مزاج کے پیش نظر یہ ظاہر کیا گیا کہ انکار تائی جی نے خود کیا ہے۔ شایان نے کوئی تاثر ظاہر نہ کیا۔

☼ ☼ ☼

بڑی پھوپھو کے اکلوتے بیٹے کی پہلی سالگرہ آئی سب نے بڑی خوشی خوشی تیاری کی۔ رومانہ نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔

"سالگرہ بہانہ ہے۔ میں نہیں جاؤں گی۔ مجھے تو یہ خفیہ سوئمبر لگتا ہے۔"

دادی نے پھر خوب سنائیں ناچار اسے جانا پڑا۔

سالگرہ سے اگلا دن اتوار تھا۔ بڑی پھوپھو اتفاق وغیرہ آئیں۔ ان کی پڑوسن نے اپنے دو بھائیوں کے لیے رومانہ اور ثانیہ کو پسند کیا تھا۔

ریحانہ بیگم سب کے درمیان بڑی مطمئن اور مسرور بیٹھی تھیں۔ پھوپھو بہت زیادہ خوش اور مطمئن تھیں۔ ابا اور تائی جی بھی اس فیملی کو اچھی طرح جانتے

تھے۔ پھوپھا جان کے سامنے کے بڑھے ٹرکے' اچھا کاروبار' یہ ہوا سارا گھر ان ہی کے سارے خدشات جاتے رہے۔ بس ایک جھٹکے سے ساری مشکلیں ہی ختم۔ رومانہ اور ثانیہ پھر اکیلی وانیہ رہ جاتی' عطیہ تو بہت بعد کی کہانی تھی۔ وہ بڑی مطمئن دکھائی دیں۔

"تم تو بہت خوش دکھائی دیتی ہو۔" رومانہ نے بڑے مزے سے تصویریں دیکھتی ثانیہ کو گھورا۔

"تو کیا تمہاری طرح حالت سوگ میں جا مروں؟" وہ ترخ کر بولی۔

"ایک گھر میں دو لڑکیاں دینا اچھا نہیں ہوتا۔" رومانہ نے پینترا بدلا۔

"توہم پرستی ہونہہ!" ثانیہ نے ذرا اثر نہ لیا۔

رومانہ نے یک دم شانے پر دھرا دوپٹہ گولا بنا کر ڈریسنگ ٹیبل پر اچھال دیا۔ بڑی سجاوٹ سے رکھی گئی میک اپ کی اشیا اوندھی ہو گئیں۔ ایک آدھ بوتل زمین بوس ہو گئی۔

"کیا کر رہی ہو؟" ثانیہ سیدھی کھڑی ہو گئی۔

"ٹھیک کر رہی ہوں۔ جا کر کہہ دو! میرا نام کم از کم اس رشتے کے بارے میں نہ لیا جائے ورنہ میں خود کو اس طرح نیچے گرا دوں گی۔"

وہ خطرناک حد تک سنجیدگی سے بولی اور پھر تکیے میں منہ دے کر رونا شروع کر دیا۔ وانیہ کان میں ہینڈز فری لگائے ہوئے بیٹھی تھی۔ سیدھی ہو بیٹھی۔

"تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے رومانہ! کوئی بات ہے تو شیئر کرو۔ یہ کون سا طریقہ ہے؟" وہ اس کے بیڈ پر دو زانو جا بیٹھی۔ ثانیہ حق دق کھڑی تھی" اتنا شدید ری ایکشن بلاوجہ نہیں ہو سکتا ہے' اب بہتری اسی میں ہے کہ اصل بات خود ہی کھل کر کہہ دو۔ اس طرح تو تم اپنے اور ہمارے دونوں کے لیے مسئلہ پیدا کرو گی۔"

رومانہ نے جھٹکے سر کے ساتھ ہی اپنی پلکیں ناک اور منہ رگڑ لیا اور سیدھی ہو گئی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔"

"تو پھر جیسی ہے' وہ بتا دو!" وانیہ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کی اشیا ترتیب سے لگانے لگی۔

"تم موبائل فون پر کسی کے ساتھ انوالو ہو؟" وانیہ نے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں اس کے عکس کو بغور دیکھا۔ رومانہ نے نگاہیں نہ اٹھائیں۔

"جواب دو! ایس ایم ایس کا چکر ہے کیا؟" رومانہ بدستور چپ رہی۔

"تمہاری کسی سہیلی وغیرہ کا بھائی وائی ہے؟" ثانیہ کرسی پر بیٹھ گئی' وہ وانیہ اور رومانہ کے سوال و جواب سے نتیجہ اخذ کرنا چاہتی تھی۔

"بلاوجہ قیاس کے گھوڑے مت دوڑاؤ۔ ایسے ہی وقت کا زیاں۔ میں جا رہی ہوں۔" وہ بالوں کے اوپر ہاتھ پھیرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

ثانیہ اور وانیہ ایک دوسرے کو پرخیال نظروں سے دیکھنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

ہر رات کالی سیاہ چادر پر دھبے کی صورت پیلا گول رنگ نمودار ہو جاتا اور الگ الگ فاصلے سے ایک دوسرے سے شرمائے ادھر ادھر دیکھتے روشنی کے ننھے ننھے دیے کسی دوشیزہ کے تاروں بھرے سیاہ آنچل کی طرح اس کی کھڑکی میں آنکھوں کے عین سامنے رک جاتے۔ مگر وہ یک ٹک ساکت بے یقینی سے جھلمل چاند کو تکتی۔ چاندنی رات ہر شے پر اپنا فسوں پھونک دیتی۔ مگر اسے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ یہی تماشا صبح ہوتا۔ ایک بہت بڑا پیلا گولا مشرق سے نمودار ہو کر سب سمتوں کو روشنی سے نہلا دیتا۔ رات اپنے رازوں سمیت اوجھل اور دن ہر شے کو عیاں کر دیتا مگر وہ شاید بصیرت اور بصارت دونوں کھو چکی تھی۔ اس کی آنکھیں اتنی خالی تھیں' جیسے ویرانے میں تنہا منتظر کھڑے فقیر کا کاسہ' کوئی تو اسے چونکائی نہیں تھی۔ کوئی بات اب رلانے کی طاقت بھی کھو چکی تھی۔

اور... اور یہ لوگ ٹارگٹ کلنگ کیوں کرتے ہیں؟ ان کا ٹارگٹ کیا ہوتا ہے؟ ان کی گولی انسان کو مارتی ہے؟ پتا نہیں۔

کاش مارنے والے کو پتا ہو' وہ کتنی آنکھوں سے

خوابوں کو' محبتوں کو' ارمانوں کو' باتوں کو' وعدوں کو' ہنسی کو اپنی انگلی کی ایک جنبش سے اڑا دیتے ہیں۔

اسے گلا پھاڑ کر روتی اپنی دس دن کی بچی بھی چونکنے پر مجبور نہ کرتی۔ تائی امی کہتیں "رونے دو! بین کرنا اس کا حق ہے کہ اس نے اتنی بڑی چیز کھو دی ہے۔" وہ سوبر کریمی سوٹ جس میں ملبوس تھے اور مونا ملگجا' مڑا تڑا سفید سوٹ پہنے ہوش و حواس سے بے گانہ تھی۔

نیوز چینل پر دو دن تک خبر چلتی رہی۔ "ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہونے والے ڈاکٹر مرتضیٰ سعید کی شادی کو سوا سال ہوا تھا۔ ان کی دو دن کی بچی بھی ہے۔"

پھر خبر بدل گئی۔ اب دوسری خبریں۔

مونا کی زندگی بھی بدل گئی۔ وہ اس سے کتنی محبت کرتا تھا۔ کتنی بے تحاشا اور وہ کتنا مخلص تھا۔ اسے اپنے کام سے کتنا عشق تھا۔ اس نے کام کیا تھا یا پھر اس سے عشق۔ پھر مرتضیٰ سعید نے دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کی بچی کچھ سوچ کر روتی۔ جو سب پر بیتی' وہ نہ سوچ جا سکتی' نہ لکھی' نہ محسوس ہوتی جس ہر بندہ کھو گیا تھا۔

دادی امی' عبید اللہ' ریحانہ بیگم' چھوٹے بڑے سب اور تایا ابو جو نعتیہ مشاعرے اٹینڈ کرتے تھے۔ اب جیسے گونگا کر آرام کرسی پر لگے تھے اور تائی امی۔ ان کی حالت نے اس گھر کے پتھروں تک کو آبدیدہ کر دیا تھا۔ ایک اکلوتی لاڈوں پالی ان کی لخت جگر۔ اس کی بیٹی کی پیدائش پر انہوں نے اس کے دونوں ہاتھوں کے لیے سونے کی چوڑیاں بنوا رکھی تھیں۔ وہ اب خالی ڈنڈے جیسے ہاتھ لیے کرسی پر گھٹنوں لگی رہتی تھی۔ کھلا دیا تو کھا لیا۔ پہنا دیا تو پہن لیا۔ اور اب کیا وہ کبھی نہیں ہنسے گی۔

خواب ٹوٹ جاتے ہیں
بھیڑ میں زمانے کی
ہاتھ چھوٹ جاتے ہیں

اور کاش ایسا ہی ہوتا۔ کبھی نہ کبھی زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ملنے کی آس تو رہتی۔ اس کا سوچا جا سکتا داغ

بولتا۔

☼ ☼ ☼

گھر کے لوگ جبراً صبح سے شام کرتے تھے۔ کھا لیا کہ پیٹ مانگتا' پھر روٹین کے دوسرے کام بھی کرتے کرتے وہ دوبارہ زندگی کے دھارے میں شامل ہوتے گئے۔ ننھی سی آرزو مرتضیٰ' ریحانہ بیگم کی گود کی عادی ہو گئی۔ وہ اپنے پیدا کیے ہوئے سب بچوں سے بھی بڑھ کر پیاری لگتی۔ تائی اور مونا کی مستقل ایک سی کیفیت تھی۔

تائی کبھی بہت اونچا اونچا روتیں۔ اللہ سے شکوے کرتیں۔ کبھی مونا کو تسلی دیتیں۔ اسے زبردستی گود میں بھرنے کی کوشش کرتیں اور کبھی اپنا سینہ کوٹتیں۔

"اس کے ساتھ کی کنواری ہیں اور وہ بیوہ' ایک بچی کی ماں۔ ہائے! میری بچی کا کیا بنے گا۔" وہ چیخ پڑتیں' پل کا درس صبر کا پھل' ساری نصیحتیں بے سود۔ وانیہ کو لگتا' وہ پاگل ہو رہی ہیں اور مونا کو بھی کر دیں گی۔

وہ سب لڑکیاں مل کر مونا کو نارمل زندگی میں لانے کی کوشش کرتیں مگر تائی کے بین...

عبید اللہ کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ ریحانہ آرزو کو بہلا رہی تھیں اور وہ بے چین روتی بچی کو تک رہے تھے۔ بڑے دنوں سے دل کے پاس درد سا اٹھتا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔

پانچ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ بڑی پھوپھو اپنی پڑوسن کا پیغام لیے دوبارہ آ گئیں۔ ابا نے انہیں تسلی دی۔ بعد میں وہ دادی جی کے کمرے میں بیٹھے تھے۔

"میرا خیال ہے اماں! منگنی وغیرہ سب فضول ہے۔ چھ ماہ بعد کی تاریخ دے دیں۔ بس زبان ہی کافی ہے۔ اتنا عرصہ تیاری کے لیے بھی کافی ہو گا۔" دادی نے اثبات میں سر ہلایا۔

تائی جی کے کانوں میں پڑ گئی۔ وہ آندھی طوفان کی طرح اندر آئیں۔

"میری بچی اجڑ کر آ گئی اور یہاں خوشیاں' شادیاں

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

اور خواب ہیں۔ ہائے! کسی کو کسی کے غم کا کیا۔ شاہانہ بچاؤ۔ ہائے امیری کوکھ کو آگ لگ گئی۔"

وہ سینہ کوٹنے لگیں۔ پیچھے عدنان تھا' بے حد براساں' الجھا الجھا سا۔ موناہی اس کے ساتھ تھی۔

"امی! کیا ہوگیا ہے آپ کو؟" وہ انہیں سنبھالنے بڑھی۔ "کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔" وہ تاسف سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"کیا کھانا پینا چھوٹ گیا؟ زندگی کے سارے کام کر رہے ہیں تو یہ بھی تو ایک کام ہے اور اب مزید کتنا وقت بچو خوشیاں نکل گئیں' جانے دیں۔ ہم دوسرے طریقے سے ہنس لیتے ہیں۔" وہ بے حد طویل بولی۔

"یہاں بن اجڑ کر آگئی اور انہیں اپنی شہنائیاں سوجھ رہی ہیں۔" رومانہ اور ثانیہ چور بنی کھڑی تھیں۔ رومانہ اضطراب سے انگلیاں موڑ رہی تھی۔

"ارے ظالم!" وہ عدنان کو کاٹ کھانے کو دوڑیں۔ "کبھی نہیں ہوگا وہ جو تو کہتا ہے۔ کبھی نہیں۔ ارے! میری ناک کے نیچے سے اونٹ نکالے گا۔"

عدنان کا صبر انتہا پر تھا' صحیح موقع کے انتظار میں اب وقت ہاتھ سے نکلنے کو تھا اور وہ عمران بھائی کی طرح امی کی باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔ اس نے پہلے مونا کو اعتماد میں لیا اور بعد میں دونوں تائی کے پاس گئے۔ مونا بہت ہی خوش تھی۔ اس نے ابھی بات ہی چھیڑی تھی کہ تائی کا غصہ آسمان پر پہنچ گیا۔ عدنان کو وہ وہ سنائیں کہ بس۔ ادھر امی تو رشتے طے ہونے کی بات کان میں پڑی۔

"میری بچی۔ ہائے میری مونا!"

وہ پھر سر ادھر ادھر مارنے لگیں۔ عدنان نے جبڑے بھینچے' مگر پھر ایک دم میز کو ٹھوکر مار کے نکل گیا۔ تائی لڑھک گئیں۔

"ہائے! میری مونا کا کیا ہوگا۔"

"امی! ثانیہ کی کردیں۔ میرا نام نہ لیجیے گا۔" رومانہ نے الماری میں گھسی امی کو سنایا۔ وہ چونک کر سیدھی ہوئیں۔

"کیوں۔ کیا مطلب ہے اس بات کا؟ رومانہ مجھے پریشان نہ کر۔ میرے اندر ہمت نہیں ہے۔" وہ نڈھال ہو کر بیٹھ گئیں۔

"سوری امی! میں کر نہیں پا رہی بس۔"

"ارے! تو جس سے کرتی ہے' اس کا نام پھوٹ دے۔" امی کی آواز بلند ہوگئی۔

"نہیں! کوئی نہیں۔" وہ الٹے قدموں دروازے سے نکل گئی۔ امی سر پکڑ کے بیٹھ گئیں۔ عبید اللہ نے غسل خانے سے نکل کر انہیں دیکھا۔

"کیا ہوگیا؟ ایسے کیوں بیٹھی ہو؟"

"تو پھر اور کیسے بیٹھوں؟ یہ گھر ہے یا آتش گیر مادہ؟ ہر بندہ جلانے پر تلا ہے۔ وہ آپ کی لاڈلی رومانہ پھر منع کر گئی ہے۔ میں اب اور نخرے نہیں سنوں گی۔ غضب خدا کا' اتنی اتنی عمریں۔ پہلے وہ وانیہ استانی صاحبہ نے وقت ضائع کیا اور اب یہ رومانہ کوئی وجہ تو ہو۔ آپ سمجھالیں میں جبراً نکاح پڑھوا دوں گی۔ حد ہوگئی۔" وہ بے حد پریشان تھیں۔

"ادھر عدنان نے نہ جانے کون سی فرمائش جڑ دی ہے۔ آپ کی بھابھی صاحبہ کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہیں۔ سارے گھر میں ایک کونہ نہیں' جہاں سکھ کا ایک پل ملے۔ گھر کی لڑکیاں گھر میں کھپ جاتیں' مگر بھابھی صاحبہ نے تو قسم کھا رکھی ہے۔"

"اوں ہوں۔ ایسی بات نہیں کرو' جہاں قسمت جہاں نصیب۔"

انہوں نے ریحانہ بیگم کو ٹوک دیا حالانکہ یہ ان کے بھی دل کے نہاں خانوں میں چھپی خواہش تھی۔ بہت پیارے لاڈلے بھتیجے اگر داماد بن جاتے' اشتعال ابھرا تو وہ ملکے ہاتھ سے سینہ مسلنے لگے۔

"جاؤ! وانیہ کو بلاؤ ذرا۔" ریحانہ بیگم خفا خفا سی باہر نکلیں۔

ابا نے پہلے وانیہ سے تفصیلاً بات کی۔

"میں کچھ جانتی تو نہیں۔ میں نے سراغ لگانا چاہا تھا' مگر بیچ میں سب الجھ گیا۔" وانیہ مدھم لہجے میں گویا ہوئی۔ "مگر کوئی بات ہے ضرور۔" وہ پر یقین تھی۔

"تمہیں اتنا یقین کیوں ہے؟"

"سیدھی سی بات ہے ابا! وہ کوئی کم عمر کم فہم بچی تو ہے نہیں جسے مسائل معلوم نہ ہوں' بڑھتی عمریں' ایک کے بعد دوسری کا نمبر' مگر جواز ایسی احمقانہ بات کیسے کی جاسکتی ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔ ابا اس کے انداز پر مسکرا اٹھے۔

"جاؤ! اسے بلاؤ' فاضل کھیلتے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

ابا ٹہلتے ٹہلتے پچھواڑے آگئے۔ مونا بچی کو گود میں لیے اس کے دھلے کپڑے تار سے اتار رہی تھی۔ بچی کے منہ میں فیڈر تھی۔ ابا غیر ارادی طور پر اسے رک کر دیکھنے لگے۔ بے حد دبلی پتلی' زردی مائل' گردن پر گھنے بالوں کا جوڑا دھرا تھا۔ اسے اپنا گدگدا سا لپٹا کتنا برا لگتا تھا۔ دسترخوان پر سارا سال اس کے ڈائننگ پر ہونے کا اعلان ہوتا تھا۔

"کھانا دیکھ کر راہی نہیں جاتا۔" اکثر بے بسی سے کہتی اور اب اسے باقاعدہ منت کر کے بلکہ نوالے منہ میں دیے جاتے تھے۔

بچی کے منہ سے فیڈر گر چکی تھی۔ اس نے رونا شروع کردیا۔ مونا نہ جانے سوچوں کی کس اتھاہ گہرائی میں تھی۔ اسے جیسے آواز تک نہ پہنچی۔ بچی نے مزید طاقت لگا کر گلا پھاڑا۔

"آں۔ مونا جانے کہاں سے لوٹی۔ "کیا ہوا۔ ارے کیوں رو رہی ہو؟ میری پیاری بیٹی!" اس نے بچی کو کاندھے سے لگایا اور پتا نہیں اس ننھی سی جان کو کیا دکھ' تکلیف تھی۔ روتی تو روتی چلی جاتی۔ کسی صورت نہ بہلتی' مونا نے شانہ بدلا' پھر ہاتھوں میں جھلایا' گدگدایا' گال چومے' مگر بچی زور زور سے گلا پھاڑتی رہی' مونا نے بے بسی سے بچی کا چہرہ سامنے کر کے اسے الجھ کر دیکھا۔

"کیا بات ہے آرزو! تم چپ کیوں نہیں کرتیں؟ بیٹا! میں تمہیں کیسے بہلاؤں؟ تم اتنی ضد کب چھوڑو گی؟ میں تو کبھی ضدی نہیں تھی اور نہ تمہارے پاپا۔ تم کس پر گئی ہو' ہیں۔ ہے نا۔" وہ اپنا لہجہ خوشگوار اور نرم بنا کر بولی۔ انداز یوں تھا جیسے وہ سب سمجھ رہی ہو اور جواب بھی دے گی۔ بچی پر بھلا خاک اثر ہونا تھا۔ اس نے اپنے جسم کی ساری طاقت جیسے رونے پر لگادی۔

"بس کرو!" مونا نے اسے جھنجوڑا۔ "تم صبر کیوں نہیں سیکھ لیتی ہو۔" اس نے جھٹکے سے بچی کو چارپائی پر چھوڑ دیا۔ ڈیڑھ فٹ تک کی اونچائی۔ بچی لمحہ بھر کو چپ ہوئی' پھر جیسے تڑپی' مگر وہ خیز دل کو چیر دینے والی آواز اس کے گلے سے برآمد ہوئی' وہ دھرتی ہلانے والی تھی۔ مونا کو بھی اتنی دیر میں اندازہ ہوا' وہ کیا کر بیٹھی ہے۔ وہ بچی کے اوپر جھک گئی۔ لپٹ گئی۔ اسے بے تحاشا چوم رہی تھی۔ سینے سے لگا رہی تھی۔ اس نے اسے خود میں بھینچ لیا۔

"آرزو۔ آرزو۔ میں تمہیں اکیلے چپ نہیں کرواسکتی۔ میں نہیں بہلا سکتی۔ تم اتنی ضدی ہوگئیں تو میں کیا کروں گی۔ ایسے نہیں کرنا۔ تمہاری ماں میں اتنی ہمت کب ہے۔" اس کی بلند سرگوشی زندہ تھی۔ عبید اللہ کے سینے میں زور کا درد اٹھا۔ وہ دیوار کا سہارا لیے دھیمے دھیمے واپس پلٹ گئے۔

☆ ☆ ☆

مونا کی بے بسی میں گھلی آواز وہ بظاہر بے حد سادہ' مگر دل کاٹ دینے والے دو جملے۔

"میں تمہیں اکیلے چپ نہیں کرواسکتی۔" "میں تمہیں اکیلے چپ نہیں کرواسکتی۔" ساری رات ان کے کان میں سیسہ بن کر پگھلتے رہے۔ وہ ثانیہ سے پانچ ماہ بڑی تھی اور انہوں نے دونوں کو اکٹھے گودوں کھلایا تھا۔ کبھی کسی قسم کا فرق کیا ہی نہیں۔ ان کے لیے وہ اپنی بچیوں جیسی ہی تھی۔ وہ کیسے سنبھالے گی اسے اکیلے وہ کیا کیا کچھ سوچتی رہتی ہے؟ اور وہ صحیح کہہ رہی تھی۔ اسے کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔ بچی کو سنبھالنے والا کون ہوگا۔ سب بے بسی سے بیٹھے تھے۔ بھابھی جی نے ابھی تک اس کی بیوگی کو تسلیم نہیں کیا تھا کہ حکم خداوندی ہے۔ وہ بس جاہلوں کی طرح بین ڈالتی رہتی

تھیں۔

⁂ ⁂ ⁂

نہ جانے اماں کے کمرے میں کون سی اہم مشاورت چل رہی تھی۔ بڑی پھوپھو' چھوٹی پھوپھو' دادی' تایا جی' تائی امی' مونا' عمران بھائی اور عدنان اندر تھے۔

جو بات تائی امی اور عدنان کے بیچ چل رہی تھی' وہ اب دادی امی کے کمرے میں سب کے بیچ کھل پڑی تھی۔ دادی امی اور دونوں پھپھو کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ تائی ہنوز اڑی ہوئی تھیں۔ تایا چپ چاپ تھے۔ وہ سب کی سنتے رہے۔ عدنان کا بے حد پھولا منہ اور خفا آنکھیں۔ پچھاڑ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔

"بھائی جی! اب آپ بھی تو کچھ کہیں۔" چھوٹی پھپھو تنگ آگئیں۔ تایا جی نے چونک کر سر اٹھایا۔

"میں کیا کہوں؟" وہ مدھم لہجے میں پوچھنے لگے۔

"تو کیا تو اتنی دیر سے کانوں میں روئی ڈال کر بیٹھا ہے؟" دادی نے ان کے لتے لیے۔

"بلکہ آپ کو تو بہت پہلے ہی کچھ نہ کچھ کہہ دینا چاہیے تھا۔" بڑی پھپھو بھی خفا انداز میں بولیں۔ وہ تائی جی کی اکلوتی بھابھی تھیں اور اب ایک بیٹے کو جنم دینے کے بعد انہوں نے رونا چھوڑ دیا تھا۔

"پھر میں کچھ کہوں گا نہیں۔ فیصلہ سناؤں گا۔" وہ ایک دم قطعیت سے شروع ہوئے۔ تائی امی نے پریشانی سے پہلو بدلا۔ عدنان نے آنکھوں آنکھوں میں اپنے دل کی بات دہرائی' مونا مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ عدنان سے لگ کر بیٹھی تھی۔ اٹھ کر اپنے ابا کے شانے سے جڑ گئی۔ انداز ہمت دلاتا ہوا تھا۔

"بات یہ ہے رفعت بیگم!" وہ بیوی سے مخاطب ہوئے "تم کس زعم میں مبتلا ہو؟ پانچ بیٹے پیدا کر کے تم نے سوچا کہ تم اللہ کی چہیتی بہت خاص ہو' جس نے تمہیں اولاد نرینہ سے نوازا۔ اور باقی دنیا کم تر اور اللہ کی ناپسندیدہ ہے کہ وہ انہیں بیٹیوں پر بیٹیاں دیتا جاتا ہے۔ تم جانتی ہو بیٹیاں رحمت ہیں اور رحمت کے بارے میں اللہ کبھی سوال نہیں کرے گا کہ وہ اس کا اپنا فیصلہ ہے جس کو چاہے نوازے۔ ہم بیٹیاں مانگتے نہیں وہ ہمارے لیے اللہ کی پسند بن کر آتی ہیں۔ بیٹا ہم مانگتے ہیں۔ رو رو کر گڑ گڑا کر۔ وہ نعمت بن کر آتے ہیں اور نعمتوں کی جواب دہی کرنی پڑے گی۔ ایک بچی کی پرورش پر جنت کی بشارت اور آقا دو جہاں کی انگلی برابر فاصلے کا ساتھ ہے۔ دس بیٹے پالنے پر بھی کوئی انعام نہیں اور ہمیں بیٹے اس لیے تو نہیں دیے گئے تھے کہ ہم اور تم۔ گردن اکڑائے فرعونی پرشان سے گھومیں۔ یہ تو ذمے داری اور آزمائش ہوتے ہیں۔" تایا جی بہت دھیما مگر بلا تکان بول رہے تھے۔ "خدا کا نظام ہے۔ اس نے کسی کے لیے بیٹیاں پسند کیں۔ کسی کے لیے بیٹے ہم سب بیٹیوں کے نصیب سے مستقبل سے ڈرتے ہیں۔ تم نے کبھی غور کیا ان کے آنے سے پہلے ان کا نصیب ان کا مستقبل دنیا میں آچکا ہے۔ مونا کے دنیا میں آنے سے چھ سال پہلے مرتضیٰ آیا۔ مونا بعد میں تحفہ بن کر آتی۔ پہلے میرے بیٹے آئے پھر بھائی کے گھر بیٹیاں۔ یہ تو بہت سیدھا تقسیم کا اصول ہے۔ تم نے عمران کے لیے نزہت پسند کی۔ بالکل درست کیا وہ تمہاری بھانجی ہے اور تمہاری بہن کا تم پر حق تھا کہ خود پر اتاری گئی نعمت کو اس سے بانٹ لو۔ اب میں اپنی نعمت کو اپنے بھائی سے بانٹنا چاہتا ہوں تو جزائی کس بات کی؟ روز جزا اللہ مجھ سے سوال کرے گا کہ جس چیز کو تیرا بھائی جگہ جگہ ڈھونڈ رہا تھا' وہ تیرے پاس تھی پھر بھی تو نے اس کو نہ دی۔ تجھے گھمنڈ کس چیز کا تھا؟ خدا نے ہمیں پانچ بیٹے دیے۔ یہ ہمارے لیے کب تھے۔ یہ خدا نے ہمارے پاس ان لوگوں کی امانت رکھوائے ہیں جو انہیں اب دعاؤں میں مانگتے ہیں۔ اللہ نے دنیا میں ایسی کوئی چیز نہیں بنائی' جو انسان ہمیشہ اپنے پاس رکھے۔ ہر چیز وقت آنے پر اصل مالک کے حوالے۔۔۔"

وہ ایک دم چپ کر گئے آواز میں نمی ابھر آئی تھی۔ بڑی پھپھو نے بارہ سال ایک محرومی کے سہارے گزارے تھے۔ وہ ویسے ہی بہت رقیق القلب تھیں۔ وہ بھی آنسو پونچھنے لگیں۔

"آپ تو بہت اچھا بولے بھائی جی!" پھپھو نے ان کا عندیہ پا لیا تھا۔ عدنان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"تایا جی!" مونا ابا سے لپٹ گئی۔ وہ بھی اس کا سر کھلانے لگے۔

"تو بچپن سے گھنا ہے۔ سب خبر ہوتی ہے پر منہ سے نہیں بولتا۔" دادی نے اپنے انداز میں سراہا۔

"مونا ہائے میری مونا۔" تائی جی کو پھر یاد آگیا۔ مونا نے زخمی نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔

"اب بس کریں امی! میں نارمل زندگی کی طرف آنے کی کوشش کرتی ہوں۔ آپ کی ہائے ہائے پھر پیچھے دھکیل دیتی ہے۔" مونا صاف گوئی سے بولی۔

"اللہ ہمت دے۔" دادی نے مونا کے بال سنوارے اور پیشانی پر بوسہ دیا۔ تائی پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

"دیکھو! اگر تمہارے پاس کوئی دلیل ہے یا تمہیں کوئی بہت اہم وجہ نظر آتی ہے ثانیہ کو بہو نہ بنانے کی تو وجہ ہمیں بتاؤ ورنہ چپ رہو۔ جب تمہارا اپنا بیٹا تم سے ناراض ہو تو تم کس طرح خوش رہو گی؟" تایا جی نے سمجھانا چاہا۔

"مونا' میری مونا۔" تائی کی ایک ہی گردان تھی جب عبید اللہ' ریحانہ بیگم اور معید کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے۔

"اماں! میں آپ سے بہت ضروری بات کرنے آیا ہوں۔" عبید اللہ اماں کے نزدیک کرسی پہ بیٹھ گئے۔ ریحانہ بیگم کے چہرے پر ناگواری اور خجالت سی تھی۔ وہ مضطرب پہلو بدلتے لگیں۔ سب نے ان کی کیفیت نوٹ کی۔

"مونا' ثانیہ کی ہم عمر ہے اور اس سے بڑی ابھی دو موجود بھی ہیں۔ سال بھر کے وقفے میں اس نے خوشیاں' غم سب جھیل لیے۔ ابھی یا سال بعد یا چار سال بعد ہمیں اس کے لیے نئے راستے کو چننا ہی ہو گا۔"

مونا بے حد الجھ کر چچا کی صورت تکنے لگی۔ وہ بہت لمبی تمہید اور خاموشی کے بعد گویا ہوئے (یہ کون سی کہانی کس وقت شروع ہو رہی تھی) چچی کا چہرہ ایک دم سوچوں سے بھر جاتا۔۔۔ پھر لمحہ بھر کو بے تاثر ہو جاتا۔ مونا نے جاننا چاہا تو وہاں اجنبی ناگوار سا تاثر تھا۔

"عصمت آپا (مرتضیٰ کی امی) خود بوڑھی خاتون ہیں' پھر ان کی اپنی بیٹیاں کل کو گھر بار کی ہو جائیں گی۔ وہ آرزو کو لاکھ پیار کرتی ہوں مگر اسے پال نہیں پائیں گی اور وہ اتنی چھوٹی ہے کہ ماں کے بغیر کہیں رہ نہیں پائے گی۔" مونا کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اس نے ابھی تک ابا جی کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ تائی کے آنسو البتہ تھوڑی تک بہہ آئے تھے۔ عبید اللہ کیا کہنا چاہتے تھے کوئی سمجھ نہ پایا۔

"میں چاہتا ہوں بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں۔" انہوں نے گردن موڑ کر ریحانہ بیگم کو دیکھا۔ وہ ان کی تائید سب کے سامنے چاہتے تھے۔ ریحانہ بیگم نے طویل سانس بھری پھر اپنا ہاتھ شوہر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ معید بہت سنجیدہ اور پر سکون لگ رہا تھا۔

"جو غم مونا پر پڑا ہے۔ اس سے نکلنا بہت مشکل ہے اور بہت وقت لگے گا مگر بہرحال ایک دن آئے گا جو آپ سب اور خود یہ بھی اپنے لیے کسی راہ کا انتخاب کرنا چاہے گی۔ اور ایسا ہی ہوتا ہے۔ زندگی میں کبھی جمود نہیں ہوتا۔ آگے بڑھنا ہی پڑتا ہے۔ بھائی صاحب! آپ کے لیے اور بھابھی جی! آپ اور بیٹے مونا تم۔۔۔ جب بھی اپنے بارے میں نیا فیصلہ کرنے لگو تو ذہن میں رکھنا۔ میں تمہارا چچا عبید اللہ' یہ تمہاری چچی ریحانہ بیگم اور یہ تمہارا کزن معید عبید اللہ تمہیں اپنے گھر میں ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہیں گے۔"

مونا کی آنکھیں جیسے خوف سے پھٹ پڑیں۔ کیا چچا نے وہی کہا جو اس کی سمجھ میں آیا۔ وہ جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔

"کک۔ کیا مطلب چچا ابو۔۔۔؟" اس نے معید کا چہرہ دیکھا۔ وہ بہت مطمئن بیٹھا تھا۔ نظریں ملنے پر بہت سادگی سے مسکرایا۔

"یہ۔ یہ مجھ سے چھوٹا ہے' میرا بھائی جیسا۔" وہ ہکلانے لگی۔

"بھائی جیسا ہے بھائی نہیں ہے۔" عبید اللہ نے ٹوک دیا۔ "اور چھوٹا بڑا ہونا فضول بات ہے۔" کمرے میں بیٹھا ہر نفس جیسے سانس لینا بھول گیا تھا۔ سب آنکھیں کھولے نیم وا ہونٹوں کے ساتھ گومگو کی کیفیت میں تھے۔

مونا نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے کمرے سے بھاگ نکلی۔ رمانہ بیگم مضطرب سی کھڑی ہو گئیں۔

آنسوؤں کی نمی کے پیچھے دھندلی آنکھوں سے رفعت بیگم کو اندازہ ہوا اس کا صرف قد لمبا نہیں تھا۔ اس کا دل بھی بہت بڑا تھا اور وہ خود چھوٹے قد کی عورت تھیں۔ کوئی بات نہیں خدا کی مرضی مگر اپنا دل بڑا تو وہ بھی کر سکتی تھیں۔ مونا مانتی نہ مانتی معید سے اس کا رشتہ جڑا یا نہیں اصل بات تو کہنا ہوتا ہے۔ کسی کے لیے اتنا اچھا سوچنا کسی سے اتنی بے غرض محبت کرنا اور کیا اپنی اولاد سے بڑھ کر بھی کسی دوسرے کے بچے سے محبت کی جا سکتی ہے کہ اس کے دکھ کا ذکر کرتے آنکھیں بھیگ جائیں۔ لہجے میں ملال گھل جائے اور کسی دوسرے کے بچے کے لیے آپ راتوں کو پریشان ہو کر سوچیں۔ کیا دنیا میں ایسا ہوتا ہے؟ وہ ٹھوڑی پر ہاتھ جمائے سوچ رہی تھیں اور پتا نہیں یہ اتنے بہت سارے آنسو کہاں سے دامن بھگونے آگئے تھے۔

☆ ☆ ☆

یہ تین دن کسی عذاب کی صورت گھر کے ہر فرد پر اترے تھے۔ پریشانی "آنے والے وقت کا خوف۔

"ہائے اگر ابا کو کچھ ہو گیا۔" ثانیہ اور تبریز کوئٹہ سے آگئے۔ ہسپتال کی سفید چادر پر مشینوں میں جکڑے ابا کو دیکھ کر ثانیہ کو غش پڑنے لگے۔ عمران بھائی بڑی مشکل سے چھٹی لے کر رات ہی پہنچے۔ شایان عدنان عمران کاشان اور مہران دونوں پھوپھا جان معید اور عنید ہسپتال کے باہر جیسے نگرانی پر تھے۔ کوئی ہلنے کو تیار نہیں۔ ادھر گھر میں قرآن خوانی صدقہ دعائیں۔

بیٹا بچپن کا نہیں عبور کر چکا تھا مگر گھر لوٹنے پر دادی ان کا سفید ریشم کا کنور سا چہرہ گود میں لیے بیٹھی رہیں۔ سو سو بار جھک کر عبید اللہ کا ماتھا چوم لیتیں۔

"کس چیز کا غم کھا گیا تھے؟" ہمن کا ہلکا سا سوجا ہاتھ دادی کے ہاتھ میں تھا جسے وہ وقتاً فوقتاً بوسہ دیتیں۔

"کوئی نہیں اماں!" ہمن کی آواز بھی بہت نحیف ہو چکی تھی۔ مونا رشتے کی بات پر ان سے بری طرح خفا تھی مگر جب سے وہ آئے تھے ہنستے آنسوؤں کے ساتھ زیر لب کچھ پڑھ پڑھ کر پھونکتی انہیں دیکھے جا رہی تھی۔

"وہ بہانہ تھا ابا! آپ کو نواسا نواسی یاد آرہے تھے۔ ہے نا؟" وانیہ نے لہجہ میں بشاشت پیدا کی۔ ثانیہ کی گوگو اور بیٹا ٹیپو نانا سے لپٹے پڑے تھے۔ ابا کھل کر مسکرا دیے۔

"وانیہ میرے دل کی ہر بات جان لیتی ہے۔"

"ہماری کیمسٹری ہے ابا!" وانیہ نے شانے اکڑائے۔

"خیر رکھے مالک۔ سب اکٹھے ہو گئے ہیں۔ گھر میں چھوٹی سی رسم رکھ لو عدنان اور ثانیہ کے لیے۔" دادی نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا سوچا۔ "تھوڑا جشن کا موقع ہے۔ بڑے دن ہوئے بس جیسے صرف سانس چلتی ہے۔" دادی نے وزدیدہ نگاہوں سے مونا کو دیکھا۔ لہجہ ملال سے پر تھا۔ ثانیہ بندوق کی گولی کی طرح کمرے سے نکل گئی۔ مونا اور رومانہ بھی پیچھے لپکیں۔

☆ ☆ ☆

مونا نے اپنی امی سے بہت سارے پیسے مانگے۔

"ثانیہ اور عدنان کے لیے شاپنگ کرنی ہے۔" اس کا لہجہ کھنکتا ہوا تھا۔ آنکھیں بھی ہنس رہی تھیں۔ تائی امی نے جیسے معجزہ دیکھا۔ اتنی خوش اتنی مطمئن پہلے والی مونا۔ آنکھیں بند کر کے نوٹ تھما دیے۔ مونا نے ثانیہ باجی کو ساتھ لیا اور بازار پہنچ گئی۔ سارا دن خواری کاٹ کر ڈھیروں تھیلوں کے

امراہ لوٹی تو دونوں کچرا چھننے والی لگ رہی تھیں۔ پیر باقاعدہ سوج رہے تھے۔ اس نے پہلے سارا سامان ماں اور دادی کو دکھایا پھر سب اپنے کمرے میں غائب کر لیا۔

"منگنی والے دن دیکھنے کو ملے گا۔" اس نے سب کو ہری جھنڈی دکھا دی۔ "ویسے میرے بھائی کی پسند کا ہے یہ کھلتا مسکراتا رنگ۔"

"تمہارے بھائی کی پسند کا اندازہ ہے ہمیں۔ مجھے چھوڑ کر اس نے اسے پسند کیا۔" وانیہ نے مصنوعی ناراضی دکھائی۔ ثانیہ سر جھکائے مسکراتی رہی۔

"میرے بھائی کو تم ہرا نہیں سکتی پارٹنر شپ پر بیشتر گیمز میں حصہ نہیں لیتا۔" مونا نے بدلحاظی سے کہا۔

"اس نے انڈور گیم اتنی مشکل سے جیتا۔" وانیہ نے طعنہ دیا۔

"مشکل آسان چھوڑو جیت تو لیا نا۔" مونا ہنسی۔

"ہونہہ!" وانیہ نے منہ بنایا۔

"توبہ ہے کوئی باہر کا بندہ دیکھے تو یہی سوچے نہ جانے کتنی بڑی دشمن ہیں یہ ایک دوسرے کی۔" ثانیہ ٹیپو کو تھپک رہی تھی تاسف سے بولی۔

"اور وہ تمہارا بھائی گھنا میسنا ہے۔ کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔" ثانیہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد حیرت کا اظہار کرتی رہی۔

"گھنا میسنا نہیں دانشور عقل مند موقع شناس وقت پر چھکا کرنے والا۔" مونا رطب اللسان تھی۔ ثانیہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ پھر مونا اور وانیہ کی بھی ہنسی نکل گئی۔ رومانہ سر تک چادر تانے لیٹی تھی۔ لیکن وہ سو نہیں رہی تھی۔ اسے مکمل خاموشی میں نیند آتی تھی۔

"تو پھر وہ سونے کی ایکٹنگ کیوں کر رہی تھی؟" وانیہ کے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ اتنی خوشی کا موقع سارا گھر شادیانے بجا رہا تھا۔ ہر بندہ مطمئن تھا۔ کہیں... کہیں رومانہ عدنان کو تو پسند نہیں کرتی؟" یہ خیال برچھی بن کر اس کے دل میں گڑ گیا۔ اس نے بمشکل ضبط کیا۔ کمرا بھرا ہوا تھا ورنہ وہ

ابھی چادر گھسیٹ کر اس سے باز پرس کرتی۔ اس نے ثانیہ کا جھلملاتا چہرہ دیکھا جس کے کان میں تھی مونا نہ جانے کون سی سرگوشیاں کر رہی تھی کہ اس کے چہرے کے رنگ چاند کی روشنی کو شرما رہے تھے۔ وانیہ کی ہتھیلیوں سے پسینہ پھوٹ نکلا۔

☆ ☆ ☆

اگلا دن رسم کا تھا۔ وانیہ نے لاکھ موقع نکالنا چاہا مگر بے سود۔ پہلے رومانہ امی کے ساتھ بازار چلی گئی۔ وہ آئیں تو ثانیہ عطیہ اور وانیہ کو اپنے ساتھ گھسیٹ لے گئی۔ رومانہ کو ڈسٹ الرجی تھی۔ وہ بازار کی خاک چھاننے کے بعد سارے گھر میں چھینکیں مارتی پائی گئی۔ سرخ ناک برستی آنکھیں وانیہ نے سر پیٹ لیا۔ یہاں تک کہ اسے اس سے بھی بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔

"یا اللہ!" وانیہ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھانے بیٹھی تھی۔ وہ سوچوں کے سمندر میں غرق تھی۔ سامنے رکھے چاول ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ سارا گھر تھکا ماندہ اپنے اپنے بستروں میں غائب تھا۔ فقط وانیہ کچن سمیٹ کر اپنی سوچوں میں غرق رات ایک بجے کھانا لے کر بیٹھی تھی۔

"رومانہ اور عدنان۔" وانیہ نے ذہن پر زور دے کر کسی ایک ایسے لمحے کو یاد کرنا چاہا جو ان کا بھید دے پاتا۔ "اوں ہوں۔" اس نے سینے پر ہاتھ لپیٹ کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ "نائی گاڈ!"

"اس رات دادی کے کمرے میں تائی اور تایا جی نے بعد احترام اور منت بھرے محبت آمیز انداز میں ثانیہ کا ہاتھ عدنان کے لیے مانگا اور امی ابا کے جواب سے پہلے دادی نے اقرار کر لیا۔ ٹھیک ابا مونا کا ہاتھ مانگنے کے بعد اپنے کمرے گئے بس۔ رات کھانے کے بعد رومانہ کی چھٹی ابا کے کمرے میں ہوئی۔" وانیہ نے کڑیاں جوڑنی شروع کیں۔ "رومانہ نے ابا کے سامنے یقیناً عدنان کا نام لیا ہو گا یا ابا کو پتا لگ گیا ہو گا۔ ایک طرف بات طے ہو جاتا پھر عدنان کی ثانیہ میں دلچسپی

www.paksociety.com

کسی سے ڈھکی چھپی نہ رہی تھی۔ اس رات کی صبح ہی تو ابا کو ہارٹ پرابلم کے باعث اسپتال لے گئے تھے۔ او میرے خدا!!

قیاس آرائی ختم ہوگئی۔ وانیہ نے سر ہاتھوں پر گرالیا۔

☆ ☆ ☆

سارے گھر میں بے حد رونق تھی' ہر بندہ خوش تھا۔ ثانیہ نے جب اپنا بے حد خوب صورت ہلکا ہرا اور گہرا نیلا انار کلی فراک دیکھا۔ ساتھ تائی نے سونے کا سیٹ دیا تھا۔ ثانیہ اتنی خوش اور حسین لگ رہی تھی کہ جیسے پری۔ اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔

"پلیز وانیہ! مونا! اگر یلو فنکشن کو گولی مارو۔ زہرہ' الماس اور عالیہ کو فون کرو۔ میری منگنی ہورہی ہے۔ فوراً" آجائیں' انہوں نے مجھے ایسا کب دیکھا ہے بھلا؟"

اس نے فوراً" فرمائش کردی۔ عطیہ نے نمبر ملادیا۔

"فوراً" آجاؤ' بس آدھا گھنٹہ ہے' میری منگنی ہورہی ہے' ہاں! مونا کا بھائی ہے عدنان۔ نہیں اداس والا نہیں تم نے کبھی دیکھا ہوگا۔"

رومانہ نے نگاہیں اٹھا کر ثانیہ کا کھلتا چہرہ دیکھا۔ اور وانیہ تو ویسے بھی اس کی نگاہوں کے تعاقب میں تھی۔

"نہیں آنانہ تو' میں اس وقت نادیہ حسین اور ایرج منکور سے بڑھ کر لگ رہی ہوں۔ ہاں! تم تصویریں ہی دیکھنا۔ تمہاری قسمت کہاں کہ تم حسین لوگوں کو روبرو دیکھو' خواہ نادیہ' ایرج ہو یا ثانیہ عبیداللہ' جل ککڑو!"

اس نے کھٹ فون بند کیا۔

"کتنا مت ہنسو! میک اپ خراب ہوگا۔ لائنیں آجائیں گی۔" رومانہ نے چوٹی میں پھول گوندھتے ہوئے تنبیہہ کی۔ وانیہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔

آج سب کی تیاری آخری حدوں تک تھی کہ جیسے دوبارہ موقع نہیں ملے گا۔ وانیہ بھی بقول دادی "لڑکیانہ حلیے میں بہت جچ رہی تھی۔ اس نے سیاہ

شرفانی شرٹ اور سلک کا بے حد کھلے پائنچے کا ٹراوزر پہن رکھا تھا۔ یہی انداز عطیہ کا بھی تھا۔ مگر رنگ جامنی تھا۔ ثانیہ ساڑھی میں تھی' مونا کو سوٹ بڑی پھوپھو نے دلوایا تھا۔ بکا اور گہرا ہرا اور لمبا کی ہمن تھی۔ اس نے سادہ بال باندھ کر ماتھے پر بندیا لگا رکھی تھی۔ یہی سادگی سب سے بڑی قیامت ڈھارہی تھی۔ وہ گئی رومانہ' وہ آتشی گلابی ٹخنوں تک لمبی قمیص' جس پر گولڈن اور سیاہ تل کلی تھی' پاجامہ سیاہ تھا اور بمشکل دکھائی دیتا تھا۔ ہم رنگ دوپٹہ' وہ بھی ماتھے پر بندیا لگائے بکھرے میک اپ میں بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ اس نے شاید خود پر خول چڑھالیا تھا' اب بڑھ چڑھ کر بس بول رہی تھی۔

وانیہ کے دل میں ملال اتر گیا' مگر وہ کچھ سکون بھی محسوس کررہی تھی۔ ثانیہ کی سہیلیاں بھی آگئی تھیں۔ رونق ہی رونق' ہنسی ہی ہنسی۔

وانیہ دادی کو بلانے گئی تو دروازے پر ہی ٹھٹک گئی۔ نیم وا جھری سے سر لگایا تو اندر کا منظر حیران کرگیا۔ رومانہ انگلیاں موڑتے ہوئے مجرم کی طرح بلاوں بیچ کھڑی تھی۔ دادی اور تایا تخت پر منہ کھولے بیٹھے تھے' جبکہ چھوٹی پھوپھو تاسف سے رومانہ کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ اس کا چہرہ ضبط سے سرخ ہورہا تھا۔

"ہائے اللہ! یہاں کیا ہورہا ہے' کہیں ان سب کو پتا نہ لگ جائے کہ رومانہ عدنان کو۔ مجھے ان کو روکنا چاہیے۔" وانیہ جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر گئی۔

"آپ سب لوگ یہاں ہیں' وہاں رسم شروع کرنی ہے' مہمان آگئے۔"

"چپ کرو!" تایا جی نے انگلی اٹھا کر وانیہ کو روکا' وہ مچل کر رہ گئی۔

"وہ تایا جی!" اس نے دوبارہ کوشش کی۔ "وہ رومانہ۔ وہ ثانیہ کا میک اپ۔"

"بھاڑ میں گیا میک اپ۔" تایا دھاڑے۔

"چپ کرکے بیٹھ جاؤ تم۔"

وانیہ دبک گئی۔ اس کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔

"تم نے کسی اور کو بتایا؟" رومانہ چپ رہی۔

"خدا کے لیے رومانہ! اب کچھ نہ بولنا۔" وانیہ نے ہاتھوں پر سر گرالیا۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے رومانہ!"

"جج۔ جی۔" رومانہ کی آنکھیں بہنے لگیں۔

"ابا کو' امی کو۔ دونوں کو۔"

"کب بتایا؟"

"وہ۔ وہ اس رات۔ وہ جس کی اگلی صبح ان کی طبیعت خراب ہوئی۔"

"ان دونوں نے کیا کہا؟" تایا جی کی آواز مضطرب ہوگئی۔

"خدا کے واسطے رومانہ ضبط کرلے" "تین زندگیاں' دو خاندان سب بکھر جائے گا۔" وانیہ کی آنکھوں میں ہنستی کھلکھلاتی ثانیہ کا روپ پھر گیا۔ اسے لگا جیسے حلق میں کانٹے اگ آئے ہوں۔

"پہلے ابا جی نے وعدہ کیا کہ وہ میری فرمائش اگر جائز ہوئی تو ضرور پوری کریں گے۔ اگر ان کے معیار پر پوری اتری تو کوئی حرج نہیں۔ وہ خود کوشش کریں گے۔ قدم اٹھائیں گے۔ میں نے کہا ابا جائز ہے' معیار کے مطابق ہے' دو بولے' بتاؤ۔"

رومانہ نے دھواں دھار رونا شروع کردیا۔

"آگے بولو۔" تایا جی کا دل بہت برا ہوا' بیٹی وہ بھی اتنی بڑی اور جس طرح بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر ہچکیوں' آہوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ تایا جی کو اپنے سرخ چہرے کی گرمی سارے وجود میں بھرتی محسوس ہوئی۔ ادھر وانیہ کو اپنا دل اپنے کانوں میں ہتھوڑے کی دھمک کی طرح دھڑکتا سنائی دے رہا تھا۔

"جب۔ جب میں نے نام لیا تو امی نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور ابا جی بالکل چپ ہوگئے۔ پھر کہنے لگے' بیٹا معیار کا بھی ہے' جائز ہے' بہت اچھا ہے' اس سے اچھا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر بیٹے میں اپنے منہ سے کہہ نہیں سکتا' کبھی نہیں' ہاں! میں تمہارے لیے دعا ضرور کروں گا' خدا تمہیں زندگی کی ساری خوشیاں دے' تم میری پیاری بیٹی ہو' خدا تمہیں خوش رکھے۔ وہ آپ کے بڑے بھائی ہیں ابا! آپ ان سے مانگ سکتے ہیں۔

میں بہت دنائی کہ مانگ سکتی ہوں' کوئی مضائقہ نہیں' مگر مانگ سکوں گا نہیں۔ پھر ابا بے بسی سے بولے' اپنے کمرے میں جاؤ۔ اگلی صبح ان کی طبیعت خراب ہوگئی۔" رومانہ زارو قطار رونے لگی۔

"امی کہتی ہیں' میری وجہ سے بابا ان حالوں کو پہنچے۔"

"ہائے میری بچی!" دادی نے بمشکل تیزی دکھاتے ہوئے اسے گود میں بھرلیا۔ بالوں پر بوسہ دیا' سر پر دوپٹہ جمایا' وہ بھی سسکیاں بھرتی گود میں چھپ گئی۔ وانیہ حق دق چاروں کے چہرے تک رہی تھی۔

پھوپھو کی آنکھوں میں بھی ملال' نمی اور رومانہ کے لیے پیار تھا۔ دلاسہ دے رہی تھیں۔

تایا نے چشمہ اتار کر نمی صاف کی۔ ان کو لگ رہا تھا دل پھٹ جائے گا۔ اپنا چھوٹا بڑا ہر مسئلہ' ہر بات بڑے بھائی کو بتانے والا بھائی کس جگہ پر ہار گیا تھا۔ انہیں بھائی پر بے ساختہ ٹوٹ کر پیار آیا۔ ان سے کچھ کہہ نہ سکا۔ دل کو پکڑے اسپتال چلا گیا۔ ان کا دل چاہا کہ جاکر بھائی کو گلے لگالیں۔ چھوٹا بھائی اتنا بڑا دل اور ایک جگہ اتنا کم ہمت۔

اور میں خود کتنا بڑا احمق ہوں۔ وہ خود شناسی پر اترے۔ کبھی آنکھیں کھول کر دیکھا ہی نہیں۔

"چلو اب یہ رونا بند کرو۔ اور یہ تمہارا منہ لال نیلا بلکہ سیاہ ہوگیا ہے۔" مسکارا اور آئی لائنر رومانہ گالوں پر بہہ نکلا تھا۔ وہ بھوت لگ رہی تھی۔

"جاکر منہ صاف کرو اور اچھے سے کپڑے پہنو۔" انہوں نے رومانہ کو لاڈ بھرا حکم دیا۔

"یہ۔ یہ اچھے تو پہنے ہیں۔" وانیہ کی پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"ہاں! اچھے ہیں' مگر وہ جو منگنی پر پہنتے ہیں' چوڑی دار یا غرارے وغیرہ۔ جیسا ثانیہ نے پہن رکھا ہے۔" تایا جی نے بمشکل سمجھایا۔ پھوپھو اور دادی ہنس پڑیں۔

"تو۔ تو۔ ثانیہ کا کیا ہوگا؟" وانیہ کھڑی ہوگئی۔ اسے سہارے کے لیے کچھ دکھائی نہ دیا۔

"اس کا کیا کرنا ہے؟" تایا جی نے الٹا اس سے پوچھا۔ پھوپھو، وانیہ کی الجھن اور بوکھلاہٹ سمجھ گئیں۔

"ثانیہ کی منگنی عدنان سے اور رومانہ کی شایان سے ہو گی۔"

"ہائیں!" وانیہ کے سر پر چھت آگری۔

"یعنی!" اس نے رومانہ کا چہرہ دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ رومانہ نے بسور کر وانیہ کو دیکھا اور ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆ ☆ ☆

جب تین بے تحاشا خوش اور ایک حیران بندے کو دادی نے انگوٹھیاں پہنائیں تو مونا نے حیرت سے اپنی بے حد پُرسکون ماں کو دیکھا۔ ان کا مسکراتا چہرہ اسے مسلسل حیرت بھری الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔

"آپ کیا اس لیے اتنی خوش ہیں کہ چاچو جی نے آپ کی بیوہ بیٹی کا ہاتھ اپنے کنوارے نوجوان بیٹے کے لیے مانگ لیا؟ آپ اس لیے ان رشتوں پر راضی ہوئی ہیں؟"

تائی جی نے چونک کر بیٹی کو دیکھا۔ اس کا مسکراتا چہرہ سامنے بیٹھے لوگوں پر تھا۔ سوال کا تاثر چہرے پر دور دور تک نہ تھا۔ مگر گہرا طنز، گہرائش بھرا طعنہ۔

"نہیں!" تائی جی کا چہرہ بھی سپاٹ رہا۔ وہ فیصلہ تمہارے چاچو نے تمہیں کرنا ہے، موجب کرو، جیسا کرو، میری کیا مداخلت، میں نے تو بس یہ سیکھا ہے کہ دل کو بڑا کیسے کرتے ہیں، دل کو بڑا کرنے سے کتنا سکھ ملتا ہے، میں آہستہ آہستہ اسے محسوس کر رہی ہوں۔" مونا نے چونک کر ماں کا چہرہ دیکھا۔ دونوں کے تاثرات سے عاری چہرے یک دم بولنے لگے۔ تائی کی آنکھوں میں نمی کی چمک تھی۔ انہوں نے مونا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بوسہ دیا۔

"امی!" مونا بے یقینی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"میرا چھوٹا دل یقین ہی نہیں کرتا تھا کہ تم بیوہ ہو چکی ہو۔ اور یہ بے یقینی ایک پل سکون نہیں دیتی تھی۔

دل کو بڑا کر کے دیکھا تو خیال آیا۔ اس میں بھی کوئی مصلحت ہو گی۔ تمہارے ابا کہہ رہے تھے حضرت ام سلمہ جب اپنے پہلے شوہر سے بیوہ ہوئی تھیں تو کس طرح نہ روئی ہوں گی، تڑپ تڑپ، چل چل، بے قرار ہو کر۔ انہیں کیا خبر تھی۔ اللہ نے ان کے لیے کیا رکھا ہے۔ اللہ نے تمہارے لیے بھی کہیں نہ کہیں بہت اچھا لکھ رکھا ہو گا۔ تمہارے ابا کہتے ہیں ہم ماں ہو، ہم سے زیادہ پیار اور فکر اس گھر میں شاید کوئی نہ کرتا ہو۔ مگر ایک اور ہے۔ جو ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ تمہارا فیصلہ وہ خود کرے گا۔ میں خدا کی مصلحتوں پر یقین کرنا سیکھ رہی ہوں۔ تم بھی اپنا فیصلہ اللہ پر چھوڑ دو۔"

نمی پلکوں پر آ گئی تھی۔ تائی جی نے چہرے پر بشاشت پیدا کی اور آنسو کو انگلی سے جھٹک دیا۔ مونا نے پہلی بار سیاہ سوٹ پر رنگین دوپٹہ گلے میں ڈالے مہران، عند، کاشان کے ہمراہ بھنگڑا ڈالتے سعد کو دیکھا۔

☆ ☆ ☆

منگنی کی تقریب بہت خوبی سے مکمل ہو گئی تھی۔ اب یہ سب اپنے مشترکہ کمرے میں الٹے سیدھے حالوں میں پڑی تھیں۔ رومانہ آئینے میں خود کو گھوم گھوم دیکھ رہی تھی کہ تیار ہونے کے بعد دیکھنے کا موقع ہی نہ ملا تھا، سب لے بھاگے، لکھیپ نیچے لے گئے تھے۔ ثانیہ اسی حلیے میں بیڈ پر نیم دراز تھی۔ مونا بھی کو تھپک رہی تھی، چھوٹی پھوپھو وانیہ کے دل کا حال سب کو تتارہی تھیں۔

"اب آپ لوگ ہنس رہے ہیں۔ میری تو جان پر بنی تھی۔ اس کا تم صم ہو جانا، چھپ چھپ کر آنکھیں صاف کرنا۔ میں نے سوچا یہ عدنان ہی میں انٹرسٹڈ ہے۔ مجھے لگتا تھا گھر میں سونامی آنے والا ہے۔ سب تباہ و برباد۔" وانیہ نے جھرجھری لی۔

"تم مجھے سمجھ ہی نہ سکیں وانیہ!" رومانہ نے آئینے سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ "اگر ایسا ہوتا تو میرے

منہ سے آواز بھی نہ نکلتی۔ ساری زندگی یہ بات میرے دل میں غائب ہو جاتی کہ میں عدنان کو پسند کرتی تھی۔ پھر اگر عدنان کی ثانیہ سے شادی ہو جاتی تو میں جلد از جلد گھر بسا لیتی اور کہیں دور غائب ہو جاتی۔" رومانہ زور دے کر بولی۔

"رونا اس بات کا تھا کہ ابا نے صاف منع کر دیا اور مجھے لگا کہ اب وہ مجھے کبھی نہیں مل سکے گا۔ ابا نے امی سے یہ بھی کہا، ثانیہ باجی والے کوئٹہ والے رشتے کو ہاں کہلوا دو، تاکہ یہ جلد از جلد یہاں سے رخصت ہو۔ آگ ماچس کا کھیل نہیں کھیلتا۔"

"پھر تم نے منزل کیسے پالی؟" ثانیہ کی دلچسپی انتہا پر تھی۔

"اسپتال میں پھوپھو نے امی ابا کی باتیں سن لیں۔ پھوپھو نے دادی کو اور دادی امی نے تایا ابو کو کہہ سنائیں، بلکہ بہت زیادہ سنا ڈالی تھیں۔ اب یہاں مونا بیٹھی ہے، لگیا کہوں۔" رومانہ نے ہونٹ دبا کر کہا۔

"جورو کا غلام، عقل کا اندھا، اور۔۔۔ اور۔۔۔" وہ رک گئی۔

"نالائق اور کم ہمت بھی کہا تھا۔ بہو کیا میکے سے جہیز لائی تھی۔ چھوٹا بھائی بھرم کھونا نہیں چاہتا۔ ساری زندگی بیٹیوں کی ہر جائز، ناجائز پوری کرنے والا ایک بالکل جائز بات پر بھی مان گیا۔ وہ تیری اولاد کے لیے اتنا درد رکھتا ہے، تجھے خبر کیوں نہیں ہوئی؟" پھوپھو نے ہنستے ہوئے رومانہ کے رکنے پر بات مکمل کر دی۔

"مگر تھپڑ بھی رسید کیا تھا۔" رومانہ نے بصد اہتمام بتایا۔ سب کی ہنسی چھت پھاڑ تھی۔

"تم سب نے مل کر میرے باپ کو ایموشنلی بلیک میل کیا۔" مونا نے ہنسی روکتے ہوئے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"بلیک میل نہیں غیرت دلائی تھی۔" پھوپھو بولیں۔

وانیہ نے برا سا منہ بنایا، وہ ٹرے میں بریانی بھر کے کھا رہی تھی۔

"تم کیوں منہ بنا رہی ہو وانیہ؟" مونا نے غور کیا۔

"جلی سڑی بیٹھی ہو، بلکہ دو دن سے کٹ کھانے کو دوڑ رہی ہو۔" سب متوجہ ہو گئے۔

"کہیں تم بھی تو میرے کسی بھائی میں انٹرسٹڈ نہیں تھیں؟" وہ شرارت سے بولی۔

"تمہارے بھائی، ہونہہ!" وانیہ نے جوتے کا خالی ڈبہ اس کی سمت پھینکا۔ رومانہ نے بچاؤ کے لیے اس کے اوپر کمبل ڈال دیا۔ پھوپھو اور ثانیہ دل کھول کر ہنستی رہیں۔

"بھئی اس میں مار دھاڑ کی کیا بات ہے، یہاں بھی تو ہو رہا ہے۔" مونا کمبل سے منہ نکال کر بولی۔

"میری ماں بے چاری سارے شہر میں لڑکیاں تلاش کرنے جاتی رہی اور یہ گھنی میسنی ساتھ جاتی تھی تیار ہو کر۔"

"وہ تو اس لیے کہ انگوں کو معلوم ہو اتنی خوب صورت لڑکی کے ہوتے ہوئے یہ عورت گھر سے باہر کیوں نکل رہی ہے، مگر سلام ہے تمہاری امی حضور کو، ایک جگہ بولا 'ایک ہی گھر میں پلے بڑھے ہیں، ایک دوسرے کو بہن بھائی کے علاوہ کچھ سمجھنے کو تیار نہیں۔ ساتھ میں میرے سر پر ہاتھ پھیرا، ورنہ مجھے ان سے بہتر کون۔" اس نے ہو بہو نقل اتاری۔

"تمہیں زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں۔" وانیہ انگلیاں چاٹ کر مونا سے بولی۔ "تمہارے بھائی میں کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے ہیں۔ میری بہن ہی اندھی ہے۔" اس نے دانت کچکچا کر رومانہ کو دیکھا۔

"تمہیں کوئی اور نہ ملا؟ امی کہتی ہیں وہ آخری بار چار ماہ کی عمر میں مسکرایا تھا۔ پتھر سے سر پھوڑنا اسی کو کہتے ہیں۔"

سب کی ہنسی کنٹرول سے باہر ہو گئی۔

"پہلے ہی مزاج نہیں ملتے، اب اور آسمان پر۔ کہ جی ایک لڑکی مجھے انتہ۔۔۔ آ۔۔۔ آ۔۔۔ چاہتی ہے۔ ہاہاہا۔"

"کون، ہوں؟" پھوپھو نے وانیہ کو جملہ مکمل کرنے سے پہلے ٹوک دیا۔ "امی جی اور بڑے بھائی نے صاف کہہ دیا ہے، یہ بات جن چار لوگوں کے علم میں ہے،

پانچوں بندہ شامل نہ ہو۔ چھوٹے بھائی جان اور بھابھی بھی حیران پریشان تھیں۔ امی نے فیصلہ سنایا ہے' بڑے بھائی جی نے رومانہ کو کہہ دیا ہے کہ تمہارے ابا ضرور باز پرس کریں گے۔ اپنا منہ بند رکھنا اور شایان کو زندگی بھر یہ نہ لگے کہ رشتہ کیسے ہوا' رومانہ نظروں سے گر جائے گی۔ عنیزہ سید نے ایک جگہ لکھا تھا' ہر مرد کی ذات میں ایک اور ذات بھی ہوتی ہے، جو کہ بدذات ہوتی ہے۔ "شایان کو رومانہ کا احسان مند ہونا چاہیے کہ اسے کہیں سے رشتہ مل نہیں رہا تھا' اس روکھے مزاج کے باعث۔ یہ تو دادی کا احسان ہے کہ انہیں رومانہ کو منانا پڑا۔"

مونا تائیدا" سر ہلا رہی تھی۔ لفظ منانا پر دانت پیس کر گھور کے رومانہ کو دیکھا۔

"میں اسے سکھاؤں گی کیسے مسکراتے ہیں۔" رومانہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر دوپٹا اتار رہی تھی۔

"سو سویٹ! اکتارو رومانٹک اسٹائل ہے۔ میں سکھا دوں گی نا ہائے۔"

ثانیہ اٹھ بیٹھی جیسے جھوم گئی۔

"ہونہہ۔ سکھاؤں گی۔" وانیہ نے دانت پیسے۔ "ہر گدھا چھلانگ لگانے سے پہلے خود کو ہرن سمجھتا ہے۔"

"گدھا۔ ہرن۔" پھوپھو اور مونا کھل کر ہنس دیں۔

"ویسے ساری باتیں ایک طرف۔" مونا نے سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ کر رومانہ سے سوال کیا۔ "تمہیں میرے بھائی میں نظر کیا آیا؟ میں تو بہن ہوں' پھر بھی بات کرتے ڈرتی ہوں کہ کیا جواب ملے تو تم نے کیسے۔؟"

"ہاں' ہاں! جواب دو۔" وانیہ نے آگے بڑھ کر ہیر برش کو مائیک بنایا۔

"یہ تمہاری منہ گنگ۔ ساری زندگی سینے پر مونگ دلے گی۔" مونا ہنس دی۔

"نہیں بنے گی۔ جب یہ میری بھابھی بنے گی تو میں اسے سیدھا کر دوں گی۔" رومانہ نے تسلی کروائی۔

مونا کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

"یہ بات دوبارہ نہیں۔" اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی۔

"دیکھو وقت آنے پر کر لیں گے۔" رومانہ نے مکھی اڑائی۔ مونا اٹھ کر بچی کو احتیاط سے کاٹ میں ڈالنے لگی۔ یک بیک گہری خاموشی چھا گئی۔

☼ ☼ ☼

منگنی کے چھ ماہ بعد کی تاریخ طے کی گئی تھیں۔ عید کا ساتواں دن۔ دو' دو شادیاں گھر کے چار افراد کنارے لگ گئے تھے۔ جینے پر دھری سل سرک گئی تھی۔ مگر تائی کو مونا اور امی کو وانیہ کی فکر تھی۔ دادی امی نے گھر کو تقسیم کر دیا تھا۔ اس طرف لڑکوں کا آنا منع تھا۔ اس طرف لڑکیوں کا۔ خود وہ درمیان والے کمرے میں تخت پر پائی جاتیں۔ ثانیہ دادی کی ہمنوا تھی۔ وہ بڑے مزے سے اس لکا چھپی کو دیکھتی۔ غصہ عدنان کو تھا اس نے بڑی مہارت سے اتنے سال کسی کی نگاہوں میں آئے بنا ثانیہ کو تاڑا تھا۔ ہتھیلیوں پر مکا برسا تا پایا گیا۔ رومانہ کے لیے سب ٹھیک تھا۔ وہ پتلے کی طرح کانوں سے ہینڈز فری لگائے اپنے کمرے کی کھڑکی سے بائیک کی سیوا کرتے شایان کو تکا کرتی۔ اسے اب صرف علیہ کا لحاظ تھا اس کے سامنے اکڑ رہتی' باقی علی الاعلان۔ اتنے سال سب کی نظروں میں آئے بنا یہ کام کیا۔ اب سب کے سامنے کرتی۔ مزے دار بات یہ تھی کہ بظاہر بڑی طرح بائیک میں غرق شایان کو خود پر پڑتیں نگاہیں فوراً معلوم ہو جاتیں۔

وانیہ نے حلفاً بتایا۔

"ہائے! میں نے شایان کو مسکراتے دیکھا ہے۔"

"نہیں' نہیں۔" ثانیہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

ان سب کی ہنسی نکل گئی۔ پھر اس نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر جھانکا۔

شایان نے غیر محسوس انداز میں ذرا سا اوپر دیکھا' پھر کام میں منہمک۔

"تمہارے بھائی پر بہت محنت کرنی پڑے گی۔"

رومانہ نے تاسف سے اطلاع دی۔

"وہ شریف ہے۔" مونا بولی۔

"ہاں! پاکستان کا چوتھا شریف' ہاہا۔"

"بس کھی کھی کو بند کرو' کوئی کام دھندا ہے کہ نہیں؟" امی بولتے ہوئے اندر داخل ہو گئیں۔

"کہاں ہے وانیہ؟" وانیہ نے چادر منہ تک تان لی۔

"یہی سو رہی ہے۔" چادر سے توزا نکلی۔

"اٹھو۔ فوراً۔ سونے والی۔" امی نے چادر جھپٹ لی۔

"مجھے جواب دو! یہ تین تصویریں ہیں' نوچولن جمیلہ دے گئی ہے۔"

"واؤ! لڑکوں کی تصویریں۔" وانیہ نے جھپٹ لیں۔

"یہ کرتے کیا ہیں؟" وانیہ نے پوچھا۔

"ایک ڈاکٹر ہے' ایک ملٹی نیشنل میں اچھی پوسٹ پر ہے۔ اور یہ تیسرا فیض نگر والی دودھ فیکٹری کا مالک ہے۔"

"واؤ! گھر کی بچتیں۔ ہاہاہا۔" وانیہ نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

"وانیہ! مجھے تنگ نہ کر۔" امی عاجز آ گئیں۔ "فیصلہ کر فوراً۔"

"ان سب لوگوں کو میرے بارے میں پتا ہے نا؟" وانیہ نے سنجیدگی کا لبادہ اوڑھا۔

"نہیں۔ ابھی نہ۔ اور نہ مجھے بتانا ہے۔ ڈرائنگ روم کی از سر نو سیٹنگ کروا رہی ہوں۔ اور جس میں تمہارے کاٹھ کباڑ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے' تمہاری دادی کے جہیز کی پیٹی میں بند کر رہی ہوں۔"

وانیہ نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جیسے خود کو سنبھالنا چاہا' مگر صدمہ شدید تھا' وہ تیورا کے بیڈ پر ڈھے گئی۔

"ہائے! میری بہن ہوش کرو۔" رومانہ سب سے بڑی ہمدرد بنی دوپٹہ جھلنے لگی۔ مونا نے تلوے رگڑ دیے۔

ثانیہ نے نادیدہ آنسو رگڑے۔ امی نے دانت پیس کر ان کی ڈرامے بازی برداشت کی۔

"اور یہ بھی سن لو' تمہارے ابا کہہ رہے ہیں' یہ نوکری وغیرہ کا تماشا اب ختم کرو' شادی کر کے گھر بساؤ۔"

"آپ خود بھی سن لیں اور ابا کو بھی بتا دیں اور ابا کی اماں کو بھی۔ میں دو ہزار بارہ کے نیشنل گیمز سے پہلے شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ یہ ایونٹ لاہور میں ہو گا اور مجھے خود بھی حصہ لینا ہے اور میرے بچوں کو بھی۔"

وہ قطعیت سے کہتی باہر نکل گئی۔ امی دھم سے بیڈ پر بیٹھیں۔ رومانہ اور ثانیہ نے آنکھوں میں اشارہ کیا۔

"شکر کریں' بس نے یہ نہیں کہا' وہ نیشنل گیمز جیتے بغیر شادی ہی نہیں کرے گی۔"

"ہاں چچی! شکر کریں۔" مونا بڑی ہمدردی ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "اس نے یہ نہیں کہا' جب تک کشمیر آزاد نہ ہو گا میں شادی نہ کروں گی۔"

"ہاں۔ ہاں۔" رومانہ نے تائید کی۔

"ہٹو پرے!" امی نے مانہ' ثانیہ کو دھکیلا۔ "اور تم بھی۔" مونا کا ہاتھ جھٹکا۔ "یہاں سکون دے کون رہا ہے' سب کی اپنی من مانیاں ہیں۔ سب اپنی کرنے والے اور تم۔" انہوں نے مونا کو کڑے تیوروں سے گھورا۔ مونا نے ہونٹ سکوڑے۔ "میں نے کیا کیا ہے چچی امی؟"

"جب تمہارے چچا کہہ رہے ہیں کہ رومانہ' ثانیہ کے ساتھ تمہارا ابھی نکاح ہو گا تو۔ تم کس لیے تنگ کرتی ہو؟"

مونا جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ "میرا یہاں کیا ذکر۔"

"تو پھر کس کا ذکر۔ بیٹا! کل بھی تو کرنا ہے' تو کل کرے سو آج۔ آج کرے سو ابھی۔ جب فیصلہ کر لیا تو۔"

"میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ "ابھی تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ مرتضیٰ چلے گئے۔"

www.Paksociety.com

امی نے اسے ٹوک دیا۔ "مرتضیٰ جا چکا ہے' تمہارے گمان و یقین سے بہت پرے۔"

"چچی امی! آپ کے کوئی ارمان نہیں ہے۔۔۔؟ آپ کی بہو ایسی ہو ویسی ہو معید ماشاء اللہ ڈاکٹر بن رہا ہے اسے ایک سے بڑھ کر ایک ملیں گی' میں بیوہ' ایک بچی کی ماں۔۔۔ عمر میں بڑی' آپ لوگ مجھ سے ہمدردی کے چکر میں اس پر ظلم کیوں کر رہے ہیں؟" وہ تلخی سے بولی۔

"کاہے کی ہمدردی؟ ہم نے کوئی ایدھی سینٹر کھول رکھا ہے کیا؟"

"تو آپ کیا دل سے راضی ہیں؟" مونا کو چچا کی محبت پر ذرا شک نہ تھا' مگر چچی کا اس صبح رنگ بدلتا چہرہ اسے یاد تھا۔

"ہاں بالکل۔۔۔" وہ یقین سے بولیں۔ "مجھے تمہارے چچا کے اس طرح اچانک فیصلے پر اعتراض تھا کہ انہوں نے مجھے فیصلہ سنایا۔ یہ کہہ کر کہ میرا اعتراض کوئی معنی نہیں رکھتا' وہ سوچ چکے ہیں۔ مجھے دکھ ہوا کہ اگر وہ مجھ سے بات کرتے' وہ دکھ اور تکلیف جو وہ تمہارے اور آرزو کے لیے محسوس کرتے تھے' مجھ سے بانٹتے تو شاید میں ان سے پہلے معید کا نام لے لیتی۔ مگر ان کا وہ ٹوک لہجہ۔ میں نے سوچا کہ اتنے سال بعد بھی وہ مجھے اندر سے نہیں جان پائے۔"

ریحانہ بیگم نے اس کا نرم گلابی ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بھر لیا۔

"میرا دل نہیں مانتا چچی امی! مجھے لگتا ہے میں معید کے قابل نہیں۔ اس پر مسلط کی جا رہی ہوں۔ اسے بہت اچھی اچھی مل جائیں گی۔" مونا کی آواز بھرا گئی۔

"تو تم میں کون سی برائی ہے؟" رومانہ جھٹ بولی۔ "سب کے سامنے تو ہے' تم لوگ دیکھنا نہ چاہو تو اور بات ہے۔" وہ تروٹھے پن سے بولی۔

"چچی آپ کہیں یہ تو نہیں سوچتیں کہ اگر میرا رشتہ لبنیٰ نہ لیا تو میری امی ان دونوں کے رشتے خراب کر دیں گی؟" اس نے بڑے دنوں سے چبھتا سوال کر دیا۔

"تم پاگل ہو' خالی ذہن شیطان کا گھر۔" امی نے اس کے سر پر چپت لگائی۔

"مجھے وقت چاہیے چچی۔ بہت سارا سوچنے کے لیے۔" "میں جب بھی سوچنے بیٹھتی ہوں ذہن و دل میں تاریکی چھا جاتی ہے۔ مجھے لگتا ہے معید سب کے احترام میں اس فیصلے پر راضی ہوا ہے۔ اگر بات اس کے اپنے اختیار میں دی جائے تو شاید وہ کبھی میرا نام نہ لے' مجھے لگتا ہے وہ چچا کو ٹال نہیں سکا۔ وہ شاید رومانہ' ثانیہ کی وجہ سے مجبور ہو گیا ہو۔"

"تو تم چاہتی ہو' وہ اپنے منہ سے کہے؟" ریحانہ بیگم تصویریں سمیٹ کر کھڑی ہو گئیں۔

"ہاں۔۔۔ آں۔۔۔ نہیں۔۔۔ نن نہیں۔" وہ چونک گئی۔ "مجھے بہت ڈر لگتا ہے' خوشیاں میرے لیے ہیں بھی کہ نہیں' شاید نہیں' اگر ہوتیں تو مرتضیٰ ہی کیوں جاتے؟" اس کی آواز گھٹ گئی۔

"بے وقوف!" رومانہ نے اس کا سر سینے سے لگا لیا۔ ثانیہ پشت سہلانے لگی۔ ریحانہ بیگم سر پکڑ کر دل گرفتہ انداز میں اسے دیکھ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

گھر کے سارے افراد نے اپنے اپنے طریقے سے مونا کو قائل کرنے کی کوشش کی' مگر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا' اس نے صاف انکار بھی نہیں کیا اور وہ مانی بھی نہیں۔

"آپ بھول جائیں کہ مونا آپ کی بیٹی ہے' اور اس کے بارے میں فیصلہ بھی میں کروں گا۔" عبیداللہ نے حتمی انداز میں ایک بار کہا تھا' مگر مونا۔ وہ نہ مانی کسی صورت۔

"نہ منگنی' نہ نکاح' نہ کوئی اور بات۔" اس نے سب کی ترجمان بن کر آئی وانیہ کو قطعیت سے کہا۔ "جب میں فیصلہ کر لوں گی تو بس نکاح' رخصتی' سب ایک ساتھ' میں کوئی نو عمر لڑکی تو ہوں نہیں کہ انگوٹھی پہن کر اتراؤں' شرماؤں۔۔۔ اور دوسرے میں تمہارے بھائی کو وقت دینا چاہتی ہوں۔ وہ خوب اچھی طرح سوچ سمجھ لے۔ دنیا کو اور آگے بڑھ کر دیکھ لے کہ بعد میں پچھتاوا نہ ہو۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی لینے کے بعد بھی اگر وہ مجھ تک پلٹا تو پھر بات ہو گی۔"

وانیہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

"چھوڑیں ابا! وہ بے وقوفی کر رہی ہے۔ بلائیں مولوی' پڑھائیں نکاح' رخصتی جبرا' کروائیں گے۔" وانیہ کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔

ابا مسکرا اٹھے۔

"تو یہ گٹ پٹ ہر جگہ نہیں چلتی۔ وہ کوئی نو عمر تا سمجھ بچی ہوتی تو میں ڈانٹ ڈپٹ کر اپنی سی کر گزرتا' اور بیٹا! ہمارے مذہب میں کنواری کی خاموشی کا مطلب اقرار ہے' جبکہ بیوہ' مطلقہ کے لیے اور حکم ہے کہ جب تک زبان سے صاف لفظوں میں اجازت نہ دے' اجازت نہ سمجھی جائے گی۔"

سب خاموش ہو گئے۔ ان کی بات میں وزن تھا۔

☆ ☆ ☆

آج رومانہ اور شایان' عدنان اور ثانیہ کی تقریب ولیمہ تھی۔ رنگ' روشنی' ہنسی' طمانیت' سکون یوں بھی ولیمہ کی تقریب منتظمین کو سکون کرنے کا باعث ہوتی ہے کہ اتنے بہت سارے دنوں کی بھاگ دوڑ۔ یہ کام وہ کام شور شرابہ۔ یہ کیسے اور وہ کیسے کے بعد سب کے چہروں پر سکون چھایا ہوا تھا' گولڈن شرارے پر فیروزی دوپٹہ پہنے رومانہ' جبکہ گہرے براؤن شرارے پر سوکھی مہندی کلر کا دوپٹہ۔۔۔ پہنے ثانیہ بے حد پیاری لگ رہی تھیں۔ بات بے بات ہنستی رومانہ اور جوابا" مسلسل مسکراتا شایان اور بڑے تفاخر سے بیٹھا عدنان۔۔۔ ثانیہ البتہ شرم سے دوہری تھی۔ عدنان رات سے اب تک اس کے کانوں میں اپنی بے تابیاں انڈیل رہا تھا کہ کب کب اس کا دل دھڑکا اور کب کب دھڑکنا بھی بھول گیا۔ ثانیہ دم بخود تھی۔

"جس بندے نے رٹے جملوں کے علاوہ کبھی کچھ نہ کہا' وہ اندر سے۔۔۔"

"صاف کھو گھنا میسنا۔۔۔" ثانیہ نے

ماہنامہ کرن

اپریل 2012 کے شمارے کی ایک جھلک

- اداکارہ "ندا رضا اصفہانی" سے شاہین رشید کی ملاقات
- اداکار "سلیم معراج" کہتے ہیں
- "آواز کی دنیا سے" آج ہے "اسماء توحید" کیا تھیں
- "قارئین کی عدالت" میں اداکارہ "اصفی خان" قارئین کے روبرو
- "مجھ سے ملیے" کرن کی مصنفین سے ملاقات کا سلسلہ
- "دردِ دل" نبیلہ عزیز کا سلسلے وار ناول
- "دست کوزہ گر" فوزیہ یاسمین کا سلسلے وار ناول
- "آدھی ادا" نایاب جیلانی کے طویل ناول کی آخری قسط
- "مقصدِ حیات" فصیحہ آصف کا طویل مکمل ناول
- "منزل ہے خدا" سباس گل کے طویل ناول کی آخری قسط
- "کہ کچھ رات کٹے" سلمیٰ آل رسٹ کا مکمل ناول
- "وہی تو ہے" عفتی افتخار کا مکمل ناول
- "کبھی روشنی" نبیلہ کرن کا مکمل ناول
- میرا گل اور عمر ساجد کے ایک دلچسپ ملاقات
- فوزیہ جلیل رانا' عائشہ نصیر' سائرہ رضا' شفقت عباس' سعدیہ امین' اسماء مریم کے افسانے اور مستقل دلچسپ سلسلے

اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب

"چہرے کچھ بولتے ہیں"

اپنی حیرت کا اظہار کیا تو نے وا یہ دو جملوں میں بات پتائی پھوپھو لوٹ پوٹ ہو گئیں۔
آج سب کی تیاری عروج پر تھی۔ کاشان' مہران اور عہد پروفیشنل فوٹو گرافر کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ایک کے بعد ایک تصویر کھنچوا رہے تھے۔
"دنکل کو ہماری شادیاں ہونی ہیں' پُرد کھوے کے لیے اگر تصویر گئی تو..."
مہران نے پھوپھو کو بتایا۔ اس کے انداز پر پھوپھو ہنس پڑیں۔ مونا نے چٹکی بجا کر فوٹو گرافر کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ پیلے رنگ کے کام والے سوٹ میں لمبے بال کمر پر سیدھے بکھرائے ہوئے ہلکے میک اپ کے ساتھ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اس کے ہر انداز سے خوشی چھلک رہی تھی مگر نہ جانے دکھ کی کیسی لکیر تھی جو آنکھوں میں کاجل کی طرح پھیل گئی تھی۔ اس کی آنکھیں اتنی ہی روشن تھیں یا بار بار جھلملا جاتی تھیں' کوئی جان نہ پایا۔ آرزو کی تیاری سب سے بڑھ کر تھی۔ اس نے سرخ گلدار لہنگے پر بیک لیس بلاؤز پہن رکھا تھا۔ پشت پر ڈوریاں کسی تھیں' دوپٹہ لہنگے میں پھنسا کر کے گزرتا شانے پر ٹکا تھا۔ بندیا' پائل' چوڑیاں' اس کے بالوں میں موتی پروئے ہوئے تھے۔ وہ گلابی رنگت والی گول مٹول سی بچی تھی۔ گھر بھر کی آنکھ کا تارا' گھر کا واحد چھوٹا بچہ اور یہ کہنا مشکل تھا کہ کون اسے سب سے زیادہ پیار کرتا ہے۔
اس نے آرزو کو اپنے سامنے کھڑے کر کے تصویر کھنچوائی۔
"پتا نہیں یہ دل بار بار کیوں کہتا ہے سب کچھ چھوڑ چھاڑ' اپنے بستر میں گھس جاؤں۔" فوٹو گرافر کے "ہو سمائل" کہنے پر اس نے اپنی پیشانی مسلی۔
"ممی! آپ بیٹھو (اٹھو)" آرزو نے منہ اوپر کر کے رعب سے کہا۔ مچھ۔
"پلیز ایک اور... میں اسے گود میں لیتی ہوں۔"
"وہ تمہارے ڈھیروں ڈھیر زیور کیا ہوئے؟ کون سے صندوق میں رکھ چھوڑے کہ آج کے دن بھی نکالنا کھلا؟" مونا چونک کر مڑی۔ معید کھڑا تھا۔ اس نے فوٹو گرافر کو جانے کا اشارہ کیا۔
"کہیں... نہیں... وہ..." وہ ہکلائی۔ "تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" اس نے فوراً روکھا لہجہ بنا لیا۔
"یونہی۔ اگر سب کی بات مان جاتیں تو آج تم بھی اتنی بہت سارا تیار ہو کر گھوم رہی ہوتیں۔" اس نے تہمینہ باجی کی سمت اشارہ کیا۔ وہ سرخ بنارسی ساڑھی میں سر تا پا سجی بنی تھیں۔ مونا کے حلق میں گولا سا اٹک گیا۔ اس نے الجھ کر اس کی صورت دیکھی۔ وہ سادگی سے مسکرا رہا تھا۔
"میری طرف اس طرح مسکرا کر مت دیکھو۔" وہ یہی کہہ سکی۔
"ہر یہاں غصے میں کون ہے؟ سب ہی ہنس بول رہے ہیں۔ تم نے خود ہی بین کیوں لگا رکھا ہے؟"
"تم سب کے پیچھے چلتے ہو؟ اپنی کوئی رائے نہیں؟"
"کیا کہنا چاہتی ہو؟" وہ پورا اس کے چہرے کی سمت گھوم گیا۔ مونا چہرہ اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔ نگاہیں چرا گئی۔
"یاد رکھو مونا سعد اللہ! رائے سب کی' فیصلہ خود کا۔ اور اگر لگا آپ کو صاحب مشورہ دے رہا ہو تو اور اچھا کہ جب کوئی اپنا مشورہ دیتا ہے تو اس کا خلوص بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ کسی نئے فیصلے میں خیر خواہوں کا مشورہ دعائیں اور خلوص ہو تو اسے اپنا لینے میں کوئی حرج نہیں۔"
وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ اس بار مسکراہٹ سادگی کا رنگ لیے ہوئے نہیں تھی۔ مونا کو نگاہیں جھکانا پڑیں۔
"تمہیں بہت اچھی اچھی مل جائیں گی۔" وہ سامنے اسٹیج کو دیکھ رہی تھی۔
"برائی تو تم میں بھی کوئی نہیں۔" معید کی آواز میں کچھ جذبے حل گئے۔ مونا چونک اٹھی۔
"تم سب مجھ پر ترس کھاتے ہو۔"
"ہمیں تو تب احساس ہوا جب گاڑی نکل چکی تھی' پسندیدگی چھلک رہی تھی مگر ملاحظہ کرو ذرا نہیں تو عصمت آنٹی لے اڑی تھیں۔ پھر ہم نے صبر کیا۔ اللہ ہمیں بھی اس جیسی دے گا۔ اللہ نے کہا' صبر کرو! یہ ہی لے لینا۔"
"تم مذاق کر رہے ہو نا؟" وہ بے یقینی سے بولی۔ پلکیں بھیگ گئیں۔
"مذاق کیسا مونا؟" وہ اس کے عین روبرو ہو گیا۔ "تم نے کبھی خود کو غور سے دیکھا ہے؟ یہ تمہارے بال' تمہاری آنکھیں' دودھ اور روح افزا کے شربت جیسی رنگت... یار! مرے میں جان پڑ جائے اور میں تو ابھی ہر طرح سے زندہ ہوں۔"
اس کی تعریف کا انداز' اظہار کا یہ طریقہ؟ مونا کو ہنسی آ گئی۔
"یہ تم نے میری تعریف کی ہے؟ ایسے کرتے ہیں کسی کی تعریف؟"
"مجھے دوسرے طریقے بھی آتے ہیں۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ "بس وقت آنے دو۔" مونا نے سٹپٹا کر اس کی صورت دیکھی۔ وہ بات مکمل کر کے اسٹیج کی جانب دیکھ رہا تھا۔
"تم سب کے مجبور کرنے پر ایسا کر رہے ہو نا؟" اس نے دھیرے سے اس کی کہنی چھوئی۔
"اگر ایسا ہوتا تو میں یہاں جھک مارنے کے بجائے وہاں گھسا ہوتا۔" معید نے خفا نگاہوں سے اسے دیکھا۔ مونا نے اس کے اشارے کی سمت دیکھا۔ خاندان کی لڑکیوں کا ایک گروپ ہنسی' مشغول میں مصروف تھا۔ کاشان' عہد اور مہران سمیت سب لڑکے اس جانب ہی متوجہ تھے۔
"وہی ایمپلٹی تو میرے اندر ہے کہ وہاں ہوں تو کسی ایک کا ہاتھ پکڑ کے باہر نکلوں۔" وہ بالکل خفا ہو گیا۔
مونا نے سر اٹھا کر اسے بغور دیکھا۔ سانولا رنگ' بہت ہلکی داڑھی' آنکھوں پر چشمہ' بلیک پینٹ پر ہلکی نیلی شرٹ اور اس کا مباقد بس کا دو اوسط اچھا تھا۔
تو پھر اسے کیا چیز یہاں کھڑا کر رہی ہے؟
وہ ایک قدم آگے ہو کر آرزو کو بلا رہا تھا۔ مونا اس کی پشت کی جانب پُرسوچ نگاہوں سے دیکھتی رہی۔
"میرے ساتھ تصویر نہیں بنوائی تم نے؟" اس نے آرزو کو گود میں لے لیا۔
"بنواؤں گی نا۔" اس نے اپنے چھوٹے ہاتھوں سے اس کے گال تھپتھپائے۔
"آپ مجھ سے پیار نہیں کرتیں۔" معید نے منہ بسورا۔
"نہیں' نہیں! کرتی ہوں بہت۔" آرزو کو سارا دن گھر کے ہر بندے کو اپنے پیار کا یقین دلانا پڑتا تھا۔ جھٹ بولی۔
"تو چلو! پھر ایک پپی ہو جائے۔" معید نے گال آگے کیا۔ آرزو نے اپنے ہونٹ اس کے گال پر رکھ دیے۔
کلک۔
"اب ایک اور..." معید دو قدم اور آگے سرک گیا۔ "اب ذرا اسٹائل سے۔" اس نے آرزو کی پلٹ جانے والی بندیا ٹھیک کرنے کی کوشش کی۔ فوٹو گرافر کیمرا سیٹ کیے منتظر تھا۔ ون' ٹو' تھری... ریڈی... اس کے ریڈی کہنے سے پہلے مونا تین قدم آگے بڑھ آئی۔
اب وہ معید کے نزدیک آ گئی تھی۔ ساتھ ساتھ قدم سے قدم ملائے۔ آرزو بہت پیارا منہ بنائے کیمرے کو تک رہی تھی' معید نے چونک کر خود سے ذرا فاصلے پر کھڑی مونا کو دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں گہری جھجک اور ہلکی بے اعتباری تھی۔
وہ بہت اعتماد اور محبت سے مسکرایا۔ درمیان رہ جانے والا بالشت بھر کا فاصلہ اس نے پل بھر میں طے کر لیا۔ تصویر بہت پیاری آئی۔ شرمائی' جھجکی مونا۔ بہت اعتماد اور خوش دلی سے مسکراتا اس کے ساتھ جڑا معید اور معید کی گود میں سجی سنوری آرزو۔
سال بعد جب مونا سولہ سنگھار کیے' معید کا ہاتھ پکڑے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی تو دروازہ کھلتے ہی پہلی نگاہ اسی تصویر پر پڑی جو بڑی کروا کے بالکل ناک کے سامنے آویزاں تھی۔

پچھلے پہر کی چاندنی

بشریٰ احمد

رات کے آٹھ بجے جہاز نے پرواز کی تو ہرے بھرے اسلام آباد کے خوب صورت گھروندوں میں جلتے ہوئے جگمگ دیے میرے قدموں تلے آ گئے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کے قدموں تلے دیپ روشن ہوں۔ یہ خواہش جہاز میں بیٹھ کر پوری ہوتی ہے۔ میں نے ننھے سے شیشے میں سے زمین پر چمکتی ہوئی روشنیوں کی بہار دیکھی۔ قطار در قطار جگنو سے چمک رہے تھے۔ اسلام آباد کی زمین پر آسمان کا گمان ہو رہا تھا۔

نیچے دیکھ کر میرے دل کو قرار سا آ گیا۔ اس وقت میں نے سوچا کہ اس کالی زمین کی طرح دل بھی ایک اندھا گھر ہے، جس میں زندگی سے ملنے والی یادوں کے دیپ روشن ہیں۔ دل کی اندھیری گلیوں میں سناٹا ہو جائے۔ اگر جابجا منڈیروں پر یادوں کے دیے چمکتے نظر نہ آئیں۔ دل ایک اندھا کنواں ہوتا اگر اس میں یادوں کے کنکر اور پتھر نہ گرتے رہتے۔

جہاز نے اڑان کے سارے ابتدائی مرحلے طے کیے۔ تیر ھا میڑھا ہو کر سیدھا ہو گیا اور پھر بلندی کی طرف پرواز کرنے لگا۔ فضائی پروازوں نے دنیا کو مختصر کر دیا ہے۔ دنیا سمٹ کے قریب آ گئی اور لوگ ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہیں۔

میں نے جہاز کے ایک زاویے سے ایک بار پھر اسلام آباد کی زمین کو دیکھا جو نظروں سے اوجھل ہونے والی تھی۔ دور سے اسلام آباد کا ٹمٹماتا شہر الف لیلوی دیس نظر آ رہا تھا۔ ان ہی حسین اور جگمگاتے گھروں میں ایک گھر کے اندر میرے دل کا قرار تھا۔ ایک گھر نے میرا سکون کرودی دکھ لیا تھا۔

میں اس بلندی سے اس گھر کو دیکھ نہیں سکتا تھا مگر اس پل مجھے وہ گھر دنیا کا خوب صورت ترین گھر لگ رہا تھا اور اسلام آباد خوابوں کا شہر معلوم ہو رہا تھا جس کی روشنیاں دور ہوتی جا رہی تھیں۔

میں نے سر گھما کر دیکھا۔ میری بیوی میرے برابر کی سیٹ پر آنکھیں موندے بے دم سی لیٹی تھی۔ آج کی دھواں دھار بارش کی وجہ سے چار بجے والی فلائٹ رات کے آٹھ بجے لاہور جا رہی تھی۔ ایک تو سارا دن سفارت خانوں کے چکروں میں گزرا تھا۔ دوسرے ساری فلائٹیں رک جانے کی وجہ سے ایئرپورٹ کے لاؤنج میں بے تحاشا مسافر بھرے ہوئے تھے۔ جن کے درمیان بیٹھے بیٹھے ہم دونوں میاں بیوی ادھ موئے ہو گئے تھے۔ ایک تھکا دینے والے انتظار اور بے زاری کے بعد خدا خدا کر کے ہمارے جہاز کی پرواز کا اعلان ہوا تھا۔

میں نے دور تک نظریں گھما کر دیکھا۔ نور برساتا اسلام آباد دور رہ گیا تھا۔ ان بہت سی روشنیوں میں، میں نے ایک گھر کا تصور کیا جس میں سیاہ آنکھوں والی وہ تنہا عورت اپنے وجود سے بے پروا بیٹھی جانے کیا کر رہی ہوگی؟

☼ ☼ ☼

میں نے محبت کر کے شادی کی تھی۔ رافعہ ہمارے پڑوس میں رہتی تھی اور میں اپنے محلے میں بڑا لائق فائق لڑکا مانا جاتا تھا۔ اس لیے محلے کے بچے اکثر کچھ نہ کچھ پڑھنے میرے پاس آ جاتے تھے۔ ہم چونکہ متوسط طبقے کے لوگوں میں سے تھے، سو محلے میں اپنی اہمیت اجاگر کرنے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہمارے پاس ذہانت کے سوا کچھ نہ تھا۔ میرے والدین اس بات پر فخر محسوس کرتے تھے کہ جب میں یونیورسٹی سے واپس آتا ہوں تو طالبانِ علم کا ایک گروہ میرا منتظر ہوتا ہے۔ ان ہی میں ایک رافعہ بھی تھی، جسے میٹرک کے ہر پرچے میں، میں نے مدد دی تھی۔ اور وہ سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گئی۔ اس طرح دونوں گھرانے قریب ہو گئے۔ پھر ایف اے میں اس نے سارے مضمون مجھ سے پوچھ کر لیے۔

سوکس اور انگریزی اسے میں ہی پڑھاتا تھا۔ جب وہ بی اے میں پہنچی تو ملازمت کے سلسلے میں میرا تبادلہ شہر سے باہر ہو گیا۔ پھر کبھی کبھی میں چھٹیوں میں گھر آیا کرتا تھا تو وہ پولیٹیکل سائنس کے ڈھیر سارے سوالات اور شیکسپیئر کے اقتباسات جمع کر کے رکھ چھوڑتی۔

ایک دن اس نے نوٹ بک سمیٹتے ہوئے بڑی ادا سے کہا۔ "آپ اپنا ٹرانسفر اسی شہر میں کیوں نہیں کرا لیتے؟"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"کتنے دن تو ہو گئے آپ کو گئے ہوئے۔"

"تمہارے امتحان نزدیک آ رہے ہیں، کیا اس لیے؟"

"نہیں۔" اس نے سر جھکا لیا۔ "آپ کے بغیر یہ سال حل نہیں لگتا۔"

"ارے۔" میں نے اسے اس طرح دیکھنا چاہا، اس طرح اس کا مذاق اڑانا چاہا جیسے کسی معصوم اور بے وقوف بچی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ میرے سامنے جوان ہوئی تھی۔ مجھ سے بارہا اس نے ڈانٹ کھائی تھی۔ تنہائی میں گھنٹوں میرے پاس بیٹھ کر پڑھتی تھی۔ میں نے اسے کبھی غور سے نہیں دیکھا تھا۔ کچھ کہنے کے لیے جب میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا تو میں لڑکھڑا گیا۔ اس کی سیاہ لمبی پلکیں نیزوں کی طرح اوپر

نیچے ہو رہی تھیں۔ اور ان چھوٹے ہونٹ اس طرح پھڑپھڑا رہے تھے جیسے درخت کی چوٹی پر پتنگ پھنسی ہو اور ہوا کے ہلکے سے اشارے پر بھی پھڑپھڑ کرنے لگتی ہو۔ اٹھارہ انیس سال کی لڑکی کے چہرے پر عجیب سا جلال ہوتا ہے۔ وہ میں نے ابھی ابھی محسوس کیا تھا اور میرے احساس کو جگانے والی رافعہ تھی۔ اس نے دوپٹے سے اپنا پورا بدن ڈھکا ہوا تھا اور پنسل سے اپنی ہتھیلی پر گل بوٹے بنا رہی تھی۔ مگر اس کے سارے تن میں چنگاریاں سی دوڑ رہی تھیں۔ اس وقت وہ مجھے گلاب کی شاخ پر تازہ تازہ کھلا ہوا پھول لگ رہی تھی جس کی پنکھڑیوں پر رات کے کسی لمحے میں شبنم کے موتی گر گئے تھے اور وہ اب اس سے سنبھالے نہ جا رہے تھے۔

"کیوں نہیں لگتا بھی تمہارا دل میرے بغیر؟" میں نے اپنے انداز کو بدلے بغیر اس طرح کہا جیسے مجھے کچھ کہنا ہی تھا۔ "جب کہ سارے محلے کا دل میرے بغیر لگ گیا ہے۔"

"میں سارے محلے کی وکالت کرنے نہیں آئی۔" اس نے اپنے دل کا غصہ ہونٹوں میں دبایا۔

"اچھا تو تم اپنے دل کی وکالت کرنے آئی ہو؟"

"ہونہہ! وہ دل کھا کر جائے کو مری۔"

"تو تمہارا مشورہ ہے کہ میں واپس اپنے شہر میں ٹرانسفر کرا لوں؟"

میں اسے روکنا چاہتا تھا۔ ابھی ابھی اس نے مجھے جگایا تھا اور جاگ کر میں اپنے جاگنے کا خود یقین کرنا چاہتا تھا۔

"مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں؟ اگر آپ کا دل وہاں لگ گیا ہے تو رہنے دیں۔" اس نے ترچھی نظروں سے مجھے دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بڑی ظالم شے ہوتی ہے، جوان لڑکی۔

قدرت نے اس کے ہاتھ میں ایک فن دیکھا نشتر ہونے رکھا ہوتا ہے۔ جب چاہے مرد کے سوئے ہوئے احساس میں چبھو دے۔

"میرا وہاں دل لگانے تو نہیں گیا تھا۔"

"اور کیا کرنے گئے تھے؟"

"نوکری کرنے گیا تھا۔"

"اچھا تو پھر نوکری کیجیے۔"

"تمہارا دل جو نہیں لگتا یہاں میرے بغیر۔" میں نے ابھی اب چوٹ کھائے ہوئے انداز میں کہا۔

اس نے سر کو جھٹک کر میری طرف دیکھا اور بھاگ گئی۔

یہ ہوتی ہے عورت۔

مرد کے پرسکون سمندر میں ایک کنکر پھینک کر ہلچل مچا دیتی ہے۔ اس کے دل کا بوجھ تو ہلکا ہو گیا ہو گا۔ میرا دل بوجھل ہو گیا۔

کبھی کبھی کا فکر لو۔ ننھے ننھے فقرے اور غلافوں میں لپٹی ہوئی عام سی لڑکی۔ میری زندگی کی آرزو بن گئی۔

رافعہ اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ زندگی کے سفر میں ہم ایک ساتھ چل پڑے۔ میں نے بہت محنت کی۔

جس طرح متوسط طبقے کا ہر نوجوان اپنے خاندان کو اعلا مقام دلانے کے لیے کیا کرتا ہے۔ ہمارے تین بچے ہیں۔ بڑا بیٹا امریکا میں رہتا ہے۔ دونوں بیٹیوں کی شادی کر دی ہے۔ پچھلے مہینے میری چھوٹی بیٹی کی شادی تھی اور اب ہم دونوں میاں بیوی مستقل رہائش کے لیے امریکا اپنے بیٹے کے پاس جا رہے ہیں۔ میرا بیٹا ڈاکٹر ہے۔ وہاں بہت اچھی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس نے میرے لیے بھی ایک جاب کا بندوبست کر دیا ہے۔ اس کا خیال ہے باقی زندگی مجھے اور رافعہ کو اپنی مرضی سے وہاں بسر کرنا چاہیے۔ رافعہ بھی یہی چاہتی تھی۔ اس لیے ہم دونوں سفر کے یہ سارے مراحل طے کر کے اسلام آباد آئے ہوئے تھے۔

☆ ☆ ☆

محبت دو قسم کی ہوتی ہے۔

ایک محبت جسم سے ہوتی ہے اور ایک روح سے۔ جوانی میں ہم ان باتوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ یہ روح وح کیا، محبت کیا ہوتی ہے؟ مگر جوانی کے آغاز میں

محبت صرف جسم کی محبت ہوتی ہے۔ اس لیے اس محبت میں لنا کے بڑے سخت مقام آتے ہیں۔ مگر یہ جسم کے تقاضوں کے آگے ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں یہی محبت انسان کو بشر کے جامے میں رکھتی ہے۔

دوسری محبت روح سے کی جاتی ہے۔ کسی دن اچانک آپ کی ملاقات کسی روح سے ہو جاتی ہے۔ روح کا جسم نہیں ہوتا۔ وہ کیف ہی کیف ہوتی ہے۔ مدھ ہی مدھ ہوتی ہے۔ اسے ہاتھ لگانے کو جی نہیں چاہتا۔ اسے چھونے کو جی نہیں چاہتا۔ بس دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ اسے محسوس کر لینے اور دل میں اتار لینے کو جی چاہتا ہے۔ وہ کسی دن خود بخود آ کر ہماری روح سے ٹکرا جاتی ہے۔ اس کو کسی شے سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ نہ ڈوبتی ہوئی شفق رنگ شام سے، نہ ابھرتی ہوئی نومولود خوشبودار صبح سے، نہ چلچلاتی ہوئی سنسان دوپہر سے، مگر وہ ان سب میں سرایت کر کے زندگی میں اتر جاتی ہے۔

ایسی محبت کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ یہ عام طور پر اس عمر میں ہوتی ہے جب سرکش جذبے تھک ہار جاتے ہیں۔ اگر جسمانی ضروریات ہی آسودگی کا پیمانہ ہیں تو پھر سب کچھ پا لینے کے باوجود آدمی ہمیشہ اپنے آپ کو پیاسا کیوں محسوس کرتا ہے؟ دولت، آرام، اقتدار، شہرت، آسائش سب مل کر بھی زندگی کو مکمل نہیں کرتیں۔ ہمیشہ ایک تشنگی سی باقی رہتی ہے جسے بے وقوف انسان مختلف نام دے کر اپنی کمزوریاں یا اپنی طاقتیں بنائے رکھتا ہے اور اپنی ذات کی جنگ اپنے ذہن کے ساتھ کرتا رہتا ہے۔ اس کی روح کو اس دن قرار آتا ہے، جب وہ اپنی روح سے، بچھڑی ہوئی روح سے ملاقات کر لیتا ہے۔

اس روز امریکی سفارت خانے کے اندر جب میں اور میری بیوی داخل ہوئے تو وہ سر جھکائے کچھ لکھ رہی تھی۔ اس کے دفتر میں ضرورت کی ہر شے تھی اور ایسا لگتا تھا کہ وہ مستعدی سے کام کرنے کی عادی ہے۔

اس نے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھا۔ اس کی سیاہ کالی آنکھوں میں کاجل کے دائرے تھے مگر سیاہ رات کے عین بیچ میں آنکھوں کی پتلیوں کے پاس کوئی ستارہ چمک رہا تھا۔ جو بھولے بھٹکوں کو زندگی کا راستہ دکھا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اتنی روشن تھیں مگر اس کا چہرہ اداس تھا۔ وہ بہت نرم لہجے میں بات کرتی تھی مگر اس کے لہجے میں بڑی خوشبو تھی۔

میں نے کاغذات اس کے سامنے میز پر رکھ دیے اور جلدی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری بیوی بھی بیٹھ گئی۔ کارروائی شروع ہو گئی۔ کوئی آ رہا تھا کوئی جا رہا تھا۔ سب کا کام ہو رہا تھا۔ میں اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔

ہمارے بیٹھے بیٹھے وہاں لنچ ٹائم ہو گیا اور اچانک میری بیوی کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ رافعہ کو کچھ عرصے سے "ورٹی گو" (سر چکرانے) کی تکلیف ہے۔ اسے چکر آنے لگے یہ دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ پھر مجھ سے کہنے لگی۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں ان کو سائیڈ روم میں لٹا آتی ہوں۔" وہ رافعہ کو ساتھ لے گئی۔ وہاں اسے دوا دی، چائے پلائی، سائیڈ روم میں لٹایا۔ جب وہ سو گئی تو دروازہ آہستہ سے بند کر کے واپس آ گئی۔

میں نے کہا۔ "لنچ ٹائم ہے۔ کیا آپ گھر نہیں جائیں گی؟"

کہنے لگی۔ "آج آپ کا کام کرنا بہت ضروری ہے۔ آپ کی بیگم بیمار ہیں۔ اگر آپ کا کام آج ہو گیا تو ان کی طبیعت پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔"

"مگر یہ تو آپ کے ساتھ زیادتی ہے۔"

اس نے ہنس کر میری طرف دیکھا۔

پتا نہیں بعض آنکھیں کیسی ہوتی ہیں۔ مسکرا رہی ہوتی ہیں، مگر اداس کر دیتی ہیں۔ اتنی ان کہی کہانیاں تھیں ان آنکھوں میں کہ میں راستہ بھول گیا۔

وہ ایک گھنٹہ جو میں نے وہاں گزارا، میری ساری زندگی پر چھا گیا۔

اس کی عمر لگ بھگ چالیس برس تھی۔ دس سال

سے وہ سفارت خانے میں ملازم تھی۔ دس سال پہلے اس کا شوہر ایک حادثے میں چل بسا تھا۔ اس کا کوئی بچہ نہیں تھا۔ دو کمروں کا ایک خوب صورت فلیٹ تھا جس میں وہ رہتی تھی۔ فالتو وقت میں پینٹنگ کیا کرتی۔ جب کچھ پیسے جمع ہو جاتے تو دنیا کی سیر کو نکل جاتی۔

اس کی باتوں میں وہ سب کچھ تھا جو اس نے اس دنیا میں دریافت کیا تھا۔ اس کے کام کرنے کے انداز میں بڑی لگن تھی اور وہ زندگی کو پوری طرح سمجھ کر اس کے ساتھ نباہ کر رہی تھی۔ اسی لیے وہ ہر ایک کی بات کو توجہ سے سنتی اور بڑے اطمینان بخش انداز سے اس کا جواب دیتی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے گیان کا کوئی بھید پا لیا ہے اور عرفان کی کسی منزل میں ہے۔

اس کا رویہ عام ملازمت پیشہ عورتوں جیسا نہیں تھا۔ رعونت سے بھرا ہوا کھردرا اکھڑ روایا بناوٹی۔

ملازمت پیشہ عورت دفتر میں خواہ کتنی ہی خندہ پیشانی سے مسکراتی رہے کھردری ہو جاتی ہے۔ خوب صورت لباس اور سلیقے سے کیے ہوئے میک اپ کے باوجود اس کے اندر کی نرمی ختم ہو جاتی ہے۔ اگر وہ عورت شادی شدہ ہو تو کئی بار دوران گفتگو اس کے لہجے کی تلخی چھلک پڑتی ہے۔ اس کی ناآسودگی کا اظہار کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا ہے۔

لیکن وہ... اپنی زندگی کی داستان اس طرح سنا رہی تھی جیسے پرائمری اسکول میں اپنی کامیابیوں کا قصہ سنا رہی ہو۔

اس ایک گھنٹے کی ملاقات میں اس سے میں نے سب کچھ پوچھا مگر دو باتیں جان بوجھ کر نہیں پوچھیں۔ ایک تو میں نے اس کا نام نہیں پوچھا کیونکہ کارڈ پر درج تھا۔ "مسز ڈگلس" اگر میں اس کا اصلی نام پوچھ لیتا تو مجھے معلوم ہے۔ وہ اس کی شخصیت کی طرح ہی خوب صورت ہوتا اور ہمیشہ کے لیے میرے سینے میں پھانس کی طرح اٹک جاتا۔ پھر یہ کہ میں روح کو کوئی نام بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ دوسرے میں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ اس نے دوبارہ شادی کیوں نہیں کی؟

وہ دل کی موت تھی۔ کئی طالب راستے میں آئے ہوں گے۔ میں اس کا جواب سننے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ وہ... ادراک کے جن جنگلوں کی جوگن بن چکی تھی۔ وہاں اس کا وجود اس پیالے کی طرح تھا جو بھرتا بھی نہ ہو اور چھلکتا بھی نہ ہو اور اس کیفیت نے اس کے گرد دل کشی کا ایک ہالہ بنا دیا تھا۔

پتا نہیں بعض لوگوں سے مل کر ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے، جیسے ہم چلچلاتی دھوپ میں سے نکل کر ٹھنڈے میٹھے سائے میں آ گئے ہوں۔ میری اس کی ملاقات کنکریٹ کی ایک سہ منزلہ عمارت کے اندر ہوئی تھی مگر ایسا لگتا تھا اردگرد ایک سبزہ زار اگ آیا ہے۔ آسمان پر اودے بادل ہیں اور پروائی اپنے آپ کمرے کے اندر در آئی ہے۔ حد نظر تک سبزہ ہی سبزہ ہے۔ آنکھوں میں اتر جانے والا۔

اس سے ملنے کے بعد جی اتنا مسرور ہوا کہ میں مسلسل اداس ہوں۔

زندگی میں خوشیاں بھی ملیں۔ پریشانیاں بھی آتی رہیں۔ کبھی بچوں کی، کبھی روزگار کی، کبھی بیماری کی، قرابت داریاں خوشیاں بھی بخشتی رہیں اور تکلیفیں بھی۔

پھول بھی ملتے رہے، کانٹے بھی چبھتے رہے۔ حیات کے ساتھ موت کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ پیارے رشتوں کی جدائی کا کرب بھی جھیلا۔ میں پریشان اور دل گرفتہ تو ضرور رہا ہوں، کبھی اداس نہیں ہوا۔

اداس تو بس محبت کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔

آج عرصہ دراز کے بعد میرا جی عجب طرح بوجھل ہے۔ اداسی دل زندہ کی علامت ہے۔ دور کہیں ہولے ہولے دل کے پہاڑ پر اداسی کی برف گر رہی ہے۔

میرے سفید بال اس برف کو سلام کر رہے ہیں۔

آج کی یہ ساری اداسی میں اس خوب صورت سیاہ آنکھوں والی عورت کے نام کرتا ہوں جس کا میں نام بھی نہیں جانتا۔

ابھی ابھی جہاز نے لاہور کے انٹرنیشنل ہوائی اڈے کی زمین کو چھوڑا ہے۔ میں نے اپنی سوئی ہوئی بیوی کا کندھا ہلایا ہے۔

اور اب میں اپنی بیوی کا ہاتھ تھام کر اترتا جاؤں گا۔

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening ,or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

راحت جبین

ساری بھول ہماری تھی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

عریشہ عادلہ کی بیٹی ہے۔ عادلہ بیوہ ہیں اور اسکول میں ملازمت کرتی ہیں۔ مکان کے دوسرے حصے میں ان کے جیٹھ اور جٹھانی اپنے بچوں نعمان، ثوبان، فرید، فاطمہ اور مریم کے ساتھ رہتے ہیں۔ بانو اور ساجدہ شادی شدہ بیٹیاں ہیں۔ عریشہ ثوبان کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتی ہے۔ ثوبان کو علم ہے مگر ابھی اس کی طرف سے اعتراف نہیں ہے۔ عادلہ کو یہ چیز پسند نہیں کیونکہ ان کے جیٹھ کا گھرانہ جاہل ہے۔

نبیلہ، عادلہ اور حمیداں کی نندیں ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں محسن اور جمال۔ جمال ملک سے باہر مگر اس کی بدمزاج بیوی طیبہ یہیں رہتی ہے۔

ابرار جمیلہ کا بیٹا ہے شہر میں پڑھتا ہے۔ باپ کی وفات کے بعد چچا کے ساتھ رہتا ہے۔ چچی کبریٰ کا سلوک اس کے اور اس کی ماں کے ساتھ ناروا ہے۔ اپنے شوہر اصغر سے اکثر ڈانٹ پڑواتی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ اس کی بیٹی بشریٰ کی ابرار سے شادی ہو جائے مگر ابرار صاف انکار کرتا ہے۔ اصغر کو غصہ آتا ہے وہ ابرار پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ ابرار ناراض ہو کر گھر چھوڑ دیتا ہے اور شہر آجاتا ہے۔

طیبہ کی مسلسل بدتمیزی سے عاجز آکر نبیلہ، جمال سے طیبہ کو ساتھ لے جانے کا کہہ دیتی ہیں۔ نبیلہ محسن کے لیے فاطمہ کا رشتہ مانگتی ہیں۔ حمیداں کے اعتراض کے باوجود رشتہ پکا ہو جاتا ہے۔

نعمان اپنے اسٹور سے سودا لینے والے ماسٹر صاحب کی بیٹی عائشہ کو پسند کرنے لگتا ہے۔ وہ گورنمنٹ ملازم ہے۔ نعمان عائشہ کی ماں سے رشتے کی بات کرتا ہے اور ان سے فاطمہ کی شادی تک انتظار کرنے کو کہتا ہے کیونکہ حمیداں کا دونوں

ناولٹ

www.paksociety.com

بیٹیوں سے پہلے بیٹوں کی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ عائشہ اور اس کے گھر والے تھوڑی سی حیل حجت کے بعد مان جاتے ہیں۔

عادلہ نبیلہ کے کہنے پر بچت کر کے عریشہ کے لیے سونے کا سیٹ بنواتی ہیں۔ عادلہ کے منع کرنے کے باوجود عریشہ حمیداں کو وہ سیٹ دکھا دیتی ہے۔ حمیداں کی عریشہ سے لگاوٹ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

فاطمہ کی شادی پر حمیداں، عادلہ سے وہ سیٹ مانگتی ہیں۔ عادلہ پریشان ہو جاتی ہیں کیونکہ انہوں نے وہ سیٹ عریشہ کے لیے بہت مشقت سے بنایا ہوتا ہے۔ حمیداں بضد ہوتی ہیں کہ فاطمہ کو شادی پر سونے کا سیٹ دیا جائے جبکہ ان کی حیثیت نہیں ہوتی۔ وہ ثوبان کی فیس کے پیسے نکال لیتی ہیں۔ ثوبان بہت بگڑتا ہے۔ عریشہ ثوبان کی پریشانی دیکھ کر چپکے سے وہ سیٹ نکال کر حمیداں کو دے دیتی ہے۔

شادی والے دن نبیلہ فاطمہ کے گلے میں وہی سیٹ دیکھتی ہیں تو عادلہ سے کہتی ہیں۔ عادلہ عریشہ سے پوچھتی ہیں تو وہ بجائے شرمندہ ہونے کے دھڑلے سے اعتراف کرتی ہے کہ اس سے ثوبان کی پریشانی نہیں دیکھی گئی۔ عادلہ عریشہ کی حرکت سے اتنی دل برداشتہ ہوتی ہیں کہ ان کا دل بند ہو جاتا ہے۔ عریشہ پچھتاتی ہے۔ ثوبان لگاوٹ سے اسے بہلانے کی کوشش کرتا ہے۔

ابرار برکت حسین کی چچازاد جمیلہ کا بیٹا ہے۔ شہر آ کر ان کے گھر رہنے لگتا ہے۔ حمیداں اس سے سخت بیزار ہیں۔ ابرار کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ عریشہ ثوبان کو پسند کرتی ہے، ساتھ ہی وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ ثوبان اپنے فائدے کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس کی خود غرضی جان کر ابرار اس سے سخت کبیدہ خاطر ہو جاتا ہے۔

حمیداں کو نعمان کی خواہش کا علم ہو جاتا ہے اور جب عائشہ کی والدہ عادلہ کی تعزیت کرنے حمیداں کے پاس آتی ہیں تو وہ ان سے خوش اخلاقی سے نہیں ملتیں۔

"آج کل ماں باپ نے لڑکوں کو پھانسنے کے لیے اپنی لڑکیوں کو آگے کر رکھا ہے اور لڑکیاں خود ہی معاملہ سیٹ کر لیتی ہیں۔" جیسے سخت الفاظ کہہ کر ان کی بے عزتی کر دیتی ہیں۔

چوتھی قسط

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ میری بچی ایسی نہیں۔" انہوں نے ماتھے پر آیا پسینہ چادر کے پلو سے صاف کیا۔

"میں آپ کی بات تو نہیں کر رہی۔ میں تو عام بات کر رہی ہوں۔ محلے میں ادھر ادھر سے کچھ نہ کچھ سننے کو مل ہی جاتا ہے... کہ فلاں کا فلاں کے ساتھ چکر چل رہا ہے... یہ لڑکا اس لڑکی کے گھر کے چکر کاٹ رہا ہے۔" انہوں نے ہنستے ہنستے لاپروائی سے جو بات کی تھی وہ تیر کی طرح آمنہ کے دل میں گڑ گئی۔

اب مزید ٹھہرنے کا مطلب مزید بے عزتی کروانا تھا۔

"میں اب چلتی ہوں کافی دیر ہو گئی۔"

"ارے ابھی تو آئی ہیں۔ چائے پی کر جائیے گا مریم لا رہی ہو گی۔"

"شکریہ بہن! چائے کے لیے ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔" وہ گھٹنوں پر زور ڈال کر کھڑی ہوئیں۔ یوں لگتا تھا ٹانگوں میں جان ہی نہ ہو۔

"ارے تو پہلے بتا دیتیں... میں کچھ ٹھنڈا منگوا لیتی۔"

"شکریہ... میں نے پی لیا۔ اللہ حافظ۔"

دروازہ عبور کرتے ہوئے ان کی آنکھیں لبالب بھر آئیں۔

وہ بیٹی کی ماں تھیں۔ نعمان کی آنکھوں سے چھلکتے جذبے بھی پہچانتی تھیں۔ وہ اپنی زبان سے اعتراف بھی کر چکا تھا۔

اس گھر میں آتے ہوئے بیٹی کے حوالے سے کچھ

ارمان، کچھ آرزوئیں، کچھ خواہشیں بھی دل میں تھیں۔ پوری گلی انہوں نے کس طرح عبور کی انہیں خود بھی خبر نہ تھی۔ قدموں کا کام چلنا تھا سو چلتے رہے۔

اپنے گھر کے دروازے پر پہنچنے تک وہ سارے ارمان آنسوؤں میں بہہ گئے۔

ساری آرزوئیں، ساری خواہشیں خود بخود مرتی چلی گئیں۔

کیا یہ ذلت ان کا مقدر صرف اس لیے بنی کہ وہ بیٹی کی ماں تھیں۔

اک تلخ سوچ نے گھر کے دروازے پر ان کا ہاتھ تھاما تھا... اس تلخ سوچ سے ہاتھ چھڑاتی، خود کو اللہ کی رضا میں راضی کرتی وہ اندر چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

نعمان چیزوں سے لدا پھندا مسرور سا گھر واپس آیا تو بیٹھک خالی تھی۔ وہ شاپر اٹھا کر کچن میں آ گیا۔ جہاں مریم آٹا گوندھ رہی تھی۔

"بھابی لوگ تو چلی گئیں۔"

"چلی گئیں کیا مطلب؟" نعمان ٹھٹک کر رہ گیا۔

"مطلب انہوں نے تعزیت کی اور چلی گئیں۔"

"چائے بھی نہیں پی! انہیں روکنا تو چاہیے تھا۔"

مریم کے جواب دینے سے قبل ہی حمیداں چلی آئیں۔ شاپرز کو دیکھ کر مزاج برہم ہو گیا۔

"روکا تھا۔ اب نہیں رکیں تو ہم کیا باندھ کر بٹھا لیتے۔"

"پھر بھی اماں! وہ پہلی بار ہمارے گھر آئی تھیں۔" نعمان الجھنے لگا۔ اسے بیکری سے واپس آنے میں اتنی دیر نہیں ہوئی تھی کہ وہ یوں اٹھ کر چلی جاتیں۔

"تجھے کیوں اتنی فکر ہے... جیسے تیری ساس بغیر چائے پیے چلی گئی ہو۔" وہ چمک کر بولیں۔

"اماں! سوچ سمجھ کر تو بولا کریں۔" اس نے شاپرز پٹخے اور غصے سے بڑبڑاتا باہر چلا گیا۔

"تیور دیکھو اس کے... اور سامان تو یوں اٹھا کر لایا ہے... جیسے تعزیت کرنے نہیں اس کا ولیمہ کھانے آئی تھیں... اے مریم! آٹا گوندھ گیا ہے تو یہ چیزیں پلیٹوں میں نکال اور چائے بھی بنا لے۔"

"کیا اماں! کوئی اور مہمان آ رہا ہے۔" مریم نے یونہی پوچھ لیا۔

"کیوں ہمیں کھانا منع ہے؟" انہوں نے غصے سے کہا۔ پھر ایک رول نکال کر کھاتی ہوئی باہر چلی گئیں۔

مریم نے آٹا ڈھکا... ہاتھ دھو کر چائے رکھی اور پہلے خود نکال کر کھانے لگی۔

☼ ☼ ☼

عائشہ نے کھانے کی ٹرے ماں کے سامنے رکھی اور پانی لینے چلی گئی۔

واپس آئی تو آمنہ اسی طرح گم صم سی بیٹھی تھیں۔ ایک نوالہ بھی نہیں توڑا تھا۔

"امی..."

وہ چونک کر بیٹی کو دیکھنے لگیں۔

"کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ روٹی اکڑ گئی تو آپ سے چبائی نہیں جائے گی۔"

"میں بھی دو بیٹیوں کی ماں ہوں..." یہ فقرہ اکڑ جھ میں تو نہ آئی۔

"امی کس سوچ میں ہیں؟"

"استغفراللہ۔" عائشہ کے پکارنے پر انہوں نے اپنی سوچ پر لعنت بھیجی اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گئیں... مگر بھوک جیسے مر سی گئی تھی۔

"جب سے آئی ہیں... آپ اسی طرح خاموش سی ہیں... کیا وہاں کوئی بات ہوئی ہے؟" عائشہ نے مدھم اور جھجکتے انداز میں پوچھا۔

"نہیں... بات کیا ہو گی..." وہ پھیکے انداز میں مسکرائیں۔

"میں بچی نہیں ہوں۔ جو آپ کے چہرے پر پھیلے پریشانی کے سائے نہ دیکھ سکوں... امی! بتا دیں آپ کے دل میں کیا ہے۔" عائشہ نے نوالہ ہاتھ سے رکھ دیا۔

"کوئی بات نہیں ہے۔ یونہی دل بوجھل سا ہو رہا

www.Paksociety.com

ہے۔ کچھ دنوں کے لیے تمہارے ماموں کے ہاں نہ ہو آئیں۔"

"ماموں کی طرف یوں اچانک' خیر تو ہے؟"

"یونہی ملنے کو دل چاہ رہا ہے۔" انہیں بیٹی کی تشویش سے چڑ سی ہونے لگی۔ عائشہ ان کے تیز لہجے پر خاموش ہو گئی۔

"تمہیں چھٹی مل جائے گی؟" انہوں نے کچھ لمحے کے بعد پوچھا۔

"جی' میری چھٹیاں تو ہیں۔ مگر ابو کو پریشانی ہو گی۔"

آمنہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

تب ہی دروازے پر تیز دستک ہوئی۔

"میں دیکھتی ہوں۔" عائشہ اٹھنے لگی۔

آمنہ نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"میں جاتی ہوں۔"

عائشہ نے کچھ تشویش اور حیرانی کے ملے جلے تاثر کے ساتھ ماں کو دیکھا۔

ان کے گھٹنے میں درد تھا۔ وہ بہت زور ڈال کر اور سہارے سے اٹھی تھیں۔ اس تکلیف میں انہوں نے پہلے تو کبھی دروازے تک جانے کی زحمت نہیں کی تھی۔

دروازے پر حسب توقع نعمان ہی تھا۔

"آج کل تو ویسے ہی ماں باپ نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور اپنی لڑکیوں کو آگے کر رکھا ہے کہ لو خود ہی بر ڈھونڈ لو اور لڑکیاں... آگے پیچھے پھر کر خود ہی سارا معاملہ سیٹ کر لیتی ہیں۔" نیزے کی انی کی طرح دل میں گڑے الفاظ انہیں پھر سے زخمی کرنے لگے۔

"السلام علیکم خالہ!" نعمان کی آواز پر وہ چونک گئیں۔

"کیسے آنا ہوا؟" ان کا لہجہ اپنائیت سے عاری اور روکھا سا تھا۔

نعمان ٹھٹک سا گیا۔

"کچھ نہیں! یہاں سے گزر رہا تھا' سوچا' ماسٹر صاحب سے ملتا چلوں۔" وہ کھسیا کر بولا۔

"وہ تو گھر پر نہیں ہیں۔" صاف اور سیدھا انداز' انہوں نے پہلے کی طرح اسے اندر نہیں بلایا تھا۔ بلکہ ادھ کھلے دروازے کو یوں پکڑے کھڑی تھیں کہ نعمان جائے تو وہ دروازہ بند کر سکیں۔

نعمان کو الجھن کے ساتھ ساتھ سبکی کا احساس ہوا۔

"میں چلتا ہوں۔ اللہ حافظ۔"

وہ خاموش خاموش سا واپس پلٹ گیا۔

دروازہ آہستگی سے بند ہوا۔

اک آہ آمنہ خاتون کے لبوں تک آنے سے قبل ہی دم توڑ گئی۔ عائشہ نے ماں کو آتے دیکھا۔

"کون تھا؟"

"کوئی نہیں۔ تم نے کھانا کھا لیا۔ تو برتن سمیٹ لو۔ میں اور نہیں کھاؤں گی۔"

عائشہ کو ابھی کھانا تھا۔ مگر ماں کے انداز سے دل اچاٹ سا ہو گیا۔ تب ہی سالن کی پلیٹیں ٹرے میں رکھنے لگی۔

"نعمان اچھا لڑکا ہے۔" ان کا انداز خود کلامی لیے ہوئے تھا۔ عائشہ نے ہاتھ روک کر ماں کو دیکھا۔

"مگر ضروری تو نہیں کہ اس کے اردگرد رہنے والے لوگ بھی اتنے ہی اچھے ہوں۔" وہ سابقہ انداز میں بڑبڑائیں۔

عائشہ کا گمان یقین میں بدلنے لگا۔ بات نعمان کے گھر میں ہی ہوئی تھی۔ جس سے آمنہ اتنی پریشان لگ رہی تھیں۔ مگر کرید نے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ جب تک آمنہ خود نہ چاہتیں۔ عائشہ ان سے کوئی بات نہیں اگلوا سکتی تھی۔ سو خاموشی سے ٹرے اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں پتا ہے فاطمہ! شروع ہی سے میری دوستی عادلہ کے ساتھ زیادہ رہی ہے۔"

نبیلہ کی دھیمی آواز کمرے کی خاموشی میں دھیرے دھیرے ڈول رہی تھی جیسے ہوا کے دوش پر لہراتی پتنگ جو کبھی اوپر جاتی ہے تو کبھی نیچے۔ وہ بھی یادوں کی ڈور تھامے ماضی کے آسمان پر ڈول رہی تھیں۔ فاطمہ اور محسن انہیں خاموشی سے سن رہے تھے۔

وہ وقت جب عادلہ' دلہن بن کر اس گھر میں آئیں۔

جب عریشہ ان کی گود میں آئی۔

ایک ساتھ دیکھے دکھ سکھ کے پل۔

دونوں کی شادی آگے پیچھے ہی ہوئی تھی۔ بس عادلہ کو اللہ نے بہت سالوں کے بعد اولاد کی نعمت سے نوازا تھا۔ تب تک وہ خود دو بیٹیوں کی ماں بن چکی تھیں۔

عادلہ کی ان کی اولاد پر لٹائی جانے والی بے تحاشا محبت۔

کچھ بھی تو نہیں بھولا تھا کہ عادلہ نے یوں رخت سفر بھی باندھ لیا تھا۔

"عادلہ کے جانے سے زیادہ افسوس مجھے اس بات کا ہے کہ وہ جاتے ہوئے اولاد کا دیا دھوکا اور اپنوں کا بخشا دکھ پوری شدت سے محسوس کر کے گئی ہے۔"

"آپ نے ٹھیک کہا۔ عریشہ نے بہت برا کیا۔" محسن نے آہستگی سے کہا۔

"عریشہ تنہا قصور وار نہیں ہے محسن! اس عمل میں باقی تمام لوگ بھی اتنے ہی ذمہ دار ہیں جتنی کہ خود عریشہ۔" نبیلہ کا لہجہ تیز ہوا۔

محسن اور فاطمہ کی نگاہیں آپس میں ٹکرائیں۔

فاطمہ کی نگاہ جھک گئی۔ وہ نبیلہ کی بات پوری طرح سمجھ گئی تھی۔ ان کے والہانہ رویے میں پوشیدہ پچھتاوے کا مطلب بھی سمجھ میں آ گیا تھا۔

"میں نے فاطمہ کا انتخاب بغیر سوچے سمجھے نہیں کیا تھا... مجھے لگتا تھا کہ فاطمہ ایک سمجھ دار اور باشعور لڑکی ہے۔ صحیح اور غلط کا شعور رکھتی ہے چاروں بہنوں میں مجھے فاطمہ سب سے الگ لگتی تھی۔ کیونکہ یہ شروع ہی سے میرے اور عادلہ کے زیادہ قریب رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کم از کم فاطمہ میں وہ خود غرضی نہیں' جو ہماری خاندانی خصوصیت بنتی جا رہی ہے۔" وہ تلخ سے لہجے میں کہتی چلی گئیں۔

"تائی امی۔" محسن نے چونک کر دیکھا۔

فاطمہ کا سر جھکا تھا مگر گود میں رکھے ہاتھوں پر اک بے آواز تواتر سے آنسو گر رہے تھے۔ محسن نے اک طویل سانس لے کر ماں کو دیکھا۔

وہ فاطمہ کی طرف متوجہ نہیں تھیں۔

"آپ نے ٹھیک کہا پھپھو! میں بہت بری ہوں۔"

وہ شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتی چلی گئی۔ اس وقت بہانے گھڑنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ سوائے اعتراف کے کوئی عمل فاطمہ کو سکون نہیں دے سکتا تھا۔

"فاطمہ! برا انسان نہیں... اس کا غلط عمل ہوتا ہے۔ کاش! میری بہو اس غلط عمل کی حصے دار نہ

خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا کمپلیٹ اسلامک پیکیج

کا نیا ایڈیشن قیمت -/750 روپے

کے ساتھ کھانا پکانے کی کتاب

کھانا خزانہ

قیمت -/250 روپے بالکل مفت حاصل کریں۔

آج ہی -/800 روپے کا منی آڈر ارسال فرمائیں۔

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32216361

www.Paksociety.com

بنی۔"

"پھپھو! میں نے امی سے بہت کہا تھا، مگر وہ مانیں ہی نہیں۔ شادی میں اتنے کم دن رہ گئے تھے کہ میں کچھ زیادہ احتجاج بھی نہ کر سکی لیکن اب مجھے لگتا ہے میں نے بہت غلط کیا۔ میں وہ زیور پہننے سے انکار کر دیتی یا کم از کم عادلہ چچی کو بتا ہی دیتی تو انہیں یوں شاک تو نہ لگتا۔"

وہ اب سچ مچ رونے لگی تھی۔

"جانے والی تو چلی گئی اور ہمارے پاس صرف "کاش" رہ گئے ہیں۔" نبیلہ نے افسردگی سے کہا۔

"پھپھو! آئی ایم سوری، مجھے معاف کر دیں۔"

"بیٹا! میں کون ہوتی ہوں معاف کرنے والی۔ اللہ سے معافی مانگو۔" انہوں نے ذرا آگے ہو کر فاطمہ کے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

"میں تمہیں یہ سب کبھی نہ کہتی۔ مگر مجھے لگا کہ تمہیں کم از کم اس بات کا احساس ضرور ہونا چاہیے کہ کبھی کبھار کسی غلط عمل کی پردہ پوشی بہت بڑے المیے کو جنم دیتی ہے۔ اور یوں بھی میں اس بات کی قائل ہوں کہ دلوں میں چھپے شکوے اچھے لفظوں میں شیئر کر لیے جائیں تو پرابلمز نہیں ہوتیں۔"

انہوں نے محسن کو دیکھا۔

وہ مسکرا دیا کہ ہمیشہ کی طرح ماں کی فہم و فراست کا قائل ہو گیا تھا۔

یوں تو سب ہی نبیلہ پر بہت بھروسا کرتے تھے۔ بس اگر نہیں قائل ہوتی تھی تو طیبہ، جو جلے پاؤں کی بلی کی طرح پورے گھر میں چکرا رہی تھی۔ جب سے محسن اور فاطمہ نبیلہ کے کمرے میں گئے تھے۔ اسے کھدبد لگی تھی۔ اگرچہ یہ نئی بات نہیں تھی... وہ دونوں اکثر ہی ماں کے کمرے میں پائے جاتے تھے۔ (ایک اسے ہی توفیق نہ تھی کہ دو گھڑی ساس کے پاس بیٹھ جائے) مگر آج اسے لگتا تھا۔ معاملہ کچھ خاص ہے۔

دروازے سے کان لگانے کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ سب لوگ اتنے مدھم لہجے میں باتیں کرتے تھے کہ صرف بھنبھناہٹ سنائی دیتی۔

وہ جز بز ہوتی، تلملاتی اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گئی۔ تب ہی جمال آ گیا۔

"خیریت تم کسے کچا چبا رہی ہو؟" طیبہ کے چہرے کے تاثرات ہی ایسے تھے کہ جمال کو پوچھنا پڑا۔

"میں نے کسے چبانا ہے۔"

"باقی گھر والے کہاں ہیں؟"

"سٹنگ روم میں۔" وہ جل کر بولی۔

"امی کے کمرے میں۔" جمال ہنس دیا۔

"اور کہاں ہوں گے؟ کمرا بند کر کے تینوں گھس جاتے ہیں۔"

"تو تم بھی چلی جایا کرو۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"ہاں۔ وہ مجھے گھاس نہ ڈالیں اور میں خوامخواہ اندر گھسوں۔ نجانے کون معاملات ہیں۔ جو بند کمروں میں ہی ڈسکس ہو سکتے ہیں۔"

"تم ہر چیز کو نیگیٹو وے میں کیوں لے لیتی ہو۔ فاطمہ بھی تو ہے وہاں۔"

"فاطمہ ان کی اپنی ہے اور میں غیر۔ ہم دونوں کی حیثیت کا تعین کرنے کے لیے یہ فرق ہی کافی ہے۔" طیبہ جل بھن کر بولی۔

جمال کے پاس اس کے بے بنیاد الزامات کا کوئی جواب نہ تھا۔ تب ہی خاموشی سے باہر نکلنے لگا۔

"اب کہاں؟" طیبہ تیزی سے کھڑی ہوئی۔

"آف کورس امی کے پاس۔ تم بھی آ جاؤ۔"

"آپ جائیں۔" وہ دھپ سے واپس بیٹھی۔

جمال مسکراہٹ دباتا چلا گیا۔

دستک دے کر اندر گیا تو تینوں نفوس خاموش اور سنجیدہ بیٹھے تھے۔ فاطمہ کی آنکھیں متورم تھیں گویا روتی رہی ہو۔ اس نے چونک کر تینوں کو دیکھا۔

"آؤ جمال بیٹا۔" نبیلہ بدقت مسکرائیں۔

"کیا ہوا؟" جمال نے فاطمہ کو دیکھا۔ جو اسے دیکھ کر سر جھکا گئی تھی۔

"کچھ نہیں فاطمہ۔ جاؤ بچے! سب کے لیے چائے بنا

لاؤ۔" انہوں نے شفقت سے کہا تو فاطمہ جلدی سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

نبیلہ نے ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیں۔

جمال کو اچانک عجیب سا احساس ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اماں! نکی جملاں اپنی بھینس بیچ رہی ہے؟" کبریٰ دودھ کاڑھنے کے لیے اپلے سلگا رہی تھی۔ بشریٰ کے سوال پر خود بھی سلگ گئی۔

"ہاں۔ بیچ رہی ہے تو نے خریدنی ہے؟"

"کیوں؟"

"دفع ہو جا بشریٰ! میری جان نہ کھا۔ سارا دن لوتھا کی لوتھا یہاں وہاں وڑکیں لگاتی ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی ماں کا ہاتھ ہی بٹا دے... ایسی بے شرم اولاد اللہ کسی کو نہ دے... تیری تائی تو پہلے ہی ہاتھ پاؤں توڑے بیٹھی ہے۔ یوں کام کرتی ہے جیسے مجھ پر کوئی احسان کر رہی ہو۔"

پھونکنی کی دو چار پھونکوں سے اپلے سلگنے لگے... دھوئیں کے مرغولے آسمان کی طرف بلند ہوئے۔ جس میں کبریٰ کا چہرہ دھندلانے لگا تھا۔

"بلو کی فیس دینے کے لیے...؟" بشریٰ پر ماں کی پھٹکار کا کوئی اثر نہ ہوا کہ دل تو ٹھکرائے جانے کا زخم سہہ رہا تھا۔

کبریٰ نے پھونکنی نیچے پٹخی اور کھڑی ہو گئی۔

"یہاں میرے سر پر کھڑی بڑبڑ نہ کر۔ کسی کام کو ہاتھ لگا لے۔ چل جا کے وال چن... سارے کے سارے ویلے، نکھٹے۔"

"تائی اسے افسر بنانا چاہتی ہے... ہم سب کو نیچا دکھانا چاہتی ہے اسے لگتا ہے۔ اس کا بیٹا بڑی اونچی شے ہے۔ اسی لیے میرے رشتے کو منع کیا ہے۔" اس کے لہجے میں اتنی نفرت تھی کہ ایک لمحے کو کبریٰ بھی ٹھٹک گئی۔

"تو ابھی تک اسی بات کو دل سے لگائے بیٹھی ہے

بھلا وہ تیرے قابل بھی تھا... کسی لور کا نہیں۔ چودھری یاسین نے اپنے بیٹے کا رشتہ دیا ہے تیرے لیے... ارے بلو جیسے تو منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔" کبریٰ نے جھک کر چاٹی اٹھائی اور سلگتے اپلوں پر رکھ دی۔

بشریٰ کو اس رشتے سے کوئی خاص خوشی نہ ہوئی تھی۔

حسد، بغض، اور ٹھکرائے جانے کے غم میں مبتلا دل کوئی خوشی محسوس بھی کہاں کر سکتا تھا... وہاں تو صرف دھواں بھرا تھا۔ کڑوا، گاڑھا اور زہریلا دھواں جس نے اس کا پورا جسم نیلو نیل کر دیا تھا۔

"اماں اگر بلو افسر بن گیا تو میں ہر شے کو آگ لگا دوں گی۔"

"جان دے... افسروں کی شکلیں بلو جیسی مسکین اور یتیم نہیں ہوتیں... جس کی شکل دیکھ کر ہی چندہ دینے کو دل چاہے۔" کبریٰ نے بیٹی کو تسلی دی۔

تب ہی باہر کے دروازے سے جملاں اندر آئی۔

"لو جی... یہ گھر تو سرائے ہے سرائے۔ جس کا جب دل چاہے آئے۔ نہ دل چاہے تو نہ آئے۔" کبریٰ نے کمرے طنز سے کہا۔

"ہر وقت مرچیں نہ چباتی رہا کر..." خلاف توقع جملاں مسکرا رہی تھی۔

"خیر ہے... تجھے کون سی خوش خبری مل گئی ہے۔ جو دندیاں باہر آ رہی ہیں۔" کبریٰ نے کمر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ بشریٰ بھی کینہ توز نگاہوں سے تائی کو دیکھ رہی تھی۔

"بلو سے بات کر کے آئی ہوں۔ خوشی تو ہو گی۔ خیر سے اس نے اپنا ٹیلی فون لیا ہے۔ وہ بغیر تار والا نہیں ہوتا موبائل۔"

کبریٰ سن، غبدل کر دودھ کو دیکھنے لگی گویا بات سنی ہی نہیں۔

بشریٰ بھی پاؤں پٹخ کر اندر چلی گئی۔

"آٹا گوندھ لیا، یا میں گوندھوں؟" جملاں

www.Paksociety.com

باورچی خانے کی طرف بڑھی۔
"ابھی ہانڈی چڑھائی ہے۔" کبریٰ نے جھکے انداز میں کہا۔
"اچھا اچھا۔ وہ بھی چڑھا دیتی ہوں۔" جمیلاس نے جاتے جاتے کہا۔
"توبہ اس عورت کی ہر سالا اپنے پتر سے بندھی ہے۔ ذرا اس کی طرف سے اچھی خبر آئی۔ ہواؤں میں اڑتی پھرتی ہے۔"
کبریٰ بڑبڑانے لگی۔ جمیلاس کی خوشی ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔

☼ ☼ ☼

رضوان اس کا دوست تو نہیں البتہ کالج فیلو تھا۔ اسی کی وساطت سے چند اچھے گھرانوں میں ٹیوشنز مل گئی تھیں۔ فیس بھی معقول تھی۔۔۔ شام کو ایک اکیڈمی میں دو پیریڈ لیتا۔
"سر! میں آپ کی فیس لے کر آتا ہوں۔" سامانے کہا تھا۔ "باسط اپنی کتابیں سمیٹ کر چلا گیا۔ وہ اس کے انتظار میں گلاس وال کے قریب جا کھڑا ہوا۔۔۔ نظروں کے سامنے لش گرین وسیع لان دھوپ میں لشک رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے فواروں سے اچھلتا پانی ماحول کی تازگی میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔
"ایسا نہ سہی مگر ایک دن ایک چھوٹا سا خوب صورت گھر ضرور بناؤں گا۔ جس کے کچن میں گیس والے چولہے پر روٹی پکاتے ہوئے ماں کی آنکھیں دھواں دھواں نہ ہوں گی۔"
چوکیدار نے گیٹ کھولا اور گاڑی تیزی سے اندر آئی۔
ابرار لاشعوری طور پر ادھر متوجہ ہوا۔ جدید تراش خراش کے ماڈرن لباس میں ملبوس وہ لڑکی یقیناً "باسط کی بڑی بہن تھی۔ اس کے ساتھ موجود شخص کو دیکھے بغیر وہ پلٹ کر صوفے پر آبیٹھا یوں تاک جھانک کرنا برا لگتا۔
"سنبعہ! جلدی کرنا" ہمارے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔"
"جسٹ آ مومنٹ" تم بیٹھو کر چائے پیو' میں چینج کر کے آتی ہوں۔"
"اوکے۔"
سنبعہ ابرار پر توجہ دیے سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔
جبکہ ابرار ثوبان کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔
"تم۔" ثوبان ٹھٹک گیا۔
"جی انہیں سال سے ٹیوشن پڑھانے آتا ہوں۔"
"سنعیہ میری فرینڈ ہے۔" نجانے کیوں ثوبان خود کو چور سا محسوس کر رہا تھا۔
"جی اور ایسی فرینڈز زندگی میں بہت سی آسانیاں بھی لاتی ہیں۔ ہے نا؟" نہ چاہتے ہوئے ابرار کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ اس کی نگاہ ثوبان کی نئی شرٹ پر تھی۔
"اٹس مائی پرسنل میٹر۔۔۔ بھیجے۔" ثوبان اس کا طنز پا گیا تھا۔
"سوری۔" وہ فوراً مدافعانہ انداز اختیار کر گیا۔
"ویسے تم نے غلط نہیں کہا۔۔۔ یہی بات میں تمہیں بھی سمجھانا چاہتا تھا۔" ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ثوبان نے کہا۔
"میری کچھ بہت چھوٹی ہے ثوبان بھائی! اس میں اتنی بڑی بڑی باتیں نہیں آتیں۔" ابرار نے ہنستے ہوئے باسط کے ہاتھ سے لفافہ پکڑا۔
"اس سے تمہارا سفر مختصر بھی ہو سکتا ہے۔"
"مجھے لمبا سفر تھکاتا نہیں۔۔۔ بس منزل کا یقین ہونا چاہیے۔" وہ مضبوط لہجے میں کہہ کر چلا گیا۔
"عجیب بے وقوف بندہ ہے۔" ثوبان نے اسے دور تک جاتے دیکھا۔
"کون ہے؟" سنبعہ کی آواز پر وہ چونک کر پلٹا۔ وہ وائٹ ٹراؤزر اور ریڈ ٹاپ میں اس کے عقب میں کھڑی تھی۔
وہ مسکرا کر نفی میں سر ہلا گیا۔

☼ ☼ ☼

عرشہ نے کتاب بند کر کے میز پر رکھی اور گردن گھما کر مریم کو دیکھا۔
وہ کمبل اوڑھے بے خبر سو رہی تھی۔
عرشہ کو چائے کی طلب ہونے لگی۔۔۔ ماحول میں سردی کا غلبہ تھا۔۔۔ موسم جاتے جاتے پھر سے پلٹ آیا تھا۔
"کیسی بے خبر سوتی ہے؟" اسے مریم کی بے خبر نیند پر رشک آیا۔
باہر کھٹکا سا ہوا۔ ساتھ ہی بند دروازے کے باہر روشنی سی دکھائی دی۔
"اس وقت کچن میں کون ہو سکتا ہے۔" وہ بیڈ سے نیچے اتری۔ "یقیناً" ثوبان ہو گا۔" وہ دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ کچن میں لائٹ جل رہی تھی۔
"آچھی۔۔۔" کوئی زور سے چھینکا۔
عرشہ تیزی سے کچن کی طرف آئی۔ مگر ابرار کو دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ بھی کھٹکے پر مڑا اور شرمندہ سا ہو گیا۔
"میں پانی لینے آیا تھا۔" اس نے پانی سے بھرا گلاس سامنے کیا۔ عرشہ نے دیکھا اس کا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔
"تمہاری طبیعت خراب ہے؟"
"جی بخار اور زکام ہے۔"
"تو کوئی دوا لو۔"
"آپ کے پاس کوئی ٹیبلٹ ہو تو۔"
"میں نے کیا دواخانہ کھول رکھا ہے۔" عرشہ نے رکھائی سے کہا۔
"تو پھر پوچھنے کی بھی کیا ضرورت تھی۔" وہ ذرا سا بڑبڑایا اور چلا گیا۔
عرشہ کا حیرت سے منہ کھلا پھر ہنسی آگئی۔
"اتنا بھی سیدھا نہیں۔ جتنا ہم سمجھے بیٹھے ہیں۔"
"آدھی رات کو اکیلی کچن میں کھڑی ہنس رہی ہو۔ خدا خیر کرے۔" ثوبان کی آواز پر وہ چونکی۔
"آپ ابھی تک سوئے نہیں۔"
"پڑھ رہا تھا۔۔۔ چائے کا موڈ بنا تو نیچے آگیا۔"
"میں بھی اسی ارادے سے آئی تھی۔"
"تو کافی بنا لاؤ۔ کچھ دیر بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں۔"
"اوکے۔"
ثوبان واپس پلٹ گیا۔ عرشہ نے کافی کے ساتھ ساتھ ایک کپ چائے بنائی۔۔۔ الماری کھول کر بخار کی گولی نکالی۔۔۔ چھوٹی ٹرے میں کپ اور گولی رکھ کر بیٹھک کی طرف آگئی۔ دروازہ کھلا تھا اور تایا کے خراٹے دروازے سے باہر تک آرہے تھے۔ دوسرے پلنگ پر ابرار نیم دراز کپٹی دبا رہا تھا۔
"چائے لے لو۔"
عرشہ کی آواز پر اس نے آنکھیں کھولیں اور تیزی سے سیدھا ہو گیا۔
عرشہ نے ٹرے اس کی طرف بڑھائی۔
گولی پر نگاہ پڑی تو ابرار مسکرا دیا۔
"شکریہ۔"
"ابھی تو خاصی سردی ہے اور تمہارے پاس تو کمبل بھی نہیں۔۔۔" عرشہ کو پلٹتے پلٹتے خیال آیا۔
"موسم بدل گیا تھا تو اماں نے کمبل اتار کر پیٹی میں رکھ دیا۔"
"ہاں صرف تمہارا۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی پچھلے کمرے میں آئی اپنا کمبل اٹھایا اور لے جا کر اس کی پائنتی پر رکھ دیا اور بنا کچھ کہے واپس مڑ گئی۔
ابرار نے حیرت سے کمبل کو دیکھا۔ پھر مسکرا دیا۔
"نیک دل شہزادی۔"

☼ ☼ ☼

"سارے سیاپے میری جان کو ہیں۔ اب اس بیمار کی خدمتیں الگ کروں۔۔۔ میں نے کیا مسافر خانہ کھولا ہے۔"
کام کرتے ہوئے حمیدہ اس کو بڑبڑانے کی عادت تھی اور آج تو ابرار کے لیے دلیہ بھی بنانا پڑ گیا تھا کہ رات سے بخار میں پھنک رہا تھا۔
"کیا ہوا تائی امی؟" عرشہ کالج جانے کے لیے تیار ہو کر آئی۔

www.Paksociety.com

"ہونا کیا ہے، مفت کی مصیبت اور یہ مریم کہاں مر گئی ہے۔ کھانے کے وقت سارے نازل ہو جائیں گے، میری عمر ہے اب صبح سویرے اٹھ کر یہ سیاپے کروں۔" انہوں نے دلیہ پیالے میں انڈیلا۔

"یہ اس مفت خورے کو پکڑا آ۔"

عریشہ نے پیالہ اٹھایا اور چپکے سے کھسک گئی۔ کام کا شوق نہ اسے تھا نہ مریم کو بس مارے باندھے کام کرتیں دونوں۔

"تجھے ہی شوق ہے۔۔۔ کیوں نہیں نعمان کی شادی کرتی۔۔۔ بہو گھر آجائے تو پھر چارپائی پر بیٹھ کر یا شتے کرنا۔۔۔" برکت حسین غسل خانے سے نکل کر کچن میں چلے آئے تھے۔

"توبے اور بیٹوں کو شہہ دو پہلے ہی ہاتھوں سے نکلے جا رہے ہیں۔" انہوں نے پراٹھا زور سے توے پر ڈالا وہ درمیانہ سے پھٹ گیا۔

"ساری عمر گزر گئی۔ آج تک تجھے ڈھنگ کی روٹی بیلنی نہ آئی۔"

عریشہ دلیہ لے کر بیٹھک میں گئی تو ابرار کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

بخار کی شدت سے چہرہ تمتما رہا تھا۔

"تم کہاں جا رہے ہو۔۔۔ اتنا بخار ہے، دوا کھا کر لیٹ جاؤ۔"

"عریشہ بی بی! یہ نخرے ان پر جچتے ہیں۔ جن کے نخرے اٹھانے والے ہوں۔۔۔" وہ ہنسا۔ سفید یونیفارم میں صبح کی پہلی کرن جیسی نکھری نکھری لڑکی نے اس کا مزاج خوشگوار کر دیا تھا۔

عریشہ اس کے جواب پر خاموش سی ہو گئی۔

شاید ماں یاد آگئی تھی۔

"یہ دلیہ غالباً میرے لیے ہے۔" اسے سوچ میں گم دیکھ کر ابرار نے اشارہ کیا۔

"جی۔۔۔" اس نے جھینپ کر پیالہ آگے بڑھایا۔

"شکریہ۔۔۔" ابرار نے تھام لیا۔

"تائی کا ادا کیجیے۔" وہ مسکرائی۔

"میری طرف سے آپ ہی کہہ دیں۔ پچی بات ہے، مجھے تو ان سے بات کرتے ہوئے بھی ڈر ہی لگتا ہے۔"

"وہ بس زبان کی تیز ہیں ورنہ دل کی بہت اچھی ہیں۔" عریشہ ناگواری سے بولی۔

"انسان کا دل اس کے لہجے سے پہچانا جاتا ہے۔۔۔ ورنہ دل میں کس نے جھانک کر دیکھا۔" ابرار کو خود بھی احساس نہ تھا کہ وہ بات کو خوامخواہ بڑھاتا جا رہا ہے۔۔۔ لاشعوری طور پر عریشہ کی موجودگی کے لمحوں کو طول دینا چاہتا ہے۔

"تمہارا مضمون فلسفہ تو نہیں۔" وہ چڑ کر بولی۔

"ارے میں تو یونہی کہہ گیا۔ آپ کو برا لگا۔"

عریشہ بغیر بولے تیوری چڑھا کر مڑ گئی۔

ابرار نے بیٹھ کر دلیے کا نوالہ لیا۔ تو فوراً "شکریہ" واپس لینے کو دل چاہا۔ کیونکہ دلیے میں اگر زیادتی تھی تو نمک کی ورنہ تو ہر چیز کی کمی ہی کمی تھی۔

☼ ☼ ☼

"نانجارو! اب اپنے اپنے کمروں میں نہ گھس جانا۔۔۔ اذان کی آواز سنتے ہی شیطان کی طرح منہ چھپانے لگتے ہو۔ یہ دو قدم کے فاصلے پر مسجد ہے۔" برکت حسین کی آواز پر نعمان جاتے جاتے پلٹا۔ آج جمعہ تھا۔ سو وہ دکان جلدی بند کر آیا تھا۔

"ابا! خود تو ساری زندگی مسجد کی شکل نہ دیکھی اور ہمیں سنا رہے ہو۔"

واش روم سے باہر نکلتے ابرار نے حیران ہو کر نعمان کو دیکھا۔ وہ کس بدتمیزی سے باپ سے بات کر رہا تھا۔

ابرار تولیے سے سر رگڑتا بیٹھک میں آگیا۔

"بکواس بند کر لوئے۔ یہ تو گھٹنوں کے درد نے مار دیا۔۔۔ میں تو جوانی میں جمعہ ہی پڑھ لیتا تھا۔ تمہیں تو وہ بھی نصیب نہیں۔"

"جانے دو ابا! ہماری عمر کے بعد تم نے بھی بڑھاپے میں مسجد کی شکل دیکھی ہے۔" وہ غڑاپ سے کمرے میں گھس گیا۔ برکت حسین بڑبڑاتے رہ گئے۔

ابرار ایک نظر انہیں دیکھ کر باہر جانے لگا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟"

"جمعہ پڑھنے۔۔۔" اس نے آہستگی سے بتایا۔

"ہاں ہاں۔۔۔ اچھا۔ یہ ہوتی ہے نیک اور سعادت مند اولاد۔ ورنہ یہ سال تو۔۔۔"

"بس کریں ماموں! کیوں مجھے اس گھر سے نکلوانا ہے۔ نعمان بھائی کا موڈ آج ویسے ہی خراب لگ رہا ہے۔" ابرار نے مسکراتے ہوئے کنگھا واپس رکھا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔

"ہاں۔۔۔ اسے کمانا جو پڑ گیا ہے۔ موڈ تو خراب ہو گا ہی۔۔۔ ایک ہم تھے، ساری زندگی ان ہی لوگوں پر لٹا دیا۔"

نعمان کو کمرے میں بھی ابا کی آواز آرہی تھی۔ مگر وہ خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔ دل میں اداسی گہرے پنجے گاڑے بیٹھی تھی۔

عائشہ کے گھر کو تالا لگا تھا۔ ماسٹر صاحب سے پتا چلا کہ وہ اپنے ماموں کے گھر گئی ہے۔ دو چار دن رکے گی۔

"کیسی عجیب بات ہے۔ اس کا اس شہر میں ہونا ہی میرے لیے سکون کا باعث ہے۔۔۔ وہ کہیں ہے تو سارا شہر ہی ویران لگ رہا ہے اور اگر وہ زندگی سے چلی گئی تو۔۔۔ تو کیا ہو گا۔" یہ خیال اتنا دہلا دینے والا تھا کہ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"مریم۔۔۔ مریم!"

مریم اس کی آواز پر بھاگی چلی آئی۔ "جی بھائی!"

"اس دن آمنہ خالہ آئی تھیں ممی سے کیا بات ہوئی تھی؟" نعمان کا ذہن ابھی تک آمنہ کے رویے میں اٹکا تھا۔ اس کی چھٹی حس کسی انہونی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

"پتا نہیں۔۔۔ میں تو کچن میں ہی تھی۔ اماں کی ہی بات ہوئی تھی۔" مریم نے حیران ہو کر بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ جاؤ۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کر لیٹ گیا۔ مریم واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ اور عریشہ امتحان کی تیاری کر رہی تھیں۔

"نعمان بھائی کیوں بلا رہے تھے؟" عریشہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ جب سے آمنہ بی بی ہو کر گئی ہیں۔۔۔ ان کے انداز ہی بدلے ہوئے ہیں۔۔۔ سچی بات ہے، مجھے تو دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے۔"

"دال میں سے کالے پیلے تنکے چننے کے بجائے تم پیپرز کی تیاری کرو۔۔۔ جو بھی بات ہو گی، سامنے آہی جائے گی۔"

"عرشی! ہم لوگ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیں گے؟" مریم نے اشتیاق سے پوچھا۔

"اجازت ملے گی تو لے لیں گے۔" عریشہ نے لاپروائی سے کہا۔

"اور اگر نہ ملی۔"

"تو نہیں لیں گے۔" وہ کہہ کر خود ہی ہنسنے لگی۔ مریم نے اسے گھورتے ہوئے کتاب کھول لی۔

☼ ☼ ☼

خوب صورت چاندنی میں ڈھلی رات تھی۔۔۔ ستارے مدھم مگر چاند خوب روشن تھا۔ فضا میں موجود خنکی جسم و جاں پر نشاط انگیز کیفیت طاری کر رہی تھی۔ ہوا جو ایسے لمحوں میں ہمیشہ خوشبو چرا لاتی۔ خوشبو جو ان کہی کو کہی میں بدل دیتی۔ بند لبوں کا سندیسہ دوسرے کے دل تک پہنچا دیتی۔

سامنے چھوٹی دیوار پر دو مگ رکھے تھے جس میں سے اٹھتی کافی کی مہک اور بھاپ دونوں ہی معدوم ہونے کو تھیں۔

وہ ایک ہاتھ دیوار پر ٹکائے ذرا سا چہرہ اوپر اٹھائے چاند کو دیکھ رہی تھی۔۔۔ اس کے کھلے بال ہوا کی شرارت سے ہولے ہولے لہرا رہے تھے۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"چاند کتنا قریب لگ رہا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ وہ تو ہے۔" عریشہ نے رخ موڑ کر اسے دیکھا اور جھینپ گئی۔۔۔ ثوبان اسی کو دیکھ رہا تھا۔

"اور خوب صورت بھی۔" وہ شرارت سے بولی۔

"ہاں وہ تو ہے۔" ثوبان سابقہ انداز میں گویا ہوا۔ "بہت مقدس اور ان چھوا سا۔"

"ہاں وہ تو ہے۔" ثوبان نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھونا چاہا۔ وہ کترا گئی اور مگ اٹھا کر ثوبان کی طرف بڑھا دیا۔
"کافی تو ٹھنڈی ہو گئی۔"
ثوبان نے اسے گھور کر مگ تھام لیا۔
وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔
پانی پی کر اپنے بستر کی طرف جاتی حمیداں چونک گئیں۔ انہوں نے رک کر کمرے میں جھانکا۔
عریشہ کا بستر خالی تھا۔
وہ مسکرا کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔
فکر ہوتی بھی تو کیوں؟
ان کی اپنی بیٹی سکون سے سو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

بہت گہرا کنواں تھا' اتنا گہرا کہ جب بھی جھک کر دیکھو۔۔۔ نگاہ گھنی تاریکی سے ٹکرا کر لوٹ آئے۔ اس نے ڈول کنوئیں میں پھینکا۔
بہت دور جا کر وہ پانی کی سطح سے ٹکرایا اور ڈوبا۔
وہ دیوانہ وار رسی کھینچنے لگا۔ ڈول اتنا بھاری ہو چکا تھا کہ وہ ہانپ ہانپ گیا۔
پیاس سے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اور رسی تھی کہ کھینچی نہیں جا رہی تھی۔ اس کی ہتھیلیاں چھلنے لگیں تب کہیں جا کر ڈول اس کی پہنچ تک آیا۔
اس نے بے تابانہ پانی پینا چاہا مگر ششدر رہ گیا۔
ڈول بالکل خالی تھا۔ اس میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔
ڈول اس کے ہاتھوں سے پھسلا اور دور بہت دور جا کر پانی کی سطح سے ٹکرایا۔
ابرار ایک دم نیند سے اٹھ بیٹھا۔
گرمی اور حبس' جسم کے ایک ایک مسام سے بہتا پسینہ۔
اس نے حیرت سے اپنی ہتھیلیاں دیکھیں۔ جن میں اب بھی درد ہو رہا تھا۔
اس نے گردن موڑ کر برکت حسین کی طرف دیکھا۔ وہ منہ کھولے گہری نیند میں تھے۔
کمرے کی فضا میں اتنی گرمائش تھی کہ وہ چادر اتار کر بے اختیار ننگے پاؤں باہر نکل آیا۔
کھلی فضا میں لمبے لمبے سانس لینے سے طبیعت کچھ بحال ہوئی۔
واپس کمرے میں جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ذہن اسی خواب میں الجھا تھا۔
"کیا یہ پیاس ہی میرا مقدر ہے؟" اس نے تیسری سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے سوچا۔
"کیا میری کوششیں کبھی بار آور ثابت نہ ہوں گی۔" چھٹی سیڑھی پر مایوسی نے سر اٹھایا۔
"نہیں' مجھے ناامید نہیں ہونا۔ میری کوشش' میرا ارادہ کمزور سہی۔ مگر میری ماں کی دعائیں اور میرے رب کی رحمت بے پایاں ہے۔" آٹھویں اور آخری سیڑھی پر اس نے اپنی مایوسی کو کچلنا چاہا۔ مگر رک گیا۔ قدم اپنی جگہ منجمد ہو گئے۔
سامنے چاندنی میں ڈھلی رات تھی۔
رات کی تاریکی میں مدغم ہوتے دو سائے۔۔۔ جو ایک دوسرے سے دور مگر ہوا کے آنچل پر سرگوشیاں کاڑھتے۔
اک شوخ مترنم ہنسی۔
کانسی کے تھال میں گرتے چاندی کے سکے۔
وہ خاموشی سے واپس لوٹ آیا۔
ہتھیلیوں میں پھر سے درد اٹھنے لگا تھا۔
نجانے کیوں؟
مگر اک درد دل میں بھی جاگ اٹھا تھا۔

☆ ☆ ☆

رو رو کے جمیلاں نے اپنی آنکھیں سجا لی تھیں۔
بین تھے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتے۔
اس کی بھینس مر گئی تھی۔ کسی نے اس کے چارہ میں زہریلی دوا ملا دی تھی۔ گاؤں کا گاؤں افسوس کے لیے امڈ آیا تھا۔ کبریٰ سب کو تسلی دیتے دیتے عاجز آ گئی تھی۔

"ہم تو اس سے بھینس خریدنے والے تھے۔۔۔ اصغر نے تو پیسے بھی اکٹھے کر لیے تھے۔"
"کسی دشمن کی چال ہے۔۔۔ میں تو کہتی ہوں جمیلاں! کھوجی کو بلاؤ۔ پولیس کو خبر کرو۔ یہ کوئی چھوٹا جرم تو نہیں۔" کسی ہمسائی نے مشورہ دیا۔
کبریٰ گھبرا کر اٹھی اور اندر چلی گئی۔
"رہنے دو ہمیں نہیں پڑنا ان پولیس کچہریوں کے چکر میں۔" کبریٰ نے تڑخ کر کہا۔
"تیری بھینسیں بھی ادھر ہی تھیں۔ آخر اس بچاری کے ساتھ ہی یہ ظلم کیوں ہوا؟" ہمسائی چمک کر بولی۔ "اس کی تو آخری پونجی بھی لٹ گئی۔"
گم صم بیٹھی جمیلاں کے کمزور وجود میں پھریری سی اٹھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر اپنی ہمدرد کو دیکھا۔
"میری پوچھو تو میرا پتر ہے حلیمہ۔ یہ تو اس کے سر کا صدقہ نکل گیا۔۔۔ دشمنوں کو لگتا ہے وہ اس طرح میرے بیٹے کی راہ روک لیں گے۔۔۔ ایسا نہیں ہو گا۔ تو دیکھنا ان ہی گلیوں میں وہ اپنی گڈی میں بیٹھ کے آئے گا اور دشمن منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔"
"پر تو کھوجی۔۔۔"
"نئیں میں نے اپنا حساب اللہ پر چھوڑا۔ وہ خود ہی انصاف کرے گا۔ تو دیکھنا میرے جیتے جی کرے گا۔"
اس کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا کہ کبریٰ اندر ہی اندر کٹ کر رہ گئی۔
لوگ ایک ایک کر کے آتے رہے' جاتے رہے۔
گھر خالی ہوا تو جمیلاں سر شام اپنے کمرے میں گھس گئی۔
اس کا دکھ کم ہونے میں ہی نہ آ رہا تھا۔
اصغر خود عاجز آ گیا تھا۔ رات کو کبریٰ پر برس پڑا۔
"جانتا ہوں۔۔۔ تجھے بڑا جلاپا ہے۔ پر ایسی بھی کیا دشمنی۔ لے کے ایک بے زبان جانور کو مار ڈالا۔"
"کیا۔۔۔ کیا کہہ رہا ہے تو؟" کبریٰ ہکا بکا رہ گئی۔
"تیری رگ رگ سے واقف ہوں۔ پر اب جو تو نے کیا ہے۔ یاد رکھ رب بھی نہیں بخشے گا۔"
"ہوش کی دوا لے اصغر! تو مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔"
وہ تڑپ اٹھی۔
"میں نے کھرا کیوں نہیں نکلوایا؟ پتا تھا مجھے یہ کھرا میرے گھر تک آئے گا۔"
"خدا کا خوف کر' کیوں اپنی طرف سے گھڑتا جا رہا ہے۔ ہاں مجھے زہر لگتا ہے بلو۔ اس کی پڑھائی۔ پر بچے کے ساتھ میری کیا دشمنی تھی۔"
"بہت برا کیا تو نے کبریٰ بہت ہی برا۔" وہ تاسف سے سر ہلاتا چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔
کبریٰ غصے سے اسے گھورتی رہ گئی۔ جیسے سمجھ نہ پا رہی ہو۔ وہ اصغر کی غلط فہمی دور کرے بھی تو کیسے۔

☆ ☆ ☆

"یہ تو ظلم ہے۔" نبیلہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ابرار نے چائے کے کپ سے نظریں ہٹا کر انہیں دیکھا۔
"یہاں تو ہر روز انسانوں کو زہر پلایا جاتا ہے۔۔۔ خالہ! آپ ایک جانور کے لیے پریشان ہو رہی ہیں۔"
"پھر بھی ابرار بیٹا۔۔۔"
"چھوڑیں خالہ! انہیں لگتا ہے کہ وہ اس طرح میرا رستہ روک لیں گے۔"
"کیسی عجیب بات ہے۔ یہ تمہارے اپنے ہیں؟"
"میں اپنے گھر سے خالی ہاتھ نکلا تھا خالہ۔۔۔ صرف اس ذات کے آسرے پر۔۔۔ مجھے اب بھی یقین ہے۔۔۔ رستہ کٹھن سہی مگر ان شاء اللہ منزل ضرور ملے گی۔ بس اماں نے بہت ٹینشن لے لی ہے۔"
نبیلہ اس باہمت نوجوان کو دیکھ کر رہ گئیں۔ دوسرے لمحے وہ ایک فیصلہ کر چکی تھیں۔
"سنو ابرار بیٹا! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔۔۔ اس دنیا میں اچھے برے سب ہی لوگ ہوتے ہیں۔ مگر ایک انسان ہی دوسرے انسان کا آسرا بنتا ہے۔ تمہاری خودداری مجھے بہت عزیز ہے۔ مگر میں نے تمہیں بیٹا کہا ہی نہیں سمجھا بھی ہے۔۔۔ اور ماں بیٹے میں کوئی انا نہیں ہوتی۔"

www.paksociety.com

ابرار کسی حد تک ان کی بات کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔
"میں چاہتی ہوں۔ تم یہاں میرے پاس شفٹ ہو جاؤ۔ کچھ دنوں تک جمال اور طیبہ واپس چلے جائیں گے۔ میں سمجھوں گی میرا ایک بیٹا گیا تو دوسرا آگیا۔"
"لیکن خالہ۔" وہ متذبذب تھا۔
"ابرار وہاں تمہیں سازگار ماحول نہیں ملے گا۔ تم یہاں سکون سے پڑھ سکتے ہو۔"
"خالہ! جب مجھے وہاں رہنا مشکل لگا تو میں آپ ہی کے پاس آؤں گا۔"
"وعدہ کرتے ہو؟"
"جی۔" وہ کھل کر مسکرا دیا۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ اس نے نبیلہ کی بات کیوں نہیں مانی۔

☆ ☆ ☆

بے پایاں خوشی کا احساس دل میں گھر کر گیا جب نعمان نے پورے پانچ دنوں کے بعد اس گھر کا دروازہ کھلا دیکھا۔ یہ تو وہی جانتا تھا کہ یہ پانچ دن اس کے لیے پانچ صدیوں کے برابر تھے۔
اس نے بے اختیار دروازے پر دستک دی۔
وہ اس وقت سب کچھ بھول گیا تھا۔ آمنہ خاتون کے لیے کارو کھا پن بھی دروازہ انہوں نے ہی کھولا۔
"اندر آجاؤ۔" اس کے سلام کا جواب دے کر انہوں نے سنجیدگی سے کہا اور رستہ چھوڑ دیا۔ چھوٹا سا صحن عبور کر کے کمرے میں بیٹھنے تک اس کی نگاہیں ادھر ادھر بھٹکتی رہی تھیں۔
"بیٹھو۔"
وہ خود بھی سامنے بیٹھ گئیں۔
"آپ لوگوں نے بہت دن لگا دیے۔"
"جانا بھی تو بہت عرصے کے بعد ہوا تھا۔ میرا بھائی تو اب بھی نہ آنے دے رہا تھا۔ عائشہ کے اسکول کا مسئلہ نہ ہوتا تو شاید کچھ دن اور رک جاتے۔" وہ مسکرائیں۔
نعمان نے شکر کیا۔
"چائے پیو گے؟"

ان کا انداز ایسا تھا کہ جیسے نعمان کو انکار ہی کرنا چاہیے۔ مگر اس نے تیزی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"عائشہ بیٹا! چائے لے آؤ۔" انہوں نے اونچی آواز میں کہا۔
نعمان کا پورا دھیان اندر پر جا بیٹھا۔
"گھر میں سب خیریت ہے؟"
"جی۔ بالکل۔" وہ چونکا اور کھسیا کر ان کی طرف متوجہ ہوا۔ دل ہی دل میں خود کو سرزنش بھی کی۔
"آپ کی طبیعت ٹھیک رہی؟"
"ارے بیٹا! انسان جب اپنا فرض ادا کر دے تو ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔"
"جی بالکل۔" نعمان نے بالکل دھیان نہ دیا کہ وہ کس فرض کی بات کر رہی ہیں۔ اس کی ساری توجہ اندر آتی عائشہ کی طرف ہوئی۔ جو غالباً پہلے ہی چائے بنا چکی تھی۔
"کہاں تو میں عاشی کے لیے اتنا پریشان تھی اور کہاں اللہ نے ایک پل میں سب بنا دیا۔ منگنی چھوڑ نکاح ہی کر دیا۔" انہوں نے نظریں چراتے ہوئے خود ہی بتا دیا۔
ہاتھ نعمان کا لرزا تھا یا عائشہ کا۔
مگر چائے سفید کرتے کو داغ داغ کرتی چلی گئی۔
"اوہ! تمہارے تو کپڑے خراب ہو گئے۔"
ان کا انداز سراسر مصنوعی تھا۔ عائشہ نے حیرت سے اس کو دیکھا۔
"نکاح کس کا نکاح؟" نعمان کھڑا ہو گیا تھا۔
"اپنی عائشہ کا۔ اس کے ماموں کے جاننے والے تھے سارا انتظام بھی انہوں نے ہی کیا۔" نعمان کا پورا وجود گہرے سناٹے میں ڈوب گیا۔
وہ صرف آمنہ کے ہلتے لب دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے عائشہ کو دیکھا۔ وہ گردن جھکائے چائے کی پیالی میں جھانک رہی تھی۔ وہ اس کے تاثرات نہ دیکھ سکا۔
"مبارک ہو آپ کو۔" ایک اجنبی سی آواز اس کے لبوں سے نکلی اور وہ عائشہ کے قریب سے نکلتا چلا گیا۔

آمنہ اپنی جگہ پڑھتے سی گئیں۔
عائشہ نے ایک شاکی سی نگاہ ماں پر ڈالی اور تیزی سے پلٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

عریشہ نے دو مگ ٹرے میں رکھے۔ کافی کی مہک اور ثوبان کی باتیں اب نشے کی صورت اختیار کر گئی تھیں۔ ایک دن بھی ناغہ ہوتا تو ساری رات نیند نہ آتی۔ محبت کی خوب صورت وادیوں میں ثوبان کا ہاتھ تھام کر وہ اتنی دور نکل چکی تھی کہ واپسی یا دوری کا تصور تو ایک طرف شائبہ تک نہ تھا۔ ٹرے اٹھا کر ہولے ہولے گنگناتی وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔
مگر ٹھٹک کر رک گئی۔
مگ آپس میں ٹکرائے اور کافی ٹرے میں چھلک گئی۔
وہ سیڑھیوں پر ایک سائے کی صورت بیٹھا تھا۔
"تم۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" عریشہ نے اپنے دھڑ دھڑاتے دل کو سنبھالا۔
"کچھ نہیں۔ اندر گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے یہاں آکر بیٹھ گیا۔" ابرار نے سادہ سے لہجے میں وضاحت دی۔ حالانکہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ کچن میں ہوتی کھٹ پٹ پر وہ کیوں اتنا بے چین ہوا کہ اسے یہاں آکر بیٹھنا پڑا۔
"آپ رستہ دو گے؟" وہ چڑ گئی۔
وہ خاموشی سے اٹھا۔ ایک ایک سیڑھی اترتا اس کے مقابل آکھڑا ہوا۔
"میں کون ہوتا ہوں۔ آپ کا رستہ روکنے والا۔ لیکن عریشہ۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے پہلی بار عریشہ کا نام لیا تھا۔
"کیا ٹھیک نہیں ہے۔"
"مرد اور عورت کی تنہائی میں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔" وہ اتنی بڑی بات کتنی آسانی سے کہہ گیا کہ ایک پل کے لیے خود بھی ٹھٹک سا گیا۔
"تم۔۔۔ تمہاری یہ جرأت۔" غصے سے عریشہ

کانپ کانپ گئی۔
"شش۔" ابرار نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ "آپ کو پروا نہیں لیکن مجھے آپ کی عزت بہت پیاری ہے۔"
عریشہ نے بولنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔
عریشہ جانتی تھی کہ آنے والا نعمان ہو گا۔ تب ہی غصے سے ابرار کو گھورتی تیزی سے اوپر چلی گئی۔
ابرار نے تاسف سے اسے جاتے دیکھا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔
نعمان کوئی بھی بات کیے بغیر خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

کچھ وقت خاموشی سے کھسک گیا۔
عریشہ کا گھر کرائے پر چڑھا دیا گیا تھا۔
بی اے کے بعد دونوں نے بی ایڈ میں ایڈمیشن لے لیا۔ جس پر مریم نے خاصا واویلا کیا۔ کیونکہ وہ ماسٹرز کرنا چاہتی تھی۔ مگر اجازت ہی نہیں ملی۔ ثوبان کا ایم بی اے مکمل ہوا تو فوراً ہی جاب مل گئی۔ جس پر حمیدہ فخر سے گردن اکڑائے پھرتی تھیں کہ ان کے بیٹے کو بغیر سفارش کے نوکری مل گئی۔ یہ صرف ابرار جانتا تھا کہ وہ منیبہ کے والد کی کمپنی میں جاب کر رہا ہے۔ خود ابرار کا سفر اس کی محنت اور نبیلہ کی مدد سے منزل کے قریب تر ہو رہا تھا۔ اسے وہ وقت دور نہ لگتا جب وہ اپنی ماں کو شہر میں چھوٹے مگر خوب صورت گھر میں رکھے گا۔
گزرتے وقت سے نعمان کو صرف خاموشیاں ملی تھیں۔ اس کے بعد حمیدہ نے کبھی اس کے منہ سے شادی کا لفظ نہ سنا تھا۔ اس کے اندر کیا تھا۔ یہ اس کی ماں نہیں جان سکتی تھی۔
عریشہ اور مریم نے جس بی ایڈ کالج میں ایڈمیشن لیا۔ وہاں کو ایجوکیشن تھی۔ کلاس میں ایک طرف لڑکے بیٹھتے دوسری طرف لڑکیاں۔ عریشہ نے کبھی یہ بات

نوٹ نہیں کی کہ مریم ہمیشہ اسی رو میں کیوں نظر آتی ہے؟ جو لڑکوں کی قطار سے قریب ہوتی۔ دوسری طرف سارے لڑکے مریم کے قریب والی سیٹ فقد کے کیوں چھوڑ دیتے تھے اور یہ بھی کہ مریم کالج جانے سے پہلے اتنی تیاری کیوں کرتی تھی۔ اسے تو زندگی میں دو چیزوں سے دلچسپی تھی۔

اپنی پڑھائی اور ثوبان۔

حالانکہ حمیداں اکثر دبے لفظوں میں جتا چکی تھیں کہ اسے اتنا پڑھ کر کرنا کیا ہے۔ مگر اس معاملے میں پھپھو نے نہ تائی کی چلنے دی نہ عرشہ کی۔ ہمیشہ عالیہ کی مثال سامنے رکھتیں۔ جس نے مشکل حالات میں جاب کے ذریعے اپنی اور بیٹی کی کفالت کی۔

دونوں کالج سے واپس آئیں تو بانو آئی بیٹھی تھی۔

"السلام علیکم بانو آپا۔"

مریم کی تو یوں بھی بانو سے کبھی نہ بنی تھی۔ بس مارے باندھے مڑ گئی۔

بانو نے ناقدانہ نظروں سے مریم کا جائزہ لیا۔

"یہ تم فیشننگ کا کورس کر رہی ہو یا بیوٹی پارلر کا؟"

"بیوٹی پارلر کا۔" مریم بے دھڑک کہتی کمرے میں چلی گئی۔ عرشہ تاسف سے سر ہلاتی پیچھے تھی۔

"اماں! دیکھ رہی ہو۔ اس کے تیور۔"

"شروع ہی سے ایسی ہے۔" حمیداں نے لاپروائی سے کہا۔

"شروع سے نہیں ہے۔ اب اس کے لچھن بدل رہے ہیں۔ کچھ چارہ کر لو۔ ورنہ سر پکڑ کر روؤ گی۔" بانو نے ڈرانا چاہا۔

"چارہ میں نے کرنا ہے۔ تم تینوں کیا سسرال میں بیٹھی بوٹیاں کاٹ رہی ہو۔ کرو کوئی چارہ۔ میں اب اس عمر میں کہاں کہاں دھکے کھاؤں۔ یہ ایک رہ گئی ہے۔ کچھ کر کرا کے میرے سر سے بوجھ اتارو۔" حمیداں بےزاری سے بولیں۔

"لائی تو تھی رشتہ۔ اب تم لوگوں کو پسند ہی نہیں آیا تو میں۔"

"لو۔ نہیں مانتی تمہارے دیور کے لیے تو میں کیا

کروں۔ کہتی ہے وہ کریلے کی شکل والا میرے لیے ہی رہ گیا ہے۔"

"تو خود کیا ہے۔ کالی توری۔ اس کے لیے کون سا شہزادہ آئے گا۔" بانو کو تو آ گیا۔

"اب کیا کروں' چار جماعتیں جو پڑھ لی ہیں۔"

"ہاں اور پڑھاؤ۔ استانی بن گئی تو کون سا کسی پروفیسر کا رشتہ آئے گا اس کے لیے۔" بانو کا طنزیہ لہجہ سنتے ہی مریم کمرے کے دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔

"آپی سکتا ہے۔ تم میرے لیے زیادہ پریشان نہ ہوا کرو۔" وہ بدلحاظی سے گویا ہوئی۔

"توبہ۔ کیسی گز لمبی زبان ہے۔ ایسی زبان والیاں سسرال میں کہیں بستیں۔"

"تم بس گئیں تو میں بھی بس جاؤں گی۔"

"جلو گی تو بسو گی۔ مجھے تو لگتا ہے ساری عمر ماں باپ کے سینے پر مونگ ہی دلو گی۔"

"تمہارے سینے پر تو نہیں دلوں گی۔"

حمیداں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ دونوں میں سے چپ کروائیں تو کس کو۔

عرشہ گھبرا کر باہر نکلی اور مریم کو بازو سے پکڑ کر لے گئی۔

"یہ بات کرنے کا کون سا طریقہ ہے؟"

"تم مجھے طریقے مت سکھاؤ۔" مریم غصے سے بازو چھڑا کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"تم بانو آپا سے اتنا چڑتی کیوں ہو۔ بڑی بہن ہیں۔"

"اپنے دیور کے لیے میرا رشتہ مانگتی ہیں۔"

"تو۔ ؟ اچھا خاصا ہے۔"

"تو تم کروا لو۔"

"تم بھی نا۔" عرشہ ہنستی ہوئی سامنے بیٹھی۔

"ہاں۔ تم نے تو آرام سے میرے بھائی پر نظر رکھی ہے۔ اور میرے لیے رہ گیا۔ بانو آپا کا دیور۔" مریم نے گویا کونین جیت لی۔

"فضول تو مت بولو۔" عرشہ کو برا لگا تو اٹھ کر باہر نکل گئی۔ جہاں بانو برقعہ پہنے جانے کو تیار تھی۔

"ارے بانو آپا! آپ کہاں جا رہی ہیں۔" عرشہ

بوکھلا کر اسے روکنے لگی۔

"بس رہنے دو۔ بڑی بے عزتی کروالی۔ اور بتا دینا اس جینکن کے منہ والی کو' میرا دیور بھی اس کے انتظار میں نہیں بیٹھا۔ ایک ماہ کے اندر اندر اس کی شادی نہ کی تو میرا نام بانو نہیں۔" دوپٹہ منہ پر ہاتھ پھیرتی باآواز بلند کہتی چلی گئی۔

"شکر ہے۔" مریم باہر نکلی۔ حمیداں نے کھا جانے والی نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔

"تیرے کلیجے میں تو ٹھنڈ پڑ گئی۔"

"جی۔" وہ ڈھٹائی سے کہہ کر کچن میں گھس گئی۔ کالج سے آکر کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔

"اللہ معاف کرے۔ سگی بہنیں ہیں۔ مگر انداز سارے دشمنوں والے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی عرشہ کی طرف متوجہ ہوئیں اور جھنجلا کر بولیں۔

"اب تو میرے سر پر کھڑی کیا کر رہی ہے۔ جا کر کھانا کھالے۔"

عرشہ کلس دبا کر کھسک لی۔ تائی خاصی غصے میں تھیں۔ کچن میں مریم گنگناتے ہوئے کھانا نکال رہی تھی۔ گویا اس پورے ہنگامے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

"عرشی! میں چاہتی ہوں۔ اب تمہاری شادی ہو جائے۔" نبیلہ کی بات پر فرینچ فرائز کھاتی عرشہ نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر انہیں دیکھا۔ وہ آج صبح سے ان کی طرف آئی ہوئی تھی۔ حمیداں کی پوری کوشش ہوئی کہ وہ نبیلہ کی طرف نہ جانے پائے۔ مگر نبیلہ کا دل جب بل چاہتا۔ اسے اس بلا لیتیں۔

"تم نے کچھ کہا نہیں۔" نبیلہ نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی تھی۔

"میں کیا کہوں؟ تایا جان اور تائی جی کو پتا ہوگا۔" اس نے بظاہر لاپروائی سے کہا۔ مگر لبوں پر مسکراہٹ سی آگئی۔ جب سے ثوبان کی جاب ہوئی تھی۔ اس کے سپنے کچھ اور رنگین ہو گئے تھے۔

"انہیں پتا ہوتا تو دکھ کس بات کا تھا۔" نبیلہ بڑبڑائیں۔

"بہرحال ایک دو رشتے ہیں میری نظر میں۔ کسی دن آتی ہوں بات کرنے۔"

"مگر پھپھو۔" عرشہ نے پلیٹ ہاتھ سے رکھ دی۔

"کچھ کہنا چاہتی ہو۔۔۔؟"

"میرا مطلب ہے۔ باہر رشتے دیکھنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ تائی ہمیشہ۔" وہ جھجک گئی۔

"کیا ہمیشہ۔۔۔؟"

"میں اور ثوبان۔۔۔" عرشہ نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ نبیلہ کچھ لمحے خاموشی سے اسے دیکھتی رہیں۔ شاید ذہن میں عالیہ کی باتیں گونجنے لگی تھیں۔ عالیہ کبھی بھی عرشہ کی شادی اس گھر میں کرنے کے حق میں نہیں تھیں۔

"انہوں نے تم سے کبھی بات کی؟"

"وہ تو اکثر ہی ذکر کرتی ہیں۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے؟"

"وہ ثوبان پہلے سیٹ ہونا چاہتا تھا۔" عرشہ کا لہجہ و انداز صاف بتا رہا تھا کہ وہ خود کس حد تک انوالو ہے۔

"شاید ان حالات میں یہی مناسب ہو۔" نبیلہ نے سوچا۔

"اب تو اس کی جاب بھی ہو گئی ہے۔ وہ خود بھی باہر جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ اب تو دیر نہیں ہونی چاہیے۔"

"باہر کون جا رہا ہے؟" عرشہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ثوبان ہی پلاننگ کر رہا ہے۔ تم سے ذکر نہیں کیا؟"

"نہیں تو۔ آپ کو مغالطہ ہوا ہوگا۔"

"نہیں۔ ثوبان نے خود جمال سے ساری انفارمیشن لی تھی۔"

"اچھا۔۔۔!" وہ اب بھی بے یقین تھی۔ تب ہی فاطمہ چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں زیور کا ڈبہ تھا۔

"پھپھو۔۔۔"

www.Paksociety.com

"آؤ فاطمہ...." وہ فاطمہ کے ہاتھ میں ڈبہ دیکھ کر سمجھ گئی تھیں کہ وہ کس مقصد کے لیے آئی ہے۔

"پھپھو! یہ عریشہ کا زیور.... میں مزید یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔" اس نے ڈبہ عریشہ کی طرف بڑھایا۔ عریشہ بدک کر پیچھے ہوئی۔

"نہیں فاطمہ آپی! یہ زیور نہیں۔ زہر ہے، جو میں نے اپنے ہاتھوں اپنی ماں کو دیا تھا۔"

"ایسا مت کہو عرشی! یہ زیور نہیں۔ تمہاری ماں کے ارمان ہیں۔" نمیلہ نے سمجھایا۔

"پھپھو! انہیں آپ اپنے پاس رکھیں۔ عریشہ کی شادی پر دیجیے گا۔"

"آپ نہیں جانتیں۔ میں جب جب یہ زیور دیکھوں گی۔ تب تب اپنی غلطی یاد آئے گی۔" وہ رونے لگی۔

"بس بیٹے! اب رونے کا کوئی فائدہ نہیں۔" نمیلہ نے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

"فاطمہ! آخر تم لوگوں کا ارادہ ثوبان اور عریشہ کی شادی کا ہے تو انتظار کس بات کا....؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں پھپھو! امی کو پتا ہوگا۔"

"اچھا میں آتی ہوں کسی دن اور اس سلسلہ میں بات کرتی ہوں۔" وہ عریشہ سے مخاطب تھیں۔ عریشہ کا ذہن پھر سے ثوبان کے باہر جانے پر اٹک گیا۔

"آخر ثوبان نے مجھ سے اتنی بڑی بات کیوں چھپائی؟"

☼ ☼ ☼

مریم کو ہمیشہ سے ثوبان کی یہ عادت زہر لگتی تھی کہ وہ کھانے کا کہہ کر اوپر چلا جاتا.... وہ ہمیشہ بڑبڑاتی۔ مگر اب یہ ڈیوٹی آرام سے عریشہ نے سنبھال لی تھی۔

"ایک تو اماں نے شروع سے انہیں سر پر چڑھایا ہے۔ اوپر سے تم ان کے نخرے اٹھاتی رہا کرو۔ مستقبل میں مسئلہ ہو جائے گا۔"

اسے ٹرے سجاتے دیکھ کر مریم نے کہا۔ تو وہ ہنس دی۔

"مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"

"ایسے کون سے لاٹ صاحب ہیں۔ جو کچن میں آکر کھانا نہیں کھا سکتے۔ ایک نوکر تو مستقل ان ہی کے لیے چاہیے۔ باہر چلے گئے تو خود پکا کر کھانا پڑے گا۔"

عریشہ نے چونک کر مریم کو دیکھا۔ گویا اس کے سوا سب ہی اس بات سے باخبر تھے۔ پھر ٹرے اٹھا کر اوپر چلی گئی۔ ثوبان فریش ہو کر نکلا تھا۔ عریشہ نے ٹرے اس کے سامنے رکھی۔

"خیریت! موڈ کیوں خراب ہے؟"

"آپ آج کل ہوتے کہاں ہیں؟"

"تمہیں بھی پتا ہے نئی نئی جاب ہے۔" اس نے کف الٹا۔

"اور باہر جانے کی تیاری بھی تو ہے۔ مصروفیت تو ہو گی۔" ثوبان نے بغور عریشہ کو دیکھا۔

"تو تمہیں پتا چل گیا۔"

"آپ کو چھپانا تھا اور وہ بھی صرف مجھ سے۔" وہ برہم تھی۔

"عرشی! تم سے چھپا کر میں نے کہاں جانا ہے۔ بیٹھو، بیٹھ کر بات کر لو۔ تم تو تلوار سونت کر کھڑی ہو گئی ہو۔"

عریشہ نروٹھے پن سے بیٹھ گئی۔

"میں کون سا ابھی جا رہا ہوں.... ابھی تو صرف خیال ظاہر کیا ہے۔ باہر جانے کے لیے ڈھیر سارے پیسے لگتے ہیں۔"

"اچھی بھلی آپ کی جاب چل رہی ہے، آپ نے باہر جا کر کرنا بھی کیا ہے۔"

"یہ جاب مجھے وہ سب نہیں دے سکتی جو میں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"دراصل ثوبان! آپ کے خوابوں کی اڑان ہے ہی بہت اونچی.... ورنہ پڑھ لیا، جاب مل گئی۔ اب اور کیا چاہیے۔"

"میں آسمان چھونا چاہتا ہوں، عریشہ! زندگی میں یہی سب کچھ نہیں ہوتا۔"

"ٹھیک کہا.... زندگی میں اور بھی بہت کچھ ہے۔

لیکن سب کچھ ہمارے لیے نہیں ہوتا۔"

"کیوں ان کے سروں پر سینگ ہیں۔ جو بڑی گاڑیوں میں گھومتے اور شاندار بنگلوں میں رہتے ہیں۔"

عریشہ نے اسے دیکھا وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔

"امی کہتی تھیں انسان کو اتنا ہی ملتا ہے جتنا اس کے نصیب میں لکھا ہو۔ یا جتنے کے لیے وہ محنت کرے اور کوشش کرے۔"

"میں کوشش ہی تو کر رہا ہوں۔"

"کامیابی کے پیچھے اتنا بھی نہیں بھاگنا چاہیے کہ ساتھ چلنے والے پیچھے رہ جائیں۔" عریشہ کھڑی ہو گئی۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"میرے اور آپ کے درمیان جو بے نام سا تعلق ہے، اسے نام دینا چاہتی ہوں۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے آہستگی سے کہہ دیا۔

"لیکن ابھی تو...."

"پھپھو کسی دن آئیں گی یہ بات کرنے۔"

"پھوپھو سے تم نے بات کی۔؟" ثوبان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں وہ خود ہی کہہ رہی تھیں۔"

"ہوں۔ دیکھتے ہیں۔" اس کا انداز مبہم سا تھا۔

عریشہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا اور غصے سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں مصیبت کیا ہے؟" لیکچر نوٹ کرتی عریشہ نے مریم کو ٹہوکا دیا۔ وہ کب سے اپنی نشست پر بے چین بیٹھی تھی۔ مجال ہے جو ایک لفظ بھی نوٹ کیا ہو۔ دھیان گھڑی سے باہر تھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ بس ذرا دیر ہی سکون سے بیٹھی۔ پھر تیزی سے کھڑی ہو گئی۔

"سر! میں تھوڑی دیر کے لیے کلاس سے باہر جا سکتی ہوں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

عریشہ نے حیرت سے مریم کو دیکھا۔ سر نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی اور اجازت دے دی۔ کلاس ختم ہونے میں دس منٹ رہتے تھے۔

"کہاں جا رہی ہو؟" عریشہ نے اشارے سے پوچھا۔

"واش روم...." مریم نے سرگوشی میں کہا اور بیگ اٹھا کر چلی گئی۔ دس منٹ گزر گئے کلاس ختم ہو گئی۔ مریم واپس نہیں آئی۔ اسٹوڈنٹس باہر نکلنے لگے.... عریشہ کاریڈور میں رک گئی۔

"توبہ! یہ تو واش روم جا کر سو ہی گئی ہے۔"

"لیلیٰ مجنوں کہاں ہیں؟" کاریڈور کے دوسرے سرے سے عاصم نے نجانے کس سے پوچھا تھا۔

"کینٹین کے عقب میں ہوں گے۔" کسی نے قہقہہ لگایا۔

عریشہ لڑکیوں کے ایک گروپ کی طرف بڑھ گئی۔

"لوگوں نے تو تعلیمی اداروں کو بھی پکنک پوائنٹ بنالیا ہے۔" صبا تنفر سے کہہ رہی تھی۔

"گندی مچھلیاں تو ہر جگہ ہی ہوتی ہیں۔" رضوانہ نے کن اکھیوں سے عریشہ کو دیکھا تو عریشہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرنا ضروری سمجھا۔

"لیکن یہ بھی تو دیکھو۔ یہ کوئی عام ادارہ نہیں یہاں اساتذہ کی تربیت ہوتی ہے۔ ایسے لوگ بچوں کو کیا سکھائیں گے۔"

عریشہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ لوگ کس کے بارے میں بات کر رہی ہیں۔ صبا اور رضوانہ نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کے رد عمل پر عریشہ عجیب سی ہو گئی۔

"میں نے ایسا کیا غلط کہہ دیا۔" اس نے حیرت سے سوچا۔ تب ہی مریم تیز تیز چلتی اس کے قریب آگئی۔

"تم کیا واش روم جا کر سو جاتی ہو...." وہ مریم پر چڑھ دوڑی۔

"ہاں، نہیں چلیں۔" اس نے چور نگاہوں سے ارد گرد لڑکیوں کو دیکھا۔

"چلو۔" وہ غصے سے کہہ کر آگے آگے چل دی۔ رضوانہ اور صبا ہنس دیں۔

"یہ سچ مچ اتنی ہی سادہ ہے یا بن رہی ہے۔"

٭ ٭ ٭

کتنی آسان سی زندگی تھی۔ اسٹور، گھر، دوست مزے میں گزر رہی تھی۔

زندگی کیسی ہے۔

کیا کھونا کیا پانا۔

ایسا کچھ سوچا ہی نہ تھا اور اب... اب تو ایسا روگ لگا تھا کہ ہونٹوں پر گہری چپ کے تالے تھے۔ دوست احباب پوچھ پوچھ کر تھک گئے تو وہ ان سے کترانے لگا۔ دو بجتے اسکول کی بچیاں اسٹور کے سامنے سے گزرتیں۔ تو وہ وہاں سے غائب ہو جاتا۔

جو اس کی نہیں ہو سکتی۔ وہ اسے دیکھنے کا گناہ گار بھی کیوں ہوتا۔

شاید خود سے ڈرتا تھا کہ کہیں اس کے سامنے نہ کھڑا ہو جائے۔ اس سے جواب طلبی نہ کر بیٹھے۔ مگر جواب طلبی کیسی؟ محبت تو نعمان نے کی تھی۔ عائشہ نے تو ایسا کوئی دعوا نہیں کیا تھا۔

"بھائی جی دو بج گئے۔" اسٹور والے لڑکے کو یہ تو نہیں پتا تھا کہ وہ دو بجے دکان سے کیوں اٹھ جاتا ہے۔ بس یاددہانی کرا دی۔

نعمان نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر سڑک سے گزرتی بچیوں کو اور خاموشی سے اٹھ گیا۔ جانا کہاں تھا۔ سڑکیں ناپتے ناپتے گھر کی طرف مڑ گیا۔

دروازہ کھلا تھا۔ وہ خاموشی سے اندر چلا گیا۔

بیٹھک میں حمیداں اور برکت حسین نجانے کس موضوع پر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایسے شیرو شکر ہو کر بیٹھنے کے مواقع ان کی زندگیوں میں بہت ہی کم آئے ہوں گے۔

نعمان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ وہ خاموشی سے وہاں سے گزر کر اپنے کمرے میں جانا چاہتا تھا مگر رک گیا۔ برکت حسین کہہ رہے تھے۔

"ہاں... تو ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ گھر کی لڑکی، گھر کا لڑکا دونوں کا نکاح کر دیتے ہیں۔ پھر اب تو ثوبان کی نوکری بھی ہو گئی ہے۔"

"خوامخواہ کر دوں... ابھی بڑا رہتا ہے اور چھوٹے کی شادی کر دوں۔ وہ تو پہلے ہی کہتا ہے کہ ہم لوگ ثوبان کو اس سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔"

"غلط تو نہیں کہتا۔ بچپن سے اب تک تو نے ہر اچھی چیز چھوٹے کے لیے سنبھال کر رکھی ہے۔"

"ثوبان پڑھنے والا بچہ تھا۔ کتابوں کے علاوہ اور کسی چیز کی طرف دھیان ہی نہ دیتا۔ اسی لیے خیال کرتی تھی۔ نعمان تو بچپن سے لڑاکو تھا۔"

"تو پہلے اس کی کر دیتی۔ اچھی بھلی لڑکی پسند کر کے بیٹھا تھا۔" نعمان ٹھٹک گیا۔

"ہاں... وہ اسٹال والی... دو دن میں لڑکے کو لے کر الگ ہو جاتی۔"

نعمان کو جھٹکا سا لگا۔ جو محبت دل کے نہاں خانوں میں چھپا کر رکھی تھی۔ وہ عیاں کیسے ہو گئی۔

"ویسے بھی نعمان کے لیے تو میں کسی غریب گھر کی کم پڑھی لکھی لڑکی لاؤں گی۔ جو ساری زندگی میری خدمت کرے۔" حمیداں نے با آواز بلند اپنے ارادے ظاہر کیے۔ ان کے خیال میں اس وقت گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔

"پھر کہتی ہے۔ میں بیٹوں میں فرق نہیں کرتی۔"

"کچھ سوچ سمجھ بھی لیا کرو۔ ثوبان نے کالج یونیورسٹی کا منہ دیکھ لیا ہے۔ اس کے ارادے اور خیال بڑے اونچے ہیں۔ پھر عریشہ کا مکان اور عادلہ کی رقم بھی اسی کے حصے میں جائے گی... وہ ہمارا خیال کیوں کرے گا۔ باہر گیا تو عریشہ کو بھی ساتھ لے جائے گا... ہمارے ہاتھ خاک آئے گا، یہی رہ جائے گا نعمان اور اس کا اسٹور۔"

یہ اس کی ماں کے الفاظ تھے۔ وہ بھی اسی طرح ان کا بیٹا تھا۔ جس طرح ثوبان مگر ثوبان کے لیے سب اچھا تھا اور اس کے لیے؟

"ویسے ہے یہ نا انصافی حمیداں! سب کچھ ثوبان کا ہے تو نعمان کو اس کے دل کی خوشی ہی دے دیتی۔ پسند کرتا تھا اس لڑکی کو۔ دیکھا نہیں کیسا چپ چپ رہنے لگا ہے۔"

"بس اب بار بار اس لڑکی کا نام نہ لے... کروا دوں گی اس کی شادی۔ کنوارہ تو نہیں رکھوں گی۔ ہونہہ میرا بیٹا پھانسنے چلی تھیں۔ ایسی باتیں سنائیں اس ماسٹنی کو کہ دوبارہ نعمان کا سوچے گی بھی نہیں۔"

نعمان کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔

"اچھا اب نبیلہ کو کیا کہوں؟"

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

اس کے دل کی خوشی چھیننے والی کوئی اور نہیں خود اس کی اپنی ماں تھی۔

وہ اس گھر کا کماؤ بیٹا تھا۔ مگر ہمیشہ دو نمبر کا شہری سمجھا گیا۔

اسے وہ ساری زیادتیاں، سارے فرق یاد آئے جو بچپن سے آج تک اس کے ساتھ برتے گئے تھے مگر یہ زیادتی...

اس کا دل چاہا کہ اٹھ کر سارے گھر کو آگ لگا دے۔

مگر وہ بے بس سا اپنے بستر پر پڑا تھا۔

٭ ٭ ٭

وہ کب سے کھڑکی سے باہر چھوٹے سے صحن میں ہوتی بارش دیکھ رہی تھی۔

بارش جو ننھی بچی کی طرح پورے صحن میں کلکلی ڈال رہی تھی۔

پانی کے بلبلے بنتے اور پھوٹتے... بچپن میں وہ ان بلبلوں کے پیچھے بھاگتی اور وہ اس کے پہنچنے سے بھی پہلے معدوم ہو جاتے۔ اسے کیا خبر کہ وہ آج بھی بلبلے کے پیچھے ہی بھاگ رہی تھی اس کے عقب میں مریم آئینے کے سامنے کھڑی کب سے اپنے خدوخال کا جائزہ لیتی ہولے ہولے گنگنا رہی تھی۔

"عرشی! کیا میری آنکھیں بہت چمکتی ہیں۔" وہ اپنی آنکھوں کو کسی اور کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔

"پتا نہیں۔" عریشہ نے بغیر پلٹے جواب دیا۔ مریم بدمزہ ہو گئی۔

"تم نے مجھے کبھی غور سے دیکھا ہو تو پتا چلے۔"

"اب تمہیں کس نے غور سے دیکھ لیا؟" عریشہ نے یونہی سرسری انداز میں پوچھا۔

"کسی نے نہیں۔" وہ مدھم سا مسکرائی۔ اور اس کے ساتھ آ کھڑی ہوئی کچھ لمحے صحن میں ہوتی بارش دیکھتی رہی۔

"عریشہ! محبت خوب صورت ہوتی ہے۔"

"ہاں... بہت۔"

"تم ثوبان سے کتنی محبت کرتی ہو؟"

"میں اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ وہ میری سانسوں میں بستا ہے مریم! بچپن سے آج تک صرف اسی کو دیکھا، اسی کو چاہا ہے۔" اس نے بات کرتے کرتے مریم کو دیکھا۔ وہ کھڑکی سے سر ٹکائے ہولے ہولے مسکرا رہی تھی۔

"اے۔" عریشہ نے اس کے سامنے چٹکی بجائی۔

"تم کس جہان میں پہنچی ہوئی ہو۔"

"کہیں نہیں... یہیں ہوں۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"لگتا تو نہیں۔"

"آؤ بارش میں نہاتے ہیں۔" مریم نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول
کوئی ایسا اہل دل ہو
نبیلہ عزیز
قیمت۔۔۔ -/250 روپے
منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37- اردو بازار، کراچی۔

"بھئی۔ تمہیں نہیں پتا مجھے صرف بارش کو دیکھنا اچھا لگتا ہے۔" عریشہ نے ہاتھ چھڑانا چاہا۔
"اور مجھے بھیگنا۔" وہ اسے کھینچتی ہوئی بارش میں لے گئی۔
"مریم! چھوڑو مجھے۔ کیا پاگل پن ہے۔"
"ہاں۔ میں پاگل ہوں۔" وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر گول گول گھومنے لگی۔ بارش ان کے وجود سے پھوٹتی کنواری خوشبو سے مست ہونے لگی۔
آسمان ان کی سرخوشی دیکھ کر مسکرایا اور کھل کر برسا۔
ان کے قدموں کی دھمک سے پانی میں دائرے سے بن رہے تھے۔
ابرار نے مبہوت ہو کر یہ منظر دیکھا۔

بارش میں نہاتی ہنسی کلیاں۔
ان کی مقدس ہنسی۔۔۔ مندر میں بجتی گھنٹیاں۔
مریم کی نگاہ ابرار پر پڑی تو اس نے ایک دم عریشہ کے ہاتھ چھوڑ دیے۔۔۔ وہ لڑکھڑا کر بری طرح ابرار سے ٹکرائی۔۔۔ مریم کھکھلاتی اندر بھاگ گئی۔
ابرار نے اسے تھام کر دوسرے ہی پل چھوڑ دیا تھا۔
عریشہ نے خفالت سے اپنے چہرے سے پانی صاف کیا اور غصے سے گھورا۔
ابرار کی نگاہ جھک گئی۔
وہ پاؤں پٹخ کر بنا کچھ کہے اندر بھاگ گئی۔
ابرار کی نگاہ اس کے بھاگتے سپید پیروں پر تھی۔
یہ نظر کا دھوکا تھا یا حقیقت۔
ابرار کو لگا پانی میں ساتوں رنگ گھل گئے ہیں۔

☆ ☆ ☆

"تم باہر جا کر کیا کرو گے؟" سنبعہ نے گلاس وال سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔ باہر بارش بے آواز مسلسل کے ساتھ گر رہی تھی۔ وہ دونوں اس ریسٹورنٹ میں ہر روز اکٹھے لنچ کرتے تھے۔ جس کا بل ظاہر ہے سنبعہ دیتی تھی۔

"وہی جو سب کرتے ہیں۔" ثوبان نے بات کو مذاق میں ٹالنا چاہا۔
"مطلب۔"
"ظاہر ہے اپنا لائف اسٹائل بہتر کرنے کی کوشش کروں گا۔"
"کتنا بہتر۔۔۔؟" وہ عجیب پہیلیاں بجھوا رہی تھی۔
"اتنا کہ تمہارے مقابل آسکوں۔" ثوبان اس کی طرف جھکتے شرارت سے بولا۔ سنبعہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
"میرے مقابل آنے کے بجائے میرے ساتھ چلنے کی کوشش کرتے تو کوئی فائدہ بھی ہوتا۔"
"ایسا تو میں صرف خواب میں سوچ سکتا ہوں۔"
"میں اس خواب کو حقیقت میں بدل سکتی ہوں۔" وہ پُراعتماد تھی۔
"سنبعہ! زمین اور آسمان کبھی ایک نہیں ہوتے۔"
"میں یہ فلسفہ نہیں جانتی۔۔۔ میں صرف اتنا سمجھتی ہوں کہ زندگی میں کوئی چیز ایسی نہیں کہ جسے میں حاصل کرنا چاہوں اور کر نہ پاؤں۔۔۔" اس کے لہجے میں اس کی ذات کا غرور بولتا تھا۔
"تم انسانوں کو بھی چیزوں میں شمار کرتی ہو۔" ثوبان نے نیپکن اٹھایا۔
"نہیں۔۔۔ اسی لیے تو تم سے پوچھ رہی ہوں۔"
"کیا؟"
"جو کچھ باہر جا کر حاصل کرنا چاہتے ہو اگر یہیں مل جائے تو۔۔۔"
"کیسے؟"
"مجھ سے شادی کر کے۔۔۔" سنبعہ نے آرام سے اپنا پرپوزل اس کے سامنے رکھا۔
ثوبان کے ہاتھ سے نیپکن چھوٹ گیا۔

باقی آئندہ شمارے میں

کنیز نبوی

ایک حجم کو لاحق ہے

وہ محبت کے معاملے میں بہت شدت پسند تھی۔ شدت اس کے مزاج کا خاصا تھا۔
یہ شدت شاید اس کے خون کا حصہ تھی۔ اس کی ماں گھنٹوں مصلے پر بیٹھی رہتی اور ماں کی یہ ریاضت اور محبت اس کے وجود میں ڈھل گئی اور اس کے اندر گھر کر کے اس کے مزاج کا حصہ بن گئی۔ زندگی میں جس کو بھی چاہا یہ شدتیں اس پر مسلط رہیں۔
رشتے ہوں یا دوستی وہ ہر معاملے میں خالص تھی مگر ایک خامی تھی کہ صرف اپنا نقطہ نظر سمجھانے کی کوشش کرتی۔ دوسروں کے خیالات و نظریات سمجھنے کی اس میں صلاحیت نہیں تھی یا وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ مزاج پر شدتیں اس قدر حاوی تھیں کہ اپنی حساس طبع کے باعث وہ حس مزاح سے ہی محروم ہو گئی تھی۔

اور میں ساحر سمیع اس کو مذاق مذاق میں جیتنا چاہتا تھا مگر مذاق مذاق میں ہی ہار گیا۔

وہ مجھ سے ملنے سے پہلے زندگی جیتی تھی مگر جب وصل کی امید کو ناامیدی کی سیاہی نے ڈھک لیا تو زندگی اس کو جینے لگی۔

شاید اسی لیے اس نے بے فیض زندگی سے پلو چھڑا لیا۔

☼ ☼ ☼

حلقہ ادب کی محفل میں نئے ادبی جریدے میں سحر سرور کی خوب صورت کہانی پر بحث جاری تھی۔ وہ نئے لکھنے والوں میں خوب صورت اضافہ تھی۔ اس کے لفظوں میں زندگی بولتی۔ عورت کے دکھ، وڈیرا شاہی، معاشرے کے پسے ہوئے طبقے پر اس کی تحریریں بے حد پسند کی جاتیں۔

مگر اس دن محفل میں جس کہانی پر بحث چھڑی تھی۔ وہ اس کی محبت پر لکھی پُراثر تحریر تھی۔ جو شاید اس نے ایڈیٹر کے پرزور اصرار پر لکھی تھی۔

حلقہ یاراں کا فرہاد بار بار "سحر سرور" کہہ کر رائے دینے میں بازی لے جانا چاہتا۔ اس کا نام "سحر سرور" ہے۔ "میں نے تصحیح کی۔ فرہاد زور سے ہنسا۔

"ہاں ہاں ساحر سمیع!" اس نے دائیں بائیں سر ہلایا۔ "میں تو اسے ایسے ہی کہوں گا کیونکہ مجھے بڑا سرور ملتا ہے۔" اس نے لفظ "سرور" بولتے وقت اپنے سگریٹ کے دھوئیں سے جلے سیاہ ہونٹ گول دائرے میں سکیڑے۔ مجھے اس کا یہ واہیات انداز ناگوار تو گزرا مگر خاموش رہا۔

"سنو کبھی عشق کیا ہے؟" اس نے جھک کر سرگوشی کی۔

"پتا نہیں! اسے عشق کہہ سکتے ہیں یا نہیں۔" پھر اسے اپنی بھولی بسری کہانیاں یاد آئیں۔ جب گھر کی چھت پر چند خطوں کے تبادلے کے بعد پڑوسن سے پہلی ہی ملاقات پر باپ نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اور چھترول بھی کی۔ دوسرا اپنی کلاس فیلو سے، جو کچھ ہی عرصے بعد ایک ڈی ایس پی کے بیٹے کے چکر میں اسے داغ مفارقت دے گئی۔

"ارے یار! ساحر کالج لائف میں عشق کہاں۔ یہ تو پسندیدگی اور دل لگی ہوتی ہے۔ عشق تو پکی عمر کا ہوتا ہے۔ ہر وقت ہر کسی کے عشق میں قربان ہوا۔" فرہاد ہنسا۔

"بس یار! ابا نے جلدی شادی کروا دی۔ پھر ملازمت، بیوی بچوں کے چکر میں وقت ہی نہیں ملا۔" اس نے قدرے خجالت سے کہا۔

"ساحر! تخلیق کے لیے تو عشق بہت ضروری ہوتا ہے۔ اب ہمیں ہی دیکھ لو! لڑکپن سے اس عمر تک سینکڑوں عشق کیے۔ ان تجربوں کو اپنی شاعری میں سمو دیا۔

اسی لیے تو یکسانیت کا شکار ہو رہا ہے۔" وہ پان کھاتے ہوئے ہلکے سے ہنسا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ "کیا واقعی میری تحریریں یکسانیت کا شکار ہیں۔ کیا میں خود کو دہرا رہا ہوں۔" یہ احساس میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔

"ساحر میاں! یہ جو لڑکی ہے نا، کسی کا فون نہیں اٹھاتی۔ زیادہ میل جول اسے پسند نہیں۔ بلکہ کئی اچھے ادیبوں نے بھی شکایت کی کہ بہت ہی مغرور لڑکی ہے۔ میسج کا جواب تک نہیں دیتی۔ تو کوشش کر کے دیکھ! شاید تیرا سحر کام کر جائے۔ تو ساحر ہے نا۔" وہ کھل کر ہنسا۔

اور میں سوچ میں پڑ گیا۔ پھر نہ جانے کس جذبے سے مجبور ہو کر میں نے اسی وقت مناسب لفظوں میں اس کے تازہ افسانے پر رائے دی۔ مگر میسج کا جواب تک نہ آیا۔ چھوٹا سا ایک لفظ شکریہ کا بھی نہیں۔

اس دن کے بعد میں نے اس کی سارے ادبی پرچوں میں چھپی تحریریں جمع کیں اور باری باری پڑھ کر رائے دیتا گیا۔ تعریف کے پل باندھ دیے۔ وہ اس کی نویں تحریر تھی۔ جب اس کا جواب صرف تھینکس کی صورت ملا۔

میرے حوصلے بلند ہو گئے۔ مو تاہی سہی اس نے جواب تو دیا۔

پھر وہ میرے ہر میسج پر شکریہ کا چھوٹا سا لفظ بھیجتی اور میں زیادہ محنت و لگن سے اس کی کہانیوں پر تبصرے لکھ کر اسے بھیجتا رہتا۔ میرے اردگرد اس کی تحریروں کا میلا سجا رہتا۔ میں لفظ چن چن کر اسے بھیجتا رہتا۔

پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں پاگل ہو گیا تھا۔ ہر حالت، ہر قیمت پر سحر سرور کو فتح کرنا چاہتا تھا اور ادبی دنیا میں اپنی دھاک بٹھانا چاہتا تھا۔ سکندر اعظم بننے کے چکر میں پتا ہی نہیں چلا کہ سامنے ایک صنف نازک ہے۔ جس کے احساسات کانچ کی طرح ہوتے ہیں۔ ذرا سی ٹھیس لگی اور جان پارہ پارہ ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ ساحر تھا اور میں، جو خود سحر تھی۔ اس ساحر نے مجھے سحر زدہ کر دیا۔ سنا تھا آگ، آگ میں، پانی پانی میں اور روشنی، روشنی میں مدغم ہو جاتی ہے۔ لیکن ہیرا ہیرے کو کاٹتا ہے..... محبت محبت میں مدغم ہو جاتی ہے لیکن سحر سحر کو کاٹتا ہے۔ اسی لیے ساحر نے مجھے کاٹ دیا ہے۔ میں نے شروع شروع میں اسے اہمیت نہیں دی۔ یہ مرد کا معاشرہ ہے۔ یہاں عورت کو بہت خیال سے اور سنبھل کر چلنا پڑتا ہے۔ ادبی حیثیت میں بھی میرے ان سے رابطے نہ ہونے کے برابر تھے۔

چند لائنیں اپنی تحریروں کے ساتھ ایڈیٹرز کو لکھنے کے علاوہ میں نے کبھی کسی کو خط نہیں لکھا۔ کبھی فون پہ لمبی چوڑی گفتگو نہیں کی۔ اس لیے کہ میں مرد کی فطرت سے آگاہ تھی۔ یہ عورت کی نہیں، رشتوں کی عزت کرتے ہیں۔

چھاؤں صرف ماں، بہن، بیٹی، بیوی کو دیتے ہیں۔ باقی تو ہر عورت کی چھاؤں میں خود بیٹھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

مگر ساحر نے میری بے اعتنائی کا ذرا بھی اثر نہ لیا۔ اس کی پہلی تعریف پر میں نے توجہ ہی نہ دی مگر آہستہ آہستہ اس کے تجزیے مجھے پسند آنے لگے۔

اپنی تحریروں کی تعریف، تجزیہ ہر ادیب کو اچھا لگتا ہے، جیسے کوئی بچے کی تعریف کرے تو ماں خوشی سے پھول اٹھتی ہے۔

اب مجھے اس کے تبصروں کا انتظار رہنے لگا۔ جب بھی کوئی تحریر شائع ہوتی میں غیرارادی طور پر منتظر رہتی۔ بار بار سیل فون اٹھاتی اور اس کا میسج نہ پا کر مایوس ہو جاتی۔

"سحر جی! کیا پُراثر تحریر ہے۔ پتا نہیں کہاں سے الفاظ چن چن کر لاتی ہیں کہ آپ کے لفظوں کے موتی قلب و نظر کو تسخیر کرتے جاتے ہیں۔ ہمارے جیسے تو آپ کی تحریر کی خوشبو میں ایسے مہک اٹھتے ہیں کہ خود ہی تخیل کے میدان کے شہسوار بن بیٹھتے ہیں۔ اچھی تحریر کا خاصا ہی یہ ہے کہ تخلیق کار کو تخلیق پر اکسائے۔ یقین جانیے! آپ کے اس افسانے سے متاثر ہو کر ایک افسانہ لکھ بیٹھا ہوں ان شاء اللہ جلدی کسی ادبی پرچے کی زینت بن کر آپ کی نظر سے گزرے گا۔ اگر آپ کا ایڈریس ہوتا تو اس پر بھیجتا مگر آپ نے اس قابل ہی نہیں جانا۔

یار زندہ صحبت باقی۔

آپ کی نظر التفات کا منتظر، ساحر سمیع۔"

اس کے میسجز اتنے ہی طویل ہوتے۔ جبکہ میں مختصر الفاظ میں کبھی شکریہ اور کبھی نیک خواہشات کا اظہار کر دیتی۔

کہ اچانک اس کے ایک پیغام نے مجھے چونکا دیا۔

"حضور! سالک صادق کب سے آپ کی راہ میں ایستادہ حضوری کا منتظر ہے کہ سرکار ازراہ مہربانی اسے بیعت میں لے لیں۔"

میں نے اس پیغام کا کوئی جواب نہیں دیا مگر جب اس نے یہی پیغام تین بار بھیجا تب میں نے اسے لکھ بھیجا۔

"ساحر صاحب! دوستی میں کوئی پیرو مرشد نہیں ہوتا۔ برابری چلتی ہے۔"

ایک منٹ سے بھی کم وقفے سے جواب موصول ہوا۔

"سرکار لیے دربار عشق ہے، یہاں برابری کیسی۔ آپ میرے لیے، بہت اعلا بہت بلند ہیں۔ مجھے اپنا مرید بنا لیں۔"

میرے تو پسینے چھوٹ گئے عشق کا اتنا واضح اظہار۔۔۔ مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ وہ خوف تھا یا مروت میں سمجھ نہ سکی۔

وہ بہت اچھا ادیب تھا۔ مجھ سے سینئر تھا۔ میں شروع سے ہی اسے شوق سے پڑھتی تھی مگر ایک دن وہ مجھ سے یوں کھلم کھلا اظہار محبت کرلے گا۔ یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

شاید میری کمزوری تھی کہ میں اسے جھڑک نہ سکی یا شاید اس کی شخصیت اور طرز تحریر بے حد پسند تھا' اس لیے۔۔۔

میرا دماغ کہہ رہا تھا کہ مجھے اسے سختی سے روک دینا چاہیے۔

مگر میرے دل نے ایسا کرنے نہ دیا۔ دل ہی تو ہے، جو آدمی کو رسوا کرتا ہے۔ گھر اجاڑ دیتا ہے' پاگل کردیتا ہے اور ہمارے جیسے حساس لوگ دل کا ہر غلط فتویٰ بھی مان لیتے ہیں۔ دل مفتی نے طوطا چشمی اختیار کی تو اس کے حوصلے اور بڑھ گئے۔

اب روزانہ اظہار محبت کے پیغام موصول ہوتے۔ میری تحریریں قصہ پارینہ بن گئیں۔ میری شخصیت' ذات مجسمہ نا پسند کے گرد ملفوف پیغامات نے مجھے اس دلدل میں پھنسا ہی دیا۔

انسان محبت سے کیوں ہار جاتا ہے۔ یہ اس کی کمزوری ہے یا محبت ہی کوئی جادوئی اثر رکھتی ہے۔ اس کے مسلسل تکراری پیغامات نے میرے اوسان خطا کردیے۔

اور ایک دن اس کی کال آگئی۔ یہ تیرہ ماہ میں اس کی پہلی کال تھی۔ میرے سیل فون کی اسکرین پر "ساحر سمیع" کا نام جگمگا رہا تھا اور ساتھ میں اس کی نئی آنے والی کتاب پر چھپی تصویر جو میں نے غیر ارادی طور پر اپنے سیل فون کے کیمرے سے کھینچ کر اس کے نمبر پہ لگا دی تھی۔

میں کشمکش میں پڑ گئی۔ اس کی کال ریسیو کروں یا نہیں۔ جب تیسری بار کال آئی تو میں نے دھڑکتے دل سے ریسیو کی۔

"سحر سرور۔"

مجھے اس کا اس طرح پکارنا عجیب لگا۔

"جی؟"

"تمہارا نام لیتے ہی میرے قلب و جاں پر سرور طاری ہو جاتا ہے۔"

اس نے میری حیرت بھانپ کر تصحیح کی۔ میں خاموش رہی۔

"سنو!"

"جی! سن رہی ہوں۔" لفظ چار نکلے مگر کتنے اس کی سماعت تک پہنچے اندازہ نہ کرسکی۔

"محبت سے فرار ممکن نہیں ہے۔ یہ بڑی ظالم چیز ہے۔ اس کے سامنے ہتھیار ڈال دو۔ اس کی محکوم بن جاؤ۔ یہ تمہیں حاکم بنا دے گی۔"

اس کی گمبھیر آواز پر میرے دل نے دھڑکن روک کر سماعت کا ساتھ دیا۔

"اپنا آپ اس کے سپرد کردو۔ بڑی خوب صورت کائنات سے روشناس کرائے گی۔ بڑے انوکھے رستوں پر چلائے گی اور شاید محبت ودیعت کرنے والے کی بھی راہ دکھلا دے گی۔"

اس نے فون بند کردیا۔ میرے دل کی دھڑکن بہت تیز ہوئی اور آنسوؤں سے چور ہوگیا۔ ایک بار پھر میں سمجھ نہ سکی کہ میں اتنی شدت سے کیوں رو رہی ہوں۔ موبائل کی میسج ٹون بجی۔

مقام محبت میں یہ دل رک گیا ہے
ایک انچ بھی ادھر ادھر نہ ہوا ہے
اسے کہو کہ بہت نامراد ٹھہرے ہے جنوں
اسے کہو کہ مجھے ہے بہت جنوں اس کا

میرے گریہ میں اور شدت آگئی۔

رات میرا تکیہ خاموشی سے بھیگتا رہا۔

"عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں"

اور میں سحر سرور بازی ہار گئی مکمل ہار۔

سیل فون پر میری انگلیوں نے پہلا پیغام لکھا۔

"ساحر! میں نے ایک کتاب میں فارسی اشعار پڑھے تھے۔ ان کا ترجمہ لکھ رہی ہوں۔

اے خالق' بے نیاز! میرا نام مجنوں کیوں رکھا؟
لیلیٰ کا عشق میرے دل میں کیوں پیدا کیا؟
شب کو میرے آہ و نالہ آسمان تک پہنچتے ہو۔
خار میرا تکیہ بنایا ہے۔ میری اس گرفتاری سے کیا چاہتے ہو۔
اے خدا! میری اس گریہ زاری عاجزی سے کیا مقصد ہے تمہارا؟"

ہاتف غیبی نے جواب دیا۔

"اے مرد غریب!
محبت والوں کو غم ہی نصیب کیے جاتے ہیں۔
وہ عشق لیلیٰ کا نہیں' فی الحقیقت وہ عشق میرا عشق ہے۔
لیلیٰ کا حسن' میرے حسن کا اک عکس بجلی ہے۔
مجھے تمہاری شب کی آہ و گریہ زاری اچھی لگتی ہے۔ میں تمہاری محبتوں کی آواز توجہ سے سنتا ہوں۔"

میں نے آگے کچھ نہیں لکھا۔

"تو کیا اب میں یہ سمجھنے کا مجاز ہوں مرشد! کہ آپ نے میری ریاضت قبول کرلی ہے اور مجھے خرقہ محبت عطا کردیا؟"

"میں کیا' میری اوقات کیا ساحر سمیع! یہ خرقہ محبت جسے ودیعت کرنا تھا' کردیا۔"

"خوشی' مسرت' سرشاری۔۔۔ یہ لفظ مجھے اپنے احساسات کے آگے بہت حقیر لگ رہے ہیں۔ تم اندازہ نہیں کرسکتیں' میری خوشی کا سحر ساحر!"

اس نے اپنا نام میرے نام کے ساتھ لگا دیا۔ مجھے برا نہیں لگا۔

اب ہماری روز بات ہونے لگی تھی۔ اچھا شعر' اچھی بات' ایک دوسرے کو بھیجنا ہمارا محبوب مشغلہ تھا۔

ہم ایک دوسرے کے ساتھ جینے لگے تھے۔ میری تحریروں میں محبتوں کا نکھار نظر آنے لگا اور ساحر تو تھا ہی محبتوں کا لکھاری۔ مگر میری محبت کے بعد اس کی تحریروں میں محبت کا احساس شدت سے جھلکنے لگا تھا۔

وہ ہر نئی تخلیق میری محبت کے نام کرکے سب سے پہلے مجھے بھیجتا۔ میری رائے کا احترام کرتا۔ مجھے مکمل اختیار تھا کہ میں اس کی تخلیق میں کمی بیشی کرسکتی ہوں۔ اس کی محبت پاکر اور اس سے محبت کرکے مجھے جینے میں مزا آنے لگا۔ زندگی بہت خوب صورت اور رعنائیوں سے بھرپور ہوگئی۔ اک عجیب سرشاری تھی جو جسم و جاں کا احاطہ کیے رکھتی۔ بہت انوکھی خوشی محسوس ہوتی۔ اس کا ہر پیغام' ہر خط پاکر اور اس کی آواز سن کر ایسی طمانیت کا احساس ہوتا جو اس سے پہلے کبھی نہ محسوس کی تھی۔

☆ ☆ ☆

اک دن میری بیوی کو پتا چل گیا۔

"یہ سارا دن کس چڑیل سے باتیں کرتے ہیں؟" وہ بگڑی۔

"ارے معصوش! میری زندگی! میری جان! میری پری تو تم ہو۔ کیسی چڑیلیں' آہیں' باجا میں' کیوں ڈرتی ہو ان سے؟ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے قریب بٹھایا۔

"مگر مجھے بالکل پسند نہیں آپ کا اس کو میسجز کرنا۔ جب دیکھو اسی سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔" وہ منہ بنا کے بولی۔

میں کوئی تردید نہیں کرسکتا تھا' نہ ہی ہم "عصر نو" کہہ کر تعلقات کو دوستی کے رنگ میں پیش کرسکتا تھا کیونکہ میں رنگے ہاتھوں پکڑا جا چکا تھا۔ وہ کئی مہینوں سے میرے سیل فون کے میسجز نہ صرف چیک کرتی رہی تھی' بلکہ وہ میسجز اپنے سیل میں فارورڈ کرکے محفوظ بھی کرچکی تھی۔ سارے ثبوتوں کے ساتھ اس نے مجھے کٹہرے میں کھڑا کیا تو ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

"آپ بہت برا کررہے ہیں' میرے ساتھ اپنے

www.paksociety.com

بچوں کے ساتھ گھر کے ساتھ۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"تمہارے لیے بچوں کے لیے گھر کے لیے ہی تو کر رہا ہوں سب کچھ۔ ہمارے گھر کی دال روٹی تو انہی تحریروں کے اعزازیوں سے چل رہی ہے۔ باقی جو تنخواہ ہے وہ تو بلوں اور بچوں کے تعلیمی اخراجات میں ہی نکل جاتی ہے۔" میں ایک پل کو رکا۔

"مہوش! یہ چھوٹے موٹے معاشقے تحریروں کو نکھارنے کے لیے ادیب کرتے رہتے ہیں۔ تمہاری محبت اپنی جگہ ہے۔ اسے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

"جھوٹ، جھوٹ بولنا تو آپ لوگوں کی عادت ہے۔ اس سے پہلے بھی تو آپ کی کتابیں بکتی تھیں۔" وہ تلملا گئی۔

"ہاں۔ مگر اب زیادہ بک رہی ہیں۔ بار بار نئے ایڈیشن آرہے ہیں اور ہر ایڈیشن پر اچھی خاصی رقم آرہی ہے گھر میں۔ تم کیوں یہ بات نہیں سوچ رہیں؟"

"مجھے لگتا ہے اب آپ میرے نہیں رہے۔" وہ اب رونے لگی۔

میں سچ مچ گھبرا گیا۔ بچے سن لیں گے تو ان کے ذہنوں پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ بالخصوص میری بیٹیاں، دو فرسٹ ایر، میٹرک میں پڑھتی تھیں۔

"میں تمہارا ہوں۔ کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا۔ تم ہو میرے گھر، میرے دل کی مالک ہو، میرے بچوں کی ماں، یار! دوسری عورتیں تو ہماری زندگی میں بہار کے مختصر موسم کی پھولوں کی طرح ہوتی ہیں جو خزاں آتے ہی پت جھڑ کے پتوں کی طرح جھڑ جاتی ہیں۔"

بہت مشکل سے میں نے مہوش کو منایا۔ یہ حقیقت تھی کہ مجھے اپنی بیوی سے محبت تھی۔ میرا گھر میری جنت تھی۔ میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا اس جنت کی تکمیل تھے۔

مگر ادبی حلقے میں راجہ اندر بنا رہتا۔ قریبی دوستوں کو تو پہلے ہی ہمارے عشق کا پتا تھا، مگر اب یہ عشق سرگوشیوں سے نکل کر کھلم کھلا ادبی حلقوں میں گردش کرنے لگا تھا۔

میرے یار دوست مجھے واقعی ساحر مانتے اور تحریروں کے پل باندھ دیتے۔ کچھ بھی تھا بہرحال میں نے ایک بہت اچھی ادیبہ کو تسخیر کیا تھا۔ اپنے لفظوں سے۔

☆ ☆ ☆

وہ جب سے محبت سے آشنا ہوئی تب سے اس کے اندر کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ خلا میں معلق آنکھ ہر جگہ محبت کا منظر دیکھتی۔ زمین و آسمان، اوزون کی بے کراں وسعتوں، درختوں، پھلوں، پھول، خوشبوؤں، پانی، مٹی، ہوا حتیٰ کہ آگ میں بھی محبت بکھری پڑی تھی۔

وہ پرواز کر کے لوٹ آتی تو یہ سب اجزائے کائنات اپنے دل میں محسوس کیے۔ دل بنا کائنات، آنکھ بنی محبت۔

وجود کے اندر احساس کی شبنم نے پیار و پریت کے گل و غنچے کھلا رکھے تھے۔

تاریکی و روشنی میں محبت۔

زندگی و موت کا فرق، خوشی و غم کی تفریق، ہجر و وصل کے معنی اسے سمجھ میں آنے لگے۔ محبت اداسی کی داستان ہے۔ حسن کا قصہ ہے۔ محبت کرنے والا داستان گو، جو بار بار اس داستان کو دہراتا رہتا ہے۔

اس کی آنکھ کو نیند نہ آتی اور چشم یاد میں بیدار ادای ہر ہر حالت میں وصل کی متمنی تھی۔

تصور کا بوجھ اٹھائے اٹھائے اس کی آنکھیں دکھنے لگیں۔

تب اس نے فیصلہ کر لیا اس سے ملنے کا۔

"چلو! وہ بھی خوش ہو جائے گا۔ عرصے سے کہہ رہا ہے ملنے کو۔ اب تکرار و بیزاری اختیار کرنے لگا ہے۔"

اسی کو بلا اس ہونے سے پہلے۔

"تم اس سے مل لو یار! بہت بے چین ہو رہا ہے تم سے ملنے کو۔" قریبی دوست نے اکسایا۔

"کیا مجھے اس سے ملنا چاہیے؟" اپنی صورت اپنی نگاہوں میں گھومنے لگی۔

"اف! محبت بھلا کیا شکل و صورت دیکھتی ہے؟ محبت تو خود اتنی حسین ہے کہ اسے محبوب کے علاوہ حسن کہیں نظر ہی نہیں آتا۔"

"کیا فرق پڑتا ہے میرے کالے رنگ سے؟ لیلیٰ بھی تو کالی تھی۔ جس پر عاشق ہوا جب قیس تو مجنوں بن بیٹھا۔ مانا کہ میرا جسم متناسب نہیں، مگر میرے دل کی خوب صورتی میری جسمانی بدصورتی پر حاوی ہو جاتی ہے۔ کوئی چیز دنیا کی میرے دل جتنی خوب صورت و حسین نہیں۔ میرے چہرے کے سب نقوش میں میری آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں۔ عشق کی راز آشنا جھیل سی آنکھیں۔ وہ بھی تو میری آنکھ کو سب سے حسین نظر آتا ہے۔ اس کی آنکھ بھی مجھے سب سے دلکش ہونے کی سند دے گی۔"

محبت ہے ہی ایسی۔ اپنے فتوے آپ دیتی ہے، دنیا کے فتووں پر نہیں چلتی۔

☆ ☆ ☆

اس بار کراچی آئی تو ملاقات کا اہتمام ہو ہی گیا۔ وہ اپنی دوست کے گھر ٹھہری تھی۔

ڈرائنگ روم کے اندر زندگی اتر آئی تھی۔ تجسس و شوق ملاقات اس کے ہر انداز سے ہویدا تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ اس کی نظر پہلے پاؤں پر پڑی۔ وہ مودب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ وہ نظریں جھکائے بالکل اس کے سامنے صوفے پر آ بیٹھی۔ اسے کوئی لفظ سوجھا نہ ہی نظریں اٹھانے کی ہمت ہوئی۔

وقت سرکتا گیا کوئی نہ بولا۔

نہ سحر نہ ساحر۔

عورت کے اندر قدرت نے یہ حس بڑی فیاضی سے رکھی ہے کہ چاہنے والی نظروں کی تپش انبوہ کثیر میں بھی پہچان لیتی ہے۔

یہ تپش چاہت کی ہے یا؟

اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ نگاہ اٹھائی۔

وہ جو ساحر تھا یک ٹک اسے دیکھتا تو تھا مگر بیزاری اور ناپسندیدگی واضح جھلکتی تھی اس کی نظروں سے۔

وہ یک بیک ٹن سی رہ گئی۔

"سحر سرور! تم اسے پسند نہیں آئیں۔"

اس کی چھٹی حس چیخی۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"میں... میں... چا... چائے... لا... لاتی ہوں۔" اس نے دھڑکتے دل کی رنجیدگی و خوف سے بھاگنے کا بہانہ تراشا۔

کچن میں اس کی دوست ٹرالی سجا چکی تھی۔

"ارے! تم کیوں آگئیں؟ میں خود ہی لے آتی۔ اتنے سالوں کی محبت کے بعد پہلی ملاقات کا موقع ملا ہے۔ بیٹھ کر دل بھر کے باتیں کرتیں۔"

وہ خاموش، چپ کہار کی طرح ایستادہ۔

"ہاں بھئی! محبت چیز ہی ایسی ہے۔ دل کرتا ہے، محبوب کی خاطر تواضع خود کی جائے۔"

چند لمحوں کی جان لیوا خاموشی۔ وہ شاید فرہاد کی بات سن رہا تھا۔

اس کی تحریروں کی مداح اور عزیز دوست نے ٹرالی اس کو تھمائی۔

وہ مردہ قدموں سے خود کو اور ٹرالی کو گھسیٹ کر ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچی۔ اندر سے آنے والی آواز نے اس کے قدموں کو دروازے پر جکڑ لیا۔

"ارے یار فرہاد! وہ تو میرے گھر صفائی کے لیے آنے والی بھنگن سے بھی بدصورت ہے۔ میرا ذوق اتنا برا نہیں ہے۔"

"محبت اندھی ہوتی ہے، لیکن میری دو آنکھیں ہیں۔" فرہاد کی بات پر وہ تمسخر سے ہنسا۔

"دل کر رہا ہے چائے پیے بغیر بھاگ آؤں، مگر یار! مروت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

اس وقت لحہ موجود میں اگر نمایاں تھا کچھ تو قلب و جاں کا درد تھا، جو خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزائے دیتا تھا۔

وہ مجنوں نہیں تھی مگر اس وقت لیلیٰ سے مجنوں بن کر اس چوکھٹ پہ گر گئی، جہاں اس کے محبوب نے قدم رکھے تھے اور وہ مجنوں سے اپنی اصل کی طرف لوٹ آیا۔ پھر سے قیس بن گیا۔

جس ساحر کا سحر سر چڑھ کے بولتا تھا وہ ایک دم سے، ایک دم میں ختم ہو گیا۔

www.paksociety.com

ہلتے پردے کے پیچھے ساحر نے سحر کے منجمد وجود کو دیکھا۔ جلدی سے فون بند کیا۔ اتنی جلدی وہ چائے لے کر آجائے گی یہ توقع نہ تھی اسے۔

کایا پلٹ چکی تھی۔

بولنے کو کچھ نہ تھا۔

لفظ جو ہاتھ باندھے ان کے حضور میں موجود ہوتے، وہ کہیں کھو گئے۔ وہ انہیں تلاشنے میں ناکام ہو گیا تو واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔ وہ اس کے ایک طرف سے سکڑ کر گزرا مگر معذرت کا اک لفظ بھی اس کے حلق سے برآمد نہیں ہوا۔

"کیا ہوا؟" غم گسار دوست نے اس کے ساکت وجود کو کمال مہربانی سے تھاما۔

اس نے اپنی آنکھوں کے رکے ہوئے پانیوں سے اس کا شانہ بھگو دیا۔

"یہ مرد ہوتے ہی ایسے ہیں۔ روح سے نہیں، جسم سے محبت کرتے ہیں۔ سیرت نہیں صورت بھاتی ہے ان کو۔" "عمر بھر ساتھ نبھانے کے عہد و پیماں اس کا منہ چڑا رہے تھے۔

"مرد اور نفس پر کبھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں اپنی خواہش پر دھوکا دے جاتے ہیں۔"

پیغام کا کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ اس کی انگلیاں موبائل کے بٹنوں پر بے تاب ہوئیں۔

"سحر ایسی کتاب ہے، جس کے روز و شب کے صفحات پر ادا اسی کے قلم سے محبت کی تحریریں رقم ہیں، مگر اس کا ہر باب اک منطقی انجام پر ختم ہو جاتا ہے۔ وہ منطقی انجام جو انسان کا انجام آخر ہے۔"

"پلیز! تم خودکشی نہ کرنا، ورنہ میں بھی خودکشی کر لوں گا۔"

کھلا پیغام اپنا تمسخر آپ اڑا رہا تھا۔

"تم جھوٹے ہو اور بزدل بھی۔ میرے ساتھ جی نہ سکے تو مر کیسے سکو گے؟"

اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ سحر کا، حالانکہ وہ ساحر تھا۔

اس کا ہر نقش میری جان پر بنا اور میرا ہر نقش اس نے منہ دیا۔

محبت حسن سے ہوتی ہے۔ اس دنیا میں بدصورت لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں۔ اس کے پورے وجود میں تلخی بھر گئی۔

اس شب، جو ساز تھا، وہ قتل گاہ عشق کا جلاد بنا تھا۔ کتنے سخت الفاظ تھے اس کے۔ خنجر کی دھار اور قاتل کے دل جیسے۔ وہ نقش جو روح کو عطر بیز کیے رکھتا آج اس کی خوشبو نے اسے حواس باختہ کر دیا۔ وہ پاگل ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ لکیروں سے عاری تھے۔

وہ کتنی ہی دیر بے دعا کے انداز میں کھلے ہاتھوں کو گھورتی رہی۔ لکیر نہ لگن کی، نہ خوشی کی، نہ زندگی کی۔

بے وقعتی و بے وفائی نے موت سے پہلے موت دے دی تھی۔ اب زہرہ جسم کا بے کراں بوجھ تھا، جس سے آزاد ہوئی۔ وقت سحر نے سحر کو اپنے بازوؤں میں سمیٹا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس صبح جب وہ اٹھا تو...

"الفراق اشد من الموت"

(فراق موت سے زیادہ سخت ہے)

کے اس کے آخری پیغام کے ساتھ کئی پیغام اس کی ناگہانی موت کی اندوہناک خبر لیے بصارت کے منتظر تھے۔

وہ مرد بننے کے چکر میں مجرم بن گیا۔ اس کے دل پر داغ لگ گیا۔ ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ ساحر، سحر سے ہار جائے، مگر ایسا ہو گیا تھا۔

اور وہ واقعی ہار گیا تو...

جو زندگی میں کبھی متاثر نہ کر سکی، مرنے کے بعد سب کو متاثر کر گئی۔ وہ جو کہتا تھا کہ بدصورتی سے محبت نہیں ہو سکتی، محبت کا مفہوم اب سمجھا تھا۔ اب اس کی تخلیق میں فراق کے پنچھی اڑتے ہیں اور ہجر کی آگ جلتی ہے۔ "الفراق اشد من الموت" ہجر موت سے زیادہ سخت ہے۔" اس کی پوری زندگی پر محیط ہو چکا ہے۔

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers If site is not opening ,or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

www.Paksociety.com

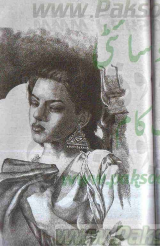

فرحت اشتیاق

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو

شہریار خان معزز اور اعلا خاندان سے تعلق رکھنے والے بے مثال ذہانت اور سحر انگیز شخصیت کے مالک ایک مغرور شخص ہیں۔ ورلڈ بینک میں ایک اعلا عہدے پر فائز ہیں اور بیوی بچوں کے ساتھ واشنگٹن میں رہتے ہیں۔ ان کی بیوی آمنہ خوب صورت اور ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں مگر گھریلو زندگی گزار رہی ہیں۔ سکندر اور زین ان کے دو بیٹے ہیں۔ سکندر اپنے باپ کا عکس ہے اس لیے شہریار خان کی تمام تر توجہ اور امیدوں کا مرکز ہے۔ زین ذہانت میں سکندر سے کم ہے۔ باپ کے امتیازی سلوک کی وجہ سے سکندر سے خائف رہتا ہے۔

محمود خالد نے عیسائی عورت وِتوریا سے شادی کی مگر دونوں میں نبھ نہ سکی اور لیزا اور سیم کی پیدائش کے بعد دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ سیم اپنے باپ کی طرح ذہین اور خوب صورت تھی۔ علیحدگی کی صورت میں اسے اپنی ماں کے ساتھ رہنا پڑا۔ لیزا ذہانت و خوب صورتی میں درمیانے درجے کی تھی۔ وہ محمود خالد کے پاس رہی۔ وِتوریا نے ارب پتی بزنس مین سے دوسری شادی کی اور میلان چلی گئی۔ نشے کی حالت میں وِتوریا کا دوسرا شوہر سیم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد لیزا کو اپنے والدین سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ محمود خالد کو چھوڑ کر اپنی نانی کے ساتھ روم شفٹ ہو جاتی ہے۔ محمود خالد عائشہ سے دوسری شادی کر کے پاکستان شفٹ ہو جاتے ہیں۔ محمود خالد اپنا کاروبار بچانے کے لیے سیم کی شادی اس سے پندرہ سال بڑے ہاشم اسعد سے کروا دیتے ہیں۔ لیزا کو اپنے باپ اور بہنوئی کی وجہ سے پاکستانی مردوں سے نفرت ہو

مکمل ناول

جاتی ہے۔ لیزا ایک مستورہ ہے۔ روم میں ملازمت کے سلسلے میں آئے ہوئے سکندر سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ سکندر کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوتی ہے اور اس کو پینٹ کرنا چاہتی ہے مگر سکندر انکار کر دیتا ہے۔

زین کی زندگی میں زین اور حسین ام مریم آتی ہے۔ زین اسے پرپوز کرتا ہے۔ شہریار خان بھی راضی ہو جاتے ہیں۔ یوں ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔ منگنی کے بعد زین ام مریم کو لے کر اپنے والدین کے پاس آتا ہے۔ وہاں ام مریم کی سکندر سے ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور احترام سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے بداخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس بات پر زین، سکندر سے مزید برگشتہ ہو جاتا ہے۔ اسی دوران گھر والوں کی عدم موجودگی میں سکندر ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر بروقت زین اور شہریار خان کی آمد سے ام مریم بچ جاتی ہے۔

ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرنے پر شہریار سکندر کو اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں اور اس سے ہر تعلق توڑ دیتے ہیں مگر کبھی کبھی آمنہ شہریار، سکندر کو فون کر لیتی ہیں۔ زین کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بیٹا علی ہے۔

سکندر کو احساس ہو جاتا ہے کہ لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اسے اپنا پورٹریٹ بنانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ تصویر بنانے کے دوران دو مقامی لڑکے ان دونوں کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سکندر ان سے مقابلہ کر کے انہیں مار بھگاتا ہے۔ لیزا آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ سکندر روم سے ہمیشہ کے لیے چلا آتا ہے۔ آخری بار وہ لیزا کے گھر دعوت میں جاتا ہے۔ لیزا اس کے چلے جانے سے بہت غمگین ہو جاتی ہے۔ نینی کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ پاکستانی مردوں سے نفرت کرنے کے باوجود لیزا سکندر سے محبت کرنے لگی ہے۔ لیزا سیم کو فون کر کے اپنی ناکام محبت کے بارے میں بتا دیتی ہے۔

ام مریم، زین سے منگنی ختم کر کے واپس چلی جاتی ہے۔ سکندر دوسرے دن دوبارہ گھر آتا ہے مگر شہریار خان اسے دھکے دے کر نکال دیتے ہیں۔ امو جان رو رو کر التجا کرتی ہیں کہ سکندر کو معاف کر دیں، وہ ست چھوٹا ہے مگر شہریار خان ان کی ایک نہیں سنتے اور سکندر کو اپنی تمام جائیداد سے عاق کر کے، ہر رشتہ توڑ کر اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ زین غصے سے گم زدہ سا کھڑا رہتا ہے۔

سکندر روم چلا جاتا ہے لیزا کو ہر جہات پر یاد کرتا ہے۔

سیم یعنی ام مریم اور لیزا یعنی کلثوم، محمود خالد کی بیٹیاں ہیں۔ ام مریم بچپن سے ہی بہت ضدی اور بدتمیز تھی۔ اپنے شوہر ہاشم سے بھی اس کا رویہ بہت خراب ہے ہاشم اسے منانے کے ہر وقت جتن کرتا رہتا ہے۔ سکندر کو وہاں ایک لڑکی پر لیزا کا گمان گزرتا ہے مگر وہ لیزا نہیں ہوتی اسے خود پر حیرت ہونے لگتی ہے۔

ساتویں قسط

وہ بجھے دل سے فلورنس جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ فلورنس میں اپنی چار روزہ ایگزیبیشن کے بعد اسے لندن واپس چلے جانا تھا۔ اس کی چھٹیاں اب ختم ہو جاتی تھیں پھر لندن میں واپس اس کی روٹین لائف شروع ہو جاتا تھی۔ کالج، فلیٹ، پینٹنگز، مصروف زندگی، ٹف شیڈول۔ نینی اس کے واپس جانے پر ہمیشہ کی طرح بہت دل گرفتہ تھیں۔ چھٹیوں کے آغاز پر جب وہ یہاں آتی تھی تو وہ کھل جاتی تھیں جیسے جیسے

اس کی واپسی کے دن قریب آتے جاتے وہ چپ چپ سی رہنے لگتی تھیں۔ حالانکہ لندن جا کر بھی وہ ان سے فون پر روزانہ نہیں بھی تو ایک آدھ دن چھوڑ کر بات کرتی ہی تھی مگر وہ اسے پھر بھی یہاں مس کرتی تھیں۔ وہ پیکنگ میں اس کی مدد کر رہی تھیں۔

"لندن جا کر اپنا خیال رکھنا لیزا۔" اس کا سامان رکھتے رکھتے وہ اس سے بولی تھیں۔

"میں اپنا خیال رکھوں گی نینی۔" اس نے مسکرا کر

انہیں یقین دلایا۔ وہ جانتی تھی نینی اسے یہ سمجھانا چاہتی ہیں کہ وہ سکندر کو بھلا کر زندگی کو نئے سرے سے شروع کرے۔ گرما کی تعطیلات میں ملے اس پردیسی اور اجنبی کو پردیسی اور اجنبی ہی سمجھ کر بھلا دے۔ کاش بھلا دینا اتنا آسان ہوا کرتا۔

"میں اوپر سے اپنا سامان لے آؤں۔" مسکرا کر نینی کو اپنے بہت مضبوط ہونے کا یقین دلاتی وہ کمرے سے نکلی تھی۔ لونگ روم میں رکھے فون کی گھنٹی بجی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ وہ سیم تھی۔

"کیسی ہو لز؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ تم اپنا سناؤ۔ کیا تم فلورنس آ رہی ہو؟" بہن کی آواز سن کر بہت خوش ہوا تھا، وہ مسکرائی تھی۔

"لز میرا پورا ارادہ تھا فلورنس آنے کا۔ مگر ہاشم کے کزن کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے دبئی میں۔ میں ہاشم کے ساتھ وہ شادی اٹینڈ کرنے دبئی جا رہی ہوں۔ حالانکہ میں نے تین مہینوں سے ہاشم سے کہہ رکھا تھا کہ میں نے اگست میں اٹلی جانا ہے۔ لز کا سولو شو ہے وہ بھی فلورنس میں۔ اس وقت "ہاں ہاں چلی جانا" ہوتا رہتا تھا اور اب جب میں تمہارے پاس آنے کا سارا پروگرام بنا چکی تھی تو آرڈر دیا گیا میرے خاندان کی بہت قریبی اور اہم شادی ہے، ہمیں دبئی جانا ہے۔ سیدھا سیدھا حکم سنا دیا گیا۔ میں کیا چاہتی ہوں، میری کیا مرضی ہے، وہ تو اہم ہے ہی نہیں نا۔ لز میں تم سے سچ کہتی ہوں زندگی میں کبھی بھول کر بھی کسی پاکستانی مرد سے شادی مت کرنا۔ یہ بیوی کو ڈی گریڈ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ میں اپنی بہن کے پاس اتنی خوشی خوشی جانے کی کیوں تیاری کر رہی ہوں، میری ذرا سی خوشی برداشت نہیں ہوئی ہاشم سے، صرف مجھے تمہارے پاس جانے سے روکنے کے لیے دبئی جانے کا پروگرام آناً فاناً بنا لیا گیا۔"

سیم کا غصے سے بھرا لہجہ دکھ لیے ہوا تھا۔ وہ اس کے پاس نہ آسکنے کو بہت محسوس کر رہی تھی۔ سیم کا جب

بھی زیادہ دل بھرا ہوتا تب ہی وہ ہاشم کے خلاف بول دیا کرتی تھی ورنہ زیادہ تر تو وہ اس کے ساتھ اپنے بہت خوش ہونے کے جھوٹ ہی بولا کرتی تھی۔ ہاشم اسد لیزا کو ذرا بھی پسند نہیں تھا۔ وہ آج تک اس سے کبھی ملی نہیں تھی۔ بہن کی زندگی برباد کرنے والے اس شخص سے وہ ملنا چاہتی بھی نہیں تھی۔

"کوئی بات نہیں سیم! تم آ نہیں پا رہیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سب سے بڑی بات تو تمہاری دعائیں ہیں اور وہ میں جانتی ہوں ہمیشہ میرے ساتھ ہیں۔"

اس کا دل سیم کے لیے بہت دکھا تھا مگر وہ بظاہر مسکرا کر بولی تھی۔ جیسی بھی ہوئی تھی اب سیم کی شادی ہو چکی تھی۔ سیم اپنی شادی کو نبھانا چاہتی تھی۔ جب وہ فیملی شروع کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ سیم نے ہاشم کے ساتھ اپنے رشتے کو زندگی بھر کے لیے قبول کر لیا ہے۔ ہاشم تو پہلے ہی تین بچوں کا باپ تھا۔ اسے مزید بچوں کی کیا خواہش ہو سکتی تھی مگر سیم اس سے گفتگو کے دوران بارہا یہ ذکر کرتی تھی کہ وہ اب ماں بننا چاہتی ہے۔ مگر ہاشم مانتا نہیں ہے۔ وہ مزید بچے نہیں چاہتا۔

"ہاں دعائیں تو ہیں مگر لز! میری خواہش تھی میں بھی تمہارے ساتھ وہاں ہوتی۔ ہمارے اٹلی میں ہو رہی ہے اس بار تمہاری ایگزیبیشن۔"

سیم نے دکھ سے بھری ایک سانس لی پھر فوراً ہی لہجے کو شاش بشاش بنا کر بولی۔

"خیر چھوڑو اس بات کو، تم مجھے یہ بتاؤ۔ تمہارا کام تو پورا ہو گیا ناں؟ جانے کی تیاری کر لی؟"

"میری سب پینٹنگز کمپلیٹ ہو گئی ہیں سیم! جانے کی تیاری بھی پوری ہے۔"

"مجھ سے فون پر کانٹیکٹ میں رہنا لز! میرا دل تمہاری ایگزیبیشن ہی میں اٹکا رہے گا۔"

"آف کورس سیم! یہ بھی کوئی بھولنے کی بات ہے۔"

سیم کے محبت بھرے لہجے کو محسوس کرتے ہوئے۔
وہ مسکرا کر بولی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے فلیٹ میں تھا۔ رات کا وقت تھا۔ لنچ میں وہ ناشپاتیاں کھانے کے بعد اس نے ڈنر میں اپنے لیے پاستا بنایا تھا۔ کھانے کو ذائقہ محسوس کرکے کھانا اس نے عرصہ ہوا چھوڑ دیا تھا مگر پھر بھی اب جب بھی کبھی اٹالین ڈشز اس کے سامنے آتیں چاہے وہ کسی پارٹی میں ہو تا یا کہیں کسی کے ساتھ لنچ یا ڈنر کر رہا ہوتا وہ انہیں ذائقہ محسوس کرکے کھاتا تھا۔ وہ انہیں کسی کو سوچتے، کسی کو یاد کرتے ہوئے کھاتا تھا۔ کوئی تھا جسے اپنی اٹلی کی ہر شے سے بہت پیار تھا۔ وہ اس کے پیار کو یاد کرکے اٹالین فوڈ کھاتا تھا۔ وہ گروسری کے لیے گیا تو گروسری اسٹور پر خوب ڈھونڈ کر اور چھان پھٹک کر اس نے اپنے لیے اٹالین چیز خریدی تھی۔ زیتون بھی وہ اسپین سے امپورٹ کیے ہوئے نہیں بلکہ اٹلی سے امپورٹ کیے خرید کر لایا تھا۔ اٹالین پنیر اور زیتون شامل کرکے اس نے اپنے لیے پاستا تیار کیا تھا۔

وہ پلیٹ میں پاستا لیے لیونگ روم میں ہی آکر بیٹھ گیا تھا۔ وہ پاستا کو انجوائے کر رہا تھا۔ ریموٹ سے اس نے ٹی وی بھی آن کر لیا تھا۔ ہسٹری چینل لگا تھا۔ وہاں اس وقت دنیا کی چند مشہور اور تاریخی اہمیت کی حامل آرٹ گیلریز کے اوپر ڈاکومنٹری آرہی تھی۔

وہ شوق اور دلچسپی سے اس پروگرام کو دیکھنے لگا تھا۔ ان مشہور گیلریز میں اب فلورنس کو دکھایا جا رہا تھا۔ وہاں کی مشہور آرٹ گیلریز کا ذکر ہو رہا تھا۔ اب اس میں اس مشہور آرٹ گیلری کو دکھایا جا رہا تھا جہاں لیونارڈو ڈاونچی سمیت کئی اور نامور مصوروں کا کام موجود تھا۔

"نیکسٹ منتھ فلورنس میں میری پینٹنگز کا سولو شو ہے۔" کھانا کھاتے اس کا ہاتھ رک گئے تھے۔
"ایگزیبیشن میں یہ میری سب سے بہترین پینٹنگ ہوگی۔"

اس کے کانوں میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ یہاں بیٹھے بیٹھے اُفیزی کے باغات میں اسی فوارے کے سامنے پہنچ گیا تھا جہاں بٹھا کر اس نے اس کی پینٹنگ بنائی تھی۔

"یہ مجھے بطور تحفہ دے دینا۔"
"نہیں تحفے میں دے دوں گی تو اپنے سولو شو میں کیا اسے نہیں رکھوں گی؟" "اسے تو مجھے لازمی وہاں رکھنا ہے۔ تم آؤ گے میرے شو میں؟" اسے یاد تھا یہ بات پوچھتے ہوئے وہ بڑی آس اور بڑی امید سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا سولو شو۔ فلورنس میں اس کا سولو شو۔

یک دم ہی بغیر کچھ سوچے سمجھے اس نے پلیٹ میز پر رکھی۔ سامنے والے دوسرے صوفے پر اس کا لیپ ٹاپ پڑا تھا۔ ایک بے اختیاری کیفیت میں وہ اٹھا۔ اگست کی کس تاریخ کو تھا اس کا سولو شو اس سے یہ پوچھنے کی اس نے کبھی ہمت ہی نہیں کی تھی۔ کہیں اس کا شو ہو نہ چکا ہو۔ اسے اٹلی سے واپس آئے ایک مہینہ ہو چکا ہے۔ کیا پتا اس کی ایگزیبیشن ہو بھی چکی ہو۔ کچھ دیر قبل اسے شدید بھوک لگ رہی تھی' وہ لیتا گرم گرم پاستا انجوائے کر رہا تھا اب سب کچھ بھلا کر اس نے لیپ ٹاپ گود میں رکھا۔ وہ کیا کرنا چاہتا ہے اسے خود معلوم نہیں تھا۔ وہ فلورنس گوگل کی آرٹ گیلریز میں اس ماہ ہونے والے سولو شوز کو سرچ کرنے لگا تھا۔ ایک دوسرا پیج کھول کر اس نے لیزا محمود کا فلورنس میں سولو شو لکھ کر بھی گوگل پر سرچ کرنا شروع کیا تھا۔ بڑی عجیب سی احمقانہ حرکت تھی۔ وہ ایک فون کال کرکے ہی لیزا سے پوچھ سکتا تھا کہ تمہاری ایگزیبیشن ہو گئی کہ نہیں مگر وہ اسے گوگل پر سرچ کر رہا تھا۔ اسے بڑی خوشی اور بہت فخر کا احساس ہوا تھا یہ جان کر کہ وہ اتنی مشہور ہے کہ محض ایک سیکنڈ میں گوگل نے لیزا محمود کی بائیوگرافی سے لے کر اس کی گزشتہ اور آئندہ ہونے والی تمام نمائشوں

تک کی تفصیلات اسے فراہم کر دی تھیں۔ فلورنس کی کس آرٹ گیلری میں اور کب لیزا محمود کی پینٹنگز کی نمائش ہونے والی تھی اسے پتا چل چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

آرٹ اور آرکیٹیکچر کے لیے مشہور اٹلی کے خوب صورت اور تاریخی شہر فلورنس میں وہ آچکی تھی۔ کل اس کے شو کی اوپننگ تھی۔ آج شو کی اوپننگ کے حوالے سے اس کی آرٹ گیلری کے منتظم کے ساتھ میٹنگ تھی۔

وہ میٹنگ کے لیے وہاں پہنچی تو اس کا بے حد پرجوش استقبال کیا گیا تھا۔ اب تو وہ ایک کامیاب آرٹسٹ کے طور پر اپنا نام بنا چکی تھی۔ شروع شروع میں جب وہ فائن آرٹس میں گریجویشن کرکے کالج سے فارغ ہوئی تھی اور زیادہ تر گروپ ایگزیبیشن میں اس کا کام ڈسپلے ہوا تھا۔ تب اچھی آرٹ گیلریز تک رسائی اور اس فیلڈ میں قدم جمانے کے لیے پروفیشنل باریکیاں سیکھنے میں سیم نے اسے بہت مدد اور تعاون فراہم کیا تھا۔ سیم کی بدولت ہی ایسا ہو پایا تھا کہ ابتدا ہی سے اس کا کام اچھی آرٹ گیلریز کی زینت بنتا تھا اور ایک آرٹسٹ کے طور پر اس کی CV مضبوط ہوتی چلی گئی تھی۔ اس نے منتظم کے ساتھ مل کر آرٹ گیلری کے اس ہال کا ایک تفصیلی دورہ کیا جہاں گیلری کے اسٹاف ممبرز منتظم کی دی ہدایات کے مطابق اس کی پینٹنگز کو دیواروں پر بڑے آرٹسٹک انداز میں آویزاں کر رہے تھے۔ وہ اپنا کام کر چکی تھی اب یہ کام منتظم کا تھا کہ وہ اس کے کام کو کتنے خوب صورت انداز میں ڈسپلے کرے گا۔

وہاں کا تفصیلی جائزہ لینے اور مطمئن ہونے کے بعد وہ منتظم کے ساتھ اس کے آفس میں آگئی تھی۔ جو واحد تصویر اس ایگزیبیشن میں فروخت نہیں کی جانی اس کے متعلق وہ منتظم کو بتا رہی تھی جب آرٹ گیلری کا ڈائریکٹر بھی اس سے ہائے ہیلو کرنے وہاں آگیا۔ ان

دونوں کے ساتھ اس کی پروفیشنل نوعیت کی گفتگو ہو رہی تھی۔ ڈائریکٹر پریقین تھا کہ اس کے سولو شو میں آرٹ کے قدردانوں کی ایک بڑی تعداد آئے گی۔ خاص طور پر وہ ہفتے اور اتوار کے دن لوگوں کی کثیر تعداد کی توقع کر رہا تھا۔ اس کے شو کی ایڈورٹائزمنٹ بھی کافی دنوں سے کی جا رہی تھی۔

ڈائریکٹر اور Curator ایک کامیاب شو کے لیے پرامید اور پریقین تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ خوشی کا اظہار کر رہی تھی مگر اسے اپنے اندر وہ ایکسائٹمنٹ محسوس نہیں ہو رہی تھی جو اپنی ایگزیبیشن سے قبل ہمیشہ ہوا کرتی تھی۔ اس بار کامیاب یا ناکامی اسے دونوں ہی سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ اس کے شو کا اوپننگ ڈے تھا۔ اس نے شیفون کے سفید رنگ کے لانگ گاؤن کے ساتھ امبرائیڈری کی ہوئی سفید ہی رنگ کی خوب صورت جیکٹ پہن رکھی تھی۔ پیروں میں سفید رنگ کے ہائی ہیل والے نازک سینڈلز تھے' موتیوں کا نیکلس اور ایئر رنگز پہنے تھے' شانوں سے پیچھے آتے ریشمی بالوں کو

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے
فائزہ افتخار کے 4 خوبصورت ناول

آئینوں کا شہر	قیمت -/500 روپے
بھول بھلیاں تیری گلیاں	قیمت -/500 روپے
لڑکیاں سے چوبارے	قیمت -/300 روپے
پھلاں دے رنگ ہزار	قیمت -/250 روپے

ناول منگوانے کے لیے فی کتاب ڈاک خرچ -/45 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

www.Paksociety.com

اس نے کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ جلیقے سے ہوا میک اپ اس کے اٹالین نقوش کو اور نکھار رہا تھا۔ وہ بست باوقار اور خوب صورت لگ رہی تھی۔ شام چار بجے شو کی اوپننگ ہوئی تھی اور اس وقت سے ہی لوگوں کی خاصی تعداد آنا شروع ہوگئی تھی۔ چونکہ فلورنس بھی اٹلی کا روم ہی کی طرح کا وہ شہر ہے، جہاں سیاح خاصی تعداد میں آتے ہیں سو اس کی ایگزیبیشن دیکھنے کے لیے آنے والوں میں ان سیاحوں کی بھی کافی تعداد تھی جو آرٹ کے شائقین تھے۔

وہ اپنی ایک پینٹنگز کے بارے میں ایک برٹش کپل کے پوچھے گئے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی آرٹ کے شیدائی تھے اور اس پینٹنگز میں اس کے رنگوں کے انتخاب اور اس نے آئل کلرز ہی کیوں استعمال کیے جیسے سوالات پوچھ کر آرٹ میں اپنی نالج اور دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے ان کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی تب ہی بے خیالی میں اس کی نگاہ سامنے اٹھی تھی۔

اسے بہت دور ہال کے داخلی دروازے سے ایک شخص اندر داخل ہوتا نظر آیا تھا۔ گرے سوٹ میں اپنی چھا جانے والی شخصیت کے ساتھ۔

نہیں وہ یہاں کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ اس کا واہمہ ہے یہ کوئی اور شخص ہے۔ شاید اس نے اسے سوچنا اتنا شروع کر دیا ہے کہ اب اسے جاگتی آنکھوں سے بھی اسی کے خواب دکھائی دے رہے ہیں۔

وہ معذرت کرتی اس برٹش کپل کے پاس سے ابھی اس نے پھر سامنے دیکھا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کیں، پھر کھولیں تاکہ اس خواب سے جاگ جائے مگر آنکھیں کھولنے پر بھی سامنے وہی آتا نظر آ رہا تھا۔ وہ مسکرا نہیں رہا تھا۔ وہ سنجیدہ تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اس کے نزدیک آ رہا تھا۔ وہ بالکل ساکت کھڑی اسے اپنے نزدیک آتا دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے پاس آ چکا تھا۔

"چاؤ Bella" وہ مسکرا کر بولا تھا۔

"سکندر" وہ حیرت اور بے یقینی کے سبب اس کے ذہن سے کچھ اور نہیں نکل سکا تھا۔

"دیکھو! تقدیر نے ہمیں پھر ملا دیا۔" وہ مسکرا کر بولا۔ وہ حیرت سے گنگ یک ٹک اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

"تم نے بتایا تھا فلورنس میں تمہارا سولو شو ہوگا۔ میں نے سوچا۔ آکر دیکھوں اپنے مشہور آرٹسٹ ہونے کا جو رعب جماتی ہو اس میں کچھ سچائی بھی ہے یا صرف باتیں بناتی ہو۔"

وہ اب بھی چپ چاپ اس کے چہرے کو بے یقینی سے دیکھے جا رہی تھی۔ اسے تو لگا تھا وہ اسے کھو چکی، وہ اس سے بچھڑ چکا اب عمر بھر وہ اسے کبھی نہیں ملے گا۔ مگر زندگی اتنی بھی سنگدل و کٹھور نہیں تھی۔

"کیا ہوا لیزا! کیا تم مجھے یہاں دیکھ کر خوش نہیں ہوئیں؟"

اس کی مسلسل خاموشی کو دیکھ کر سکندر نے قدرے سنجیدگی سے پوچھا۔

خوش؟ خوشی تو بہت چھوٹا بہت معمولی سا لفظ تھا اس کی دلی کیفیات کا اظہار کرنے کے لیے۔

"خوشی کو تو ابھی میں نے محسوس کرنا شروع بھی نہیں کیا۔ ابھی تو میں حیران ہو رہی ہوں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں ہو رہا۔ ایسا لگ رہا ہے، میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ ابھی آنکھ کھلے گی اور تم یہاں نہیں ہوگے۔ پہلے مجھے یہ یقین آ جائے کہ تم حقیقت میں میرے سامنے ہو پھر خوشی کو سوچوں گی۔"

وہ بے اختیار اپنے دل کی بات کہہ بیٹھی تھی۔ اسے اس پل خود پر اپنی زندگی پر بے پناہ پیار آ رہا تھا۔ جسے کھو دیا تھا زندگی نے اسے پھر اس کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ ابھی اسی وقت نینی کو فون کرے، "سیم کو فون کرے مگن دونوں کو بتائے کہ وہ اس وقت کیسا محسوس کر رہی ہے۔ سکندر شہریار اس کے سامنے کھڑا ہے" اس کے اتنے نزدیک کھڑا ہے کہ وہ اسے ہاتھ بڑھا کر چھو سکتی ہے۔

خوشی اور بے یقینی نے گھل مل کر اس کی آنکھوں میں آنسو جمع کر دیے تھے۔ وہ خود کو سنبھال رہی تھی۔ یہاں اس وقت، اس جگہ کھڑے ہو کر وہ کوئی بھی جذباتی حرکت ہرگز نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا گلا رندھ سا رہا تھا۔ وہ سکندر سے نارمل سے انداز میں کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ کوئی بھی ایسی بات، جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ اسے دیکھ کر خوش ہے۔ سکندر بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

ابھی وہ بولنے کے لیے کوئی مناسب سا جملہ ترتیب دے ہی رہی تھی کہ مقامی آرٹ اسکول کے کچھ نوآموز مصوروں کا ایک گروپ اس کے پاس آ گیا۔ ان میں سے چند ایک کو تو صرف اس کا آٹوگراف چاہیے تھا جبکہ باقیوں کو کچھ پینٹنگز کے بارے میں اس سے چند سوالات کرنے تھے۔ اس نے پریشان سا ہو کر سکندر کو دیکھا۔

وہ یہاں سے ابھی اور وہ چلا گیا تو پھر؟ اس بار وہ اسے کھو دینے کا تصور تک نہیں کر سکتی تھی۔ اپنی ایگزیبیشن، آرٹ گیلری اور یہاں آئے آرٹ کے قدردان، اسے یک دم ہی سب بہت برا لگنے لگا۔ اپنے اور اس شخص کے بیچ حائل ہوتی دیوار لگنے لگا۔ وہ جانتی تھی کہ اس پل اس کے چہرے پر الجھن اور پریشانی صاف پڑھی جا سکتی ہے۔ سکندر اسے کشمکش میں مبتلا دیکھ کر رسانیت سے بولا۔

"تم جاؤ لیزا!" وہ اس سے اردو میں مخاطب ہوا تھا۔ اس نے بھی جواب اردو ہی میں دیا تھا۔

"مگر تم۔" وہ کسی بھی قیمت پر اس کے پاس سے جانا نہیں چاہتی تھی۔

ایک بار کھو کر وہ اسے پھر مل گیا، یہ اس کی خوش قسمتی ہے۔ اب کی بار کھو دیا تو کیا پتا پھر کبھی ملے بھی کہ نہ ملے۔

"تم اطمینان سے سب سے ملو، بات چیت کرو۔ میں تمہاری پینٹنگز دیکھ رہا ہوں۔ میں یہیں ہوں۔" وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

وہ جیسے بادل نخواستہ اس کے پاس سے جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا لیزا کی تمام پینٹنگز دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ آرٹ اسکول کے نوآموز مصوروں کے گروپ سے گفتگو کے دوران بھی لیزا مڑ مڑ کر اسے دیکھتی جا رہی تھی۔ اسے "ناٹ فار سیل" (فروخت کے لیے نہیں) کے ٹیگ کے ساتھ اپنی پینٹنگ نظر آئی تھی۔ وہ چلتا ہوا سیدھا اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ اس نے اور لیزا نے اس پینٹنگ کے بننے کے دوران جو جو باتیں کی تھیں، وہ سب یاد آ رہی تھیں۔ اسے Tivoli یاد آ رہا تھا۔

"اچھی لگ رہی ہے نا تمہاری پینٹنگ؟" اسے پیچھے لیزا کا آ کر کھڑا ہونا محسوس ہوا تھا۔

"ہاں بہت۔" وہ تصویر سے نظریں ہٹاتے بولا۔

"چلو ہمیں باہر چلتے ہیں۔" وہ اس سے بولی تھی۔ اس بار اسے گردن گھما کر اسے دیکھنا پڑا تھا۔

"مگر ابھی ایگزیبیشن کا ٹائم ختم نہیں ہوا۔" اس نے گھڑی میں وقت دیکھا تھا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں کیوریٹر کو انفارم کر دیتی ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہی ہوں۔"

اس لڑکی کے لیے اپنی تصاویر کی نمائش جس کی نجانے وہ کب سے تیاریاں کر رہی تھی، جس کے لیے اپنی نجانے کتنی راتوں کا سکون اور نیند اس نے قربان کی تھی غیر اہم ہو چکی تھی۔ اگر کچھ اہم تھا تو سکندر شہریار۔

وہ چند لمحے ٹکٹکی باندھے لیزا کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔

"آج تمہارے شو کی اوپننگ ڈے ہے۔ بہت سے لوگ تم سے ملنے آ رہے ہیں۔ تمہارا اس طرح ایگزیبیشن سے چلے جانا مناسب نہیں۔ تم اطمینان سے یہاں سب سے ملو، سب کو وقت دو۔ ابھی تو اگلا ایک ڈیڑھ گھنٹہ میں تمہاری پینٹنگ کو دیکھ رہا ہوں۔ اتنا بھی آرٹ کا ناقدر نہیں۔ میں اپنی دوست لیزا محمود کے آرٹ کو دیکھنا اور سراہنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد بھی اگر آج کا شو ختم ہونے میں کچھ وقت باقی بچا تو میں

آرٹ گیلری کے کیفے میں جا کر بیٹھ جاؤں گا۔"

وہ دیکھ رہا تھا کہ لیزا فوراً" اس سے اختلاف کرتے ہوئے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اسے ڈر ہے کہ کہیں وہ پھر سے واپس نہ چلا جائے۔

"میں تم سے ملے بغیر، تم سے باتیں کیے بغیر، تم مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہو، یہ سنے بغیر یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔ شو کا ٹائم ختم ہو تو تم کیفے میں آجانا۔"

اس بار جیسے لیزا کو اس کی سچائی کا یقین آگیا تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔ وہ اتنی ہی پیاری لگ رہی تھی جتنی ہمیشہ لگا کرتی تھی۔ وہ صرف اس کو ہی اتنی پیاری لگتی تھی یا ہر کسی کو یونہی اس لڑکی سے محبت ہو جاتی ہوگی، وہ جانتا نہیں تھا۔

"سی۔ سینور سکندر!" وہ مسکرا کر بولتی ہوئی اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ وہ بڑی تسلی سے لیزا کی ہر پینٹنگ کو دیکھ رہا تھا۔ گاہے بگاہے وہ لیزا کو بھی دیکھ رہا تھا۔ جو کبھی کسی سے گفتگو کرتی نظر آتی تو کبھی کسی سے۔ وہ لوگوں کے ہجوم میں تھی۔ کبھی کسی کو آٹو گراف دیتی نظر آرہی تھی تو کبھی کسی کے ساتھ تصویر کھنچواتی، کبھی کسی کے سوالوں کے جواب دیتی ان کی نگاہیں ملتیں، وہ نگاہوں میں نرم سا تاثر لیے اسے دیکھ کر مسکرا اٹھتا۔ جوابا" لیزا اسے یوں دیکھتی جیسے ابھی تک بے یقینی کا شکار تھی اس کی یہاں موجودگی پر۔

وہ لوگوں کی تعریفوں، ستائشوں کو سنتے رہنے سے زیادہ اس کے پاس آنے کے لیے بے چین نظر آرہی تھی۔ نو بجے شو کا ٹائم ختم ہونا تھا اور وہ صرف لیزا کی پریشانی اور الجھن کا خیال کر کے وہاں نو بجے تک رکا رہا تھا۔ وہ کئی بار گھوم پھر کر لیزا کی ہر پینٹنگ کو تقریبا" حفظ کر چکا تھا۔ اس نے لیزا سے کیفے میں جا کر بیٹھنے کی بات کی تھی اور لیزا نے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں کیا تھا مگر پھر بھی اسے لگا تھا اگر وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوا تو وہ شو کے ختم ہونے کے وقت تک یہاں ٹھہر نہیں پائے گی۔ اس کے پیچھے پیچھے چلی آئے گی۔ یہ لیزا محمود کا دن تھا۔ اس کی نجانے کتنے مہینوں کی محنت کا ثمر آج اسے مل رہا تھا، اس صورت میں کہ ایک بڑی

تعداد میں لوگ اس کی تصاویر کو دیکھنے اس کے آرٹ کو سراہنے کے لیے آرہے تھے۔

اس نے خود آرٹ گیلری کے کیوریٹر کو کسی سے بہت خوشی سے یہ کہتے سنا تھا کہ اس کی توقع سے بھی بڑھ کر لوگ نمائش دیکھنے آرہے ہیں۔ آرٹ کے نقاد، صحافی اور آرٹ کے قدردان لیزا کو سراہ رہے تھے۔ لوگ اس کی پینٹنگز منہ مانگے دام پر خریدنے کو بے قرار تھے۔ وہ اس خاص دن اور خاص موقع کو لیزا کے لیے بہت خاص رہنے دینا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی وہ اپنی کامیابی کو پوری طرح انجوائے کرے۔ اس کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر اسے خوشی سے سرشار سا دیکھ کر اسے بہت خوشی ہو رہی تھی۔

اسے کئی بار لگا جیسے وہ اپنے کامیاب سولو شو پر نہیں بلکہ سکندر شہریار کے اس شو میں آجانے پر خوش ہے۔ وہ اپنی کامیابی پر نہیں، بلکہ اس کے آجانے پر خوش تھی۔ ادھر گھڑی نے نو بجائے ادھر لیزا سب چھوڑ چھاڑ سیدھی اس کے پاس آگئی۔

"چلیں؟"

"تمہیں اگر کچھ دیر اور رکنا ہے تو رک جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کرلوں گا۔" وہ مسکرا کر رسانیت سے بولا۔

"نہیں۔ مجھے اور نہیں رکنا۔ ڈنر کے لیے میں کیوریٹر سے پہلے ہی معذرت کرچکی ہوں۔ میں انہیں کافی دیر پہلے بتا چکی ہوں کہ میرے ایک بہت خاص گیسٹ آئے ہیں، مجھے ڈنر ان کے ساتھ کرنا ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر بولی تھی۔

"فیلو پھر۔" ان دونوں نے باہر جانے کے لیے ایک ساتھ قدم بڑھائے تھے۔ وہ دونوں آرٹ گیلری سے باہر نکل آئے تھے۔ فلورنس میں بھی اسے سیاح اسی طرح نظر آرہے تھے جیسے روم میں نظر آتے تھے۔ آرٹ گیلری کے آس پاس کئی تاریخی عمارتیں، چرچ اور قدیم، خوبصورت فاؤنٹین موجود تھے۔

"تم نے مجھے بتایا ہی نہیں تھا کہ تم بھی اگلے ماہ فلورنس آنے والے ہو۔"

اسے خود دو دن پہلے تک پتا نہیں تھا کہ وہ دوبارہ اٹلی آنے والا ہے۔ وہ ایک ریسٹورنٹ کے پاس آکر رک گیا تھا۔ ریسٹورنٹ کے باہر بھی میزیں لگی تھیں، تاکہ جو لوگ ارد گرد بکھری تاریخ اور فلورنس کی خوبصورتیوں کو سراہتے ہوئے کھانا کھانا چاہتے ہیں، وہ ایسا کرسکیں۔

"کیا خیال ہے، یہاں بیٹھ کر کھانا کھائیں؟"

بجائے لیزا کے سوال کا جواب دینے کے اس نے کھانے کی بات چھیڑی۔

لیزا نے خوشی خوشی مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ وہ دونوں ایک میز پر بیٹھ گئے تھے۔ وہاں سے آس پاس کی تاریخی عمارتیں اور فوارے بڑے خوبصورت لگ رہے تھے۔

"تمہارے شو کی اوپننگ تو بڑی کامیاب رہی ہے۔"

اسے لیزا سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کیا چیز شوق سے کھاتی ہے۔ اس کی پسند کی ڈشز اسے ازبر تھیں اور وہ انہیں آرڈر کرچکا تھا۔

"ہاں۔" وہ شو کی کامیابی پر بس اتنا ہی خوش تھی کہ "ہاں" کہہ دینا اسے کافی لگا تھا۔ اس کی اصل دلچسپی اس بات میں تھی کہ سکندر شہریار یہاں کیسے آگیا ہے۔

"تم نے بتایا نہیں، تمہارا فلورنس آنا کیسے ہوا؟"

اور سکندر شہریار لیزا محمود کے حسین چہرے کو اپنی نگاہوں کی گرفت میں لیے خود اپنے آپ سے یہ سوال کر رہا تھا کہ وہ آج یہاں فلورنس میں کیا کر رہا ہے؟

"کیا آفس کے کسی کام سے یہاں آئے ہو؟" اسے خاموش دیکھ کر لیزا نے مزید پوچھا۔ ان کے سامنے ان کا کھانا سرو کیا جاچکا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا وہ لیزا سے جھوٹ بول دے کہ "ہاں! میں یہاں کسی میٹنگ یا کانفرنس میں شرکت کے لیے آیا ہوں" مگر زندگی میں جو ایک واحد سچا رشتہ "ایک سچی محبت" اسے اس وقت ملی تھی، جب وہ زندگی اور محبت ہی سے ناامید ہو بیٹھا تھا کیا اس سے جھوٹ بولا جاسکتا تھا؟

ماہنامہ
حنا
بہنوں کا اپنا ماہنامہ
لاہور
اپریل 2012 کا شمارہ شائع ہوگیا ہے
اپریل 2012 کے شمارے کی ایک جھلک
☆ "سلیمہ ہاشمی" سے کاشف گوریجہ کی ملاقات،
☆ "چراغ راہ" صبا احمد کا مکمل ناول،
☆ "ستم گزیدہ" سدرہ سحر عمران کے قلم سے ناول
ایک دل گداز تحریر،
☆ "تمہاری راہ طلب میں" صبا عامر کا مکمل ناول،
☆ "وفا کا ناطہ" تحسین اختر کا ناولٹ،
☆ "تیری راہ طلب میں" صبا عامر کا ناولٹ،
☆ اس کے علاوہ عنبر اکمل، ریما انصاری، ساجدہ تاج، سعدیہ ملک
اور فلک ارم ملک کے افسانے،
☆ "تم آخری جزیرہ ہو" ام مریم کا سلسلے وار ناول،
☆ "وہ ستارہ صبح امید کا" فوزیہ غزل کا
سلسلے وار ناول،
پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں، رنگ و خوشبو، شوبز
کی دنیا کی دلچسپ معلومات کے علاوہ حنا
کے بھی مستقل سلسلے شامل ہیں
اپریل 2012ء
آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب کریں

کیا وہ لیزا محمود سے جھوٹ بول سکتا ہے؟ اس کی زندگی میں سچی ہنسی، سچی خوشی، سچی محبت بلکہ زندگی ہی کو واپس لانے والی اس لڑکی سے وہ مرتے دم تک جھوٹ نہیں بول سکتا۔ کیا وہ اس سے محض اس لیے جھوٹ بول دے کہ سچ بول کر خود کو اس پر عیاں نہیں کرنا چاہتا؟

"نہیں۔" وہ لیزا کے ساتھ اپنے رشتے کی سچائی اور خوبصورتی کو صرف خود کو عیاں کرنے کے خوف سے کم نہیں کر سکتا۔

"میں یہاں آفس کے کام سے نہیں آیا۔" وہ آہستہ اور سنجیدگی سے بولا۔ ابھی ان دونوں نے کھانا کھانا شروع نہیں کیا تھا۔

"میں فلورنس خاص طور پر تمہاری وجہ سے آیا ہوں۔ تمہارا سولو شو دیکھنے اور تم سے ملنے۔ تمہیں مبارک باد دینے۔"

اس نے لیزا کے چہرے پر پہلے حیرانی پھر خوشی اور پھر خوشی سے سرشار مسکان بکھرتی دیکھی۔

"تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ میں یہاں صرف اور صرف لیزا محمود سے ملنے آیا ہوں۔ میں نے گوگل پر تمہارے اس شو کی جگہ اور تاریخ سرچ کی تھی۔ میں نے دو دن پہلے بالکل آناً فاناً اور اچانک فلورنس آنے کا پروگرام بنایا ہے۔" وہ اس کی خوشی اور بے یقینی محسوس کر کے مسکرا کر بولا۔

"کیوں؟" وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

اب وہ اسے کیا بتاتا کہ وہ ایک جادوئی سی قوت کے زیر اثر یہاں چلا آیا ہے۔ بغیر کسی ارادے اور کسی سوچ کے اس کا دل اسے یہاں اٹھا لایا تھا۔ اس کے دل نے اسے سوچنے اور سمجھنے کی مہلت تک نہیں دی تھی۔ اگر اس نے ذرا بھی سوچ سمجھ لیا ہوتا تو کیا آج یہاں لیزا محمود کے سامنے بیٹھا "اس مشکل سوال کا سامنا کر رہا ہوتا۔ وہ اس سے ملنے آیا ہے، مگر کیوں؟ کس لیے؟"

وہ تو اس لڑکی سے زندگی بھر نہ ملنے کے ارادے باندھے بیٹھا تھا۔

لیزا کے خوشی سے سرشار چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے آپ سے الجھ رہا تھا۔ اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اسے لیزا سے دوبارہ نہیں ملنا چاہیے تھا۔ دوبارہ ملنے کا مطلب ہے اسے کوئی آس، کوئی امید دلانا۔ اسے اپنی محبت کا یقین دلانا۔ وہ لیزا کو اپنی وجہ سے کوئی بھی دکھ دینے کا کبھی تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ جب وہ اسے اپنا ساتھ اور اپنی محبت نہیں دے سکتا تو اسے یہ حق بھی نہیں کہ وہ اس کی زندگی میں بار بار آ کر ہلچل پیدا کرے۔

"تم آج بہت اچھی لگ رہی ہو۔" اس کے سوال کا جواب دیے بغیر اس نے گفتگو کا موضوع ہی تبدیل کر دیا۔

"وائٹ کلر تم پر بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

اس نے اپنی پلیٹ میں پاستا ڈالا، ساتھ ہی لیزا کے آگے بھی ڈش رکھی۔ لیزا خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"شروع کرو بھئی۔" اس نے خود ہی لیزا کی پلیٹ میں بھی پاستا ڈالا۔

اس نے کھانا شروع کر دیا تھا مگر وہ اسے دیکھ رہی تھی، اسی طرح سنجیدگی اور خاموشی سے۔ اس کی آنکھوں میں بہت سے سوال تھے، وہ آنکھیں اس سے سوال کر رہی تھیں، اپنے ہر سوال کا جواب مانگ رہی تھیں۔

"تمہاری نینی کیسی ہیں؟"

وہ یہاں کر انجان بن رہا تھا۔ اسے لیزا کی آنکھوں میں موجود سوالوں سے ڈر لگ رہا تھا۔ اس کا یہاں سے بھاگ جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ وہ آخر یہاں کیوں آیا ہے؟ اس کے دل نے یہ اسے کس مشکل میں ڈال دیا ہے۔

"ٹھیک ہیں۔" لیزا نے اس کے کہنے پر کھانے کا ایک نوالہ لیا تھا۔ وہ سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جبکہ وہ اس کی نگاہوں میں چھپے سوالوں سے نگاہیں چرا کر کھانا کھانے میں یوں مگن تھا گویا آج اس وقت ان دونوں کے درمیان سب سے اہم بات ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا ہی تھی۔

"تم آج ہی آئے ہو؟"

"ہاں۔ ایئرپورٹ سے سیدھا تمہارے پاس تمہاری ایگزیبیشن میں چلا گیا۔"

جو سوچ رہا تھا وہ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"ہاں، آج ہی آیا ہوں اور کل صبح واپس چلا جاؤں گا۔"

وہ لیزا کو دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

"تمہاری ایگزیبیشن تو میں دیکھ آیا ہوں، بہت اچھی جا رہی ہے۔ تمہارے سولو شو کے اتنے کامیاب آغاز پر کیسا محسوس کر رہی ہو؟"

"تم مجھ سے وہ کیوں نہیں کہتے سکندر! جو کہنا چاہتے ہو؟ جو میں تمہارے لبوں سے سننا چاہتی ہوں۔ تم اپنے سب کام، ساری مصروفیات چھوڑ کر میری خاطر دوبارہ سے فلورنس آ سکتے ہو تو اپنے دل کی بات کیوں نہیں کہہ سکتے؟"

لیزا کی آنکھیں اس سے پکار پکار کر کہہ رہی تھیں۔ وہ اس کے لبوں سے ایک اظہار سننے کی متمنی تھی۔

"میں نے اس ایک مہینے میں تمہیں بہت یاد کیا ہے سکندر!"

وہ چند لمحوں تک اس کے کچھ کہنے کی منتظر رہی۔ پھر جب دیکھا کہ وہ کچھ نہیں کہہ رہا تب آہستگی سے بولی۔

"تم مجھے فون کر لیتیں۔ تمہارے پاس میرا سیل نمبر تو تھا۔"

"تم جس انداز سے مجھ سے گڈ بائے کر کے گئے تھے، کیا اس کے بعد میں ایسا کر سکتی تھی؟ تمہارا مجھ سے رخصت ہونے کا انداز مجھے واضح طور پر بتا گیا تھا کہ تم اس چند روزہ ملاقات کو عمر بھر کی دوستی میں تبدیل نہیں کرنا چاہتے۔" وہ شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھ کر دھیمی آواز میں بولی۔

"میں کیا چاہتا ہوں اور کیا نہیں چاہتا، مجھے خود نہیں پتہ۔ میں یہاں فلورنس میں کیا کر رہا ہوں، کیوں بیٹھا ہوں یہاں، مجھے تو یہ بھی نہیں پتہ۔"

وہ جیسے خود اپنے اوپر ہنسا تھا مگر اس ہنسی میں ایک بے بسی پنہاں تھی۔ لیزا اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہی ہے۔

"اپنے دل سے پوچھ لو کیا پتا وہ تمہیں بتا دے۔" لیزا اس کی طرف دیکھ کر آہستگی سے بولی۔

وہ جواباً چپ رہا۔ وہ جیسے کچھ بھی کہتے ہوئے محتاط تھا۔ مبادا اس کے لبوں سے کوئی ایسی بات نکل جائے جو اس پیاری لڑکی کو وعدے کی کسی ڈور سے باندھ دے۔ وہ اپنی زندگی کے اندھیروں میں اسے کیوں حصہ دار بنائے۔ وہ اگر اسے کوئی خوشی نہیں دے سکتا تو اسے کوئی دکھ دینے کا بھی اسے کچھ حق نہیں۔

"چلو فلورنس کی سڑکوں پر گھومیں۔ تمہارے روما کی طرح یہاں بھی تو ہر گلی پر، ہر سڑک پر ہسٹری بکھری پڑی ہے۔"

وہ کھانا چھوڑ کر یک دم ہی میز سے اٹھا تھا۔ بل ادا کرنے کے لیے اس نے ویٹر کو اشارے سے بلایا تھا۔ لیزا اسے دیکھتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔

وہ دونوں آہستہ قدموں سے چلتے کیفے سے دور آ گئے تھے۔ لیزا خاموش تھی۔ اس نے لیزا کے خاموش چہرے کو بغور دیکھا۔ اس کے چہرے پر اب خوشی نہیں، دکھ اور خاموشی تھی۔

"اتنی چپ کیوں ہو لیزا! پلیز کوئی بات کرو۔" لیزا نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا ضرور، بولی کچھ نہیں۔

"کیا میں نے یہاں آ کر تمہیں دکھی کیا ہے؟ پتا ہے لیزا! تمہارا بہت بولنا اور بے تحاشا ہنسنا مجھے بہت پسند ہے۔"

لیزا چلتے چلتے یک دم ہی رکی تھی۔ وہ دونوں اس وقت فوارے کے بالکل نزدیک کھڑے تھے۔ لیزا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"جب تمہیں میں پسند ہوں میری ہر بات بھی پسند

www.Paksociety.com

ہے تو پھر الجھن کیا ہے سکندر؟"

لیزا نے یک دم ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکال نہیں پایا۔ اس نے لیزا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اسے اس کی آنکھوں میں ایک فیصلہ کن سی کیفیت نظر آئی۔ اس کی آنکھیں ارادوں کی مضبوطی کے ساتھ یہ بتا رہی تھیں کہ اس بار وہ اسے اپنی زندگی سے نکلنے نہیں دے گی۔ اسے روک لے گی۔ اس نے ایک گہری سانس لی جس میں اک عمر کی تھکن شامل تھی۔

"میری زندگی میں الجھنیں ہی الجھنیں ہیں لیزا! میری زندگی تمہاری زندگی جیسی خوشگوار اور ہموار نہیں۔ تم مجھے نہیں جانتیں۔"

آہستگی سے بولتے ہوئے اس نے لیزا کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکالا اور فوارے کے اطراف لگی بنچ پر نڈھال سے انداز میں بیٹھ گیا۔ وہ لیزا کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے زمین کو گھور رہا تھا۔ اس نے لیزا کو اپنے برابر بیٹھنا محسوس کیا تھا۔

"تمہیں جتنا جاننا میرے لیے ضروری تھا میں تمہیں اتنا جانتی ہوں سکندر! میں جانتی ہوں کہ میرے ساتھ بیٹھا یہ شخص ایک سچا اور کھرا انسان ہے۔ یہ ساتھ ہو گا تو مجھے زندگی سے اپنے لیے اور کچھ بھی نہیں چاہیے ہو گا۔ یہ میری حفاظت کرے گا' یہ میری بہت پروا کرے گا' یہ مجھ سے بہت محبت کرے گا۔"

"اس کے بارے میں کچھ بھی جانے بنا اتنا بھروسا؟ اتنا بھروسا تو اس کے بہت اپنوں نے بھی اس پر نہ کیا تھا۔" اس نے تلخی سے سوچا۔

"تم مجھے اتنا اچھا مت سمجھو لیزا! میری سچائی وہ نہیں جو تمہیں دکھتی ہے۔ میں اتنا اچھا ہرگز نہیں جتنا تم سمجھتی ہو۔ بہت سیاہ' بہت داغ دار ہے میرا وجود۔ میرے قریب آؤ گی تو میرے وجود کی سیاہی تمہیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔"

اس نے اب بھی نظریں اٹھا کر لیزا کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسی طرح زمین کو دیکھتا آہستہ آواز میں بولا تھا۔ بنچ پر رکھے اس کے ہاتھ کو لیزا نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا ہاتھ تھامے تھامے نہ جانے اسے کیا ہوا' اس نے اس کی ہتھیلی اپنی نگاہوں کے سامنے کر لی۔ وہ بغور اس کی ہتھیلی کو دیکھ رہی تھی۔

سخت کاموں اور بے تحاشا محنت اور مشقت نے اس کے ہاتھوں کو کسی راج مزدور' کسی پلمبر' کسی کارپینٹر کے ہاتھوں جیسا سخت اور کھردرا بنا دیا تھا۔ برسوں کی مشقتیں اس کے ہاتھوں سے واضح تھیں۔ لیزا نے شاید اس چیز کو پہلے بھی کبھی محسوس کر رکھا تھا تب ہی بجائے کچھ پوچھنے کے اس نے آہستگی سے بے حد نرمی سے اس کی ہتھیلی پر اپنی انگلیاں پھیری تھیں۔

"تمہیں زندگی نے بہت دکھ دیے ہیں نا سکندر! اسی لیے اب تم زندگی سے خفا ہو۔ تم خوش نہیں ہونا چاہتے' تم ہنسنا نہیں چاہتے۔ تم زندگی سے خوشیوں سے منہ موڑ لینا چاہتے ہو؟" اس نے بے اختیار نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"تم جانتی ہو اپ کمال؟ تمہارے ساتھ تمہارے روما میں پورے بارہ سال بعد ہنسا تھا۔ مجھے رنگ اچھے لگنے لگے تھے' مجھے زندگی اچھی لگنے لگی تھی۔ میرا خوش ہونے کو جی چاہنے لگا تھا۔ تمہاری سنگت میں پورے بارہ سال بعد میں خوش ہوا تھا۔ جب تھا کوئی جادو ہے تم میں جو مجھے تمہارے پیچھے فلورنس تک کھینچ لایا ہے۔" وہ کہے بنا نہیں رہ پایا۔

وہ اتنی نرمی سے اس کی سخت اور کھردری ہتھیلی پر اپنی انگلیاں پھیر رہی تھی جیسے اس کے زخموں سے چور چور وجود کا ہر درد سمیٹ لینا چاہتی ہو۔

"جب تمہیں میرے ساتھ خوشی ملتی ہے تو پھر مشکل کیا ہے سکندر! پلیز میرے اور اپنے لیے زندگی کو مزید مشکل مت بناؤ۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔"

"پلیز لیزا! اس طرح کی باتیں مت کرو۔ میں ایک تھکا ہوا اور ناکام انسان ہوں۔ میرے اندر زندگی کی امنگ ختم ہو چکی ہے۔ میرے پاس تمہیں دینے کے لیے مایوسیوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مجھے تمہارے پاس یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ تمہاری پرسکون زندگی کو ڈسٹرب کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں تمہیں کوئی خوشی نہیں دے سکتا تو دکھ بھی نہیں دینا چاہیے۔" وہ بہت تکلیف سے بول پا رہا تھا۔

"تم نے آج یہاں آکر مجھے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی دی ہے سکندر! میری محبت یک طرفہ نہیں' مجھے یہ اطمینان دیا ہے۔ جس سے مجھے محبت ہے۔ وہ میری خاطر' میری محبت میں اپنے سب کام چھوڑ کر روما سے فلورنس آیا ہے۔ میں خوشی سے پاگل ہو رہی ہوں اور تم کہتے ہو تم نے مجھے دکھ دیا ہے؟ مجھے ڈسٹرب کیا ہے؟"

وہ لیزا کے منہ سے محبت کا لفظ سن کر پریشان ہو گیا۔

"اس لفظ کو ہمارے درمیان مت لاؤ لیزا! ورنہ جب میں تمہیں چھوڑ جاؤں گا تو یہ لفظ کسی دوسرے شخص کا ساتھ قبول کرنا تمہارے لیے بہت مشکل بنا دے گا۔" اس کا لہجہ ایک ہارے ہوئے' ناکام شخص کا لہجہ تھا' جو زندگی کے ہر محاذ پر پہلے ہی شکست تسلیم کر چکا تھا۔

"تم مجھے کیوں چھوڑ جاؤ گے؟" اس سے یہ سوال پوچھتے وقت لیزا کا لہجہ بھر آیا تھا۔

"اس لیے کہ میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔"

"تم ہو نا۔ میرے لیے تمہارا ہونا ہی سب کچھ ہے۔"

وہ ایک پل اسے کھو دینے کے خوف سے پریشان لگنے لگی تو اگلے پل یوں لگا وہ پر یقین ہے کہ وہ اسے روک لے گی۔ وہ اس لڑکی کی ان محبتوں کا حقدار نہیں کیسے سمجھائے اسے۔

"جذباتی باتیں مت کرو لیزا! سمجھنے کی کوشش کرو۔ جو تم سوچ رہی ہو وہ کبھی نہیں ہو سکتا۔" وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں قدرے خفگی سے بولا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" لیزا کا اس کی جھنجلاہٹ کے جواب میں پرسکون انداز تھا۔

"اس لیے کہ میں تمہارے قابل نہیں۔ میرے ظاہری وجود اور میری موجودہ زندگی پر نہ جاؤ۔ میرا ماضی داغ داغ ہے۔ میرا ماضی بڑا بھیانک ہے۔ برسوں ہوئے میری فیملی مجھے ڈس اون کر چکی ہے۔ سوائے میری ماں کے جو بھی کبھی مجھ سے فون پر بات کر لیتی ہیں' میرے گھر کا کوئی فرد میری شکل دیکھنا تک گوارا نہیں کرتا۔ میں بیس سال کی عمر میں چار بلیک Gay امیکنز کے ہاتھوں sexually abuse کیا جا چکا ہوں۔ میں اندر سے اتنا کھوکھلا' اتنا داغ دار ہوں کہ میرے نزدیک آنے سے تمہاری اجلی شفاف صورت بھی بدنما ہو جائے گی۔"

وہ یک دم ہی جیسے پھٹ پڑا تھا۔ لیزا حیرت اور دکھ سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"سکندر!"

"ہاں! اولابور گیس پر اس لڑکی کے لیے اتنے جنونی انداز میں میں نے اس لیے ری ایکٹ کیا تھا کہ میں خود ایک rape victim ہوں۔ جب تمہیں یہ سب بتا ہی رہا ہوں تو یہ بھی بتا دوں اپنا وہ ایکسیڈنٹ میں نے خود کروایا تھا۔ میں خود ایک گاڑی کے سامنے آگیا تھا۔ اس لیے کہ میں مرنا چاہتا تھا۔ یہ ذلت بھری زندگی جیتے جیتے میں تھک چکا ہوں۔"

وہ بہت زور سے چلایا تھا۔ آس پاس سے گزرتے چند لوگوں نے اسے تعجب سے دیکھا تھا۔ اس کی زبان سمجھ میں نہیں آرہی تھی مگر چلانا تو سمجھ میں آرہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ یہاں پتھروں سے سر مار مار کر رونا شروع کر دے۔ پھر کسی گاڑی کے آگے آجائے۔ اسے اپنے آپ سے نفرت ہو رہی تھی۔ اپنے وجود سے گھن آرہی تھی۔ اس کا خود کو مٹا ڈالنے کو جی چاہ رہا تھا۔

وہ لیزا کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل چاہا یہاں سے اٹھ کر کہیں بہت دور بھاگ جائے۔ اتنی دور کہ زندگی میں دوبارہ لیزا سے کبھی سامنا نہ ہو سکے۔ اپنی اتنی بھیانک سچائی آج تک اس نے کسی کو نہیں بتائی تھی۔ لیزا کو بتا کر اب وہ اس کا سامنا کرنے کی ہمت خود میں نہیں پا رہا تھا۔ نجانے یوں بالکل سن سا بیٹھے اسے کتنی دیر ہوئی ہو گی جب اسے یک دم ہی اپنی

www.paksociety.com

ہتھیلی پر نمی کا احساس ہوا۔ اس نے بے اختیار سر اٹھا کر لیزا کو دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کے آنسو اس کی ہتھیلی پر گر رہے تھے۔ اس نے لیزا کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکالا اور یک دم ہی بینچ پر سے اٹھا بغیر لیزا کی طرف دیکھے وہ آہستگی سے بولا۔

"میں کل صبح تم سے مل کر واپس چلا جاؤں گا۔"

اسے خود اپنی آواز اجنبی لگی تھی۔

"تم کہاں جا رہے ہو سکندر؟"

وہ روتے روتے بینچ سے اٹھی تھی۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی مگر وہ اب یہاں مزید ایک پل نہیں رک سکتا تھا۔

"لیزا پلیز! میں اس وقت اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔ میں تم سے کل بات کروں گا۔"

اپنی پامالی، اپنے سارے دکھ اسے پھر سے یاد آنے لگے۔ وہ اس وقت کسی اور کا تو کیا خود اپنا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ عجیب سی ایک نفرت، غصہ اور وحشت اس پر سوار ہو گئی تھی۔ وہ لیزا کو وہیں چھوڑ کر اپنے ہوٹل جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے ہوٹل روم میں تھا۔ خودکشی کرنے کا خیال اس پر پوری طرح حاوی تھا۔ وہ کیوں زندہ ہے؟ اسے مر جانا چاہیے۔ اسے بارہ سال پہلے ہی مر جانا چاہیے تھا۔ ایک وحشت تھی، جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

اسی نو عمر سکندر شہریار کی طرح جس سے اس کی شخصیت کی آن، بان اور وقار ایک لڑکی نے چھین لیا تھا۔ چند کالے امریکیوں نے چھین لیا تھا۔ اس کے اپنے خونی رشتوں نے چھین لیا تھا۔

ام مریم، وہ چار gay امریکنز، شہریار خان، زین شہریار۔ ان سب میں سکندر شہریار کا قاتل کون تھا؟

اسے تو آج ان سب میں سے کسی کا بھی خیال نہیں آ رہا تھا۔ کسی سے بھی نفرت محسوس نہیں ہو رہی تھی اگر وہ کسی سے نفرت کر رہا تھا تو اپنے آپ سے۔ اتنا

وحشت بھی کوئی ہوتا ہے کہ اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی انسان جیتا چلا جائے۔ وہ لکسر کس کیوں آیا تھا؟ اسے لیزا کیوں اچھی لگتی تھی؟ اس کا لیزا سے پھر سے ملنے کو کیوں جی چاہتا تھا؟ اس کا دل چاہا، وہ خود کو سزا دے۔ اسے نہ تو خوش ہونے کا کوئی حق حاصل ہے، نہ جینے کا اور نہ محبت کرنے کا۔ اپنے اس داغ دار وجود کو لے کر اسے برسوں پہلے مر جانا چاہیے تھا۔

☼ ☼ ☼

"اگر واقعی میرا خون ہو اور ابھی غیرت تم میں بچی ہے تو آج کے بعد مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔"

"بے غیرت انسان! ام مریم پر گندی نظر ڈالنے کی تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟"

"مجھے اس درندے سے بچاؤ زین! یہ میری عزت برباد کرنا چاہتا ہے۔"

"ہم مریم کو ٹھکرانے کی ساری زندگی کوئی ہمت نہیں کر سکا ہے۔"

"Ray! leave the baby."

"It's my turn"

اپنے بال نوچتا وہ بارہ سال پہلے کے سکندر شہریار کی طرح ہی رو پڑا تھا۔ اس کے گرد آوازیں ہی آوازیں تھیں۔ شور ہی شور تھا۔ وہ چار تھے اور وہ اکیلا تھا۔ وہ بھیم تجیم طاقت ور تھے اور وہ ان کے آگے بیس سال کا ایک کمزور اور بے بس لڑکا۔

"پلیز لیومی۔" وہ رو رو کر ان کی منت کر رہا تھا۔ وہ چاروں اس کی بے بسی پر قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے۔

"پاپا، پاپا" پکار رہا تھا۔ وہ وہاں سے بھاگ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ دیو قامت کالے امریکی قہقہے لگا کر اس پر ہنس رہے تھے۔

ان میں سے ایک اس کی طرف بڑھا تھا۔ اس کے باقی ساتھی بے ہنگم انداز میں اس کی بے بسی پر ہنس رہے تھے۔ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں شراب کی بوتلیں تھیں۔ شراب کے گھونٹ لے کر وہ بوتل ایک کر دوسرے کو دے رہے تھے۔

اس نے خود کو بچانے کی آخری کوشش کی۔ وہاں سے اٹھ کر بھاگنا چاہا مگر اس کی طرف بڑھتے ایک کالے نے ایسا زور دار مکا اس کے منہ پر مارا کہ وہ اوندھے منہ سڑک پر گرا تھا۔ اس کی ناک اور دانتوں سے خون نکل گیا تھا۔ اس کالے نے اس کے بال مٹھی میں دبوچ کر اس کا سر زمین پر زور سے مارا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور خون بہنے لگا تھا۔

"پاپا مجھے بچالیں۔ پاپا مجھے ان سے ڈر لگ رہا ہے۔ پاپا! یہ مجھے مار ڈالیں گے۔ پاپا مجھے بچالیں۔" وہ روتے ہوئے باپ کو پکار رہا تھا۔

"ایک Rapist میرا بیٹا کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ تم ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ۔ آج کے بعد زندگی بھر مجھے اپنی منحوس شکل مت دکھانا۔"

اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے ہوٹل روم میں بیڈ پر لیٹا تھا۔ اپنے اندر کی وحشتوں سے سکون پانے کے لیے اس نے پلز لے کر سونے کی کوشش کی تھی۔

بس آج کی رات، صرف آج کی رات۔ کل صبح ہوتے ہی وہ یہاں سے چلا جائے گا۔ وہ لیزا سے دوبارہ کبھی نہیں ملے گا۔ پلز کے سہارے بھی اسے کچھ ہی دیر کے لیے نیند آئی تھی۔

وہ آدھے گھنٹے بعد ہی روتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے اپنے اوپر پھر وہی سانپ کی طرح رینگتے ہاتھ محسوس ہو رہے تھے۔ وہ باتھ روم آیا تھا۔ شاور سے پانی پوری رفتار سے بہہ رہا تھا اور وہ شاور کے نیچے کھڑا اپنے وجود پر لگی ہر غلاظت صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اپنی تذلیل، اپنی عزت نفس کی پامالی اسے رلا رہی تھی۔ وہ باتھ کے فرش پر پاگلوں کی طرح رو رہا تھا۔

"سکندر شہریار ریپسٹ نہیں، سکندر شہریار تو خود ایک ریپ وکٹم ہے۔"

اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ کر وہ اپنی عزت، اپنے مردانہ وقار کی پامالی پر چلا کر رو پڑا۔

☼ ☼ ☼

بارہ سال پہلے کی وہ شام پھر اس کے سامنے آ کر

کھڑی ہو گئی تھی۔ صفائی کا کوئی بھی موقع دیے بغیر اس پر فرد جرم عائد کر دی گئی تھی۔ اسے دھکے مار کر اس کے گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ ناقابل اعتبار اور گناہ گار قرار دیا جا چکا تھا۔

روتی ہوئی اس کی ماں کی مجال نہ تھی کہ بیٹے کی حمایت کر پاتی۔ نفرت سے اسے دیکھتا ہوا اس کا بھائی اسے گھر سے نکالے جاتے دیکھ کر مطمئن تھا اور اسے دھکے مار کر گھر سے نکالتا ہوا اس کا باپ اس کی کوئی بھی بات سننے کا روادار نہ تھا۔

وہ بدکردار لڑکی قابل اعتبار تھی مگر وہ ان سب کا خون ان کے لیے ناقابل اعتبار تھا۔ اس کا گناہ کیا تھا؟ شاید اس کا گناہ شہریار خان کا بیٹا ہونا، زین شہریار کا بھائی ہونا تھا۔ شاید اس کا گناہ اس گھر میں پیدا ہونا تھا۔

وہ گھر جہاں پر کچھ بھی نارمل نہ تھا۔ وہ گھر جہاں اس کے باپ کی انتہاؤں کو چھوتی سخت مزاجی اور اصول پسندی تھی اور اس کی ماں کی خدمت گزاری اور خاموشی۔ اپنے اس گھر میں اس نے بچپن ہی سے بڑا عجیب و غریب سا ماحول دیکھا تھا۔

وہ ایک اونچے گھرانے، اونچے خاندان کا چشم و چراغ ہے، اس کی زندگی میں ہر چیز پرفیکٹ ہونا چاہیے۔ اسے زندگی میں ہر وہ کام کرنا ہے جو اس کے پاپا اس سے کہیں۔ ہر وہ چیز حاصل کرنا ہے جو اس کے پاپا چاہتے ہیں۔ اسے ہوش سنبھالتے ہی اٹھتے بیٹھتے اس کے باپ نے یہ سمجھایا تھا۔

اس کے پاپا کی اس سے توقعات بہت اونچی تھیں۔ کہیں کوئی کمی، وہ برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ وہ ان کی توقعات کے مطابق خود کو ثابت کرنے میں کبھی کبھی تھکنے لگتا تھا۔ وہ باپ کو خوش رکھنے کا ہر جتن کرتا تھا۔ جو وہ اس سے توقع رکھتے تھے۔ وہ اس معیار کی کارکردگی دکھاتا، جو وہ اسے حکم دیتے۔ مگر پھر بھی کہیں ذرا سی کمی اگر رہ جاتی تو وہ اس سے ناخوش ہو جاتے تھے۔

اسے کیا پڑھنا ہے، کیا کرنا ہے، کن لوگوں سے ملنا ہے، کس سے دوستی کرنا ہے، بڑے ہو کر کیا بننا ہے،

سب کچھ اس کے لیے شہریار خان نے سوچا تھا۔ اس کی پسند اور مرضی کا کہیں کوئی دخل نہ تھا۔ انہوں نے اسے بچپن میں بھی دوسرے بچوں کی طرح لاابالی، شرارتی اور لاپروا نہ رہنے دیا تھا۔

وہ شہریار خان کا بڑا بیٹا ہے۔ اسے شہریار خان کا نام اونچا کرنا ہے۔ بچپن کا بے فکر دور بھی اس نے ذمہ داریوں اور تفکرات کو خود پر مسلط کرکے گنوا دیا تھا۔ وہ نہ دوسرے بچوں کی طرح اپنی مرضی کے کھیل کھیل سکتا تھا، نہ اپنی مرضی سے سو اور جاگ سکتا تھا۔ جو کھیل پاپا کہیں گے وہ صرف وہی کھیلے گا۔ وہ باپ سے ڈرتا تھا۔ وہ ناراض ہوتے تھے تو ان کی آنکھوں کی سختی اسے بہت ڈراتی تھی۔ وہ چیختے چلاتے نہیں تھے، ان کی سرد کاٹتی ہوئی نگاہیں ہی اسے سہمانے کے لیے کافی ہوا کرتی تھیں۔

دوسرے لوگوں کو شاید وہ باپ کا لاڈلا نظر آتا ہوگا کہ وہ اپنے ہر ملنے والے سے اس کی تعریفیں کیا کرتے تھے مگر وہ جانتا تھا، اس کی امو جان جانتی تھیں کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ سکندر کی تعریفیں صرف اس لیے ہوتی ہیں کہ وہ اپنی خوشی، اپنی مرضی اور اپنے بچپن سے دستبردار ہو کر باپ کی تابع داری کیا کرتا تھا۔ اپنے بچپن، اپنی نوعمری اور نوجوانی کے ہر کھیل کود، تفریح اور انجوائے منٹ کی قربانی دے کر وہ باپ کو خوش کرپایا تھا۔

زین پر باپ کی طرف سے اس طرح کے کوئی پریشر نہ تھے۔ اسے کبھی کبھی زین پر رشک آیا کرتا۔

پھر وہ یہ سوچ کر خوش ہو جاتا کہ چلو باپ کی جانب سے تمام پریشر اور سختی وہ خود جھیل کر زین کو اس پریشر سے بچا رہا ہے تو اچھا ہی ہے۔ ان دونوں بھائیوں میں سے کوئی ایک تو ہر وقت کے اس دباؤ سے خود کو بچالے۔ وہ بارہا محسوس کرتا کہ ان کے معیار پر پورا اترنے کے دباؤ سے آزاد ہو کر وہ زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرسکتا ہے۔

کبھی وہ باپ کی نصیحتیں، داداجی اور ان جیسا بننے کی باتیں سنتے سنتے تھکنے لگتا تو اسے اپنی ذہانت بری لگنے لگتی۔

کسی ایک آدھ بات میں نہیں بلکہ زندگی کے تمام معاملات میں اسے اپنے پاپا کا رویہ ابنارمل لگا کرتا تھا۔ وہ ایک انتہائی سخت مزاج، حاکمانہ طبیعت کے شخص تھے۔ ان کی حکم عدولی کی کوئی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی امو جان ان کے آگے مؤدب، سر جھکائے رہا کرتی تھیں۔ اس کے پاپا اور امو جان کی شادی اگر نبھی تھی تو اس میں سارا کا سارا کمال اس کی امو جان کے صبر، برداشت اور خاموشی کا تھا۔ ان کی ماں، ان کے باپ کے آگے دبی دبی رہتی تھی اور وہ دونوں بھائی باپ سے اپنے اپنے طور پر خوف زدہ رہتے تھے۔

زین تو شہریار خان کے آگے کچھ بولتا ہی نہیں تھا۔ اس سے چونکہ وہ خود بہت زیادہ بات کرتے تھے کہ اسے اپنے ساتھ رکھتے تھے تو وہ ان سے سر جھکا "جی پاپا" "اچھا پاپا" اور "یس پاپا" بول لیا کرتا تھا۔

اس سب کے باوجود بہرحال اسے اپنے پاپا سے پیار تھا۔ اسے اپنی امو جان سے عشق تھا اور زین۔ وہ تو اس کا پیارا سا چھوٹا سا بھائی تھا۔ اس میں تو اس کی جان تھی۔ وہ اس سے صرف دس ماہ چھوٹا تھا مگر اسے یوں لگتا جیسے وہ اس سے بہت چھوٹا ہے۔

اپنی ساری محبت، ساری چاہت اس کا زین پر نچھاور کردینے کو دل چاہتا تھا۔ وہ اس کی بہت پروا کرتا تھا، بہت خیال رکھتا تھا، وہ اپنے سب کھلونے، اپنی ہر چیز زین کے ساتھ شیئر کرتا تھا مگر اس کی محبتوں کا جواب زین نے ہمیشہ تلخی ہی سے دیا تھا۔

وہ کبھی بھی سمجھ نہیں سکا تھا کہ آخر زین کو اس سے شکایت کیا تھی؟ وہ کیوں اتنا اکھڑ اکھڑ اور خفا رہتا تھا۔ جیسے جیسے وہ بڑے ہوتے گئے، وہ زین کے اس رویے کا عادی ہوتا چلا گیا۔

یہاں تک کہ زین کا اس کے ساتھ صرف لاتعلقی اور بے گانگی والا رشتہ ہی باقی رہ گیا۔ وہ جتنا زین سے قریب ہونے کے جتن کرتا وہ اتنا ہی اس سے دور بھاگتا تھا۔

وہ لاشعور میں ابھرتی اس خوفناک بات کو کبھی شعور کی سطح پر قصداً نہیں لایا تھا کہ زین اس سے نفرت کرتا ہے۔ زین بس مزاجاً تلخ ہے۔ وہ بھلا اپنے اکلوتے بھائی سے نفرت کیوں کرسکتا ہے؟ وہ اسے ناپسند کیوں کرسکتا ہے؟

یونیورسٹی جاکر تو زین اس سے اتنا دور ہوگیا تھا کہ مہینوں بعد ہی اس کی شکل دیکھ پاتا تھا۔ وہ اسے لاس اینجلس فون کرتا تو وہ اس کی فون کال جیسے بحالت مجبوری سن لیتا۔ اکھڑے لہجے میں اس کے سوالوں کے جواب دیتا۔ چند منٹوں کی بات کے بعد ہی وہ اپنی کسی مصروفیت کا بتا کر گفتگو ختم کردیا کرتا۔

زین کا اکھڑ مزاج اس کی بے گانگی دل کو چاہے جتنا بھی دکھاتی مگر وہ زین سے کبھی کچھ نہ کہا کرتا نہ ہی کبھی زین کی بے گانگی کی ماں سے شکایت کیا کرتا۔ البتہ وہ دنوں اس رنج میں مبتلا رہتا کہ اس کا بھائی فون پر اس کی آواز سننا تک گوارا نہیں کرتا۔ زین کے کسی بھی رویے کو نہ اس نے کبھی ماں سے ڈسکس کیا تھا نہ ہی باپ سے۔ وہ بھائی کے خلاف ماں، باپ سے کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔

زین نے اپنے لیے کسی لڑکی کو پسند کرلیا ہے، یہ بات امو جان سے پتا چلی تو اسے حقیقتاً بھائی کے لیے بہت خوشی ہوئی تھی۔ کیا پتا اب اس لڑکی کے آجانے کی وجہ سے اس کے بھائی کے مزاج کی تلخی اور کڑواہٹ کم ہوجائے۔ زین نے اسے اس قابل نہیں سمجھا کہ اپنی زندگی میں آئی اس خوشگوار تبدیلی کو اس سے شیئر کرتا۔ اس بات پر دکھ محسوس کرنے کے بجائے وہ بھائی کی خوشی کا سوچ کر ہی خوش ہوئے جا رہا تھا۔

اسے زین اور ام مریم کے رشتے کی ساری تفصیلات امو جان سے پتا چلا کرتی تھیں۔ اس کی ہونے والی بھابھی کا نام ام مریم تھا۔ ابھی اس نے اسے دیکھا نہیں تھا مگر بغیر دیکھے بھی اسے یقین تھا جسے اس کے بھائی نے چنا ہے، وہ بہت پیاری ہوگی۔

وہ دل و جان سے زین کی منگنی میں شرکت کرنا چاہتا تھا۔ مگر زین کے لیے اس کی شرکت ہرگز اہم نہیں تھی۔

اس نے زین سے فون پر بات کی۔ منگنی وہ تین دن آگے بڑھانے کی ضد کی، وہ بہت خوش تھا مگر زین کے خشک اور سرد سے انکار نے اسے بالکل گم صم سا کردیا تھا۔

زین کے لیے اس کا ہونا یا نہ ہونا بالکل بھی اہم نہیں تھا۔ بلکہ اسے زین کے لہجے کی بے مروتی سے یہ احساس ہوا تھا جیسے زین چاہتا ہے کہ وہ اس کی منگنی میں شریک نہ ہو۔

وہ کرسمس کی چھٹیوں میں گھر آیا تو زین اور ام مریم کے لیے الگ الگ تحائف لایا۔ وہ بھائی سے بہت دنوں بعد مل رہا تھا۔ اپنی ہونے والی بھاوج سے بھی وہ پہلی بار مل رہا تھا۔ اس لیے بہت خوش تھا۔ اس کی فرمائش پر امو جان نے اسے زین کی منگنی کی تصویر بھیجی تھیں اور ان میں اسے اپنی بھابھی بہت اچھی لگی تھی۔ اس کے بھائی کو ایسی ہی پیاری سی لڑکی ملنی چاہیے تھی، مگر جب وہ اپنے گھر آیا تو زین اس سے اسی انداز میں ملا جیسے ہمیشہ ملا کرتا تھا، بے گانگی اور بے رخی والا انداز۔ اور ام مریم؟

وہ اس سے زندگی میں پہلی بار مل رہا تھا، وہ اس کے بھائی کی منگیتر اور ہونے والی بیوی ہے، اس کی بھابھی ہے، وہ اس سے اسی انداز میں ملا تھا جو اس رشتے کا تقاضا تھا مگر سب کے درمیان بیٹھے پتا نہیں کیوں اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ام مریم اسے بہت غور سے دیکھے جارہی ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھتا تو وہ نگاہیں ادھر ادھر کرلیتی، وہ نگاہیں ہٹاتا تو وہ پھر اسے دیکھنے لگتی۔ شاید وہ اس سے پہلی بار مل رہی تھی اس لیے اسے اس طرح دیکھ رہی تھی۔

وہ اگلی صبح بھی گرم جوشی اور محبت سے ام مریم سے باتیں کررہا تھا۔ زین کو زبردستی گفتگو میں شریک کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ ام مریم اس کے ہارورڈ میں پڑھنے سے متاثر ہو رہی تھی، پتا نہیں کیوں مگر اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس کی شخصیت سے متاثر ہو رہی تھی مگر اس نے اس بات کو بہت مثبت انداز میں لیا تھا۔

www.paksociety.com

اس نے تو اس بات پر بھی ہرگز کچھ نہیں سوچا تھا کہ ام مریم اپنی شخصیت کی خوبیاں' غیر معمولی ذہانت اور خود اعتمادی قصداً اس کے سامنے نمایاں کیوں کر رہی تھی۔ اگر اس کی چھٹی حس اسے کچھ بتا بھی رہی تھیں تو وہ اسے جان بوجھ کر اپنی سوچوں میں آنے نہیں دے رہا تھا۔ وہ ام مریم کی خود پر غیر معمولی توجہ کو اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر رہا تھا۔ مگر وہ زیادہ دیر اسے اپنا وہم سمجھ نہیں سکا تھا۔

اسی شام جب وہ سب ڈنر کرنے گئے تب ام مریم نے زین کے برابر بیٹھنے کے بجائے اس کے برابر والی کرسی بیٹھنے کے لیے منتخب کی تو کسی اور نے اس بات کو محسوس کیا ہو یا نہیں اس نے ضرور محسوس کیا۔ ام مریم کھانے کے دوران زین کو نظر انداز کر کے سارا وقت اس کی جانب متوجہ رہی تھی۔ اس سے باتیں کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

اسے حیرت بھی ہوئی تھی اور دکھ بھی۔ ام مریم ایسا کیوں کر رہی تھی۔ کیا اس سے یہ انجانے میں ہو رہا تھا' وہ سادہ اور نادان تھی یا وہ جان کر زین کے بجائے اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وجہ جو بھی تھی اس کے دل کو یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔

وہ قصداً سنجیدہ سا ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا تھا وہ ام مریم کے ساتھ اب بے تکلفانہ بات چیت نہیں کرے گا۔ تھوڑا سا نارمل انداز اپنا لے گا۔ مگر اس ڈنر کے دوران بھی' اس ڈنر کے بعد بھی گھر آ کر بھی' اگلی صبح بھی ام مریم اپنے ہر انداز سے اسے یہ بتا رہی تھی کہ وہ اس کی جانب ملتفت ہے۔ وہ اس میں دلچسپی لے رہی ہے۔

وہ بڑے خاص انداز سے اسے دیکھ کر مسکراتی۔ اسے یہ سگنل دے رہی تھی کہ وہ اسے پسند کر رہی ہے اور وہ اس کی ان نگاہوں کو یوں نظر انداز کر رہا تھا' جیسے ام مریم کی توجہ کے معنی سمجھ ہی نہ رہا ہو۔ شاید کم عمری کی وجہ سے ام مریم اس طرح کی حرکت کر رہی تھی۔

اس نے اس کے ساتھ اپنا رویہ سرد اور خشک سا بنا لیا تھا۔ وہ اپنے رویے سے اسے اس کی غلطی کا احساس دلانا چاہتا تھا۔

یہ بات ایسی تھی کہ وہ اسے کسی کے ساتھ بھی شیئر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس سب کو ام مریم کی کم عمری' نادانی اور بچپنا ہی سمجھ رہا تھا۔ اپنے رویے کو اس نے بے شک سرد اور خشک بنا لیا تھا مگر وہ اسے کوئی بری لڑکی ہرگز نہیں سمجھ رہا تھا۔ مگر وہ لڑکی ہر لگے لمحے اسے یہ بتا رہی تھی کہ وہ نادان نہیں ہے' وہ بچی نہیں ہے۔ وہ ڈرائی فروٹس کھاتا ٹی وی دیکھ رہا تھا جب زین کے سامنے اس کی موجودگی میں وہ اس کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی پلیٹ سے ڈرائی فروٹس کھاتے اور اس کے ہاتھ سے ریموٹ لیتے ام مریم نے جان بوجھ کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے ٹکرایا تھا۔ وہ بدلحاظی سے اسے جواب دیتا وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ اسی رات ان کے گھر ہونے والی پارٹی میں وہ بطور خاص اس کے پاس آئی تھی۔

"بہت ہینڈسم لگ رہے ہو تم سکندر! آج اس پوری پارٹی میں تمہارے جیسا کوئی ایک فرد بھی نہیں لگ رہا۔"

اسے اندر ہی اندر بہت دکھ بھی ہوا تھا اور ام مریم کے اوپر غصہ بھی آیا تھا۔ وہ پوری طرح بجی سنوری اس کی تعریف کرتی اسے اپنی جانب مائل کرنے کی کوئی چھپی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ وہ اپنی نگاہوں سے اسے پسندیدگی کا بڑا واضح پیغام دے رہی تھی۔

"تھینکس۔ دیسے مریم! میرا خیال ہے میں تم سے عمر میں زیادہ بڑا نہ سہی مگر رشتے میں تو بڑا ہوں۔ تم مجھے سکندر بھائی بولا کرو تو زیادہ بہتر ہے۔"

بغیر مسکرائے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں یہ تنبیہہ موجود تھی کہ ام مریم ان کے رشتوں کا احترام کیا کرے۔

"اتنی حسین لڑکی تعریف کرے تو کیا یہ فضول سا جواب دیا کرتے ہیں؟" وہ مسکرا کر بولی تھی۔

"ہونے والی بھابھی تعریف کرے جو بالکل چھوٹی بہن جیسی لگتی ہو تو یہی جواب دیا جانا چاہیے۔"

وہ بات مکمل کرتے ہی وہاں سے آگے بڑھ گیا تھا۔ زین وہیں کچھ فاصلے پر کھڑا تھا اور وہ لڑکی زین کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی تھی۔ اس روز اسے پہلی بار زین کے انتخاب پر افسوس ہوا تھا۔ وہ جو اپنی شخصیت کی تمام تر خوبیوں اور خصوصیات کا بھرپور استعمال کر کے زین کے بھائی کو اپنی جانب متوجہ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ کیا کرے؟ وہ کس سے کہے یہ بات؟ کیسے کہے یہ بات؟ وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے زیادہ سے زیادہ وقت اپنے کمرے میں رہنا شروع کر دیا تھا۔

وہ ام مریم اور زین دونوں ہی کو نظر انداز کر کے پڑھائی اور امتحانات کا بہانہ بنا کر زیادہ سے زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزار رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ جلد از جلد بوسٹن واپس چلا جائے۔ مگر شہریار خان کی مرضی اور اجازت کے بغیر وہ واپس جا نہیں سکتا تھا۔ اور انہوں نے اس کے لیے یہی پروگرام طے کیا تھا کہ وہ چھٹیاں ختم ہونے تک یہیں پر رہے گا۔ ان چھٹیوں کے دوران شہریار خان اسے اپنے مختلف دوستوں اور واقف کاروں سے ملوانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ اس کے عملی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے انتہائی ضروری تھا کہ اسے شہریار خان کے بااثر ملنے جلنے والوں میں باضابطہ اور باقاعدہ تعارف حاصل ہو سکے۔

سب پکنک پر جا رہے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ گھر پر رک جائے مگر وہ اپنے نہ جانے کی کیا توجیہہ پیش کرتا؟ شہریار خان نے یہ پروگرام اپنے دونوں بیٹوں اور ہونے والی بہو کی خاطر ہی بنایا تھا۔ سب گھر سے نکل رہے تھے۔ بالکل آخری لمحوں میں اپنا کیمرا نہ ملنے کا بہانہ بنا کر ام مریم نے ایسی صورت حال پیدا کی کہ گھر سے نکلنے والے آخری دو افراد وہ دونوں رہ گئے تھے۔ وہ اس کا کیمرا ڈھونڈتے ہوئے سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس لڑکی کا کیا ایک ڈراما ہے تاکہ وہ پکنک اسپاٹ تک سکندر کے ساتھ اس کی گاڑی میں جا سکے۔

اسے ام مریم کی خود پر توجہ سمجھ میں آ چکی تھی مگر ابھی تک اس لڑکی کے شاطرانہ دماغ تک وہ پہنچ نہیں سکا تھا۔ وہ اسے ایک نادان اور جذباتی لڑکی سمجھ رہا تھا' جو اس کی ظاہری شخصیت سے متاثر ہو گئی تھی۔ وہ دونوں گاڑی میں ساتھ جا رہے تھے۔ وہ قصداً سنجیدہ اور لیا دیا سا تھا۔

ام مریم اس سے ادھر ادھر کے عام موضوعات پر بات کر رہی تھی اور وہ سنجیدگی سے ایک بڑے بھائی کا سا انداز بنا کر اس کی باتوں کے جواب دے رہا تھا۔

"تمہاری معلومات کتنی زبردست ہیں سکندر! تمہارا مطالعہ کس قدر قابل رشک ہے۔ ہارورڈ میں پڑھ رہے ہو تو بالکل ٹھیک پڑھ رہے ہو۔ تم ڈیزرو کرتے ہو وہاں پڑھنا۔ بہت غیر معمولی ہو تم۔ تمہاری پرسنالٹی بہت کرزمیٹک اور شاندار ہے۔" باتیں کرتے کرتے وہ ایک دم ہی بول گئی۔

"تھینکس مریم!" اس نے قصداً طاری کیے بڑے پن کے ساتھ ہلکی مسکراہٹ چہرے پر لا کر اسے یوں جواب دیا جیسے اس کی تعریف میں چھپی کوئی بات اس نے محسوس نہیں کی ہے۔

"زین تمہارے جیسا غیر معمولی ذہین اور شان دار نہیں ہے۔ سچ بولوں تو مجھے تم دونوں سگے بھائی ہی نہیں لگتے ہو۔ کہاں تم' تمہاری اس قدر شاندار پرسنالٹی اور ذہانت' کہاں زین جیسا میڈیا کر (اوسط درجے کا) بندہ۔ اس میں تم جیسی کوئی ایک بھی بات نہیں ہے۔ تم دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تمہارے آگے تو زین بالکل ہی معمولی سا لگتا ہے۔"

اسے مریم کا زین کی برائی کرنا سخت برا لگا تھا۔

"میرے بھائی کی برائی میرے منہ پر کرتے ہوئے تمہیں یہ سوچ لینا چاہیے مریم! کہ میں اپنے بھائی کے خلاف ایک لفظ برداشت نہیں کر سکتا۔" اس نے خفا سی نگاہوں سے ام مریم کو دیکھا تھا۔

"میں برائی نہیں کر رہی۔ ایک حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ تم راہ چلتے کسی اجنبی شخص سے بھی زین کو اپنے ساتھ کھڑا کر کے پوچھ لو کہ تم دونوں میں سے کون زیادہ اچھا لگتا ہے تو وہ یہی کہے گا' جو میں کہہ رہی ہوں۔"

"زین بہت ذہین لڑکا ہے مریم! اس میں ایسی بہت سی خوبیاں ہیں جو تجھ میں نہیں۔ تم خوش قسمت ہو جو

تمہیں زین کا ساتھ ملا ہے۔" اس کے لہجے میں سختی آگئی تھی۔

"ہاں! زین اچھا ہے، مگر تم جیسا نہیں ہے۔ میں اگر تم سے پہلے مل چکی ہوتی تو زین میرا انتخاب کبھی نہ ہوتا۔ مجھے ایکسٹرا آرڈنری (غیر معمولی) ذہین اور لیڈر شپ کی صلاحیت رکھنے والے مرد پسند ہیں۔ خود مجھ میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔ کاش! زین سے منگنی کرنے سے قبل میں تم سے مل لی ہوتی۔ تمہیں پہلی نظر دیکھ کر ہی میں دنگ رہ گئی تھی سکندر! تم ہو بہو میرا آئیڈیل ہو۔ میرا آئیڈیل جو مجھے لگتا تھا کہیں وجود نہیں رکھتا۔ تب ہی تو میں زین جیسے میڈیا کر کے ساتھ سمجھوتا کر بیٹھی تھی۔ تمہیں نہیں لگتا سکندر، میں اور تم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں، ہم میں بہت Campatibility (مطابقت) ہے۔"

وہ بہت دلنشین لہجے میں یہ باتیں کر رہی تھی۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور بیس اکیس سال کا لڑکا ہوتا تو اتنی حسین لڑکی کے لبوں سے اپنی تعریفیں سن کر خوشی سے ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا، جھوم جھوم جاتا مگر وہ سکندر شہریار... الٹا تپ اور کھٹا نہیں تھا۔ اسے ام مریم کی باتیں سن کر غصہ آگیا تھا۔ اس نے شدید غصے اور ناراضی سے ام مریم کو دیکھا تھا۔

"تمہیں اس طرح کی بات نہیں کرنی چاہیے مریم! تم میرے بھائی کی منگیتر ہو، میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں۔ پلیز رشتوں کا احترام کرنا سیکھو۔"

اس کا لہجہ تنبیہی تھا۔ اسے خود اپنے آپ میں بڑی شرم آرہی تھی۔ دکھ بھی ہو رہا تھا کہ اس کے بھائی کی منگیتر اس سے کس طرح کی باتیں کر رہی تھی۔ اسے کس طرح نثار ہو جانے، مر مٹنے والے انداز میں دیکھ رہی تھی۔

"ابھی میری زین سے شادی نہیں ہوئی ہے سکندر! صرف منگنی ہوئی ہے جو توڑی بھی جاسکتی ہے۔ مجھ سے اگر ایک غلط فیصلہ ہو گیا ہے تو ابھی میں اسے ٹھیک کر سکتی ہوں۔ صرف ایک انگوٹھی ہی تو ہے، میں زین کو لوٹا دوں گی۔ تم زین کا مت سوچو سکندر! اپنا سوچو۔

مجھ جیسی لڑکی تمہیں دنیا میں کوئی اور نہیں ملے گی۔ اپنے دل سے پوچھو۔ کیا تمہارا دل میرا ساتھ نہیں چاہتا؟ کیا تمہارے دل کی یہ آرزو نہیں کہ تمہیں مجھ جیسی لڑکی کا ساتھ ملے؟ ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں سکندر! ہمارا ملنا بے شک بہت عجیب حالات میں ہوا ہے، تمہارے لیے یہ خاصی آکورڈ سی سچویشن ہے، میں تمہارے بھائی کی منگیتر ہوں، میں تمہاری الجھن سمجھ سکتی ہوں مگر پلیز! زین کا مت سوچو۔ لوگوں کا مت سوچو۔ اپنا سوچو۔ میں تمہاری خاطر تن اور ابھی زین سے منگنی توڑنے کے لیے تیار ہوں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں سکندر! میں اپنی ساری زندگی تمہارے ہم قدم کرنا چاہتی ہوں۔"

اس کے اسٹیئرنگ پر رکھے ہاتھ کے اوپر ام مریم نے اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پرے دھکیلا تھا۔ وہ شدید غصے میں تھا۔ وہ تیز آواز میں چلایا تھا۔

"شٹ اپ ام مریم! جسٹ شٹ اپ۔ کس طرح کی لڑکی ہو تم؟ تمہارے اندر رشتوں کی کچھ عزت ہے کہ نہیں؟"

اپنا اشتعال قابو کر کے وہ شدید برہمی سے ام مریم کو دیکھ رہا تھا۔ چند سیکنڈ وہ بالکل خاموش رہا تھا۔ پھر جب اس نے اپنے غصے پر کچھ قابو پا لیا تب انتہائی سخت لب و لہجے میں اس سے بولا۔

"اس طرح کی گھٹیا بات مجھ سے پھر مت کہنا مریم! تم سے میرا صرف اور صرف ایک ہی رشتہ ہے اور وہ تمہارا زین کی منگیتر ہونا ہے۔ یہ گھٹیا باتیں کر کے میرے دل سے اپنی عزت ختم مت کرواؤ۔"

اتنے سخت لب و لہجے میں اسے ڈانٹنے کے بعد وہ سمجھ رہا تھا کہ ام مریم کی آج کے بعد دوبارہ ایسی بات کرنے کی جرأت نہیں ہوگی، مگر وہ غلط تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ شدت سے اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ وہ پکنک کے دوران سارا وقت اس کے آس پاس رہنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ اس کا غصہ اور ناپسندیدگی اب اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی ہے۔ وہ جانتا تھا وہ

سب کے سامنے یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اسے مریم کے ساتھ باتیں کرنے، کھیلنے، اٹھنے بیٹھنے کسی بھی چیز میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

زین کو ام مریم پر نثار ہوتا دیکھ کر اسے زین پر بہت افسوس ہو رہا تھا، شدید رنج ہو رہا تھا۔ اس کا ایک بار نہیں کئی بار دل چاہا تھا وہ زین کو اکیلے میں اپنے پاس بلا کر یہ بات بتائے کہ جس لڑکی پر وہ دیوانہ وار اپنی چاہتیں اور محبتیں نثار کر رہا ہے وہ آج پکنک پر آتے ہوئے سارا راستہ زین کا مذاق اڑاتی آئی ہے۔ وہ زین سے کہنا چاہتا تھا کہ زین یہ لڑکی تمہاری چاہت اور محبت ذرہ برابر نہیں کرتی۔ وہ لڑکی جھوٹی محبتیں جتا کر اس کے بھائی کو بے وقوف بنا رہی تھی۔

وہ زین کو ام مریم کی ایک ایک بات بتانا چاہتا تھا۔ مگر کیا زین اس کی کوئی بات سنے گا؟ زین اس سے جتنا بے زار، بدگمان اور خفا رہتا تھا۔ یقیناً وہ اس کی بات سننے سے پہلے ہی اکھڑ جاتا۔

وہ لڑکی زین کی آنکھوں کے سامنے اسے اپنی محبت سے بے وقوف بناتی اس کے بھائی سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ زین کو کسی بھی طرح یہ بات بتادے۔ مگر زین کا اپنے ساتھ سرد اور خشک رویہ اسے کچھ کہنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ہمت کرتا، پھر زین کی نگاہوں کی بے گانگی اور نفرت دیکھتا تو ہمت ٹوٹ سی جاتی۔

اسے ام مریم بہت بری لگ رہی تھی۔ وہ سادہ اور بھولی نہیں، بہت چالاک لڑکی تھی۔ اسے زین کی معصومیت اور سادگی پر غصہ آرہا تھا۔ زین اس طرح اندھا اعتماد کیوں کرتا تھا اس لڑکی پر؟ زین کو اس لڑکی کی اداؤں کی خبر کیوں نہیں ہو رہی تھی؟ مگر زین تو ابھی چھوٹا تھا اس لڑکی نے تو اس کے پاپا تک کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ شہریار خان ام مریم کو اپنی ہونے والی بہو کے طور پر دل و جان سے قبول کر چکے تھے۔ وہ اسے بہت پسند کرتے تھے۔

اس نے دبے لفظوں میں انہیں ام مریم کے متعلق بتانے کی کوشش کی تو انہوں نے اس کی بات کو سرے

سے کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ نہ شہریار خان اور نہ ہی امو جان نے اس کی بات پر توجہ دی تھی۔ الٹا زین اس سے خفا ہو گیا تھا کہ اس نے مریم سے بداخلاقی سے بات کی ہے۔

ذہانت سے کام نہ چلتا دیکھ کر ام مریم نے اسے راغب کرنے کے لیے اپنی خوبصورتی کو استعمال کرنا شروع کیا تھا۔ وہ اس کے سامنے قصداً بہت تیار ہو کر آتی۔ اپنی بے تحاشا خوبصورتی اس پر ظاہر کرتی۔ اس طرح کہ کوئی کم عمر لڑکا تو کیا کوئی بڑی عمر کا مرد ہو تو وہ بھی بھٹک جائے۔ اس نے ام مریم کو نظر انداز کرنے کی پالیسی اپنا رکھی تھی۔

اس نے دل میں یہ سوچ لیا تھا کہ چھٹیاں ختم ہونے پر جب زین اور ام مریم یہاں سے چلے جائیں گے تب

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے 2 خوبصورت ناول

دل کے موسم
مریم عزیز
قیمت 250 روپے

ننگے پاؤں
نگہت سیما
قیمت 250 روپے

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37، اردو بازار، کراچی

وہ اپنا جانا ایک دو دن بڑھالے گا اور کوشش کرے گا کہ یہ بات امو جان کو تو ضرور بتا کر جائے گا۔ وہ سارا سارا دن اپنے کمرے میں گزار رہا تھا۔ وہ صرف کھانے اور ناشتے کے لیے کمرے سے نکلا کرتا تھا۔ وہ اس کا سامنا ہی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر وہ لڑکی اپنی کوششوں میں نہ تو تھک رہی تھی، نہ ہی ہار مان رہی تھی۔

وہ تیس دسمبر کی رات تھی جب وہ اپنے کمرے میں تھا۔ وہ خود کو قصداً "پڑھائی میں مصروف کیے ہوئے تھا۔ یہ اس کے علم میں تھا کہ شہریار خان اور امو جان کسی پارٹی میں گئے ہوئے ہیں، مگر زین کہاں چلا گیا تھا اسے پتا نہیں تھا۔ وہ بیڈ پر کتاب لے کر بیٹھا تھا جب اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ ام مریم تھی۔

اس سے پہلے تک وہ جو کچھ کرتی رہی تھی وہ اس پر حیران ہوا تھا، پریشان ہوا تھا، گھبرایا تھا، دکھ میں مبتلا ہوا تھا۔ مگر آج وہ جس طرح اس کے کمرے میں آئی تھی اسے دیکھ کر تو وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ وہ ایک خوبصورت قیامت کے روپ میں اس کے سامنے بڑی ادا سے کھڑی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کی انتہائی مختصر سی نائٹی پہن رکھی تھی۔ بال کھلے ہوئے تھے، خوبصورت میک اپ کیا ہوا تھا۔ خوشبوؤں میں مہکتی وہ ایک زندہ قیامت بنی کسی بھی ذی ہوش مرد کی پارسائی کا کڑا امتحان بن سکتی تھی۔

اسے اس روپ میں دیکھ کر کوئی کتنا بھی پارسا ہو، بہک سکتا تھا۔ پہلا احساس شرم اور غیرت کا تھا جو اس کے اندر پیدا ہوا تھا اور اگلا شدید ترین اشتعال کا۔ وہ ایک دم ہی شدید غصے کے عالم میں بیڈ سے اٹھا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے مریم؟" وہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔ اس کی نظریں فرش پر تھیں۔

ام مریم اسے خود سے نظریں چراتا دیکھ کر کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اس کے پاس آ گئی تھی۔

"میری طرف دیکھنے سے کیوں ڈر رہے ہو سکندر! کیا اپنے بہک جانے کا ڈر ہے؟"

وہ اس کے بالکل نزدیک آ گئی تھی۔ اس نے اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈالی تھیں۔ وہ اس کے اس قدر نزدیک تھی کہ وہ اس کی سانسیں اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔

"بکواس مت کرو۔" اس نے اسے دھکیل کر خود سے دور ہٹانا چاہا تھا مگر وہ ہٹی نہیں تھی۔ وہ دعوت گناہ دیتی خود کو اس پر نچھاور کر رہی تھی۔

"فرشتہ بننے کی کوشش مت کرو سکندر! تم ایک لڑکے ہو، تمہارے سامنے ایک حسین لڑکی کھڑی ہے۔ جو تم پر مر مٹ چکی ہے۔ اپنا آپ تمہارے قدموں میں نچھاور کر چکی ہے۔ تم آج وہ کرو جو تمہارا دل تم سے کہہ رہا ہے۔"

اس نے ایک زوردار طمانچہ اس بے غیرت لڑکی کے منہ پر مارا تھا۔ وہ جو اس کے گلے میں بانہیں ڈالے خود سپردگی کے عالم میں کھڑی تھی اس تھپڑ کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ اوندھے منہ نیچے گری تھی۔ اس نے ام مریم کے پاس زمین پر تھوکا تھا۔

"بہت گھٹیا، بہت ذلیل لڑکی ہو تم۔ میں خود تو کیا اب میں زین کو بھی تم سے شادی نہیں کرنے دوں گا۔ ایسی بدکردار لڑکی میں اپنے بھائی کی زندگی میں کبھی نہیں آنے دوں گا۔"

ام مریم فرش پر سے واپس اٹھی تھی۔ وہ کسی ناگن کی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔ پھنکار رہی تھی۔

"ام مریم کو ٹھکرانے کی ساری زندگی کوئی ہمت نہیں کر سکا ہے سکندر شہریار! لوگ ام مریم کے پیچھے آتے ہیں۔ تم پہلے شخص تھے جس کے پیچھے ام مریم آئی تھی۔ جس پر ام مریم حقیقت میں مرمٹی تھی۔ مجھے تھپڑ مار کر تم نے اچھا نہیں کیا ہے سکندر۔ تم نے اپنے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں کیا سکندر۔"

وہ نفرت سے پھنکارتی دھمکی آمیز لہجے میں اپنی بات پوری کرتے ہوئے اس کے کمرے سے چلی گئی تھی۔ وہ شرم اور غیرت سے کتنی دیر تک مٹھیاں بھینچے کھڑا رہا تھا۔ وہ ہرگز ہرگز اس کے بھائی کے قابل نہیں

تھی۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا، چاہے کچھ ہو جائے وہ زین کو اس بدکردار لڑکی سے شادی نہیں کرنے دے گا۔ وہ شہریار خان اور اپنی امو جان کو تو ساری بات بتا کر ہی دم لے گا۔ مگر اگلی صبح ناشتے کی میز پر جب اس نے یہ بات شہریار خان اور امو جان کو بتانے کی کوشش کی تو مارے شرم اور غیرت کے بات مکمل طور پر اس کے لبوں سے ادا ہی نہیں ہو پائی۔

بہت کوشش کے باوجود وہ سچ بول نہیں پایا۔ اس کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔ شرم اور غیرت نے اس کی نگاہوں کو جھکا دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شہریار خان جیسے ذہین شخص اس کے نامکمل جملوں ہی سے بات کی گہرائی تک پہنچ جائیں گے مگر اس بدکردار چالاک لڑکی میں نجانے کیا جادو تھا کہ وہ جو لوگوں کو ایک نظر دیکھ کر پہچان لیا کرتے تھے اس کے بتا دینے پر بھی بات کی سچائی اور سنگینی کو سمجھ نہ سکے۔

زین میں بچپنا اور معصومیت تھی، وہ اس لڑکی کی اصل فطرت کو نہیں جان پایا تھا مگر شہریار خان جیسے جہاں دیدہ شخص بھی اسے پہچان نہیں پائے تھے۔ وہ اور امو جان ام مریم کو ایک بہت اچھی، اعلا خاندان کی باکردار لڑکی سمجھتے تھے۔ وہ اس کی بات کو اہمیت دینے کو تیار نہ تھے۔

وہ جھنجلا کر ناشتے کی میز سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ ناشتے کی میز پر اس کی کہی باتیں زین نے بھی سن لی ہیں۔ وہ ابھی اپنے کمرے میں بیٹھا الجھ ہی رہا تھا کہ سچائی کس طرح اپنے ماں باپ تک پہنچائے کہ زین اس کے کمرے میں آیا۔ وہ زین کو اپنے کمرے میں آتا دیکھ کر خوشی سے اٹھا تھا کہ برسوں بعد زین نے اس کے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زین اس سے لڑنے آیا ہے، مگر وہ اس کے پاس آیا تو تھا نا۔ چاہے خفا ہو کر ہی سہی، مگر زین اس سے لڑنے یا خفا ہونے نہیں آیا تھا۔

وہ اس پر اپنی نفرت ظاہر کرنے آیا تھا۔ وہ زین کے زہر میں بجھے، نفرت میں ڈوبے لفظوں پر ساکت کھڑا

تھا۔ زین اس سے خفا نہیں رہتا تھا، وہ اس سے بدگمان نہیں رہتا تھا، وہ مرحبا "خفا" نہیں تھا، وہ اس سے نفرت کرتا تھا، شدید نفرت۔ وہ اسے اپنا دشمن سمجھتا تھا، اپنا سب سے بڑا دشمن۔ پہلی بار لاشعور سے نکل کر یہ بات اس کے شعور میں آ کر اسے بتا رہی تھی کہ اس کا چھوٹا بھائی اس سے نفرت کرتا ہے، شدید ترین نفرت۔

وہ دکھ اور صدمے سے گنگ کھڑا تھا۔ زین اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ اس کی خوشیوں سے حسد کر رہا ہے اس لیے ام مریم کے خلاف بول رہا ہے۔ اس نے زین کو سچائی بتانے کی کوشش کی تھی مگر جہاں نفرتوں کی ایسی دھند چھائی تھی وہاں زین اس کی کوئی بھی بات کیسے سمجھتا۔ وہ اس بدکردار اور مکار لڑکی کے سحر میں بری طرح گرفتار تھا۔

زین اپنی نفرت کا سارا زہر اگل کر اس کے کمرے سے جا چکا تھا۔ وہ کتنی دیر یا کل سن سا اپنی جگہ پر کھڑا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ خود کو اس کیفیت سے باہر نکال پایا تو مایوسیوں میں گھر کے اس نے سوچا کہ کیا وہ زین کی نفرت کے آگے ہتھیار ڈال رہا ہے، ہار مان رہا ہے؟ وہ اپنے بھائی کی زندگی تباہ ہونے دے رہا ہے؟

نہیں، وہ زین کی نفرتوں اور الزام تراشیوں سے ہار نہیں مانے گا۔

وہ آج ہی شہریار خان کو ساری بات بتائے گا۔ ایک ایک بات۔ ام مریم کی ساری سچائی۔ وہ شہریار خان کو ام مریم کا اصل چہرہ دکھا کر ہی دم لے گا۔ وہ اپنے بھائی کی زندگی تباہ نہیں ہونے دے گا۔ وہ زین کا ام مریم کے ساتھ رشتہ ختم کروا کر ہی دم لے گا۔ وہ شہریار خان کو ام مریم کی حقیقت، اس کی گھناؤنی سچائی بتانے کے لیے اپنے کمرے سے نکلا تھا۔

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

اقبال بانو

سہارا

صفدر گھر میں داخل ہوا تو اس کے لبوں پر نہایت خوبصورت مسکراہٹ تھی۔ لاؤنج میں آیا تو بھابھی اور بشریٰ بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔

"ارے آج تم جلدی آگئے؟"

وہ گڑبڑا گیا پھر خود پر قابو پاکر بولا۔ "ایک پارٹی سے ملنے گیا تھا۔ سوچا اب آفس کیا جاؤں گھر ہی آگیا۔" وہ صوفہ پر بیٹھ گیا۔

"چائے پیو گے؟" بشریٰ نے پوچھا۔

"نہیں موڈ نہیں ہے۔"

"آج ہم گئے تھے تمہارا رشتہ دیکھنے۔" بھابھی نے بتایا۔ صفدر نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"ذرا بھی اچھی نہیں لگی لڑکی۔ میں نے تو آج کشور کو ڈانٹ پلادی۔ کیا فضول سی لڑکیاں دکھاتی ہے۔ پوچھو بشریٰ سے 'لڑکی کیا تھی پوری تھیلا کی تھیلا' میں نے کہا کہاں میرا اسمارٹ دیور اور کہاں یہ کپاسی لڑکی۔ میں نے تو صاف انکار کردیا۔"

"اچھا کیا۔" صفدر آہستہ سے بولا۔

"مجھ سے لکھوالو' تمہاری بھابھی کسی صورت تمہاری شادی نہیں کریں گی۔" تزئین کا جملہ صفدر کے کانوں میں گونجا۔

"تم بے شک بشریٰ سے پوچھ لو۔ بشریٰ کو بھی پسند نہیں آئی۔" بھابھی نے بشریٰ کی طرف دیکھا۔

"ہاں بھائی! بھابھی سچ کہہ رہی ہیں۔ ہم اور دیکھیں گے۔ آخر آپ کا نصیب کہیں تو ہوگا۔" بشریٰ جلدی سے بولی۔

"اوکے۔" صفدر صوفے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں ذرا عامر کی طرف جارہا ہوں۔"

"کھانا گھر ہی کھانا۔ میں نے کریلے قیمہ بنایا ہے۔" بھابھی نے محبت سے کہا تو صفدر سرہلا کر لاؤنج سے نکل گیا۔

"میں تیمور کو فون کروں۔ آفس سے واپسی پر لیتے جائیں۔" بشریٰ نے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا فون اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

"ہاں بلالو۔ کھانا یہیں کھا کر جانا۔ اب کہاں جاکر پکاتی پھرو گی۔" بھابھی نے محبت بھرے لہجے میں کہا تو بشریٰ سرہلا کر رہ گئی۔

"تو آج بھی عذرا تمہارا رشتہ دیکھنے گئی تھی۔" خالہ جمیلہ نے مسکرا کر پوچھا۔ تو صفدر سرہلا کر رہ گیا۔

"تمہیں یاد ہے کچھ۔ کتنے سال ہوگئے ہیں تمہارا رشتہ ڈھونڈ رہی ہے وہ۔ ساتھ اس نے بشریٰ کو بھی لگایا ہوا ہے بشریٰ بھی اسی کی زبان بولتی ہے۔ اب تو تم منع کردو انہیں۔"

"میرا کیا جاتا ہے خالہ! جانے دیں۔" صفدر بے نیازی سے بولا۔

"مغضب خدا کا پورے تیرہ سال ہوگئے تمہارا رشتہ تلاشتے ہوئے۔ اتنے عرصہ میں تو تیرہ ہزار رشتے مل سکتے تھے۔" جمیلہ خالہ نے صفدر کی طرف دیکھا۔

"میں نے تو یہ بھی سنا ہے اب عذرا اپنے عمران کا رشتہ بھی دیکھتی پھر رہی ہے۔"

"پتا نہیں خالہ!" صفدر نے سر کو نفی میں جنبش دی۔

"پیار کیا کرو نا۔ اب عمران کو دیکھو اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو تم سے سولہ سترہ سال چھوٹا تو ہوگا۔"

"جی خالہ!"

"پھر اس کی اتنی جلدی لگ گئی ہے اور تم دیکھ لینا وہ اپنے بیٹے کا رشتہ یوں کرے گی۔" جمیلہ خالہ نے چٹکی بجائی۔

"خالہ! یہ تو نصیب کی باتیں ہیں۔"

"اے ہے رہنے دو بس تمہارے ہی نصیب کھوٹے ہیں کیا۔" وہ تنک کر بولیں تو صفدر مسکرادیا۔ اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی چلا دیا۔ جمیلہ خالہ آہ بھر کر رہ گئیں۔

"ہائے کتنی حسرت تھی خالدہ کی کہ تم آفرین سے بیاہے جاتے مگر تمہاری بھاوج نے خالدہ کی خواہش پوری نہ ہونے دی پھر زندگی نے ہی وفا نہ کی ورنہ آج تم تنہا نہ ہوتے۔"

"خالہ! چھوڑیں پرانی باتیں کچھ کھانے کو ہے تو لے آئیں۔ سچ بہت زور کی بھوک لگی ہے۔"

www.Paksociety.com

"ہائے میں صدقے۔ آتے ہی کیوں نہ بتایا۔ میں نے گوبھی گوشت بنایا ہے۔"

"ارے تزئین! صفدر کے لیے پھلکے تو ڈال دے۔" جمیلہ خالہ نے وہیں سے ہانک لگائی۔ تزئین کچن میں چائے بنا رہی تھی۔

"اچھا امی لاتی ہوں۔"

✲ ✲ ✲

"میں نے ٹیلر سے کپڑے اٹھانے ہیں۔ چلیں گے صفدر؟" تزئین کہہ رہی تھی۔

"ہاں۔ ہاں کیوں نہیں؟" صفدر نے جلدی سے کہا۔

"ارے کم بخت تجھے ہزار مرتبہ کہا ہے۔ تجھ سے بڑا ہے نام نہ لیا کر بھائی بولا کر مگر سنتی ہی نہیں۔"

"بھائی صرف اپنے ہوتے ہیں امی! اور یوں بھی مجھے اچھا نہیں لگتا میں صفدر کو دوست سمجھتی ہوں۔"

"یا اللہ اس لڑکی کو کب عقل آئے گی۔" جمیلہ نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

صفدر نے میز سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

"امی گھنٹے تک آجاؤں گی۔"

"اپنے ابا کے آنے سے پہلے آجانا ورنہ باتیں مجھے سننی پڑیں گی۔"

"آپ فکر نہ کریں آجاؤں گی۔"

"حسب معمول پھر بھابھی کو لڑکی پسند نہیں آئی صفدر!" تزئین نے گاڑی میں بیٹھتے ہی یہ ذکر چھیڑ دیا۔

"ہاں یار! پتا نہیں بھابھی کیا چاہتی ہیں۔"

"وہ کسی صورت تمہاری شادی نہیں کرنا چاہتیں۔"

"مگر کیوں...؟"

"کتنی بار تو بتا چکی ہوں ان کی نظر تمہارے بزنس پر ہے۔ تمہاری شادی ہوجائے گی تو بزنس کا بٹوارا ہوگا اور یہی چیز وہ نہیں چاہتیں۔ مجھے تو لگتا ہے اسد بھائی بھی شامل ہیں بیوی کے ساتھ۔" تزئین کا تجزیہ دل مسل دینے والا تھا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ حیران تھا۔ "وہ میرے بھائی ہیں تزئین!"

"تم مانو نہ مانو۔ یہ دونوں کی ملی بھگت ہے۔ آج تم بزنس علیحدہ کرنے کا کہو، تمہیں وہ ایک دھیلا بھی نہیں دیں گے۔"

"نہیں... نہیں تزئین! تمہیں غلط فہمی ہے۔ اسد بھائی ہمیشہ کہتے ہیں کہ یہ بزنس ہم دونوں کا ہے۔"

"کہتے ہیں نا، تم بٹوارہ کرنے کا کہو تو دیکھنا تمہیں کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیں گے اور خالی ہاتھ۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے" آخر بھائی ہیں میرے۔"

"پیسے کے سامنے خون سفید ہوجاتے ہیں۔ تم رہتے کون سی دنیا میں ہو۔" تزئین نے صفدر کو دیکھا۔

"میں تمہاری دوست ہوں اور صحیح کہہ رہی ہوں۔"

"صرف دوست...؟" صفدر نے اس سے پوچھا۔

"یہ دوستی کسی اور رشتے میں نہیں بدل سکتی؟"

تزئین نے ایک پل کو اسے دیکھا پھر ہنس دی۔

"تم چاہتے ہو میں ایک اچھے دوست سے ہاتھ دھو بیٹھوں؟"

"مجھے پتا ہے۔ تم بھلا مجھے کیسے قبول کر سکتی ہو۔ تمہارا اور میرا ایج ڈیفرنس بہت زیادہ ہے اور۔" صفدر نے گہرا سانس لیا۔

"پلیز صفدر! ایسے مت سوچو۔ عمروں کا فرق میرے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مگر۔"

"مگر کیا...؟" صفدر نے اسے دیکھا۔

"تمہاری بھابھی نہیں مانیں گی۔ تمہیں یاد ہے آفرین آپا پر انہوں نے کتنے الزام لگائے تھے اور۔"

"یاد ہے سب مجھے۔"

"تو میں بھی بغیر کسی وجہ کے بدنام ہو جاؤں؟"

"اس بار ایسا نہیں ہوگا۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"وہ اپنی خصلت سے باز نہیں آئیں گی۔"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تم بتاؤ کہ راضی ہو؟" وہ مسکرایا۔

"کتنا بڑا فیصلہ میں اتنی جلدی کیسے کر سکتی ہوں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے تم اچھی طرح سوچ لو۔" صفدر نے کہا پھر بولا۔ "ٹیلر کے پاس نہیں جانا؟"

"وہاں بھی چلتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے امی فساد ڈالیں گی اگر کپڑے نہ لے گئی تو۔" تزئین نے کہا۔

صفدر سر ہلا کر رہ گیا۔

✲ ✲ ✲

کمرے سے آتی آواز پر صفدر دروازے ہی میں ٹھٹک گیا۔

"مجھے آپ چا چو نہ سمجھیں۔ امی اب سیدھی طرح بتائیں۔ آپ کو میری شادی کرنی ہے یا نہیں؟" عمران اونچی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"دیوانہ ہوا ہے۔ دیکھ تو رہی ہوں رشتے۔" عذرا نے تنک کر کہا۔

"جیسے چا چو کے اب تک دیکھتی آئی ہیں۔ تیرہ سال گزر گئے ہیں وہی ہیں جو آپ پر اعتبار کرتے ہیں۔" وہ طنزیہ ہنس کر بولا۔

"ہاں تو وہ شریف لڑکا ہے۔"

"تب ادھیڑ عمر ہو گو لڑکا تو نہ کہیں۔" عمران نے تمسخر سے کہا۔

"بکو مت۔ کبھی دیکھا ہے تم نے۔ اس نے اونچی آواز میں مجھ سے بات نہیں کی اور ایک تم ہو۔" عذرا جھڑکتے ہوئے بولی۔

"اپنے حق کے لیے آواز اٹھانا جرم نہیں ہے امی! میں اب جاب کرتا ہوں۔ اپنے گھر کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہوں تو میری شادی ہو جانا چاہیے۔"

"ہاں تو میں کب انکار کر رہی ہوں۔ کوئی لڑکی پسند آئی تو۔"

"آپ کو کوئی لڑکی پسند نہیں آئے گی۔" اس نے بات کاٹ کر کہا۔ "میں نے لڑکی پسند کرلی ہے اس اتوار کو آپ چل رہی ہیں نشاط کے گھر۔"

"نشاط۔ کون۔ نشاط...؟" عذرا نے حیرت سے پوچھا۔

"میرے ساتھ آفس میں کام کرتی ہے۔"

"غضب خدا کا نوکری کرنے والی لڑکیوں کا تو ویسے بھی دیدہ ہوائی ہوتا ہے وہ بھلا۔" عمران نے اس کی بات کاٹ دی۔

"نشاط میری پسند ہے اور میں ہر صورت اسی سے شادی کروں گا۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔" وہ غصے سے بولی۔

"نہ جائیں مذہب اور قانون ہمیں اجازت دیتا ہے۔"

"آنے دو اپنے ابا کو میں۔"

"مجھے ابا کی دھمکی مت دیں امی۔ میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔" عمران نے غصہ سے کہا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ صفدر دیوار سے لگ کر کھڑا تھا۔ اس کو لگا جیسے اس کا سانس رک گیا ہو۔

✲ ✲ ✲

تزئین کی رضامندی کے بعد صفدر نے جمیلہ خالہ سے بات کی تھی۔ اس وقت وہ ان کے پاس بیٹھا تھا۔

"میں نے بات کی تھی تمہارے خالو سے۔ مگر وہ کہتے ہیں کیا گارنٹی ہے کہ تم تزئین کو خوش رکھو گے۔ پہلے آفرین کے ساتھ۔" جمیلہ خالہ کہہ رہی تھیں۔

"خالہ! آفرین کا طعنہ نہ دیں۔ اس وقت واقعی میری غلطی تھی مگر تب میں اور اب میں درمیان میں پورے تیرہ سال آگئے ہیں اور۔ اور آپ مجھ پر اعتبار کریں۔ میں تزئین کی پوری ذمہ داری اٹھاؤں گا۔"

جمیلہ خالہ سوچوں میں گم ہو گئیں۔

"کیا سوچ رہی ہیں خالہ...؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے صفدر! میں بیٹی کی ماں ہوں۔"

"میں بھی آپ کا بیٹا ہوں۔ کوئی غیر نہیں۔ بھانجے بھی تو بیٹے ہوتے ہیں خالہ!" صفدر ان کا ہاتھ تھام کر بولا۔

"کیوں نہیں بیٹا!" جمیلہ خالہ نے صفدر کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"یار عامر! میں تمہارے ساتھ بزنس کرنا چاہتا ہوں تم مجھے اپنا پارٹنر بنالو۔" صفدر نے عامر سے کہا۔

"کیوں نہیں۔"

"مگر میرے پاس زیادہ سرمایہ نہیں ہے۔"

"ہم دوست ہیں صفدر! سرمایہ میرا ہوگا۔ تم بس مارکیٹنگ کرو۔ منافع آدھا آدھا۔"

"ٹھیک ہے۔ میرے پاس دس لاکھ ہیں۔ وہ میں تمہیں دیتا ہوں۔ باقی آہستہ آہستہ لگاتا رہوں گا۔"

"اوکے۔" عامر نے ہامی بھری۔ صفدر بہت خوش تھا۔

"میں نے عامر کے ساتھ پارٹنر شپ کرلی ہے۔ اس کا "منرل واٹر" کا کاروبار ہے اور بہت بڑے پیمانے پر چل رہا ہے۔ ففٹی پرسنٹ کا پارٹنر ہوں میں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" تزئین نے کہا۔

"یہ سب تمہارا نصیب ہے۔"

"نہیں صفدر! تمہاری محنت ہے۔" تزئین نے محبت سے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

اس روز وہ ناشتہ کر رہا تھا کہ عذرا بھابھی نے کہا۔

"صفدر آج ذرا بشریٰ کو تو لیتے آنا۔"

"کیوں...؟"

"شام کو تمہارے لیے لڑکی دیکھنے جانا ہے کسی نے رشتہ بتایا ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"آپ بشریٰ کو فون کردیں۔" صفدر نے کہا۔

"نہیں۔ تم جاکر لے آنا۔ تیمور آفس چلا گیا ہوگا پھر وہ دونوں بچوں کے ساتھ کہاں رکشا کے دھکے کھائے گی۔"

"چلیں میں دوپہر کو لیتا آؤں گا۔"

"صفدر! کل تم حیدر عباس کی طرف نہیں گئے تھے۔" اسد اپنی رسٹ واچ کے بکل لگاتے ہوئے اس کے قریب آئے۔

"مجھے وقت نہیں ملا۔ آج جاؤں گا۔"

"تم لیٹ نہ ہوا کرو، وہ کسی اور کو آرڈر دے بیٹھا تو۔"

"وہ نہیں دے گا۔ میں ابھی جاتا ہوں۔" صفدر نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھا۔

"اور ہاں وہ جو ہر ٹاؤن والا جو پلاٹ تمہارے نام سے لیا تھا۔ میں نے اس کی پوری پے منٹ کردی ہے۔ اب اس کا قبضہ لینا ہے۔"

"تھینک یو بھائی جان!" صفدر تشکر آمیز لہجے میں بولا۔

عذرا نے نہایت حیران نظروں سے اسد کو دیکھا تھا مگر بولی کچھ نہ تھی۔

وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ مگر اسے واپس پلٹنا پڑا کہ وہ اپنا سیل فون بھول گیا تھا۔ لیکن اسے دروازے میں ہی ٹھٹکنا پڑا۔

"اس گھر کی پے منٹ کیوں کی؟ جبکہ وہ صفدر کے نام تھا۔"

"پے منٹ نہ کرتا تو گھر ہاتھ سے نکل جاتا۔ پھر کیا فرق پڑتا ہے۔ رہنا تو ہم ہی نے ہے نا۔ صفدر کے کون سے بال بچے ہیں جو وہ حقدار ہوں گے۔ اس کا بھی جو کچھ ہے ہمارے بچوں کا ہے۔"

"یہ تو ہے۔" عذرا نے کہا۔

"آج تم پھر اس کا رشتہ دیکھنے جارہی ہو...؟" اسد نے پوچھا۔

"ہاں جا تو رہی ہوں مگر مجھے پتا ہے صفدر کی عمر کا سن کر وہ لوگ انکار کردیں گے۔ لڑکی نے ابھی بی اے کا امتحان دیا ہے۔"

"پھر نہ جاؤ۔" اسد نے کہا۔

"صفدر سمجھے گا۔ ہم اس کی شادی ہی نہیں کرنا چاہتے اور سچی بات تو یہ ہے اسد! اب بھلا صفدر کی عمر کہاں رہ گئی ہے شادی کی۔" عذرا ہنسی۔ صفدر کو لگا تھا جیسے زمین اس پر سے گزر گئی ہو۔

وہ اندر جانے کے بجائے وہیں سے پلٹ گیا۔ اسے نہیں پتا کہ وہ کس طرح گاڑی میں بیٹھا اور جب دیکھا تو اس کی گاڑی جمیلہ خالہ کے دروازے پر کھڑی تھی۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو تزئین دھلے کپڑے الگنی پر

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening ,or you find any issue in using site send your complaint at
admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

ڈال رہی تھی۔ صفدر صحن میں نیم کے درخت تلے پڑی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا صفدر؟" تزئین گھبرا کر تیزی سے اس کے قریب آئی۔

"صفدر۔ صفدر!" وہ اس کا بازو ہلا رہی تھی اور صفدر آنکھیں موندے لیٹا تھا۔

"کیا ہوا صفدر۔؟ امی۔" تزئین کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا۔ میں ٹھیک ہوں۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔ ہنوز آنکھیں بند تھیں۔

"آنکھیں تو کھولو۔" تزئین بے قراری سے بولی۔ تب آہستہ سے صفدر نے آنکھیں کھولیں تو دو آنسو آنکھوں کے کونوں سے ٹپک پڑے۔

"صفدر! تم رو رہے ہو؟"

"آج رشتے ننگی تلوار بن کر سامنے آگئے ہیں اور وہ تلوار میرے کلیجے کے پار ہوگئی ہے۔ تم صحیح کہتی تھیں تزئین! بھابھی چاہتی ہی نہیں کہ میری شادی ہو۔ آج ان کے منہ سے میں نے خود سنا ہے۔"

صفدر نے آہستہ آہستہ اسے سب کچھ بتادیا۔

"تمہیں دکھ نہیں ہونا چاہیے صفدر! میں تو کب سے یہ حقیقت تمہیں بتاتی آرہی ہوں۔"

"میری زندگی کے تیرہ خوبصورت سال جذبوں اور امنگوں سے بھرپور بھیا اور بھابھی نے اپنی لالچی طبیعت کی وجہ سے ضائع کردیے۔"

"اچھا چھوڑو اللہ نے جو وقت کسی کام کا مقرر کیا ہے وہی وقت ہوتا ہے تم دل برا نہ کرو۔ چائے لاؤں؟"

"ہاں پلادو۔ خالہ کہاں ہیں؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ساتھ والوں کے گھر گئی ہیں ابھی آتی ہیں۔"

"تزئین! ایک بات کہوں۔؟"

"ہوں۔"

"اگر میں خالہ سے کہوں کہ تمہاری رخصتی جلد کردیں تو۔"

"تو کیا؟" تزئین نے اسے دیکھا۔

"بھابھی کے ساتھ رہ لوگی؟"

"ہاں۔ تم ساتھ ہوگے تو رہ لوں گی۔"

"تھینک یو تزئین۔" صفدر اس کا ہاتھ تھام کر محبت سے بولا۔ تو وہ مسکرادی۔

☼ ☼ ☼

صفدر نے جلد از جلد جوہر ٹاؤن والی کوٹھی کی فائل حاصل کرلی اور سنبھال کر اسے لاکر میں رکھ دیا۔ آہستہ آہستہ وہ اسد بھائی کے بزنس میں سے اپنا حصہ بھی اس طرح علیحدہ کرتا رہا کہ انہیں خبر بھی نہ ہوئی۔

صفدر نہایت محنت سے اپنا راستہ بنا رہا تھا۔ عذرا بھابھی اب بھی اس کے رشتے تلاش رہی تھیں۔ البتہ عمران کی خواہش پر نشاط سے عمران کی منگنی ہوگئی تھی۔ اور اب اسد بھائی نے کہا تھا کہ سب جوہر ٹاؤن والی کوٹھی میں شفٹ ہوجائیں کہ جلد عمران کی شادی کرنی تھی اور اوپر کا پورشن عمران کے لیے ڈیکوریٹ کیا جانا تھا۔

صفدر دیکھ رہا تھا۔ بھابھی عمران کے لیے اچھی سے اچھی چیزیں لارہی تھیں۔ قیمتی فرنیچر، پردے، کارپٹ لگتا تھا نشاط جہیز میں کچھ بھی نہ لائے گی۔

☼ ☼ ☼

وسیع لان میں اسد اور عذرا کرسیوں پہ بیٹھے چائے پیتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ تب ہی کرولا کار پورچ میں آکر رکی۔ صفدر اور تزئین ساتھ اترے۔ وہ دونوں لان میں اسد اور عذرا کے پاس آگئے۔

"السلام علیکم بھائی جان اور بھابھی!"

"وعلیکم السلام۔"

"ارے یہ تزئین آج کیسے آگئی۔ تم خالہ کے گھر گئے تھے کیا؟" اسد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تزئین اپنے گھر آئی ہے۔"

"کیا مطلب۔؟" عذرا نے حیرت سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ میں نے تزئین سے شادی کرلی ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم۔" اسد کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"وہی جو آپ سن رہے ہیں۔" صفدر اطمینان سے بولا۔

"دماغ خراب تو نہیں ہے تمہارا۔ اپنا اور شفیع خالو کا اسٹیٹس دیکھا ہے کہاں وہ پرچون فروش اور۔"

"بس بھائی جان! آگے ایک لفظ مت کہیے گا۔ شفیع خالو میری بیوی کے شوہر ہیں اور میں برداشت نہیں کروں گا کہ آپ ان کی شان میں گستاخی کریں۔"

"بکواس بند کرو۔ چھوڑ آؤ اسے وہیں جہاں سے لائے ہو۔"

"یہ میری بیوی ہے اور یہیں رہے گی۔"

"اس گھر میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور اگر تم نے ضد کی ....

تو پھر تم بھی اس کے ساتھ دفع ہوجاؤ، میں سمجھوں گا میرا کوئی بھائی تھا ہی نہیں۔" اسد غصہ میں جھاگ اڑا رہے تھے۔

"ایسا تو میں بھی سمجھ لوں گا۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ گھر میرا ہے۔ میرے نام ہے۔ بزنس میں بھی تو آدھا حصہ میرا ہے۔"

"کچھ نہیں ہے تمہارا۔ میں تمہیں ایک ٹکا بھی نہیں دوں گا۔" اسد مارے غصہ کے بے قابو ہوتے لگے۔

"نہ دیں ٹکا۔ گھر تو میرا ہے۔ اس کے کاغذات میرے پاس میرے نام سے محفوظ ہیں۔" صفدر نے کہا تو عذرا شوہر کی طرف دیکھ کر بولی۔

"دیکھا میں نے کہا تھا کہ آپ کو مکان کی پیمنٹ نہیں کرنا چاہیے تھی۔"

"آستین کے سانپ۔" اسد پھنکارے۔

"میں نہیں آپ لوگ ہیں آستین کے سانپ۔ پورے پندرہ برس میرا خون چوستے رہے۔ مجھے بہلاتے رہے کہ میری شادی کررہے ہیں اور جان بوجھ کر رشتے ریجیکٹ کرتے رہے۔ دو سال قبل میں نے خود تزئین سے شادی کرلی۔ یہ گھر میرا ہے اگر بھائی کی طرح رہنا ہے تو رہیں ورنہ جہاں جی چاہتا ہے چلے جائیں۔ مجھے پتا چل گیا ہے کہ آج کل رشتے کچی دیوار کی طرح ہیں جو کسی وقت بھی ڈھے سکتے ہیں۔ آج پتا چلا اسد بھائی کہ ہماری رگوں میں بے شک ایک ہی باپ کا خون ہے مگر ہم اپنے مطلب کی خاطر ایک دوسرے کو ذبح کرنے سے بھی کبھی نہیں چوکیں گے۔ میرا رشتوں سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔"

صفدر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"اس گھر پہ اس بزنس پہ اتنا ہی میرا حق ہے جس قدر آپ کا ہے۔ یہ ہم پھر طے کریں گے۔ میں اوپر اپنے پورشن میں جارہا ہوں۔"

صفدر نے تزئین کا ہاتھ تھاما اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔ عذرا اور اسد ایک دوسرے کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے جواری ہار کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔

☼

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول
زرد موسم
راحت جبیں

قیمت -/600 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

www.Paksociety.com

عفت سحر پاشا

دھنک کے رنگ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"اف کیا بتاؤں، رو کھانے تو وہاں جاکے عمران سے کمال کی باتیں کیں۔" "آج ہم سب عمران عباس کے ہاں لنچ پر مدعو تھے۔ وہیں سے آکر زرمینہ نے بڑے جوش سے فائقہ کو بتایا تو اس کا منہ بن گیا۔

"میں نے تو اس سے کہا تھا کہ جاکے عمران کے ساتھ میری باتیں کرنا اور یہ وہاں جاکے کمال کی باتیں کرتی رہی ہے۔ ویسے یہ کمال ہے کون؟"

نگار الطاف

بڑے دکھی انداز میں کہتے ہوئے اس نے آخر میں تجسس سے پوچھا تو اس کی کوڑھ مغزی پر میں جل کر رہ گئی۔

"تمہارے جیٹھ صاحب۔" زرمینہ نے بھی طنزیہ کہا تو وہ حیرانی سے بولی۔

"اچھا۔ عمران کا بڑا بھائی بھی ہے؟ مگر میں تو کبھی پسند نہیں کرے گا کہ یہ غیر مرد کی باتیں کرے۔"

"خدا کے لیے۔" زرمینہ اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے اٹھ گئی۔

"دفع۔" اس نے زرمینہ کے پیچھے ہاتھ لہرایا اور اب کی بار رخ سخن میری طرف کیا۔

"ویسے حیرت کی بات ہے رومی! تمہیں میرے جیٹھ کی باتیں کس نے بتائیں؟"

ماہین اور نوین دل کھول کر ہنس رہی تھیں۔ میں نے دانت پیسے۔

"کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے تم جہاں سے آئی ہو، بڑے ادب و احترام سے تمہیں وہیں واپس پہنچا دوں۔"

"اپنے کمرے میں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں! اللہ کے پاس۔" میں نے جل کر کہا تو ماہین کا قہقہہ نکل گیا۔ میں اس کی نالائقی پہ کڑھتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ باقی سب لاؤنج میں براجمان دعوت ہی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں ذرا دیر کو رکی۔

"ہر شے اعلیٰ اور نفیس تھی۔ لوگ بھی اور کھانا بھی۔ ہاں، ڈرنس ملائی بہت ٹھنڈی تھی۔"

دادو جان نے کہا تو میں نے انہیں یاد دلایا۔

www.Paksociety.com

www.paksociety.com

"آپ کو بہت تیز زکام ہو رہا ہے۔ ورس ملائی آپ کو لینا ہی نہیں چاہیے تھی۔" انہوں نے شاید فریزر میں رکھی ہوئی تھی۔

"ہائیں! فریزر میں؟"

وہ متحیر ہوئیں تو سب ہی کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی' جبکہ میں خود کو کوستے ہوئے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر منہ کھولا۔ زبان نکال کر ہر زاویے سے چیک کی۔

"زبان لمبی ہو گئی ہے یا منہ میں سے کچھ گر گیا ہے؟" زرمینہ اندر داخل ہوئی تو میں نے منہ بند کر لیا۔

"کیا ہوا؟"

"ایسے ہی شک سا ہوا تو دیکھ رہی تھی میری زبان کالی تو نہیں۔" میں نے آہ بھری۔

"ہیں... یہ کیسا شک ہے؟" وہ حیران ہوا ٹھی۔ میں گہری سانس لیتے ہوئے بیڈ پہ ٹک گئی۔

"فائقہ کو بددعا دی تو اس بے چاری کا پلا خالصتاً اردو دانوں سے پڑ گیا۔ پچھلے دنوں دادو جان کی قابل رشک قوت سماعت (سننے کی حس) پر اعتراض ہوا تو میں نے سوچا کہ دادی فضلاں (دادو کی سگی جو اونچا سنتی ہیں) اچھی ہیں' جو مرضی کہتے رہو ہنستی اپنی مرضی کا ہیں اور کل سے بے چاری دادو جان کو انتا برا زکام لگا ہے کہ کانوں کے پردوں کے آگے رعشہ جم گیا ہے۔ بے چاری الٹا سید ھا سنے جا رہی ہیں۔" مجھے واقعی افسوس ہو رہا تھا۔

"اسی لیے کہتے ہیں کہ الٹا سیدھا سوچو بھی مت۔" زرمینہ نے ناصحانہ انداز میں کہا تو میں اثبات میں سر ہلا کے رہ گئی۔

ویسے قارئین! ہے تو شرم کی بات مگر دادو کے ان دنوں اونچا سننے کا فائدہ بہت تھا۔ دادو کے سامنے بھی آپس میں جو مرضی بات کر لو ان کی چھڑی پڑنے کا ڈر نہیں رہا تھا۔

ابھی بھی میں فائقہ اور زرمینہ ان کے کمرے میں موجود تھیں اور میں دادو کے سر میں تیل کا مساج کر رہی تھی۔

ہمارا موضوع گفتگو فائقہ کی منگنی ہی تھی۔

"بڑا شوق تھا تمہیں منگنی زدہ ہونے کا۔ دیکھ لو کون سی بہار آ گئی ہے تمہاری سڑی بھسی زندگی میں۔" میں نے اس پر طنز کا تیر پھینکا تو وہ موبائل لہراتے ہوئے ناز سے بولی۔

"ان باکس چیک کرو ذرا۔ اس پورے مہینے میں پچیس میسجز آچکے ہیں عمو کے۔"

"ہائے۔" زرمینہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ "اور تم نے ایک بھی نہیں پڑھوایا؟"

"وہ بچیوں کے لیے نہیں ہیں۔" وہ اور اٹھلائی۔ میں تو اپنے جلتے دل ہی کو سنبھال رہی تھی۔ زرمینہ نے کہا۔ "شکریہ! بچی کہنے کا۔"

"میرا مطلب بچی بچی تھا۔" فائقہ نے بھی وضاحت کر کے اس کا دل جلانے میں کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

"شرم کرو لوہ دن بھول گئیں جب اسی "عمو جان" کا رشتہ میری طرف ٹرانسفر ہو گیا تھا تو کیسے میرے آگے پیچھے روتی پھرتی تھیں۔ تمہیں تو مانگے تانگے کا منگیتر ملا ہے۔" زرمینہ نے بھی برا رخ سے کہا۔

"اری چل! ہم تجھے کچھ نہیں سمجھتے۔" فائقہ نے ہاتھ جھٹکا اور بڑی ادا سے بولی۔

زرمینہ مٹھیاں بھینچ کر رہ گئی۔

"اے توبہ! یہ کیا منہ ہلا رہی ہو خالی؟ آواز تو نکل نہیں رہی تمہاری۔" دادو نے کان میں انگلی گھماتے ہوئے زور سے کہا تو زرمینہ گڑبڑائی۔

"وہ دادو وظیفہ... وظیفہ پڑھ رہی تھی۔"

"لطیفہ... وہ کون ہے؟" وہ پوچھنے لگیں۔

"وظیفہ کہہ رہی ہے دادو!" میں نزدیک تھی' سو زور سے بولی۔

"لطیفہ سنا رہی ہے تو پھر ہنستی کیوں نہیں ہو سب؟" انہیں اعتراض ہوا۔

اف! ہم سب تو پہلے ہی دادی فضلاں کی ڈسی ہوئی تھیں۔ زور زور سے بول بول کے حلق میں خراش پڑ جاتی تھی۔

"وظیفہ دادو جان! وظیفہ۔"

زرمینہ نے پھیپھڑوں پر زندگی بھر کا زور لگا دیا۔

"اچھا... وظیفہ! کون سا وظیفہ کر رہی ہو آج کل؟" انہوں نے سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ... صبح اٹھتے ہی کلمہ پڑھتی ہوں' لان میں ہریالی دیکھتی ہوں تو سبحان اللہ پڑھتی ہوں۔ آئینہ دیکھ کر..."

"لاحول ولا پڑھتی ہوں..." فائقہ نے برجستگی سے اضافہ کیا تو زرمینہ روانی سے بولی۔

"بالکل..." پھر ہماری ہنسی پر وہ منہ پہ ہاتھ پھیر کے رہ گئی۔

دادو نے زرمینہ کی اس قدر "دین داری" پر اسے پیار کیا۔

"یہ موئے کانوں کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے' ہفتہ بھر لگ جائے گا۔" تکیہ کھینچا اور سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئیں۔

وہ بے چاری اس صورت حال سے کافی پریشان تھیں۔ ہمیں ترس آیا۔

"دادو! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔" میں نے انہیں تسلی دی تو وہ تکیے پر سے سر اٹھا کے مجھے دیکھتے ہوئے اچنبھے سے بولیں۔

"کسی سے ذکر نہ کروں تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔ یہ بھی کوئی وظیفہ ہے کیا؟"

"توبہ..." میں سر کھجا کے رہ گئی۔

بہر حال یہ پتا ضرور چل گیا تھا کہ ان دنوں دادو سے کوئی بات کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ وہ تو ان دنوں محرم کو بھی "مجرم" بنا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ان ہی دنوں بینک والوں کے پرانے بند مکان کا تالا کھل گیا۔ لڑکوں کی زبانی علم ہوا کہ کوئی کم آمدنی اور زیادہ بچوں والی فیملی اس بوسیدہ سے مکان کو کرائے پر لے چکی ہے۔ دادو کا حسب عادت خدمت ہمسایہ کا شوق جاگ اٹھا۔ لے کے مجھے اور زرمینہ کو ہی دوڑایا۔ فائقہ نے تو صاف انکار کر دیا۔

"بھئی! مجھے تو اپنے خوابوں کا شہزادہ مل گیا ہے۔ مینا کو لے جاؤ۔ اس بے چاری کے شاید بھاگ جاگ جائیں۔"

اور زرمینہ تو یہ سن کے آستین چڑھا لیں۔

"تمہاری یہ جرأت..."

"یہ کیا...؟ نیچے کرو آستین۔ سخت بری لگتی ہیں مجھے آدھی آستین۔" دادو کی نظر پہلے پڑ گئی۔ وہ گڑبڑائی۔

"وہ... دادو! گرمی... لگ رہی تھی۔"

"اچھا جاؤ... اور یہ پاؤ اور سائن کا ڈونگا ان کے ہاں پکڑا کے آؤ اور طریقے سے بات کرنا۔ کہنا' کسی بھی شے کی ضرورت پڑے تو جھجکنا مت۔"

دادو کی نصیحت میں کئی قابل اعتراض باتیں تھیں مگر اب ان سے بحث کون کرتا' سو ہم سر پہ نیک بیبیوں کی طرح دوپٹے اوڑھ کر نکل آئیں۔

اس کالونی میں سب ہی مکان بہت اچھے بنے ہوئے تھے' مگر بینک والے (جن کے بیٹے کی بینک میں جاب ان کی وجہ تسمیہ ہے) جب لاہور شفٹ ہوئے تو بند مکان کی حالت خستہ ہوتی چلی گئی اور آج ایک عرصے کے بعد یہاں کا تالا کھلا اور اس میں آوازیں گونجی تھیں۔

"پتا نہیں' کیسے لوگ ہوں گے۔" زرمینہ نے کال بیل پہ ہاتھ رکھا اور ساتھ ہی ایک زوردار چیخ ماری۔

"کمینی! شرم کرو۔ کسی کو دکھا ہے تمہیں اور چیخنا شروع کر دیا۔" میں نے اسے ڈانٹا۔ وہ کپکپاتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کک... کرنٹ چھوڑ رکھا ہے الو کے پٹھوں نے بیل میں۔"

میں نے فوراً "دو نفل شکرانے کے مانے... زرمینہ کی نہیں' بلکہ اپنی جان بچنے کی خوشی میں۔

اسی وقت ان الوؤں... مطلب کہ کرائے داروں میں سے کسی نے آ کر کھٹاک سے گیٹ کھولا۔

ایک عدد درمیانے سائز کا ڈارک براؤن سا بچہ دانت نکوسے ہمیں کم اور چاولوں کی ڈش اور سالن کے ڈونگے کو زیادہ دیکھتے ہوئے بولا۔

"بیل آپ نے بجائی ہے؟"

"ہیں۔۔۔؟ اندر آواز آگئی تھی بیل کی؟" زرمینہ ازحد حیران ہوئی۔

"بیل تو خراب ہے جی! آپ کی چیخ سے پتا چلا کہ گیٹ پہ کوئی آیا ہے۔" وہ مدبرانہ انداز میں بولا تو مجھے ہنسی آگئی۔ مگر زرمینہ کی ناراضی کے خیال سے دبالی۔

"بڑے مختلف انداز کے سر نکلتے ہوں گے ہر دفعہ ان کی بیل بجانے سے۔"

"امی ہیں تمہاری؟" زرمینہ نے غصے سے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے جی! زندہ سلامت ہیں میری امی۔ انہیں کیوں کچھ ہونے لگا۔" بچہ جذباتی ہو کر بولا تو اس مرتبہ مجھ سے ہنسی روکنا مشکل ہو گئی اور زرمینہ بے چاری اس بار تیرہ سالہ بچے کے سامنے گڑبڑا سی گئی۔

"میرا مطلب ہے وہ گھر پہ ہیں؟"

"ہاں جی! انہوں نے کون سا کالج میں داخلہ لیا ہوا ہے۔"

جذباتیت کو پرے پھینک کر وہ پھر سے ٹیڑھے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا تو میں نے گہری سانس بھری۔

"اب اندر بھی آنے دو! ٹانگیں تھک گئی ہیں ہماری۔ یہ سالن چاول نہیں لینے کیا؟"

اسے وہم ہوا ہم یہ "من و سلویٰ" لے کر واقعی پلٹ نہ جائیں۔ اس نے "چشم ما روشن دل ما شاد" کے مصداق پورا دروازہ وا کر دیا۔

"آئیں آپا جی۔۔۔!"

ہم دونوں نے اشتیاق کے مارے اندر قدم رکھے۔ ڈیوڑھی پار کر کے بڑا سا کمرا تھا جو اب شاید ٹی وی لاؤنج بنا ہوا تھا۔

وہاں بیٹھی بچوں میں گھری چھوٹی اور قدرے موٹی سی عورت اٹھ کر تیزی سے ہماری طرف آئی۔

"یہ دادی جان نے بھجوایا ہے آپ کے لیے۔ ہم سامنے والی لین میں "بٹ ہاؤس" سے آئی ہیں۔" میں نے ٹرے انہیں تھما کر فوراً بوجھ ہلکا کیا۔

"ہیں۔۔۔ باجی! یہ کیا تکلف کیا آپ نے! ہو ہو ہو ہو" بے ہنگم سی ہنسی کے ساتھ اس نے ٹرے تھام لی تو میں تڑپ کر رہ گئی۔

"باجی۔۔۔؟" خود وہ چہرے مہرے سے چالیس پینتالیس سے کم کی نہ لگ رہی تھی۔

"بیٹھو جی آپ۔۔!" اس نے فوراً دو موڑھے گھسیٹ کر ہمیں پیش کیے اور ساتھ ہی کچن کی طرف منہ کر کے آواز دی۔

"نی شیدا (شاہدہ) نی فاخرہ۔۔۔ مرن جو گیو! ادھر تو آؤ کوئی۔"

اسی وقت کچن میں سے دس سالہ بچی بھاگتے ہوئے آئی تو ان خاتون نے ٹرے اس کے حوالے کی۔

"ایک بھی نوالہ لیا تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔ برتن خالی کر کے لے آ۔۔۔"

آنکھیں نکال کے اسے دھمکایا۔ ہمیں مجبوراً برتنوں کی واپسی تک بیٹھنا پڑا۔ عجیب سی بدبو پورے ماحول پہ چھائی ہوئی تھی۔ اس پر آٹھ عدد بچوں کا شور۔ الامان۔

"ان کی چھٹی کا ٹائم نہیں ہوا ابھی؟"

میں نے خوشگوار گفتگو کا آغاز کیا (دادو کو پوری رپورٹ جو دینا تھی جا کر)

"نہیں جی۔۔۔ کن کی؟"

خاتون نے مجھ پہ نگاہ جمانے کی ناکام کوشش کی۔ کسی دائمی کمزوری کی وجہ سے ان کا سر اور آنکھیں دائیں بائیں گردش کرتی رہتی تھیں۔ بلکہ ان کے کچھ بچے بھی ایسے ہی تھے۔

میں نے بچوں کی طرف اشارہ کیا جو فری اسٹائل ریسلنگ کر رہے تھے۔

"یہ جو ٹیوشن پڑھنے آئے ہیں۔"

"آہا۔۔۔ باجی مذاقیہ ہوتی آپ۔"

انہوں نے اپنا موڑھا آگے کرتے ہوئے ایک جھانپڑ میرے ہاتھ پہ لگایا۔

"ہیں۔۔۔؟" میں ہونق بنی دیکھتی رہ گئی۔

"یہ جی! میرے اپنے بچے ہیں۔۔۔ ذاتی۔"

"اوئی ماں۔۔۔" زرمینہ نے عجلت پھرسے گنتی کی۔ "پچھ سات۔۔۔"

وہ خاتون تڑپ اٹھیں۔ "خدا نہ کرے میرے سات بچے ہوں۔"

زرمینہ گڑبڑائی۔ "وہی تو۔۔۔ محلے والوں کے بھی مکس ہو گئے ہوں گے ان میں۔۔۔"

"نہ جی۔۔۔ اللہ زندگی تندرستی دے انہیں۔ پورے آٹھ بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں میری۔" وہ بڑے افاخر سے بولیں۔ ہماری سانسیں تھمتے تھمتے رہ گئیں۔ اب وہ اپنا تعارف پیش کر رہی تھیں۔

"میرا نام عارفہ ہے اور میرے میاں کا نام اکرم علی۔ ویسے وہ اکرو کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ میں بیس سال کی تھی جب میری شادی ہوئی۔ لو جی! شادی تو ہو گئی پر بچے نہ۔ علاج معالجے دم درود سب کرلیے۔ تین سال بعد میرا کاشا پیدا ہوا۔ ویسے کاشف نام ہے اس کا۔ اس کے بعد تو جی! اللہ نے ہمارے گھر سال کے سال خوشی بھیجنا شروع کر دی۔ (خوشی نہ ہوئی کیلنڈر ہو گئے) پر ہم نے بھی اللہ سے "نہ" نہیں کی۔ پھر شیدا (شاہدہ) فاخرہ 'بوبا' (یہ شاید کسی زمانے میں ببلی ہوا کرتا تھا۔ زیادہ لاڈ میں بگڑ گیا ہوگا) شوکی 'مانا' دنبی ہمیرا 'ابکا' اور یہ نکا منا (چھوٹا بے چارہ) اس کا نام بھول جاتی ہوں۔ ابھی دو سال کا ہے۔۔۔ ہاں۔ جانی۔۔۔ رمضان میں ہوا تھا تو اس کے ابے نے رمضان ہی نام رکھ دیا۔ ہم پیار سے جانی کہتے ہیں۔"

"اب۔۔۔ پانی ملے گا۔" میرا تو حلق خشک ہونے لگا۔

"ہاں! ہے تو۔ پر جی گرم ہوگا۔ فرج تو ہے نہیں اور ان مرن جوگیوں نے صبح جو برف والے سے برف لی تھی اسے کوٹ کر شربت ڈال کے کھا بھی لی ہے۔" وہ آرام سے براجمان تھیں۔

"یہ بدبو کہاں سے آرہی ہے کچھ جل رہا ہے شاید۔"

زرمینہ نے میرے ذہن کے سوال کو زبان دے ہی دی۔

"ہاں جی! آج ان کے ابے نے بکرے کی سری لا کر دی تھی۔ شیدا وہی بھون رہی ہے چولہے پہ۔ بال وال جل رہے ہیں اسی لیے بو آرہی ہے۔" وہ اطمینان سے بولیں۔

"وہ برتن لا دیں تو ہم اب چلیں۔" میں نے دہشت زدہ ہو کر اس ماحول سے نکلنے کا فیصلہ کیا۔

"ہائے اللہ کوئی خاطر مدارت نہ چاہ پانی۔ ایسے تو نہ جانے دوں گی۔ پہلی بار تو محلے سے کوئی آیا ہے۔" انہوں نے بچوں کو دو ہنٹر لگاتے ہوئے اندرونی کمرے میں دھکیلا اور خود پھر سے موڑھا سنبھال لیا۔

"ان کا ابا سبزی کی ریڑھی لگاتا ہے۔ بڑی برکت ہوتی ہے اللہ کے فضل سے۔۔۔ یہ میرا کاشا اس کام کو پسند نہیں کرتا۔ پندرہویں سال میں لگا ہے۔ پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا اس کا۔ ابے نے گاڑیاں ٹھیک کرنے کا کام سیکھنے پہ لگا دیا۔۔۔ ایسے ہی بچپن نکل گیا میرے بلونگڑے کا۔ گڈیوں کے پیچھے لیتے لیتے ہی بے چارے کی مونچھیں نکل آئیں۔" دکھ سے وہ تو بھر کے بولیں، پر مجھے اور زرمینہ کو جو ہنسی آئی۔ وہ بیان سے باہر ہے۔ دونوں میں منہ دبا دبا کے ہنسی چھپائی۔ عارفہ بیگم غمزدہ سی بیٹھی تھیں۔

اسی وقت فاخرہ اچھلتی کودتی برتن لے آئی۔

"اماں۔۔۔ شیدا نے بکرے کا کان کھالیا ہے سری بھونتے بھونتے۔" منہ بسور کر اس نے شکایت کی تب ہی اس کے پیچھے پیچھے شیدا۔۔۔ بلکہ شیدا صاحبہ بھی چلی آئیں۔ ماں ہی کے سائز اور موٹاپے کی شاہدہ باجی۔

"یا اللہ۔۔۔ یہ تو کوئی اور ہی مخلوق ہیں۔ کچے کان کھانے والی۔" ہم دونوں فوراً اٹھ گئیں۔

"ہائیں!۔۔۔ بیٹھو تو کوئی چاہ پانی۔"

"ارے نہیں بہت شکریہ۔ دراصل ہماری دادو جان نئے ہمسایوں کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ آپ کو

کوئی ضرورت ہو تو بلا جھجک بتایئے گا۔ ابھی اجازت دیجیے۔" زرمینہ نے عجلت دادو کی تاکید دہرا دی۔
ورنہ میں تو یہ سب کہنے کا ارادہ منسوخ کر چکی تھی۔ کچھ عجیب سی طرح کی فیلنگ تھی۔
"ہاں۔۔۔ فریج کا بڑا مسئلہ ہے۔ برف اور ٹھنڈے پانی کا۔" وہ فوراً بولیں۔
"کوئی بات نہیں۔ آپ کسی بچے کو بھیج کے ہمارے ہاں سے برف منگوا لیا کریں۔" میں نے بھی مروت کمائی۔
اس وقت تو ہم نے وہاں سے بھاگنے کی کی مگر یہ خبر نہ تھی کہ یہ مروت آنے والے دنوں میں مصیبت بن کے ہم سے چمٹنے والی ہے۔ گھر آ کے ہم دونوں نے پوری رپورٹ دی۔ سب ہی ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہوئیں۔
"ہر عمر ہر سائز کے بچے دستیاب ہیں ان کے ہاں دادو جان! اگر کٹ ٹیم کے بچے لگتے ہیں۔" میں نے مزے سے کہا۔
"ہائیں۔ گرگٹ کے بچے۔۔۔؟" دادو حیران ہوئیں۔
"گرگٹ کے ہی لگتے ہیں۔ گول گول آنکھوں والے۔" زرمینہ ہنسی۔
"اور اکرو صاحب کے بچوں کے نام کتنے جدید ہیں بیٹا! وہ بھی تو بتاؤ۔ شاید کوئی صاحب ذوق رکھنا چاہے اپنے جگر گوشے کا نام۔" میں نے مزا لیا۔
"کاشانو بانو ذنب۔۔۔" زرمینہ نے شروع کیا تو میں نے ٹوکا۔
"ذنبہ نہیں ذنبی۔"
"حلیے سے تو ذنبہ ہی لگ رہا تھا۔"
ہم سب نے مسٹر اکرو لسٹری والے کی فیملی کا خوب مزا لیا۔
اگلے روز سے ان کا کوئی نہ کوئی بچہ برف لینے آ پہنچتا۔ اگر لوڈشیڈنگ کی وجہ سے برف نہ ہوتی تو ٹھنڈا پانی۔ مگر وقت بے وقت۔
اب تپتی دوپہر میں مہمان اکرو صاحب کے گھر میں آتے اور غنیمت ہماری خراب ہوتیں۔
"خبردار! ہمسائے ماں جائے ہوتے ہیں۔" دادو آنکھیں دکھاتیں۔
"خیر ماں جائے تو ایسی حرکتیں نہیں کرتے۔" مجھے اعتراض تھا۔

☼ ☼ ☼

بھری دوپہر میں جبکہ مسلسل چار گھنٹوں سے بجلی غائب تھی، دروازہ بجا۔ کوئی اٹھنے کو تیار نہ تھا۔
"ایسے ہی دادو کوئی مانگنے والا ہوگا۔"
"دینے والے سوئے نہیں رہتے۔ جاؤ! جا کے دیکھو کون ہے۔" انہوں نے مجھے ڈانٹا۔
"اتنی گرمی ہے دادو! میں سو رہی۔"
"تو وہ گرمی میں نہیں تپا یہاں تک جو گیٹ پہ کھڑا ہے؟ جاؤ!" قطعی لہجہ۔ مجھے اٹھتے ہی بنی۔
گیٹ تک آتے آتے مجھے آنے والے شخص سے نفرت ہو چکی تھی۔ گیٹ کھولتے ہی عمران عرف بوبی المعروف بوبار نظر پڑی تو غصہ شدید تر ہو گیا۔
"کیا ہے؟"
"برف چاہیے جی۔" بڑا پراعتماد انداز اور ادھر ادھر لڑھکتی آنکھیں۔
"آج تو صبح سے لائٹ نہیں۔ برف جمی ہی نہیں۔ ہم نے تو خود برف والے سے برف لے کے فریزر میں رکھی ہے کولنگ کے لیے۔" میں نے سچ ہی بولنا مناسب سمجھا۔ اس نے پل بھر سوچا۔
"ہاں تو وہی دے دیں جو برف والے سے لی ہے۔"
میں بھک سے اڑی۔ "حد ہو گئی یعنی کہ۔۔۔"
پھر دادو کا "ہمسائے ماں جائے" والا قول یاد کرتے ہوئے میں نے دو بوتلیں ٹھنڈے پانی کی اسے لا کر دیں تو وہ ٹلا۔

☼ ☼ ☼

دادو کی طبیعت میں پہلے سے کافی بہتری آ گئی تھی، مگر لو تپانے والا مسئلہ ہنوز تھا۔

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening ,or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

www.Paksociety.com

"پتا نہیں کیا منہ ہلاتی رہتی ہیں پاس بیٹھ کے۔ میں تو ترس گئی ہوں ان کی آوازوں کو۔" وہ انہیں بٹ کو بتا رہی تھیں۔

اس نے جھاڑ پونچھ کے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر دادو کے پاس لا رکھا۔

"اس کا کیا فائدہ؟ سننے ہی کا تو مسئلہ ہے۔" دادو بیزار تھیں۔ خصوصاً ہماری باتیں نہ سننے اور ٹوک نہ سکنے کا غم انہیں کھائے جا رہا تھا۔

مگر میرو نے نعتیہ کیسٹ لگا کر تار کے ذریعے ایئر پیس ان کے کانوں میں ٹھونسے تو وہ خوش ہو گئیں۔

"یہ تو بڑی اچھی آواز آرہی ہے۔"

میرو نے ٹیپ آف کیا اور انہیں سمجھانے لگا۔

"سماعت کا مسئلہ نہیں ہے۔ ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ اور یہ ریکارڈنگ کا بٹن ہے ریڈ والا آگے نہیں دبانا۔"

"ہاں..... کبھی اتنی توجہ مجھے نہ دی۔"

میرے دل سے ہوک نکل گئی جسے میں نے حسب عادت سب کے سامنے بک بھی دیا۔

"اگر تم اس کی دادی ہوتیں تو وہ تمہیں بھی اتنی ہی توجہ دیتا۔" فائقہ نے مجھے زوردار جھانپڑ دکھایا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ابا کی طبیعت خراب ہے، جی! ریڑھی لے کے نہیں گئے۔ ذرا اپنے فریزر میں یہ سبزیاں رکھ لیں۔" شاہدہ عرف شیدا لی بی بنفس نفیس چلی آئیں۔

کسی کے بولنے سے پہلے ہی دادو نے ہمسائیوں کو ماں جایا تسلیم کرتے ہوئے سبزیوں کا ٹوکرا اٹھوا کر فریزر میں رکھوا دیا۔ ہم گہری سانس بھر کے رہ گئے۔

مگر کیا معلوم تھا کہ ایک ڈھول گلے میں ڈال رہے ہیں جسے نہ چاہتے ہوئے بھی بجانا پڑے گا۔

پہلے بولی صاحب تشریف لائے۔ دروازہ کھولنے کا شرف فائقہ کو حاصل ہوا۔

"کدو چاہئیں جی..." رعب دار انداز۔

"شرم نہیں آتی اس بھری دوپہر میں۔" وہ تلملائی۔

"کدو لینے کا کوئی وقت ہوتا ہے جی....؟" جواباً وہ معصومیت سے بولا پھر فائقہ کو یاد دلایا۔

"ہماری سبزی پڑی ہے آپ کے فریزر میں۔"

فائقہ پاؤں پٹختے ہوئے اندر آئی۔

تھوڑی دیر کے بعد بینگن اور شام کو کدو.... سب کی ناک میں دم آگیا۔

اور حد تو اس وقت ہوئی جب میرو کے آنے کا وقت ہوا۔ میں تو کتنے ہی دنوں سے اس بے لنے بیل سے ٹکرانے کا موقع ڈھونڈ رہی تھی۔ بیل بجتے ہی اڑتے ہوئے گیٹ تک پہنچی۔

ایک خوب صورت سی مسکراہٹ کے ساتھ میں نے گیٹ کھولا تو لمحہ بھر کو دماغ جھنجھنا گیا۔

شاہدہ صاحبہ بمعہ ترازو جھنی سی کھڑی تھیں۔

"دو جی ایک گاہک آگیا ہے۔ کلو بھنڈیاں لینا ہیں۔"

"یا خدا..." پردے میں چھپ کے ہمارا ٹاکرا دیکھنے والی "چڑیلوں" کے قہقہے پورے محلے نے سنے ہوں گے۔

"تم لوگ فریزر کیوں نہیں لے جاتے ریڑھی کی جگہ؟ وہیل لگے ہوئے ہیں اسے بھی۔" میں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

"اچھا جی... اور ریڑھی کا کیا ہوگا پھر...؟" اس نے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"وہ ہمیں دے جاؤ۔" میں نے جل کر کہا پاؤں پٹختے ہوئے واپس ہوئی تو شاہدہ صاحبہ ترازو پکڑے پیچھے پیچھے تھیں۔

دادو کے کمرے میں آزر مینہ ان کے بستر پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

"تمہیں کیا ہوا...؟"

میں بھنڈیوں سے فراغت پا کر ادھر ہی آئی تھی۔

میرا چہرہ دیکھ کر ہی دادو بہت کچھ سمجھ گئیں۔

"مجھ سے کچھ مت پوچھیں دادو! میرا موڈ خراب ہو گیا ہے۔" میں منہ پھلا کر دھپ سے ان کے پاس

بیٹھی۔

"ہائے توبہ! آج پھر دودھ خراب ہو گیا؟ کتنی بار کہا ہے کہ ٹائم پہ ابال دیا کرو۔"

انہیں غصہ آیا تھا۔ میں نے سر تھام لیا۔

☆ ☆ ☆

فائقہ کی منگنی ہو گئی "بٹ ہاؤس" کی ایک اور بے چاری اب "چارے والی" (میرا مطلب ہے کہ منگیتر والی) ہو گئی تھی اور میں نے سوچا کہ فائقہ کی منگنی ہو جانے کے بعد میرے مخالفین میں سے ایک بندہ کم ہو گیا ہے۔ ہائے ری قسمت۔

یہاں تو جناب کمپیٹیشن (مقابلہ) ہی شروع ہو گیا۔ وہ بھی باقاعدہ وہی خبیث فائقہ جو میرے منگنی شدہ ہونے پر فوت شدہ ہونے والی ہو گئی تھی۔ عمران عباس کا تحفتاً بھیجا موبائل فون دکھا دکھا کر دو روز تک دل جلاتی رہی۔ اوپر سے اس کی گفتگو۔

"عمو نے کہا ہے میسج کیا کریں گے۔"

اب میرا دل تو جلنے گا ہی۔ جس کے اتنے پرانے منگیتر نے آج تک کبھی سم بھی نہیں لا کے دی۔ (بلکہ وہ تو بیس روپے کا ایزی لوڈ ہی کروا دے تو معجزہ ہو جائے)

"ہماری تو میرج ہونے والی ہے۔ خود ہی سوچ لو! بندہ کتنا رومانٹک ہوگا۔ فکر مت کرو! تم سب کو بھی میسج پڑھایا کروں گی۔" وہ اتراتے ہوئے چلی گئی۔

پیچھے سب سے اونچی آواز رمینہ کی تھی۔

"فکر مت کرو! تمہارا ابھی نمبر لگنے والا ہے۔" میں نے جل کر کہا۔ پھر رمینہ کی ہنسی دیکھ کر اضافہ کیا۔

"میکینک کا۔"

"در فٹے منہ۔" وہ بدکی۔ پھر وہ بدو میرے مقابلے پر اتر آئی۔

"تاں! تو تمہارا کیوں دل جل رہا ہے؟ تم نے سوچا ہوگا "بٹ ہاؤس" کی باقی لڑکیوں کے ہاتھوں میں تو شادی کی لکیر ہے ہی نہیں۔"

وہ ٹھیک ٹھاک تجربہ دان تھی۔ میں سر کھجانے لگی۔

بہرحال!

اب فائقہ میرے مقابلے پہ آگئی تھی۔ تو سوچنا یہ تھا کہ میرو کو عمران عباس کے لیول تک کیسے لایا جائے؟

ماہین پر سعاکو پر چار پیسے لگائے۔ فائقہ سے راز داری کا وعدہ لیا۔ تب کہیں جا کے اس نے گھسی پٹی سی ٹپ دی۔

"جی جان سے اس کی خدمت کرو۔ دل تو کیا اس کے جگر گردوں اور پھیپھڑوں پر بھی قابض ہو جاؤ گی۔"

میں ہول کے رہ گئی یوں لگا جیسے پوسٹ مارٹم کے لیے کوئی مردہ سامنے ہی پڑا ہے۔

وہ بگڑ گئی۔ "چار پیسوں میں ایسا ہی نسخہ مل سکتا ہے۔"

میں خون کے گھونٹ پی کے رہ گئی۔

اب سوچنا صرف یہ تھا کہ یہ معجزہ ہوگا کیسے؟

☆ ☆ ☆

وہ آفس سے جلدی گھر آگیا تھا۔

میں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کی شاید طبیعت ٹھیک نہیں تھی (ورنہ وہ بھی مجھے آڑے ہاتھوں لیتا۔)

"پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔"

اس نے مختصراً بتایا تو تائی جان نے فوراً واہموں کی پٹاری کھولی۔

"کسی کی نظر لگ گئی ہے۔"

فوراً ڈنڈی والی لال مرچیں لا کر اس کی نظر اتاری اور جا کر انہیں چولہے پر جلا دیا۔

"ذرا بو تو آئی ہو مرچیں جلنے کی۔ بڑی سخت نظر لگی ہے میرے بچے کو۔" وہ زیر لب کچھ قرآنی آیات پڑھ کے اس پر پھونکنے لگیں۔

"میں کمرے میں جا رہا ہوں۔ تھوڑا آرام کروں گا۔" وہ اٹھ گیا۔

اس کے تھوڑی دیر بعد میں بھی اس کے پیچھے گئی۔

دروازہ کھٹکھٹا کر بڑے دھیان سے (اچھلے تجربات کی

www.paksociety.com

روشنی میں) اس کی "ہیں" سن کر میں کمرے میں داخل ہوئی تو وہ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔

"بہت زیادہ درد ہو رہا ہے؟" میں نے ہمدردی دکھائی۔

"یہ سوال تو باہر بھی پوچھا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

توبہ! اتنا صفاچٹ جواب۔

"تو میں کون سا ہوائی جہاز کا کرایہ خرچ کے آئی ہوں؟" میں نے بھی ادھار نہ رکھا۔ پٹاخ سے بولی۔ اس نے مجھے خفیف سا گھورا۔

(مجھے فکر ہوئی۔ اب تو مجھے ہر وقت ہلکے سے میک اپ میں رہنا ہو گا۔ وہ تو کبھی بھی گھورنا شروع کر دیتا تھا۔)

"دراصل میں پوچھنے آئی تھی میرو! کہ تم کیا کھاؤ گے۔۔۔ آج تو قیمہ کریلے پکے ہیں تمہارے فیورٹ۔" میں نے لہجے کو شیریں بناتے ہوئے کہا۔

"وہ تو میں قطعاً نہیں کھا سکتا آج۔ پیٹ میں درد ہے تو ذرا لائٹ سے فرق پڑے گا۔" وہ تکیہ ذرا سا نیچے کرتے ہوئے بستر پر دراز ہو گیا۔

میں نے ایک نظر روشن انرجی سیور پر ڈالی۔ پھر بڑی مستعدی سے پوچھا۔ "ٹیوب لائٹ بھی جلا دوں؟"

"کیا مطلب۔۔۔ کیوں؟" وہ حیران ہوا۔

"خود ہی تو کہہ رہے ہو، پیٹ میں درد ہے' لائٹ سے فرق پڑے گا۔ اسی لیے ٹیوب لائٹ جلانے کا پوچھا۔" میں نے وضاحت کی تو وہ دانتوں پہ دانت جما کے رہ گیا۔

"میرے پیٹ میں درد ہے' آنکھوں میں نہیں۔" وہ چڑ کر بولا۔

"میں لائٹ کھانے کی بات کر رہا ہوں۔ ٹیوب لائٹ کی نہیں۔"

"اوفوہ! تو کیا مجھے انگلش نہیں آتی؟ اب تم خود ہی آدھے ادھورے جملے۔۔۔" مجھے برا لگا تھا۔

"رومیا! شٹ اپ۔" وہ آنکھیں موندتے ہوئے گویا ہوا۔

"میرے پیٹ میں درد ہے' پہلے اس کے لیے کچھ ہلکا پھلکا سا لاؤ۔"

لو جی! اب ہلکے پھلکے کی تشریح بھی نہیں کی اور آنکھیں موند لیں۔ وضاحت طلب کرتی تو مزید بے عزتی ہوتی۔ سو اپنا دماغ لڑایا تو جو بات سامنے آئی وہ یہ تھی کہ بے چارے میرو کے پیٹ میں درد ہے اور وہ پیٹ پر کچھ ہلکا پھلکا باندھنا چاہتا ہے' شاید اسی سے کچھ فرق پڑ جائے۔ لاؤنج میں آ کر میں نے صوفے پر سے کشن اٹھالیا۔

"بے وقوف! یہ کہاں سے ہلکا پھلکا ہے؟" فائقہ نے مجھے ٹوکا۔

"روئی لے جاؤ۔" تابین نے مشورہ دیا تو میں کھل اٹھی۔ واقعی روئی سے ہلکا پھلکا تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

میں نے کاٹن (روئی) کا پورا پیکٹ اٹھالیا اور اس کے کمرے میں چلی آئی۔

مجھے دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔

"کچھ لائی نہیں ہو۔۔۔؟" وہ قدرے حیران ہوا۔ میں نے تفاخر سے اس کے سامنے شاپر لہرایا۔ "لائی ہوں نا۔ ہلکا پھلکا۔"

"یہ کیا ہے؟" وہ جانے کیوں متحیر ہوا تھا۔

"کاٹن (روئی) تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ کچھ ہلکا پھلکا لاؤں۔ اس سے ہلکا اور کچھ نہیں ہوتا۔ تم اسے پیٹ پہ باندھ لو گے کیا؟" میں نے تفکر سے پوچھا تو وہ سر دونوں ہاتھوں میں تھام کے بیٹھ گیا۔

"سر میں بھی درد ہے۔۔۔ اس کے لیے کیا لاؤں؟" میں نے دل سے اُمڈتی ہمدردی سے پوچھا تو وہ سر اٹھا کر دھاڑا۔

"ہتھوڑا۔"

"کون سا' چھوٹا یا بڑا۔۔۔؟" میں نے غور نہیں کیا تھا۔

"گیٹ آؤٹ۔۔۔" وہ اتنے زور سے بولا کہ میں آدھے سیکنڈ میں وہاں سے غائب ہو گئی۔

سب کو قصہ سنا کر میں نے خوب خوب ہمدردی بٹوری۔

"کوئی اور منگیتر ہوتا تو پاؤں دھو دھو پیتا۔ کتنا خیال رکھنے والی منگیتر ملی ہے' مگر ادھر تو اسے اپنے ہی نخروں سے فرصت نہیں۔"

"گدھی! بھائی نے کھانے کے لیے کچھ ہلکا پھلکا مانگا تھا۔ پیٹ پہ باندھنے کے لیے نہیں۔"

زرمینہ نے دانت کچکچاتے ہوئے آ کر بھانڈا پھوڑا تو میں سب کے قہقہوں پر کھول کے رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"میرو کا میسج آیا ہے۔"

فائقہ نے گویا پورے محلے کو خبر دی۔ ہم پانچوں ہی صوفے پہ اس کے اوپر لد گئیں۔

"کم بخت ماریو! میسج پڑھنے سے پہلے ہی مجھے فوت شدہ کر دو گی۔" فائقہ نے بمشکل کہا۔ تو سب شرافت کے جامے میں آ گئیں۔

"سنو! اس دنیا میں ایک ایسا بھی دل ہے۔ جو صرف آپ کے لیے دھڑکتا ہے۔"

زرمینہ نے باآواز بلند پڑھا تو جہاں ہم سب نے اس قدر رومانوی "میسج" دیکھ کر دل پر ہاتھ رکھا' وہیں فائقہ کا دمکتا چہرہ دیکھنے لائق تھا۔ آگے اسکرین خالی تھی مگر میسج ابھی باقی تھا۔

"یہ ہوتے ہیں منگیتر۔۔۔ یوں سمجھو! "بٹ ہاؤس" میں صرف میری ہی منگنی ہوئی ہے۔ باقی سب خانہ پری۔" وہ میسج آگے کرتے ہوئے یقیناً مجھ پہ یہ طنزیہ "ڈورون یا نازی" کر رہی تھی۔

میں نے آہ بھری۔ بے شک۔۔۔ از میرٹ اتنا ہوئے تم اس لائق کہ دنیا کے منگیتر تم پر فخر کرتے اور لڑکیاں تم سے منگنی کرنے کو ترستیں۔"

"آگے تو پڑھنے دو یار۔۔۔" تابین کو کھدبد لگی تھی۔

"جو صرف آپ کے لیے دھڑکتا ہے۔ اور وہ ہے۔ وہ ہے۔

آپ کا اپنا دل۔"

"ہو جی۔۔۔!" پہلے سب حیران ہوئیں اور فائقہ ششدر۔ اس کا دل تھا' غبارہ نہیں۔ ورنہ "ٹھس" کی آواز تو ضرور ہی آتی۔

سب سے اونچا قہقہہ میرا تھا۔

"دیکھا۔ یہ ہوتے ہیں منگیتر۔"

"نہ۔۔۔۔ وہ شاید۔۔۔ کچھ غلط میسج آگیا ہے۔" فائقہ بے چاری کے غبارے میں سے ہوا نکل گئی تھی۔ غور سے دوبارہ پڑھنے لگی۔

"ہاں ہاں! غور سے پڑھ لو۔ میرے خیال میں کسی دل کے ڈاکٹر نے اپنی نئی تحقیق ارسال کی ہے۔ تمہیں۔" میں نے پاچھیں پھیلائیں تو وہ خفا ہو کے اٹھ گئی۔

"دفع دور! تم لوگ تو اس قابل ہی نہیں ہو کہ تمہیں اچھے اچھے میسج پڑھائے جائیں۔"

اس کے واک آؤٹ کرنے کے بعد میں اطمینان کی سانس بھرتے ہوئے صوفے پہ لمبی لیٹ گئی۔

"یا اللہ! تیرا شکر ہے۔ تو نے اس تنک چڑھی کو نیم چڑھی نہیں بنایا۔ تیرا شکر کہ تو نے اسے کچھ کچھ میرو جیسا منگیتر عطا کیا۔" میں نے باآواز بلند کہا تو زرمینہ کا پھینکا ہوا کشن میرے منہ پہ آ کے لگا۔

"نابنجار! میرے بھائی میں کیا کمی ہے بھلا؟" کبھی کبھی اس کا "جذبہ بہن" جاگ اٹھتا تھا۔

"نہ۔۔۔ کوئی کمی نہیں۔ غصہ' اکڑ پن' بدلحاظی' بداخلاقی' بدتمیزی' بدتمیزی۔۔۔"

"یہ کون سا پہاڑہ پڑھ رہی ہو۔۔۔؟"

میرو کی آواز تھی یا بم کا گولہ۔ جو میرے سر پہ آ کے پھٹا۔ میں جو انگلیوں پہ "بد" کے لاحقے والی ساری بد عادات اس میں ٹھونسنے والی تھی' بد بدا کے رہ گئی۔ بدک کے اٹھی۔

"وہ۔۔۔ رمضان شریف آنے والا ہے تو میں ان سب کو سمجھا رہی تھی کہ ہمیں اپنی بدتمیزی' بدتمیزی' بدلحاظی اور بداخلاقی کو پس پشت ڈال کر اپنے بہترین مسلمان ہونے کا ثبوت دینا چاہیے۔"

اس نے لمحہ بھر مجھے گھورا۔ (کہیں ہماری باتیں سن

www.paksociety.com

نہ پڑ گیا ہو)

"وری گڈ! تو پھر اپنی ساری بد عادات کو ذرا اپنی پشت پہ اٹھاؤ اور کچن میں جا کر چار کپ چائے اور کچھ اسنیکس تیار کرو۔ ذرا تمہاری مسلمانیت بھی کھل کے سامنے آئے۔"

وہ اطمینان سے بولا تو ان جیبوں کی دبی دبی ہنسی سے اپنا دل جلاتے ہوئے میں کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"پتا نہیں خدا کن نیکیوں کو ناخن ۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ کن لڑکیوں کو اچھے منگیتر دیتا ہے؟"

میرا دل دکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آئی لو یو۔

آئی وانٹ یو۔

آئی لائک یو۔

آئی مس یو۔"

"ہائے ۔۔۔" میں تو ہارٹ اٹیک کی تیاری میں تھی۔

"آگے پڑھو یار۔" کور آگے لکھا تھا۔

"یہ سب فعل حال جاری کی مثالیں ہیں۔"

سب مسیج پڑھ کے ملامتی بلکہ ہمدردانہ نظروں سے فائقہ کو دیکھ رہی تھیں۔

عمران عباس کے مسیج کی پہلی رومانٹک لائن پڑھ کے ہی جو اندھوں کی طرح دھاگتے ہوئے ہم پر رعب جمانے آئی تھی۔

"لعنت ہے یار ۔۔۔"

وہ اب رہا ہوا کا غبارہ تھی۔

"اللہ! تیرا شکر ہے۔ تو نے میری لاج رکھی ورنہ یہ لڑکی تو میرا دل جلا ڈالنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتی۔" میں نے فوراً دونوں ہاتھ اٹھا کر رب کا شکر ادا کیا۔

"تمہاری ہی بد دعائیں لگی ہیں مجھے۔" وہ مجھ پہ غرائی۔

"میں کہاں کی پہنچی ہوئی ہوں۔ یہ تمہاری کرنیاں ہی آگے آئی ہیں۔ یاد ہے نا کیسے رومانٹک شعر عید پہ لکھے تھے تم لوگوں نے میبو کے کارڈ میں؟" میں نے بھی جتک کر کہا تو زرمینہ ہنسی۔

"پھر عید آ رہی ہے۔ میری خدمات حاضر ہیں۔"

"دور فٹے منہ ۔۔۔" میں نے اسے ہاتھ دکھایا اور مصمم ارادے کا اظہار بھی کیا۔

"اس بار میں اپنے ہاتھوں سے اڈمیرٹ کو کارڈ لکھوں گی۔ دیکھنا! کیسے متاثر ہوتا ہے وہ۔"

"کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔" ناہین پڑھا کو کتاب کا صفحہ الٹتے ہوئے بڑبڑائی۔

وہ تو میں نے پڑی دیکھی ہوئی نہیں تھی ورنہ اسے مزا چکھاتی۔ سو میں نے اسے نظر انداز کرنا ہی مناسب سمجھا۔

"املا کی غلطیاں نکال کے واپس نہ تھمایا اس نے کارڈ تو میرا نام بدل دینا۔" زرمینہ نے منہ پہ ہاتھ پھیرا۔

"پھا پھا کٹنی رکھوں گی تمہارا نام۔" میں نے دانت پیسے۔

فائقہ بھی اپنے مستقبل سے کافی مایوس دکھائی دے رہی تھی۔

"ناحق اس منگنی کے بکھیڑے میں پڑی۔ ذلیل ماریوں نے رومانٹک دولہا کے خواب دکھا دکھا کر مجھ سے ہمایوں سعید کے خواب بھی چھین لیے۔"

"خود ہی تو "عمو جان" کے پیچھے مری جا رہی تھیں۔ اب بھگتو!" زرمینہ نے طنز کیا تو میں اچھلی۔

"ہائیں! یہ کب کا واقعہ ہے؟ کب کی اس نے یہ ذلیل حرکت؟"

"کون سی حرکت ۔۔۔؟" میرے بھڑکنے پر زرمینہ گڑبڑائی۔

"یہی عمران کے پیچھے مری جانے والی۔ پچھلی گرمیوں کی بات ہو گی تب ہی اسے شوق ہو رہا تھا ناردرن ایریاز جانے کا۔ مری جانے کا بھی پروگرام تب ہی بنا ہو گا۔"

"یا اللہ!" فائقہ نے سر تھاما۔

"اب شرمندہ ہونے سے کیا فائدہ؟ جب بھاگنے کے منصوبے بنا رہی تھیں تب کیوں نہیں سوچا؟" میرے اندر تو دادو کی جاہ و جلال والی روح گھس گئی تھی۔

"اری او غیرت کی پوٹلی ۔۔۔ مری اسلام آباد نہیں جا رہی تھی۔ عمران کے پیچھے مر رہی تھی۔" زرمینہ نے ہاتھ جوڑتے ہوئے زور سے کہا۔ تو میں کھسیانی ہو گئی۔

"تو یوں کہو نا۔" پھر مدبرانہ انداز میں فائقہ کو مشورہ دیا۔

"اور بھلا پیچھے کیوں مرنا! اس کے سامنے مرو تاکہ اسے کچھ خبر بھی ہو۔"

فائقہ نے جواباً "اپنے لمبے ناخن دکھائے تو مجھے دبکنا پڑا۔

☼ ☼ ☼

ہم سب شام کو لان میں بیٹھے تھے۔

"گرمی پھر آ رہی ہے یار! اور میرا تو گرمیوں میں کام کرنے کو بالکل بھی دل نہیں کرتا۔" فائقہ اکتا کر بولی۔

"تو سردیوں میں تم کون سا اپنے ہنر دکھا کے گولڈ میڈلز اکٹھے کرتی ہو؟" ڈائجسٹ میں سر دیے بیٹھی زرمینہ نے طنز کیا۔ اسی وقت گلی میں آئسکریم والے نے میوزک بجانا شروع کر دیا۔

"ہائے! آئس کریم ۔۔۔" میرے منہ میں پانی بھر آیا۔

"گلی میں سے لو گی؟ میبو نے دیکھ لیا تو تمہارا اگلا دیا دے گا۔" زرمینہ نے ڈرایا۔

"ابھی تو چائے پی کے بیٹھی ہو بدیدی!" فائقہ نے بھی مجھے گھورا، مگر میں بھاگ کے اندر سے پیسے لے آئی۔

"کون کون کھائے گا؟"

"تم ہی کھاؤ! کون بھی اور آئس کریم بھی۔ ہم نے تو ابھی چائے پی ہے۔" ان سب نے انکار کر دیا۔ چائے تو میں نے بھی پی تھی مگر یہ کمبخت آئس کریم ۔۔۔ کنٹرول کہیں ہوتا خود پر۔

میں نے گیٹ وا کر کے جھانکا۔

"تم خود مت جانا۔ بھائی کو بتاؤں گی۔" زرمینہ اندر سے چیخ اٹھی۔

سامنے بولی صاحب آنکھیں گھماتے بچوں پر رعب جماتے ہوئے دکھائی دیے تو اسے بلایا۔

"کیا ہے جی؟ مجھے اشارے کر رہی تھیں؟"

گرا تھرو دیکھیں ذرا۔ جی چاہا گھما کے جھانپڑ لگاؤں، مگر فی الحال تو مسکہ لگانے کا کام تھا۔

"ایک چاک بار منگوانی تھی۔"

"اچھا۔" اس کی باچھیں کھلیں۔

"ایسا کرو! میرے لیے تو صرف چاک بار ہی لانا اور ایک آئس کریم تم بھی لے لینا۔"

میں نے اسے پیسے تھمائے اور اندر آ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ چاک بار کا ریپر اتارتے ہوئے اندر آیا۔ ہم سب اسے دیکھنے لگے۔

"میری آئس کریم ۔۔۔؟" میں نے اسے گھورا۔

اس نے دانت نکالتے ہوئے بقیہ رقم میرے ہاتھ میں تھمائی۔

"چاک بار ایک ہی تھی اس کے پاس جی۔"

اطمینان سے کہہ کر بولی صاحب بڑے اسٹائل سے چاک بار کھاتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گئے اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان سب میں سے کس کے بال نوچوں۔ سب ہی کھینسیں نس رہی تھیں۔ ہمارے ہمسائے تو واقعی "ہم سائے" بن گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

دادو کے سر کی مالش کرتے ہوئے میں سخت غصے کا شکار تھی۔

فائقہ، مینا اور ماہین بھی موجود تھیں۔ نوین اور زرین کے امتحانات ہو رہے تھے، اس لیے وہ موجود نہ تھیں۔

"ایک تو دادو نے ہمسایوں سے ہمدردی کر کے ہماری جان مشکل میں ڈال دی ہے۔ مرنے کے بعد

www.paksociety.com

جنت ملے نہ ملے یہ وقت سے پہلے ہمیں جنت رسید کروا دیں گے۔"

"اور نہیں تو کیا۔ اتنی مشکل سے ان کی سیریاں نکلوائی ہیں میں نے فریزر میں سے۔" فائقہ نے جھرجھری لی۔

"چھوڑو ان لوگوں کو تم سناؤ۔ عمران کا کوئی نیا میسج نہیں آیا؟" زرمینہ کو کھدبد لگی تھی۔

"آیا بھی ہو تو اب یہ لیک آؤٹ نہیں کرنے والی۔" میں نے ہنسی روکنے کا تکلف کیے بغیر کہا اور دادو کے سر کی مالش ختم کرتے ہوئے تیل کی شیشی بند کرنے لگی۔

"تم تو بس جلو اور جلتی رہو۔ مل گیا نا تمہیں سڑا بھسا ازمیر بٹ؟ ساری عمر اس کی گھوریاں اور گھرکیاں سنتے سنتے مر جانا۔" فائقہ نے مجھے کوسنے دیے۔

"ششش..." زرمینہ نے ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے دادو کی طرف اشارہ کیا۔ جو اب تکیے سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھیں۔

"ادھر مطلع صاف ہے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔

"ابھی تک اونچا سن رہی ہیں بیچاری دادو۔ دیکھو! ٹیپ میں کیسٹ چل رہی ہے مگر آواز نہیں آ رہی۔ لیکن انہیں پتا ہی نہیں۔"

"اور تم..." میں بازو چڑھاتے ہوئے فائقہ کی طرف پلٹی۔

"تمہیں کون سا ازمیر بٹ سے اچھا مل گیا؟ مجھے تو چلو دادو نے پھنسا دیا مگر تمہارا تو نین مٹکا تھا۔ لب بھگتو! میسج فارورڈ کرنے والے کو۔ کبھی جو خود سے کوئی میسج بھیجا ہو۔"

"فٹے منہ..." فائقہ کا تو دل جل کے رہ گیا۔ مگر میری تسلی ہو گئی۔

"کمینیو! تم دونوں مسلسل میرے بھائی کو کوس رہی ہو۔" زرمینہ کو خیال آ ہی گیا تھا۔

"تو اور کیا کروں؟ میرے تو سارے گرما گرم جذبات پر تمہارے بھائی نے بے اعتنائی کا ٹھنڈا پانی ڈال دیا

ہے۔ ہائے! ساعتیں ترس کے رہ گئی ہیں کوئی رومانٹک ڈائیلاگ سننے کو۔ پتا نہیں کس فراڈ کی بے حرمتی کروں میں نے۔"

میں نے دوپٹے سے ناک پونچھی اور جواباً" زرمینہ کا زوردار جھانپڑ کھایا کہ وہ دوپٹا اس کا تھا۔

"جیسی حرکتیں تم نے کی ہیں، وہ دل میں اترنے والی نہیں، دل ساڑ کے سواہ (جلا کے راکھ) کرنے والی ہیں۔ خواتین، شعاع پڑھ کے بھی ہیرو کے دل میں اترنا نہ آیا تجھے روکا کل، اُف ہے تجھ پر۔" زرمینہ جلی بیٹھی تھی۔

"نائنٹی پرسنٹ ان ڈائجسٹوں کے ہیرو ازمیر جیسے اکھڑ اور بے دل نہیں ہوتے۔" میں نے ناراضی دکھائی۔

"پتا ہی کر لو یار! اکسپ اور انڈرسٹینڈ نہ ہو میرو۔" فائقہ کو ابدھے کی طرح کافی دور کی سوجھی تھی۔

"واقعی روی! ان لڑکوں کی منگیتریں عام سی شکل و صورت والی ہوتی ہیں۔ وہ عموماً" کسی اور سے افیئر چلا لیتے ہیں۔" ماہین نے متفکرانہ تجزیہ کیا اور مجھ سے زوردار دھمو کا کھایا۔

"یہ عام سی شکل و صورت والی کسے کہا ہے تم نے؟" میں غرائی۔

"ویسے روی! تمہیں بھائی پہ چیک لازمی رکھنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے۔ وہ کبھی باہر سے رات گئے لوٹیں تو شرٹ پہ کوئی بال یا لپ اسٹک کا نشان..."

اب زرمینہ نے تو چاہے شرارت کی ہو مگر میرے دل میں تو اس کی باتیں کھب سی گئیں۔

☆ ☆ ☆

رات سب سونے چلی گئیں مگر میں ٹاک شو میں چند چھپیسے سیاست دانوں پر نظریں جمائے انتہائی دلچسپی اور انہماک ظاہر کرتے ہوئے بیٹھی رہی۔ وجہ؟

جی بالکل! ازمیر بٹ کا انتظار۔

تینوں لڑکے گھر آ چکے تھے۔ ازمیر کے بارے میں پتا

چلا کہ وہ اپنے کسی دوست کی عیادت کے لیے اسپتال گیا ہوا ہے اور تھوڑا لیٹ آئے گا۔ مجھے لفظ دوست میں سے "گرل فرینڈ" کی بو آئی۔

اب میں ازمیر کی شرٹ پر سے بال اور لپ اسٹک کا داغ دیکھنے کو بیٹھی تھی۔

آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ سیاست دانوں کی مکارانہ شکلیں دیکھ دیکھ کر دل اوب گیا۔ تب کہیں جا کے ڈور بیل بجی۔ میں نے گیٹ کی طرف دوڑ لگائی۔ دوسری بار بیل کرنے پر کوئی اور دروازہ کھولنے آ سکتا تھا۔ "لیتھ جنا" میں نے گیٹ کھولا تو میری سانس پھول رہی تھی۔ وہ موٹر سائیکل پر تھا۔ اندر آیا۔ میں گیٹ بند کر کے پلٹی۔

"تم کیا میراتھن جیت کے آ رہی ہو...؟" اس کا اشارہ میری پھولی ہوئی سانس کی طرف تھا۔

"نہیں... ایسے ہی۔ دوڑ کے آئی ہوں نا اس لیے" میں سٹپٹائی۔

"آرام سے آ کے بھی گیٹ کھولا جا سکتا تھا۔ میں کون سا واپس چلا جاتا۔"

وہ اندر کی طرف بڑھا۔ تو میری زبان پھسلی۔

"میں نے سوچا کوئی اور نہ آ جائے گیٹ کھولنے۔"

وہ رکا۔ میری دھڑکن بھی رک سی گئی۔ سیاہ زیرک نظریں میرے چہرے پر تھیں۔

میں نے تھوک نگلا۔

"وہ... میرا مطلب ہے کہ سب سو رہے ہیں۔ تم بار بار بیل کرتے تو سب ڈسٹرب ہوتے۔ میں تو جاگ ہی رہی تھی نا۔"

"تم کیوں جاگ رہی تھیں؟"

"تمہارے لیے..." دوسری سٹپ

مگر ساتھ ہی میری زبان چل پڑی۔

"مطلب یہ کہ سوچا" تمہیں بھوک نہ لگی ہو، کھانا گرم کر دوں گی۔"

وہ مجھے ہلکا سا گھور کے اندر داخل ہو گیا۔ میں کوریڈور کے دروازے کی چٹخنی لگا کر گہری سانس بھرتے ہوئے اس کے پیچھے لاؤنج میں آئی۔ وہ صوفے

پر بیٹھا۔ ٹیک لگائے، ٹانگیں پھیلائے، آنکھیں موندے بالکل پرسکون حالت میں۔

میرا دل بلیوں اچھلا۔ موقع اچھا تھا بال اور لپ اسٹک کا داغ چیک کرنے کا۔

میں دبے قدموں آگے بڑھی اور صوفے کے پیچھے کھڑی ہو کر بغور اس کی شرٹ کو دیکھا مگر کوئی نسوانی بال یا لپ اسٹک کا داغ نظر نہیں آیا۔ اس نے ایک دم سے آنکھیں کھول دیں۔

"تم کیا وظیفے کر رہی ہو کھڑی ہو کے؟"

"وہ... میں... بال دیکھ رہی تھی۔" اب اور کیا کہتی۔ میں تو ڈوب مرنے کو تھی۔ وہ حیران سا اٹھ کھڑا ہوا۔

"بال...؟"

"ہاں... وہ... بال تمہارے بال۔ کس قدر چمکیلے اور خوب صورت ہیں۔ میرے بال روکھے ہو رہے ہیں۔ سوچا" تم سے پوچھوں کون سا شیمپو استعمال کرتے ہو۔"

میری زبان فراٹے سے چلی اور رکی تب جب ازمیر بٹ کو خود سے فقط دو قدم کے فاصلے پر پایا۔

"خیر! روکھے تو نہیں۔ بہت شائن ہے تمہارے بالوں میں اور اگر تھوڑے سے لمبے ہو جائیں تو زیادہ خوب صورت لگیں۔"

اتنا نرم لہجہ۔ وہ یقیناً "میرے بالوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ "یا اللہ... اگر یہ سامنے کھڑا نہ ہوتا تو اپنی انگلی کو کاٹ کر دیکھ لیتی۔ کہیں خواب تو نہیں۔" میں حیران تھی۔

"کاش! فائقہ یا زرمینہ کی آنکھ ہی کھل جائے اور وہ بھی "بٹ ہاؤس" کا یہ تاریخی رومانٹک سین دیکھ لیں۔" میرے دل سے دعا نکلی۔

"روی... ! یہاں کیوں بت بن کے کھڑی ہو؟"

یہ آواز تو فائقہ کی تھی۔ تو کیا واقعی وہ جاگ گئی تھی۔ میں نے گڑبڑا کر اسے دیکھا۔ پھر ادھر ادھر گھوم کر دیکھا مگر میرو غائب تھا۔

www.Paksociety.com

"وہ کدھر گیا؟"
"وہ کون ...؟" فائقہ نے مشکوک انداز میں مجھے دیکھا۔
"ابھی یہاں میو کھڑا تھا۔ ہم دونوں رومانٹک گفتگو کر رہے تھے۔" میں نے احتجاج کیا۔
"نیند میں ہو شاید۔ میو اور رومانس؟ مطلب متضاد الفاظ۔" وہ اطمینان سے بولی تو مجھے بھی شک ہونے لگا۔
"وہ گیا کہاں؟"
کیا میں تنہا ہی میں خواب دیکھ رہی تھی؟
گہری سانس بھرتے ہوئے میں فائقہ کے ساتھ چل دی، مگر دل والی جگہ کچھ خالی خالی سی محسوس ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

دادو بے چاری پورا ہفتہ مزید اونچا سنتی رہیں، بلکہ سنتی کچھ اور سمجھتی کچھ رہیں۔ بنا آواز کے ان کا ٹیپ ریکارڈر آن رہتا۔ وہ بے چاری سمجھتیں کچھ نہ کچھ لگا ہی ہوا ہے۔ البتہ ہمیں وہاں بیٹھ کے لڑنے اور اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کا موقع خوب ملا ہوا تھا جو عام حالات میں دادو کے اتنے قریب بیٹھ کر ممکن نہ تھا۔
دادو نے خدمت خلق کا عظیم مظاہرہ اس صورت کیا کہ بوبی صاحب کو انگلش پڑھانے کی ذمہ داری اپنی فرفر انگریزی بولنے والی پوتی فائقہ کے ذمے لگا دی۔
اور اب بوبی میاں دادو کے کمرے میں موجود تھے۔ میں تو اس دن والے چاک پار کا قصہ ہی نہ بھولی تھی۔ اب فائقہ بھی اسے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
"کچھ آتا بھی ہے کہ ایسے ہی منہ اٹھا کے آ گئے ہو؟" فائقہ نے استانیوں والا رعب دکھایا۔ وہی دادو کے اونچا سننے کا فائدہ۔
"کتاب بھی اٹھا کے لایا ہوں جی۔" بوبی صاحب ڈیلوں کو ادھر ادھر گھماتے ہوئے پر اعتماد تھے۔ پھر کتاب کھول کر فرفر پڑھنے لگے۔
"یہ دیکھیں جی! دس ازاے سائی بک۔
دس ازاے حاجی بلڈنگ۔
دس ازاے میچ (بھینس)"
"یہ کیا ہے۔ یہ سب کدھر لکھا ہے؟"
فائقہ ششدر رہ۔ ہم بوبی صاحب کی انگلش دانی پر پریشان۔
"یہ دیکھیں جی!" اس نے فاتحانہ انداز میں کتاب تھمائی۔
"دس ازاے نوٹ بک
دس ازاے ہیوج بلڈنگ
دس ازاے مگ..."
فائقہ نے اونچی آواز میں پڑھا۔ پھر دانت پیس کر بوبی سے کہا۔
"تم فیل ہو مکمل..."
"نہیں جی! میں بھی سوچ رہا تھا کہ میچ (بھینس) لکھا ہوا ہے تو تصویر کیوں مگ کی دی ہوئی ہے۔" وہ تفکر سے بولا۔ جتنی وہ شک کا فائدہ چاہ رہا تھا۔
دادو نے تاکید کی۔ "ٹھیک پڑھائی کرانا اسے۔ بڑے دل سے آیا ہے پڑھنے۔"
فائقہ نے آہ بھری۔ "کاش! پورے دماغ سے آیا ہوتا۔"
مگر اب دادو نے کہہ دیا تھا تو فائقہ بی بی ہی بوبی کی استانی ٹھہریں۔
"تم کوئی کام کیوں نہیں سیکھ لیتے؟" فائقہ نے دبی آواز میں مشورہ دیا تو وہ بے نیازی سے بولا۔
"ابے نے درزیوں والے کام پر ڈالا تھا جی۔ پر درزی صاحب کہنے لگے کہ لوگوں نے ڈگ زیگ سلائیاں نہیں لگوانیں۔ پھر میں گھر آ گیا۔"
اس کی متحرک آنکھیں دیکھ کر اور اس کی بات سن کر ہماری ہنسی نکل گئی اور بوبی صاحب اس ہنسی کو اپنی ٹیوشن سمجھ بیٹھے۔
حسب معمول ہم تینوں دادو کے کمرے میں تھیں، بنا آواز کے ٹیپ ریکارڈر کی چرخیاں گھوم رہی تھیں۔ دادو میو کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں۔
"اف ... رات کیا سین ہوا لاؤنج میں۔" میں نے آہ بھری۔
"میں نے بھی چوہا دیکھا تھا وہاں۔ کوئی پنجرہ رکھو رات وہاں۔" مینا کو یاد آیا۔
"رومانٹک سین تھا رومانٹک۔" میں نے اسے دانت پیستے ہوئے گھورا۔
"میو بھیا بھی ساتھ تھے؟" وہ حیران ہوئی۔
"خبیث لڑکی پوری بات تو سن لو۔ میں اور میو تھے لاؤنج میں تنہا۔"
میرا لہجہ آخر میں خواب ناک ہو گیا۔
"چل نی ..." دونوں کو یقین نہ آیا۔
"رات میں لاؤنج میں گئی تب بھی اکیلی کھڑی الٹی سیدھی ہی بہکی بہکی باتیں کر رہی تھی۔" فائقہ کو یاد آیا۔
"خود ہی تو کہا تھا کہ میو کی شرٹ پر کسی لڑکی کے بال اور لپ اسٹک کے نشان دیکھنا۔ وہی دیکھنے کو رات وہاں گئی تھی میں ... ہائے۔" میں شرمائی۔
"یا اللہ! کس قدر بے حیا لڑکی ہے۔ کیسے دیدہ دلیری سے رومانس کے قصے سنا رہی ہے۔" فائقہ نے انگلی دانتوں تلے دبائی۔
"آگے کیا ہوا ...؟" زرمینہ بے تاب ہوئی۔ میں نے اسے گھورا۔
"ابھی پیچھے کا میں نے کب بتایا ہے؟"
"تب تک بھی چکو۔"
"وہ آگے آیا۔ میرے قریب ہوا اور بولا۔" میں نے ڈرامائی انداز میں کہنا شروع کیا تو فائقہ نے لقمہ دیا۔
"تم اچھا سا ٹوتھ پیسٹ کیوں استعمال نہیں کرتیں؟"
"یہ عمران عباس نے تمہارے خواب میں آ کر کہا ہوگا۔" میں جل بھن کے بولی۔ وہ دانت دکھانے لگی۔
"اب بتا بھی دو یار۔" زرمینہ بیزار ہونے لگی۔
مگر اسی وقت دادو اور میو لوٹ آئے تو ہمیں بھی اپنے جامے میں آنا پڑا۔
"اللہ کا شکر ہے۔ اب تو سب ٹھیک سنائی دے رہا ہے۔" دادو خوش تھیں۔
"مبارک ہو دادو جان!"
ہم تینوں نے یک زبان ہو کر کہا۔
"خیر مبارک! میں تو ترس کے رہ گئی تھی اپنی پوتیوں کی آواز سننے کو۔"
وہ ٹیپ ریکارڈر چیک کرنے لگیں۔
"اسے ایسے ہی چلا رکھا ہے؟ آواز تو آ نہیں رہی۔" میو نے ہنس کر کہا تو دادو مزے سے بولیں۔
"میری بچیاں روز آ کے میرے پاس بیٹھتی تھیں۔ مجھ سے باتیں کرتی تھیں۔ میں نے سوچا ان کی باتیں روز ریکارڈ کر لیا کروں۔ جب کان ٹھیک ہوں گے پھر ان کی یہ میٹھی میٹھی باتیں سنوں گی۔ آؤ میو! تم بھی بیٹھو۔"
یہ دادو کی محبت تھی یا چالاکی ... ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔
مگر کانوں میں سائیں سائیں کی آواز کیسے آتی ہے، ہمیں تب پتا چلا اور پھر کراہی کیم جمید تیز بھاگی ہو گی، جتنی تیزی سے ہم تینوں وہاں سے بھاگیں۔
اب دادو اور میو نے پتا نہیں، ہماری لن ترانیاں سنیں یا نہیں۔ فی الحال تو میں میو کو منہ دکھانے لائق نہیں رہی۔
قارئین! خدا کسی کی دادی کو اونچا نہ سنوائے اور اگر سنوائے تو پلیز! انہیں کوئی بھی ٹیپ ریکارڈر نہ دلوائے۔

www.Paksociety.com

رمشا خالد خان

خواہشوں کی مسافت

ناولٹ

رات بہت گہری تھی 'ہلال' سورج غروب ہوتے ہی لحظہ بھر کو اپنی جھلک دکھا کر کیل کی اتھاہ گہرائیوں میں کہیں کھو گیا تھا۔ ستاروں کے غبار کے پاس چمکتے تاروں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے آسمان کے طاقچوں میں دیے ٹمٹمار ہے ہوں' پروائی بھی یوں ساکت تھی جیسے رات کی سانس حلق میں اٹکی ہو۔ اس بیرک نما لمبے کمرے میں بہت سی آنکھیں تھیں' جو لو دیتے روشن دان میں سے جھلکتی رات سے ڈر کشید کر کے دل کے کٹورے میں بھرتے ہوئے نیند کا انتظار کر رہی تھیں' ایسے میں چند نیند کی رسیا ایسی بھی تھیں' جو نئی جگہ' نئے ماحول اور گھر سے دوری کے غم کو کونے کھدروں میں ڈال کر اوہام کا سارا اصطبل بیچ کر بہت اطمینان سے سو رہی تھیں۔

یہ انٹر سائنس گرلز کالج کے ہاسٹل میں فرسٹ ایر کے نئے سیشن میں آنے والی لڑکیوں کی پہلی رات تھی۔

ایک بجے جب پورا ہاسٹل اچھی طرح اندھیرے اور سناٹے میں ڈوب چکا تو ہاسٹل کی طویل راہ داری میں موم بتی کی زرد روشنی نے آس پاس کے اندھیرے کو نگلا' کینڈل کی دھیمی ٹک ٹک نے سناٹے کو لات ماری' ایک ہیولہ فرسٹ ایر کے کمرے کے باہر جا کر رک گیا اور دروازے پہ ہلکی سی دستک دی۔ اندر جاگتی لڑکیوں میں بے چینی پھیل گئی۔ دوسری اور پھر تیسری دستک پر وہ سب اپنی اپنی جگہ پر اٹھ بیٹھیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دروازہ کھولنے کے اشارے کرنے لگیں۔

دستک کچھ اتنی پراسرار تھی کہ ڈر کے مارے سوتی لڑکیوں کو بھی ٹہوکے مار کر جگا دیا' اب ساری کی ساری باجماعت سہمی نظروں سے دروازے کو یوں دیکھ رہی تھیں' جیسے اس کے خود بخود کھل جانے کی منتظر تھیں۔

"ہو سکتا ہے وارڈن ہو۔" اپنے گھونسلہ نما گھنگھریالے بالوں کو ایک ہاتھ سے کھجاتے اور دوسرے سے آنکھیں ملتے ہوئے تسمینہ ابھی تک

www.paksociety.com
www.Paksociety.com

نیند کے خمار میں جھوم رہی تھی۔ شام کو جو آنکھوں میں بھر بھر کر کاجل ڈالا تھا، وہ سارا اب گالوں پر تھا، آنکھیں نیند سے جاگنے پر سرخ ہوئی ہوئی تھیں۔

"مگر وارڈن تو آج شام ہی دو دن کی چھٹی پہ گھر چلی گئی ہے۔" اس کے پاس بیٹھی شازمہ اس کی شکل سے ڈر کر دوسری چارپائی پر جا بیٹھی۔ مسلسل ہونے والی دستک میں اب قدرے تیزی اور جھنجلاہٹ آگئی تھی۔

"بزدلو! بنہ الحمنا تم لوگ میں خود ہی دیکھتی ہوں۔" تنگ آکر تسمینہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

ایک ہاتھ ہینڈل پر جمایا، دوسرے سے بولٹ گرا کر آہستہ سے دروازہ کھولا، سب سے پہلے سیاہ سینڈل نظر آئے، سفید گاؤن سے ہوتی نظر اوپر اٹھی، دعا کے انداز میں اٹھے ہاتھوں کے بیچ موم بتی جل رہی تھی، اس کی زرد روشنی میں واضح ہوتے چہرے پر نظر پڑی تو سانس گویا رک گئی۔

سفید چونے سے تھپا چہرہ، خون جھلکاتے سرخ ہونٹ، مڑی ہوئی پلکوں والی بند آنکھیں جو دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ پر ایک جھٹکے سے کھلیں، اپنے سامنے گھنگھریالے، بکھرے بالوں، سرخ پھٹی آنکھوں اور خوف سے منہ کھولے لمبے دانت جھلکاتی تسمینہ کو دیکھ کر انہیں ڈرانے آئی چڑیل کی اپنی زوردار چیخ نکل گئی۔ جس کے ختم ہونے سے پہلے تسمینہ اور فرسٹ ایر کی باقی لڑکیوں کی دہشت ناک چیخوں نے رات کے سناٹے میں تہلکہ مچادیا۔

تسمینہ بھاگ کر اپنے بیڈ کے نیچے گھس گئی، چڑیل بھی اپنی موم بتی پھینک پھلانگ کر اندھیری راہ داری میں فرار ہوگئی، مگر اس کے بعد جو فرسٹ ایر کی چیخیں تھمنے میں نہیں آرہی تھیں۔ جب تک باقی کمروں کے دروازے کھلے، ہاسٹل کی لائٹس آن ہوئیں، تب تک چیخوں کا طوفان ہچکیوں اور آنسوؤں کے سیلاب میں بدل چکا تھا۔

"ارے کیا ہوا؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔"

"کیوں چیخ رہی تھیں۔ کیا گھر والوں کی یاد آرہی تھی؟" سینئر لڑکیاں انہیں ساتھ لگائے چپ کراتے ہوئے طرح طرح کے سوال پوچھے جارہی تھیں، مگر ان سب کی ایک ہی رٹ تھی۔

"ہمیں یہاں نہیں رہنا، ہمیں گھر جانا ہے۔"

"اچھا اگر گھر والوں کی اتنی ہی یاد آرہی تھی تو تکیوں میں منہ چھپا کر سسک لیتیں، اتنی زور سے باجماعت گلے پھاڑنے کی کیا ضرورت تھی۔" جہاں روگ کر بے زاری سے کہتی یہ باجی رخسانہ تھی، ہاسٹل کی سب سے سینئر لڑکی۔

"اگر آپ ہمیں پہلے بتا دیتیں کہ اس ہاسٹل میں چڑیلیں شتر بے مہار گھومتی ہیں تو نہ ہمیں، ہمارے گھر والے یہاں چھوڑ کر جاتے اور نہ کبھی ہمیں ان کی یاد میں یوں گلے پھاڑنے کی ضرورت پیش آتی۔" فرسٹ ایر نے ان کی بات کا برا مانا تھا، اس لیے تنک کر بولیں۔ "بہرحال باجی رخسانہ نے انہیں تسلی دی، پھر بڑی مشکل سے ان کا رونا بند کروا کر انہیں سونے پر آمادہ کیا۔

"اب تم لوگ بتاؤ، یہ شرارت کس کی تھی۔" باجی رخسانہ نے تفتیش کا آغاز کمرے کے باہر جمع لڑکیوں سے کیا۔

"ہمیں کیا معلوم۔" کم و بیش سب کا جواب یہی تھا۔

وہ دروازے کے پاس پڑی موم بتی کو غور سے دیکھتے ہوئے فرسٹ ایر کو مزید تسلی دینے لگی۔

"میں وارڈن کے آنے سے پہلے پہلے پتا چلالوں گی یہ شرارت کس کی تھی۔ پھر تم دیکھنا، ووان کا کیا حشر کریں گی۔"

وہاں سے نکل کر اس کا رخ اپنے کمرے کے بجائے راہ داری کے آخر میں اندھیرے کمرے کی طرف تھا۔

☆ ☆ ☆

"پانی ہائے کوئی پانی دے دے مجھے۔"

صلہ تیزی سے بھاگتی ہوئی اندر آئی اور دھڑام سے بستر پر گر کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ فارحہ نے جلدی سے دروازہ بند کر کے کنڈی لگادی۔ صنم نے پانی کا گلاس بھر کر اس کی طرف بڑھایا۔

"تو ہی گئی تھیں، فرسٹ ایر کو ڈرانے، مگر پہلی چیخ محترمہ کی اپنی نکلی۔"

تمنا، صنم کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسی سے دہری ہوگئی۔

پانی کا گلاس غٹاغٹ چڑھاتی صلہ نے گھور کر اسے دیکھا، مگر ہونٹوں پر لگا سرخ ٹوتھ پیسٹ پانی پینے سے منہ کے اندر چلا گیا تھا، اس لیے جواب دیے بغیر واش روم میں جاکر کلیاں کرنے لگی۔

"مگر مشن تو پورا کر کے آئی ہے، فرسٹ ایر کی چیخیں تھمنے میں نہیں آرہیں۔"

باہر کا جائزہ لیتی فارحہ نے اس کا دفاع کیا۔

"کریم سوکھ گئی ہے، اتر نہیں رہی، کیا کروں؟"

کپڑے تبدیل کر کے چہرہ صاف کرتی صلہ جھنجلائی ہوئی تھی۔

"کاٹن پر فیس واش لگا کر چہرے پر ملو۔" بستر میں دبکی تمنا نے مفت مشورہ پھینکا۔

"چہرے کی پتائی کے لیے کس کی کریم کی شامت آئی تھی؟" صنم نے انگڑائی لی۔

"تمہاری۔" وہ مزے سے بولی۔

"کیا۔" صنم اچھل ہی تو پڑی تھی۔

"ہو ہو بعد میں، پہلے بستروں میں گھس کر سوتے بن جاؤ، وارڈن کی نام نہاد جانشین ادھر ہی آرہی ہے۔"

فارحہ نے اطلاع دی اور لائٹ بند کردی۔

ان چاروں کا گروپ "فور اسٹارز" کے نام سے مشہور تھا۔ نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں سب سے آگے رہتا تھا۔ باجی رخسانہ کو یہ چونکہ خاطر میں نہیں لاتی تھیں، اس لیے اسے ان سے خدا واسطے کا بیر تھا، ہمیشہ ان کی شرارتوں کے ثبوت اکٹھے کرنے میں لگی رہتی تھی، مگر یہ بھی کسی سے کم نہیں تھیں۔

دروازے پر دستک ہوئی، تیسری دستک پر بال الجھائے صلہ اٹھی اور مندی مندی آنکھوں سے دروازہ کھولا۔

"باہر اتنا شور تھا، مگر تم لوگوں نے جھانکا تک نہیں، پوچھ سکتی ہوں کیوں؟" اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر تفتیش کا آغاز کیا۔

"ہم سو رہے تھے، شور پر میری آنکھ تو کھلی، مگر اتنی ڈراؤنی چیخیں تھیں، میری تو ہمت نہیں ہوئی باہر آنے کی۔ ویسے کیا ہوا تھا؟" آنکھیں پٹ پٹا کر معصومیت سے پوچھتی صلہ، رخسانہ کو زہر لگ رہی تھی۔

"اچھا تو کیا واقعی باہر سے چیخیں بلند ہو رہی تھیں؟" کہنیوں کے بل تکیے سے سر اٹھاتے ہوئے تمنا نے چہرے پر حیرت کے تاثرات پیدا کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس دوران فارحہ اور صنم بھی سر کھجاتی، جمائیاں لیتی اٹھ بیٹھیں۔

"کیوں بی بی! تمہیں کیا لگا تھا؟" رخسانہ نے تمنا سے پوچھا۔

"وہ دراصل میں پاک اسٹڈی کا ٹیسٹ یاد کرتے کرتے سو گئی تھی، خواب میں تحریک آزادی کا منظر دیکھ رہی تھی، مجھے لگا لوگ جوش و خروش میں چیخ رہے ہیں۔"

"اچھا!" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ "اور تمہیں کیا لگا؟" رخسانہ نے توپوں کا رخ اچانک فارحہ کی طرف کیا، وہ گڑبڑا گئی۔

"وہ، دراصل وہ، ہاں میں فزکس کا سبق یاد کرتے ہوئے سو گئی تھی، ذہن پر ایٹم سوار تھا، کچی نیند میں چیخیں سنیں تو مجھے لگا اٹامک وار شروع ہوگئی ہے۔"

"استغفراللہ، یہ تمہیں کیوں اتنی ہنسی آرہی ہے۔" لاکھ چھپاتے بھی صنم کی مسکراہٹ عیاں ہوگئی تھی، مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی۔

"دراصل میں نا، خواب میں اپنی منگنی ہوتے دیکھ رہی تھی، مجھے چیخیں سن کر ایسا لگا جیسے میرا منگیتر اتنا حسین ہے کہ لڑکیاں اسے دیکھ کر دانتوں میں انگلیاں دبائے چیخ رہی ہیں۔" گالوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں میچے ہوئے وہ مزے سے بولی۔ تینوں سے اپنی ہنسی دبانا مشکل ہوگیا۔

"بند کرو اپنی یہ ڈرامے بازی میں تم چاروں کی رگ رگ سے واقف ہوں سیدھی طرح بتاؤ کس نے فرسٹ ایئر کو ڈرایا ہے؟"
"آپ نے۔"
"کیا؟"
"میرا مطلب ہے آپ نے دیکھا ہم میں سے کسی کو یہ حرکت کرتے ہوئے جو آدھی رات کو ہماری نیند حرام کرنے چلی آئیں۔" ماتھے پر تیوری چڑھائے تمنا کی سنجیدگی دیکھنے کے لائق تھی۔
"ویسے چڑیل اصل بھی تو ہو سکتی ہے۔" صنم نے لہجہ پراسرار بنایا' رخسانہ کے چہرے پہ خوف کی پرچھائیں لرز گئیں۔
"جی نہیں اگر اصلی ہوتی تو اپنی یہ موم بتی چھوڑ کر کبھی نہ بھاگتی۔" اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے اس نے موم بتی ان کے سامنے لہرائی۔ صلہ قدرے گھبرا گئی۔
"چلیے بھاگتی چڑیل کی موم بتی ہی سہی۔ چڑیل پھر کبھی تلاش کر لیجیے گا' فی الحال جائیے' ہمیں سونے دیجیے۔" فارحہ بے مروتی سے بولی۔
"میں وارڈن سے تم لوگوں کی شکایت کروں گی۔" اس نے دھمکی دی۔ وہ پیر پٹخ کر چلی گئی۔ دروازہ بند کر کے چاروں ہنستے ہوئے اس کی جھنجلاہٹ سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔

☼ ☼ ☼

"ہائے کب وہ مبارک دن آئے گا جب ہمیں چھٹیوں کا مژدہ سنایا جائے گا۔"
لائبریری کی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے تمنا کا تھکن سے برا حال تھا فارحہ اور صنم کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی لگاتار تین پیپرز میں ٹیسٹ لکھ لکھ کر ہاتھوں کا کباڑا نکل گیا تھا۔
"صلہ کہاں ہے؟ ابھی تک کلاس روم میں ہے کیا؟" صنم نے پوچھا۔
"پڑھ رہی ہوگی' کسی کونے میں بیٹھ کر پیپر تو سب سے پہلے اسی نے حل کیا تھا۔"
تمنا نے منہ بنایا' دوستی کے باوجود اس کا اور صلہ کا مقابلہ سخت رہتا تھا' ذہین تو دونوں تھیں' مگر صلہ بلا کی محنتی تھی' تمنا چاہ کر بھی اس جیسی جان توڑ محنت نہیں کر پاتی تھی اس لیے ہمیشہ دوسرے نمبر پر ٹھہرتی تھی۔
"ہاسٹل میں رہنے میں سب سے بڑی قباحت یہی ہوتی ہے کہ بندہ چھٹی نہیں کر سکتا' ورنہ گھر پر تو عیش ہی عیش تھے۔ جس دن زیادہ ٹیسٹ ہوں چھٹی مار لی۔" فارحہ مسلسل اپنا کتھارسس کر رہی تھی۔
"تکمی! تمہاری ان ہی چھٹیوں سے تنگ آکر تو تمہارے گھر والوں نے تمہیں گھر بدر کیا ہے۔" صنم اس کے ہاتھ سے چپس کا پیکٹ اچک کر دور جا بیٹھی' فارحہ نے اس دن بازے والے پر آؤ دیکھا نہ تاؤ اور تمنا کے ہاتھ سے اسکیل کھینچ کر اسے دے مارا' وہ تو جھکائی دے گئی مگر اسکیل "تو نہیں اور سہی" کے مصداق لائبریری کی کھلی کھڑکی سے اندر چلا گیا' زوردار چیخ بلند ہوئی' تینوں نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک دوسرے کو دیکھا اور اگلے ہی پل نو دو گیارہ ہو گئیں۔
صلہ لیب کے سامنے والے لان میں سفید گلابوں کے کنج کے پاس گھاس پر بیٹھی کھلے لان میں بری طرح منہمک تھی' جب تینوں بھاگتی ہوئی اس کے پاس آکر دھم سے بیٹھ گئیں اور پھولی سانسیں ہموار کرنے لگیں۔ "کیا ہوا؟" کچھ توجہ دیے بغیر اس نے ذرا کی ذرا آنکھیں اٹھا کر پوچھا۔ تمنا دلچسپ پیرائے میں مزے لے لے کر اسے بتانے لگی مگر اس کی توجہ گود میں رکھی کتاب پر بدستور تھی۔ تمنا جان نہ سکی وہ سن بھی رہی ہے یا نہیں چنانچہ صنم اور فارحہ کی نوک جھونک پھر شروع ہو گئی تھی' صلہ کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام ہو کر وہ خود بھی کتابیں کھول کر بیٹھ گئی' کچھ دیر بعد باجی رخسانہ ایک ہاتھ میں اسکیل پکڑے دوسرے سے سر سہلاتی' ہر ایک کو مشکوک نظروں سے گھورتی وہاں سے گزری تو چاروں کتابوں میں بری طرح غرق تھیں۔

☼ ☼ ☼

"کسی نے کھانا زہر مار کرنا ہے تو آجائے۔" فارحہ میس سے لایا کھانا اخبار بچھا کر لگانے لگی۔
"آج کھانے میں کیا ہے؟" تینوں اشتیاق سے آ بیٹھیں۔
"من و سلویٰ۔" ڈونگے میں جھانک کر کانوں پر ہاتھ رکھ کر صنم نے لمبی چیخ ماری۔ "کہہ دو صنم! یہ سراسر میری آنکھوں کا دھوکا ہے' مسلسل دوسرے کھانے میں آلو ٹینڈے نہیں ہو سکتے۔"
صنم سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ "ہائے! گھر میں کیسے شان دار کھانے کھانے کو ملتے تھے۔ اماں ہر دوسرے تیسرے دیسی مرغ بھونتی تھیں' یہ تو میں ناشکری تھی جو من و سلویٰ چھوڑ کر بد مزا کھانے کھانے یہاں آگئی۔" سدا کی چٹوری صنم کی آنکھوں میں سچ مچ آنسو تیر گئے۔ وہ گاؤں کی رہنے والی دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ گھر کی فراغت اور تنہائی سے تنگ آکر ہاسٹل آگئی تھی۔ فارحہ اسی شہر کی رہنے والی تھی' دس بہن بھائیوں میں اس کا نمبر ساتواں تھا' گھر کے شور شرابے سے گھبرا کر وہ بھی ضد کر کے ہاسٹل اٹھ آئی تھی' جبکہ صلہ اور تمنا کزنز تھیں۔ ان کا یہاں آنے کا مقصد صرف اور صرف حصول علم تھا۔ دونوں کا شمار کالج کی بہترین اسٹوڈنٹس میں ہوتا تھا۔ ایف ایس سی پری میڈیکل کے فرسٹ ایئر میں صلہ نے پورے کالج میں ٹاپ کیا تھا' جبکہ تمنا ہمیشہ کی طرح دوسرے نمبر پر رہی تھی۔
"اب بت بن کر کیوں بیٹھی ہو؟ کھاؤ اور ختم کرو اس بلائے جان کو' نہیں تو اگلے وقت بھی یہی کھانے کو ملے گا۔" صلہ نے ہاتھ بڑھایا تو بادل نخواستہ ان تینوں کو بھی کھانا پڑا۔

☼ ☼ ☼

آج چھٹیوں کا اعلان ہوا تھا' ہاسٹل میں گویا ایمرجنسی نافذ ہو گئی تھی' افراتفری سی افراتفری تھی' ہر کوئی سامان پیک کر کے یوں بھاگ رہا تھا جیسے عمر قید سے رہائی ملی ہو۔

دنیا بھر میں مقبول معیاری ادب
عمران ڈائجسٹ
Emale: id@khawateendigest.com

اپریل 2012 کے شمارے کی ایک جھلک
"سالگرہ نمبر"
معرکش راجکماری
داسی
فولاد
اُپچ
محبت کی نفرت
محبت کا پجاری
مولوی مہربان علی
مرے بھتیے
مجید کا ماضی
بھنور
پاکی محبت
حرم کے داغ
اپریل 2012 کا تازہ شمارہ آج ہی خرید لیں

"خبردار! آج گھر کوئی نہیں جا رہا' ہم کل جائیں گے۔ آج رات خوب موج مستی کریں گے۔" کالج سے واپسی پر فارحہ نے اعلان کیا' تینوں اس سے متفق ہو گئیں۔ سب سے پہلے تو سامان پیک کر کے رکھا' پھر جمع پونجی گن کر ساری کی ساری چوکیدار کے حوالے کر کے 'بریانی' ڈرم اسٹکس' ڈھیر ساری املی اور چاکلیٹ منگوائیں۔ کولڈ ڈرنک تمنا کی طرف سے تھی کیمسٹری کے گرینڈ ٹیسٹ میں اس نے سب سے زیادہ نمبر لیے تھے۔ اس کی خوشی دیکھنے لائق تھی۔

"یہ ہاسٹل لائف بھی کتنی عجیب ہوتی ہے' ایک طرف دل گھر اور گھر والوں کے لیے ہمکتا ہے تو دوسری طرف ہاسٹل کے کمرے' دوستوں کو چھوڑنے کو بھی دل نہیں مانتا۔"

سفید چکنی دیوار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے صلہ بہت اداس تھی۔ وہ چاروں نیچے پسکڑا مارے املی کے چٹخارے لے رہی تھیں۔

"یار! میرا ابھی کل جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔" صنم افسردگی سے بولی۔

"حالانکہ چھٹیوں کا سب سے زیادہ انتظار بھی تمہیں ہی تھا۔" فارحہ نے اسے چپ رسید کی۔

"اوہو ابھی سے یہ اداسی والی باتیں مت کرو' نہیں تو مجھے رونا آجائے گا' چلو لوڈو کھیلتے ہیں۔" تمنا نے بستر کے نیچے سے لوڈو نکالا' پھر وہ چاروں دیر تک کھیلتی رہیں۔ چائے پینے کا دل تو سب کا چاہ رہا تھا' مگر اٹھنے میں آلکسی ہو رہی تھی' بڑی مشکل سے زبردستی صلہ کو اٹھایا گیا۔

"اچھا یہ بتاؤ زندگی میں تم لوگوں کے لیے سب سے زیادہ کیا ضروری ہے؟" کپ سب کو پکڑاتے ہوئے صلہ کو نہ جانے کیا سوجھی جو پوچھ بیٹھی۔

"کھانا۔" صنم فٹ سے بولی۔ سب ہنس دیں۔

"دولت!" فارحہ نے قدرے جھجک کر صاف گوئی سے کہا۔

"کامیابی' خواہ جیسے بھی حاصل ہو۔" تمنا کی باری آئی تو اس کے لہجے میں چٹانوں سی مضبوطی تھی۔

"ہم سے تو پوچھ لیا' اب تم تو بتاؤ۔" اسے کپ سمیٹ کر اٹھتا دیکھ کر صنم نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"میرے لیے۔" مڑی ہوئی پلکوں والی بڑی بڑی آنکھیں میچ کر صلہ نے ایک پل کو سوچا اور مسکرائی۔ "دوستی اور اپنی ذات کا اعتبار۔" فارحہ اور صنم کی آنکھوں میں توصیف اتری۔

اگلے دن صبح ہی صبح صنم کے بھائی اسے لینے آگئے' فارحہ نے کون سا دوسرے شہر جانا تھا' اطمینان سے رکشہ پکڑ کر وہ بھی روانہ ہو گئی۔ ان دونوں کو لینے چاچا جی بھی ٹائم سے آگئے۔

تمنا حسب عادت سفر شروع ہوتے ہی آنکھیں بند کر کے نیند میں گم ہو چکی تھی' تین گھنٹے کے طویل سفر کے بعد گاڑی سرخ اینٹوں والی میر منزل کا سیاہ گیٹ اور چھوٹا سا ڈرائیو وے عبور کر کے پورچ میں آرکی۔

ڈرائیو وے کے دائیں اور بائیں ڈیوڑھیاں تھیں' ایک طرف صلہ میر اور دوسری طرف تمنا میر کا پورشن تھا' جبکہ ڈرائیو وے اور پورچ مشترکہ تھا۔

صلہ گاڑی رکتے ہی تیزی سے دروازہ کھول کر اپنے پورشن کی طرف بھاگی۔ گول اینٹوں والا سرخ صحن تم تم چمکویا ابھی ابھی دھلا تھا' گول ستونوں پر چڑھی بیلیں پھولوں سے لدی تھیں' کونے سے اوپر جاتی چوڑی سیڑھیوں کے ہر قدم پر الگ رنگ کے گلاب کا گملا رکھا تھا' پچھلی بار اس نے جو تین نئے گلاب کے پودے لگائے تھے' ان میں سے دو پر پھول آچکے تھے۔ برآمدے میں رکھا طوطوں کا پنجرہ خاموش تھا' طوطے منکیوں میں شاید آرام کر رہے تھے۔ سارے گھر کا تفصیلی جائزہ لیتی وہ ہونٹوں میں مسکراہٹ دبائے کچن میں داخل ہوئی اور اماں کے پیچھے سے جا کر ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے اس نے پرسکون ہو کر ان کے شانے پر سر رکھ دیا' وہ بالکل نہیں چونکیں' صبح سے اسی لمس کی تو منتظر تھیں۔ خاموشی کا پل تمام ہوا' اب وہ ان کے گال چومتے ہوئے پر پڑا' ابا' آپی' بھیا سب کا پوچھے جا رہی تھی۔

کچن کے کونے میں بچھے سرخ غالیچہ پر دسترخوان

بچنے تک وہ اسے سب کی طرف سے مطمئن کر چکی تھیں۔ وہ جلدی سے ہاتھ دھو کر دسترخوان پر آبیٹھی' چکن بریانی' تڑکا لگی دال' گرم سنہری چپاتیاں دیکھ کر اس کی بھوک چمک اٹھی۔ اماں اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلا رہی تھیں' جب تک کھانا ختم ہوا' وہ ہاسٹل اور کالج کی تمام اہم سرگرمیاں ان کے گوش گزار کر چکی تھی۔

"جاؤ' اندر جا کر سو جاؤ۔" اس کی پلکوں پر ٹھہری تھکن دیکھ کر اماں نے پیار سے پچکارا۔

"ہونہوں' ابھی تو آپ سے ڈھیر ساری باتیں کرنی ہیں۔" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر برآمدے میں تخت پر آبیٹھی اور ان کی گود میں سر رکھ کر سرشار سی لیٹ گئی' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ فرسٹ ایئر والا واقعہ سناتے سناتے اسے نیند آگئی۔ اماں احتیاط سے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر سیدھی بیٹھ گئیں' مبادا ان کے ہلنے جلنے سے ان کی لاڈلی کی نیند خراب ہو جائے۔

☆ ☆ ☆

بالوں کو ڈرائر سے سکھاتے ہوئے صلہ آئینے میں بغور اپنے نئے کپڑوں کا جائزہ لے رہی تھی' سادہ سیاہ چوڑی دار پاجامہ اور چوڑی دار آستینوں والی گھٹنوں تک آتی سیاہ شرٹ پر بالکل سادہ سرخ دوپٹہ اس کی گلابی مائل صاف رنگت پر بہت کھل رہا تھا' مڑی ہوئی پلکوں والی بڑی بڑی گھور سیاہ آنکھوں میں بھر بھر کاجل ڈالا اور کندھوں تک آتے سلکی بالوں میں برش پھیر کر وہ باہر نکل آئی۔ شام کیسے پر پھیلانے لگی تھی' ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا نے موسم سہانا کر دیا تھا' موڈ میں آکر اس نے سرخ گلاب توڑ کر بالوں میں ٹانک لیا۔

"اماں! میں تمنا کی طرف جا رہی ہوں۔" اس نے آواز لگائی اور آگے بڑھ گئی۔

چچی انار کے پیڑ کے پاس تخت پر بیٹھی بادام پستوں کی ہوائیاں کاٹ رہی تھیں۔

"السلام علیکم چچی!" اس نے ڈیوڑھی سے ہی پرجوش سلام کیا۔

"صبح کی آئی ہو' اب آئی چچی کی یاد۔ تمنا تو کب کا بھابھی بیگم کو سلام کر آئی۔" گلے لگاتے ہی انہوں نے شکوہ کیا۔

"دراصل میں کھانا کھاتے ہی سو گئی تھی' ابھی اٹھی ہوں۔" ہونٹ کا دایاں کونا دباتے ہوئے وہ قدرے شرمندہ ہوئی۔

"نیا جوڑا ہے؟" دوپٹا ہاتھ میں لے کر مسلتے ہوئے انہوں نے کپڑا جانچا۔

"جی! میں جب بھی لمبی چھٹی کے بعد گھر آتی ہوں' اماں میرے لیے نیا جوڑا ضرور بنوا کر رکھتی ہیں۔" وہ خوشی خوشی بتانے لگی۔

"ہوں' بیٹیاں پرایا دھن ہوتی ہیں' اتنا سر پہ نہیں چڑھانا چاہیے' پر کون سمجھائے ہماری بھابھی بیگم کو۔" وہ ہنکارا بھر کر بڑبڑائیں' صلہ لاپروائی سے ہوائیاں چکھنے لگی۔ ان کی ایسی باتوں کی تو بچپن سے عادی تھی۔

"تمنا کہاں ہے؟" اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

"تمہارے ہی لیے چائے بنانے گئی ہوں گی۔"

"جی!" سعادت مندی سے سر ہلاتے ہوئے اس نے باداموں کی مٹھی بھی بھر لی۔ چچی کٹی ہوائیوں سمیت میوے کا ڈبہ بھی لے گئیں۔ وہ پیر جھلا کر بادام ٹونگتے ہوئے آسمان پر کبوتروں کا غول دیکھنے لگی' یہ تیمور کے کبوتر تھے۔

"دو ماہ میں چار نئے کبوتر لے لیے۔ بڑی ترقی ہے بھئی۔" وہ بڑبڑائی۔

"یہ اکیلے اکیلے کس سے باتیں ہو رہی ہیں؟" بال تولیے میں لپیٹے تمنا اس کے برابر آبیٹھی۔

"کسی سے نہیں' بس کبوتر دیکھ رہی ہوں۔"

"پتا ہے' 'بہاری' نے بچے دیے ہیں' گولڈن گولڈن' نرم و ملائم اتنے کیوٹ ہیں کہ حد نہیں۔" اس نے کبوتری کا بتایا۔

"چلو اوپر چل کر دیکھتے ہیں۔" صلہ مچل اٹھی۔

"ابھی نہیں' بعد میں' ورنہ امی ناراض ہوں گی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی انہوں نے تیمور کی کلاس لی ہے۔ موصوف کے میٹرک کے پیپر ہونے والے ہیں

مگر پڑھا خاک نہیں۔" اس نے منہ بنایا' تیمور اور اس کی ذرا انہیں بنتی تھی۔

"تم نے بھی آج نیا سوٹ پہنا ہے' بہت اچھا ہے۔" اس کے کاسنی سفید پرنٹڈ سوٹ کی صلہ نے تعریف کی۔

"ہاں! یہ تو اچھا ہے مگر تم نے کیا یہ بلیک' ریڈ اتنا گھسا پٹا اور پرانا کیسی فیشن پہن رکھا ہے۔" بغور اس کا جائزہ لیتے ہوئے تمنا نے ناک چڑھائی۔

"اولڈ از گولڈ۔" بے نیازی سے کندھے اچکا کر مسکراتے ہوئے اس نے بات ختم کردی' طویل سانس خارج کر کے تمنا نے پاس پڑا اخبار اٹھالیا صلہ چائے پیتے ہوئے اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر اسے ہوں' ہاں میں ٹالتے ہوئے وہ اخبار میں بری طرح گم تھی' اس کی خاموشی سے گھبرا کر وہ کھڑی ہوگئی' پچی سے نظر بچا کر کبوتر دیکھنے اوپر چلی گئی' مگر تمنا نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا' نجانے کیوں گھر آکر وہ اتنی بیگانہ بن جاتی تھی۔

☆ ☆ ☆

میر فضل حسین اپنے وقت کے بہت شریف النفس اور عزت دار انسان تھے' قول کے بے حد پکے' جو بات ایک بار کہہ دیتے پھر چاہے دنیا ادھر سے ادھر ہو جاتی' اپنا کہا ضرور پورا کرتے تھے۔ ان کے تین بچے تھے۔ ایک بیٹی سنبل اور دو بیٹے میر منصف اور میر منیب' یہ ان دنوں کی بات تھی' جب بیٹی کے فرض سے سبک دوش ہونے کے بعد وہ بیٹوں کی شادی کا سوچ رہے تھے۔ انہیں ضروری کام کے سلسلے میں کوئٹہ جانا پڑا' وہاں ان کا معمولی سا ایکسیڈنٹ ہوگیا' راہ چلتے اجنبی نے نہ صرف ان کی مرہم پٹی کروائی بلکہ انہیں اپنے گھر بھی لے گیا' اجنبی میزبان کی شرافت اور مہمان نوازی سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ واپسی پر شمین خان کی بڑی لڑکی مرجان کو اپنے ہونہار بیٹے میر منصف کے لیے مانگ کر شادی کی تاریخ تک مقرر کرتے آئے' شمین خان نے بھی ان کی شرافت و نجابت پر بھروسا کرتے ہوئے لڑکا دیکھے بغیر رشتہ منظور کرلیا۔

ادھر ان کی بیوی نفیسہ بیگم میرنے یہ سنتے ہی ہنگامہ کھڑا کردیا' اپنے دونوں بیٹوں کے لیے وہ اپنی بھانجیوں کی آرزو کیے ہوئے تھیں' مگر میر فضل جیسے قول کے پکے انسان کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور مرجان بڑی بہو بن کر ان کے گھر آگئی۔ وہ نہ صرف روایتی پہاڑی حسن سے مالا مال تھی بلکہ پڑھی لکھی' صوم صلوٰۃ کی پابند' شیریں زبان و کلام کی حامل نیک لڑکی تھی۔ میر منصف اسے پاکر بے حد خوش تھے۔ بیگم نفیسہ بیگم اگر خود اپنی پسند سے لے آتیں تو لازما" ان کے پاؤں بھی زمین پر نہ ٹکتے کہ اتنی حسین بہو ان کے خاندان میں کسی کی نہیں تھی مگر انہیں مرجان سے اول روز سے چڑ تھی' وہ چھوٹے بیٹے کے لیے حسب خواہش اپنی بھانجی شاہینہ بیاہ لائیں' شاہینہ کی سرد مزاجی کے باوجود اسے مرجان پر ترجیح دیتی رہیں۔ سنبل کا بھی یہی حال تھا۔ شاہینہ نے بھی ان کی دیکھا دیکھی مرجان کو جٹھانی والی اہمیت و عزت کبھی نہیں دی۔ بس طنز سے "بھابھی بیگم" کہہ دیتی تھی۔

میر صاحب نے یہ صورت حال دیکھی تو "میر منزل" کا الگ پورشن بنوا کر بڑے بیٹے کو وہاں منتقل کردیا تاکہ بہو سکون سے رہ سکے۔ میر صاحب کی زندگی تک تو سب ٹھیک رہا مگر ان کی وفات کے بعد شاہینہ نے پر پرزے نکالنے شروع کردیے' ساس کا وجود تک کھٹکنے لگا' بھانجی کے تیور دیکھ کر نفیسہ بیگم کو بہت دکھ ہوا تھا' مرجان نے یہ صورت حال دیکھی تو ان کی منت کر کے بعد احترام انہیں اپنے پورشن میں لے آئی پھر آخری وقت تک ان کی اتنی خدمت کی کہ وہ اسے دعائیں دیتی دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ اب تو نند بھی اعتراف کرتی تھی۔

"بھابھی! جتنی خدمت آپ نے اماں کی کی' اتنی تو میں بھی نہ کرپاتی۔"

مرجان نے ساس کی وفات کے بعد بھی نند کا میکا قائم رکھا۔ اس کے اخلاق و اخلاص نے پورے

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at
admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121
www.Paksociety.com

خاندان کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا مگر شاہینہ نے اپنی خوش بدلی جھنجلاہٹ کے ساتھ روز اول سے، جو خلیج تھی وہ وقت کے ساتھ ساتھ اور بھی گہری ہوتی گئی۔
مرجان بیگم کے تین بچے تھے صائم، صائمہ اور اس سے دس سال چھوٹی صلہ تھی جبکہ شاہینہ بیگم کے چار بچے تنزیلہ، تنزیل، تمنا اور تیمور تھے۔
شاہینہ بیگم شروع سے تنزیلہ کے لیے صائم کو پسند کیے ہوئے تھیں۔ ایئر فورس جوائن کر کے فائٹر پائلٹ بننے کے بعد تو صائم کی شخصیت مزید نکھر گئی تھی مگر اس نے شادی کے لیے اپنی خالہ زاد جاناں کا انتخاب کیا۔ شاہینہ بیگم کا دل مزید برا ہو گیا۔
سنبل کا اکلوتا بیٹا ڈاکٹر منیر بھی کچھ برا نہیں تھا۔ شاہینہ کو امید بندھ گئی مگر سنبل نے بھی تنزیلہ کے بجائے صائمہ کا ہاتھ مانگ لیا۔ شاہینہ بیگم نے طیش میں آ کر دونوں بچوں کی شادیاں خاندان سے باہر کر دیں۔ تنزیل اپنی ڈاکٹر بیوی کے ہمراہ کینیڈا جا بسا تنزیلہ بیاہ کر شوہر کے ہمراہ دبئی چلی گئی۔ اب ان کی ساری توجہ کا مرکز تمنا تھی۔ وہ بچپن سے اس کا مقابلہ صلہ سے کرتی آئی تھیں جیسا صلہ نے پہنا ویسا انہوں نے تمنا کو پہنایا، جیسا اس نے کھایا، ویسا ہی تمنا کو کھلایا مگر ان کی لاکھ کوششوں کے باوجود صلہ ہمیشہ تمنا سے میدان میں ایک قدم آگے رہی تھی۔ پھر تمنا سے دو سال چھوٹا تیمور تھا، اس کی دفعہ شاہینہ بیگم اپنے مسئلوں میں الجھی تھیں، کچھ بڑے تین بچوں کی تعلیم و تربیت کی تھکن تھی کہ وہ اس پر ذرہ برابر توجہ نہ دے سکیں، وہ خودرو پودے کی مانند خود ہی اتنا بڑا ہو گیا تھا، ماں سے زیادہ اس کے لاڈ تائی نے اٹھائے تھے۔ اسی لیے شاہینہ بیگم اپنی غلطی ماننے کے بجائے تیمور کے بگڑنے کا سہرا مرجان بیگم کے سر باندھتی تھیں اور وہ دھیمی سی مسکراہٹ اپنے ملیح چہرے پر سجائے چپ چاپ ان کے سب الزامات سنتی رہتیں تھیں، کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیا تھا، یہی وجہ تھی دل میں لاکھ کدورت کے باوجود شاہینہ بیگم کا ان سے زبانی جھگڑا کبھی نہیں ہوا تھا اور اسی وجہ سے بھائیوں کے دل بھی ابھی تک آپس میں جڑے تھے۔

☆ ☆ ☆

"کٹو... کاٹو، جلدی کرو۔ بچ کے جانے نہ پائے، گورا سا ڈور کو تھمکاؤ، یہ... یہ ستیاناس۔"
تیمور اپنی نئی گڈی کو چھ سالہ بلو کی پتنگ سے پیچ میں کٹتے دیکھ کر سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور اس وقت کو کوسنے لگا جب صلہ کے منت کرنے پر ڈور اسے تھمائی تھی۔
"جب پیچ لڑانا نہیں آتا تو لڑایا کیوں؟ کرا دی ناں میری ہیٹی، سب تو یہی سمجھیں گے ناکہ تیمور کی گڈی اس چھ سالہ بلو نے کاٹ دی، کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا مجھے۔"
وہ سر پکڑے یوں پریشان تھا کہ کیا ہی بڑے بوڑھے بڑی سے بڑی بدنامی پر ہوتے ہوں گے۔ ڈور لپیٹتے ہوئے صلہ کو زور سے ہنسی آ گئی۔
"اچھا بابا! معاف کرو، مجھ سے لے لینا گڈی کے پیسے۔"
"اور جو بدنامی ہوئی وہ؟" تیمور چمک کر بولا۔
"زیادہ پیسے دے دوں گی۔"
"تو نکالو پانچ سو روپے۔" وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔
"بڑی کم قیمت لگائی اپنی عزت کی۔" تاسف سے سر ہلاتی وہ شرارت سے بولی۔
"عزت پیسے سے تھوڑی ملتی ہے۔ وہ تو بنانا پڑتی ہے۔" وہ مدبرانہ انداز میں بولا۔ "تم مجھے پانچ سو دو، میں اس کی اتنی بڑی گڈی لے آتا ہوں کہ وہ کسی محلے میں بھی کسی نے نہیں اڑائی ہوگی، پھر دیکھنا سب میری گڈی کٹنے کی خبر بھول کر نئی گڈی دیکھنے کیسے اندر ہیں گے، یوں میری بڑی شو بن جائے گی۔" وہ کالر اکڑانے لگا۔ صلہ نے ابرو اچکا کر داد دیتے ہوئے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔
"اور جو چرخی کٹ بنائیں گی وہ؟"
"دیکھا جائے گا، تم بس پیسے نکالو۔" وہ سر ہو گیا تو اسے دیتے ہی بنی۔ وہ چلا گیا۔
صلہ اوپر والی سیڑھی پر گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر

بیٹھ گئی۔ سورج واپسی کے سفر پر رواں دواں تھا۔ اس سے کچھ نیچے کبوتروں کا غول چکرا رہا تھا۔ سیڑھیوں پر بیٹھ کر گملوں کی نم مٹی اور گلابوں کی مدہوش کن خوشبو اپنے اندر اتارتے ہوئے آسمان پر شام کے رنگ دیکھنا اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔ شام گہری ہونے لگی تو اماں نے اسے اندر بلا لیا۔ وہ نماز پڑھ کر لاؤنج میں جا بیٹھی۔ مسقط سے ابا کا فون آ گیا۔ ان سے بات کرنے کے بعد اس نے اسلام آباد میں بھیا کا نمبر ملایا۔ وہ تو گھر پر تھے نہیں، البتہ جاناں بھابھی سے خوب گپ شپ رہی۔
"چائے پئیں گی اماں؟" کچھ دیر بعد وہ کچن کے دروازے پر کھڑی اماں سے پوچھ رہی تھی۔ انہوں نے تسبیح پڑھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کا کھانا کھانے کا موڈ نہیں تھا۔ چائے کے ساتھ سینڈوچ بناتے ہوئے اسے فرح اور صنم بہت یاد آ رہی تھیں۔ تمنا تو گھر آ کر بالکل بدل جاتی تھی، موڈ ہو تو آ جاتی ڈھیروں باتیں کرتی، نہیں تو دنوں شکل نہیں دکھاتی تھی، وہ جاتی تب بھی اسے خاص لفٹ نہیں کرواتی تھی۔ ایسے میں وہ گھر کی تنہائی سے گھبرا کر ابا، بھیا، آپی کو لمبی لمبی فون کالز کرتی تھی مگر آخر کب تک؟ آخر کار تنگ آ کر کتابیں کھول کر بیٹھ جاتی اور انہیں حفظ کرتی رہتی۔
اگلی صبح وہ پودوں کو پانی دینے اور ان کی کانٹ چھانٹ کرنے کے بعد اماں سے سر میں بادام کے تیل کی مالش کروا کر کس کر چٹیا بنائے تخت پر کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی، جب تمنا بڑے خوش گوار موڈ میں گول گپوں کی بھری پلیٹ لیے چلی آئی۔
"پتا ہے صلہ! اگلے ہفتے ماہ رخ آپی کی شادی ہے۔" گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے اطلاع دی۔
"ہوں، کل کارڈ آیا تھا، دیکھا تھا میں نے بھی۔" بڑا سا گول گپا منہ میں بھرتے ہوئے اس نے زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ ماہ رخ، تمنا کی خالہ زاد کزن تھی۔
"تو پھر تم چلو گی؟" چنے چن چن کر کھاتے ہوئے اس نے بڑی آس سے پوچھا۔
"نہیں۔" صلہ نے فوراً سے انکار کر دیا۔
"مگر کیوں؟ پلیز صلہ! چلو ناں، دیکھو صائمہ آپی سے بھی کب سے ملاقات نہیں ہوئی، اسی بہانے ان سے بھی مل لیں گے اور لاہور کی خوب سیر بھی کریں گے۔ بہت مزا آئے گا، ورنہ تمہارے بغیر میں خاک انجوائے کر سکوں گی۔" وہ منتوں پر اتر آئی۔
"اتنے مسکے کیوں لگا رہی ہو؟ سیدھی طرح کہو صلہ! تم تو گھر بیٹھ کر پڑھائی کرو اور میں وہاں لنڈی بھنگڑا سیمجھ سے نہیں ہو گا۔" اچانک آ کر پلیٹ سے ایک گول گپا اچکتے ہوئے تیمور نے تمنا کی نقل اتاری۔ اسے پتنگے لگ گئے۔
"بکواس کرتے ہو بدتمیز، تم جلتے ہو ہماری دوستی سے۔" تمنا جوتا اٹھانے کو جھکی، وہ زور زور سے ہنستا ہوا نو دو گیارہ ہو گیا۔
"بدتمیز پتا نہیں کیا کیا بکواس کرتا رہتا ہے، نجانے کیوں اسے ہماری دوستی سے جلن ہوتی ہے۔" اس کا موڈ بہت بگڑ گیا تھا۔ بڑبڑائے جا رہی تھی۔ تیمور اگرچہ اس سے چھوٹا تھا مگر دونوں بہن بھائیوں میں "دانت کاٹے کی دشمنی" تھی۔ نہ وہ تمنا کا احترام کرتا نہ وہ کوئی لحاظ رکھتی تھی۔
"اچھا چھوڑو، میں اماں سے بات کرتی ہوں، اگر وہ راضی ہو گئیں تو ضرور چلوں گی۔" صائمہ آپی سے ملنے کے خیال سے صلہ راضی ہو گئی تھی۔ تمنا کو بھرپور تسلی دی، تب کہیں اس کا موڈ بحال ہوا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تائی جان کے گلے میں بانہیں ڈالے انہیں ساتھ چلنے پر آمادہ کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

صبح کا وقت تھا۔ بس اسٹاپ پر بڑی چہل پہل تھی۔ وہ سب ویٹنگ لاؤنج میں آ کر بیٹھے تو رات بھر کے سفر کی تھکن چہروں پر رقم تھی۔
"جاؤ تیمور! باہر جا کر دیکھو کون لینے آیا ہے ہمیں۔"

دور دور تک کسی شناسا چہرے کو نہ پاکر تمنا بے زاری سے بولیں۔ "یہ دور ذمہ داری کا مظاہرہ کر کے فوراً" اٹھ گیا۔ جاتے جاتے کینٹین سے چائے لے کر بھی دیتا بھی گیا۔ پچا ساتھ نہیں آئے تھے۔

شاید بیگم کا پارہ ہائی ہوا ہی چاہتا تھا کہ وہ جینز شرٹ میں ملبوس اٹھائیس سال کے انتہائی خوبرو نوجوان کے ساتھ آتا دکھائی دیا جس کی چال میں تیزی گیلے بال اور چہرے پر تازہ شیو کی نیلاہٹیں بتا رہی تھیں وہ سخت افراتفری میں تیار ہو کر آیا ہے۔

"السلام علیکم! سوری مجھے دیر ہو گئی" آپ لوگوں کو انتظار کرنا پڑا۔" قریب آکر اس نے مہذب طریقے سے معذرت کی۔

"کوئی بات نہیں بیٹا!" ساری کوفت بھلا کر اس کا ماتھا چومتے ہوئے شاہدہ بیگم نہال ہو گئیں۔

"آپ نے پہچانا بھابھی بیگم! یہ شاہ رخ ہے" آپا کا سب سے چھوٹا اور اکلوتا بیٹا۔ بہت بچپن میں ایک بار آیا تھا ہمارے یہاں۔"

"جیتے رہو! ماشاءاللہ اب تو بہت بڑے ہو گئے ہو۔" اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مرجان بیگم مسکرائیں۔

"کیسی ہو تمنا؟"

"جیسی نظر آرہی ہوں۔" وہ کھلکھلائی۔

"یہ؟" اس نے پاس کھڑی صلہ کو پہچاننے کی کوشش کی۔

"یہ صلہ ہے' میری کزن۔" تمنا نے تعارف کروایا۔ صلہ نے صرف سر کے اشارے سے سلام کرنے پر اکتفا کیا۔ وہ پر شوق نظروں سے سیاہ چادر کے ہالے میں دمکتا اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے سامان اٹھانے لگا اس کی رہنمائی میں سب چل کر گاڑی میں آ بیٹھے۔

صلہ کے خوب صورت چہرے میں نجانے کیسی کشش تھی کہ ڈرائیو کرتے ہوئے شاہ رخ کی نظر بے اختیار ہو کر مرر سے جا ٹکراتی تھی۔ وہ آنکھیں موند کر سیٹ بیک سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی' گاڑی کو معمولی سا دھچکا لگنے پر جھٹکے سے آنکھیں کھول کر سیدھی ہوئی' وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ آئینے میں نظریں ٹکرانے پر کھل کر مسکرایا۔ وہ گھبرا کر چادر ماتھے سے نیچی کرکے رخ بدل کر بیٹھ گئی تاہم سارا راستہ پر شوق نظروں کی تپش اسے پریشان کرتی رہی تھی۔

امینہ خالہ کا گھر مہمانوں سے بھرا تھا' شادی والے گھر کی بھرپور افراتفری ہر چیز سے جھلک رہی تھی۔ انہیں بہت پر جوش طریقے سے خوش آمدید کیا گیا' امینہ خالہ نے فوراً "ماشاءاللہ" حلوہ پوری بیلچے اور پائے کے پر تکلف ناشتے کے بعد تمنا وغیرہ آرام کرنے چلے گئے جبکہ صلہ اور مرجان بیگم کو لینے منیر بھائی آ گئے۔ ان کا صائمہ کی طرف قیام کا ارادہ تھا۔ اس کے جانے سے بے خبر شاہ رخ کی بے تاب نگاہ بڑی دیر تک مہمانوں کے ہجوم میں اس کا چہرہ تلاشتی رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

روز شام کو لڑکیاں اکٹھی ہو کر ڈھولکی بجاتیں' خوب گانے گائے جاتے' تمنا فون پر فون کرکے صلہ کو بھی آنے پر مجبور کر دیتی۔ وہ کبھی اماں' کبھی پھوپھو اور کبھی صائمہ کے ساتھ آجاتی۔ شاہ رخ کی نظر اس پر پڑتی تو کھل اٹھتا۔ اس کی سراہتی نظر صلہ کو سمٹ جانے پر مجبور کر دیتی' وہ بات کرنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا مگر وہ سب کے درمیان سے اٹھ کر نہ دیتی تھی' وہ منہ بسور کر رہ جاتا تھا مگر آتے جاتے شوخ سی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالنا نہیں بھولتا تھا۔

آج ماہتاب کی مایوں تھی۔ اسے سوچوں میں گم لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر صائمہ ٹھٹک گئیں۔

"شاباش ہے صلہ تم پر' ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔ میں تیار ہونے جارہی ہوں' تم بھی فوراً اٹھو! دیر ہو گئی تو منیر غصہ ہوں گے۔" اسے اٹھا کر وہ خود بھی چلی گئیں۔

گوٹے کناری سے سجے سبز فراک پر سبز اور پیلے رنگوں کی خوب صورت چنری اوڑھنے کے بعد بالوں کو کیچر میں قید کر کے پیچھے کھلا چھوڑ دیا۔ ہلکی گلابی لپ اسٹک لگا کر کاجل سے آنکھیں سنوارتے ہوئے آئینہ دیکھا تو بے اختیار شاہ رخ کی شوخ سراہتی نظریں تصور میں آ ٹھہریں۔ اس کی اب تک کی زندگی بہت سادہ اور شفاف تھی' وہ کو ایجوکیشن میں بھی صرف پرائمری تک پڑھی تھی۔ ددھیال اور ننھیال میں ہم عمر کزن کا بھی کوئی نہیں تھا' صنف مخالف کی توصیفی نظروں سے کبھی پالا بھی نہیں پڑا تھا۔ اس لیے شاہ رخ کی وارفتگی اسے گھبرا دیتی تھی۔

وہ تیار ہو کر باہر آئی تو سنبل پھوپھو اسے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ گہری سیاہ آنکھوں اور بالیوں کے سوا تمام روپ رنگ اس نے ماں کا چرایا تھا۔ انہوں نے نظر بد کی دعا اس پر پھونکتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی۔

شادی کا گھر حسب روایت بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ سبز' سرخ پیلی بتیاں ترتیب سے ٹمٹماتی دیکھنے والوں کو مبہوت کر رہی تھیں۔

"صلہ! میرا پرس تو گاڑی میں ہی رہ گیا' پلیز لے آؤ نا۔" آرائشی دروازے کے قریب پہنچ کر صائمہ کو خیال آیا۔ صلہ الٹے قدموں بھاگی' منیر بھائی گاڑی لاک کر رہے تھے' اسے آتا دیکھ کر رک گئے۔ پرس لے کر وہ اندر آئی تو صحن خالی تھا' شامیانہ' کرسیاں' اسٹیج کچھ بھی تو نہیں تھا' ڈھولک کی آواز دور سے آرہی تھی' اسے حیرت ہوئی' برآمدے اور کمروں میں کئی خواتین تھیں' مگر سب کی سب اجنبی' تمنا اور صائمہ آپی کہیں نظر نہیں آرہی تھیں۔

"کہیں میں غلط جگہ تو نہیں آگئی۔" اسے پریشانی لاحق ہوئی۔ "تقریب کا انتظام اوپر ہے' سیڑھیاں ادھر لاؤنج میں ہیں۔" اسے ہراساں دیکھ کر ایک لڑکی نے مسکراتے ہوئے رہنمائی کی۔ وہ طمانیت کی سانس لے کر لاؤنج میں آئی' وہ ٹینوں اور پھولوں سے سجی سیڑھیاں چڑھنے لگی' موڑ مڑی تو سیڑھیوں کے درمیان کمرے کا دروازہ اچانک کھلا' وہ اپنے خیالوں میں تھی' ایک دم سے شاہ رخ کو دیکھ کر چونک گئی۔ وہ محظوظ ہو کر زور سے ہنسا۔

سفید کرتا شلوار پر پیلا دوپٹا گلے میں ڈالے' ماتھے پر بال بکھرائے ہنستا ہوا وہ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ صلہ خجل ہو کر کترا کر نکلنے لگی۔

"سنو!" اس نے پکارا۔ "مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی صلہ! تمہارا نام تمہاری طرح خوب صورت ہے یا تم اپنے نام کی طرح پیاری ہو؟"

گمبھیر لہجے میں پوچھتا وہ اس کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا اس کے ہاتھ میں گجروں کا تھال تھا' وہ گھبرا گئی۔

"بتاؤ نا۔" آنکھوں میں شرارت لیے وہ اس کی حالت کا مزہ لے رہا تھا۔

"شاہ رخ! کہاں ہو تم؟" پیچھے سے کسی نے آواز دی۔

"یہ پہن لینا' تمہارے ہاتھ میں آکر سج جائیں گے۔" دو گجرے اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے وہ تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں اتر گیا۔ صلہ ہکا بکا اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔

"یہاں کیوں کھڑی ہو؟" تمنا اسے ہی ڈھونڈنے نیچے آرہی تھی' اسے سیڑھیوں کے بیچ کھڑا دیکھ کر حیران ہوئی۔

"لاؤ میں پہنا دوں۔" اس کے منع کرنے سے پہلے وہ گجرے اس کی کلائیوں میں سجا کر اسے اپنے ساتھ اوپر لے آئی اور ڈھولک کے پاس لا بٹھایا' وہ تالیاں بجا رہی تھی' جب ذرا دیر بعد شاہ رخ اوپر آیا' اس کے ہاتھوں میں گجرے دیکھ کر وہ مسکرا دیا' اس نے جلدی سے ہاتھ دوپٹے میں چھپا لیے۔ اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

وہ جھینپ کر وہاں سے اٹھ گئی' مگر ساری تقریب میں شاہ رخ کی شوخ نظروں نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ رات کے جب وہ لوگ واپس لوٹے تو میک اپ صاف کر کے جیولری اتارتے ہوئے گجرے اتارے بغیر وہ بستر پر آ کر لیٹ گئی۔

آج چودھویں کی رات تھی۔ کھلی کھڑکی میں سے جھلکتی چاندنی نے بیڈ کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ چاندنی اور گجروں کی مہک نے کتنی ہی دیر نیند کا راستہ روکے رکھا تھا۔

www.paksociety.com

٭ ٭ ٭

پھر صرف اس رات ہی نہیں بلکہ مہندی، رخصتی یہاں تک کہ ولیمہ کے فنکشن پر بھی صلہ کے لاکھ کترانے کے باوجود شاہ رخ اسے کہیں نہ کہیں اکیلا جا لیتا اور دو گجرے اس کی ہتھیلیوں پر رکھ کر دل کے تاروں کو چھیڑنے والا کوئی نہ کوئی جملہ کہہ جاتا جس کے زیر اثر اسے ساری ساری رات نیند نہیں آتی تھی۔

اس وقت وہ سب ڈائننگ روم میں ناشتا کر رہے تھے۔ صائمہ آملیٹ کی پلیٹ میز پر رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ "کیا ہوا صلہ! رات کو نیند ٹھیک سے نہیں آئی؟"

"دراصل جگہ کی تبدیلی کی وجہ سے پورا ہفتہ میں ٹھیک سے سو نہیں سکی۔" اس نے آنکھیں چرائیں مبادا ان میں پنہاں بھیدوں کی بھنک انہیں پڑ جائے۔ "اب گھر جاؤں گی تو خوب سوؤں گی۔" وہ خواہ مخواہ آنکھیں ملنے لگی۔

"کیوں بھئی؟ ابھی تو تمہاری چھٹیاں باقی ہیں، رہو نا کچھ دن اور ابھی تو تم نے لاہور کی سیر بھی نہیں کی۔" منیر بھائی چائے کا کپ اٹھاتے بولے۔

"کوئی لے کر جائے گا تو سیر کرنے جائے گی اب بچی اکیلے تو جانے سے رہی، تمہیں تو اپنے مریضوں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔" پھوپھو بیٹے کی ہر وقت کی مصروفیت سے خائف رہتی تھیں۔ ناراض ہو کر بولیں۔

"اچھا تو پھر کل اتوار ہے، شاہی قلعے میں پکنک کا پروگرام رکھ لیتے ہیں کیا خیال ہے؟" انہوں نے ماں کی ناراضی دور کرنے کے لیے فوراً پروگرام بنایا۔

"بہت نیک خیال ہے۔" صائمہ مسکرائی۔

"تم یوں کرو صلہ! فون کر کے ممانی اور تمنا کو بھی ساتھ چلنے کا کہہ دو۔" صلہ چائے کا کپ لے کر لاؤنج میں چلی آئی اور فون کے پاس رکھی ڈائری میں سے لمبنہ (?) خالہ کا نمبر تلاش کر کے فون ملایا۔ مسلسل بیل جا رہی تھی مگر کوئی اٹھانے کا نام نہیں لے رہا تھا وہ تنگ آ کر ریسیور رکھنے کو تھی کہ دوسری طرف فون اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو!" شاہ رخ کی آواز ایئر پیس سے ابھری۔ اس کی دھڑکن بڑھ گئی۔

"مجھے تمنا سے بات کرنی ہے۔" پل بھر کی خاموشی کے بعد وہ قدرے جھجک کر بولی۔

"مجھ سے کیوں نہیں؟" آواز پہچان کر وہ شوخ ہوا۔

"پلیز!" "آپی ادھر آ رہی تھیں" اس نے منت کی۔

"ہیلو! تم بھی کیا یاد کرو گی۔" اس پر ترس کھا کر اس نے تمنا کو بلا دیا۔ پکنک کا سن کر وہ حسب توقع خوش ہو گئی۔ سارا دن صائمہ پکنک کی تیاریوں میں مصروف رہی۔ وہ بھی کھانے بنانے میں اس کی برابر مدد کرتی رہی۔

رات کو تھکن سے چور ہو چکی تھی۔ آج اماں اس کے ساتھ سوئی تھیں ان کا احترام تھا یا رعب اس کے خیالوں کی رو بھٹک نہ سکی، وہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگیں۔ اسے فوراً نیند نے آ لیا۔ بھرپور نیند لینے کی وجہ سے اگلی صبح وہ بہت تر و تازہ تھی۔

گلابی کلیوں والے فراک پر گلابی لائننگ والا کاسنی ٹراؤزر اور ایسا ہی شیفون کا دوپٹا اوڑھے کر بالوں کو بینڈ میں جکڑ کر وہ سب سے پہلے تیار ہو گئی تھی۔ چچی کو لینے کے لیے گاڑی لمبنہ خالہ کے گھر کے آگے جا کر رکی تو وہ متلاشی نظروں سے گھر کے در و دیوار تکنے لگی۔ مگر شاہ رخ کہیں نظر نہیں آیا۔ تمنا کا دل باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔ مگر صلہ نہ جانے کہاں کھوئی کھوئی سی تھی۔ اس کی یہ کھوئی کھوئی کیفیت مینار پاکستان کی بلندی سے شہر کا نظارہ کرتے، مزار اقبال پر فاتحہ پڑھتے، پر وقار بادشاہی مسجد میں ننگے پاؤں گھومتے، شاہی قلعے کے سبزہ زار میں پکنک مناتے، تیمور اور منیر بھائی کے ساتھ کار روز کھیلتے ہوئے سارا دن برقرار رہی تھی۔

اپنی ہی دھن میں باتیں کرتے قلعے کی سیڑھیاں اتر کر تمنا نے پہلو میں دیکھا تو صلہ نہیں تھی۔ اس نے

گردن گھمائی، زرد آسمان پر کونجوں کی ڈار بہت طویل تھی، اس کے نیچے شان دار قلعہ بہت خاموش اور پرسکون لگ رہا تھا۔ صلہ ایک ہاتھ قلعے کے دروازے پر رکھے، گردن اٹھائے بہت غور سے آسمان کی وسعتیں کھوج رہی تھی۔

"صلہ! وہاں کیوں کھڑی ہو کیا واپس نہیں چلنا؟" تمنا نے آواز لگائی۔ وہ چونکی اور سبج سبج سیڑھیاں اترنے لگی سیڑھی اترتے ہوئے اس کا فراک لمحہ بھر کو پھولتا پھر گر جاتا اس کی ہر ہر جنبش کو بغور دیکھتے ہوئے تمنا کو اس پر کسی مغلیہ شہزادی کا گمان گزرا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے جھٹکے سے گردن موڑ لی۔

٭ ٭ ٭

افراتفری سی افراتفری تھی، ہر کوئی جلدی میں تھا، انسانوں کا بے چین ہجوم، طرح طرح کے چہرے، ریل گاڑی کی سیٹی میں گم ہوتی باتوں کی آوازیں، جگہ جگہ نظر آتے لال وردی میں نمایاں ہوتے، مضبوط قوت ارادی، سخت کھردرے ہاتھوں، پرسکون چہروں اور تیز چال والے قلی، ریلوے اسٹیشن کا منظر وہی روایتی سا تھا۔

گاڑی چلنے میں ابھی تھوڑی دیر تھی، اماں وضو کرنے گئی تھیں۔ ان کی خواہش پر واپسی کا سفر بس کے بجائے ریل سے ہونے والا تھا۔ صلہ بینچ پر بیٹھی اشتیاق سے اسٹیشن کی گہما گہمی کا جائزہ لے رہی تھی، منیر بھائی ذرا فاصلے پر کھڑے سامان کے لیے قلی سے بات کر رہے تھے۔ تمنا اور چچی ماہتاب آپی کی سسرال ان سے ملنے گئی تھیں۔ انہوں نے وہاں سے سیدھا یہیں آنا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں آگے بھاگ رہی تھیں مگر وہ ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ اب تو منیر بھائی کو بھی بے چینی ہونے لگی تھی۔ ٹرین روانہ ہونے میں پانچ منٹ تھے۔ جب وہ لوگ سیڑھیاں اترتے نظر آئے۔ تیمور کے عقب میں شاہ رخ کو دیکھ کر صلہ طویل سانس بھر کر پرسکون سی ہو گئی۔ "آئیے ماہی جی!" اماں کو ساتھ لے کر منیر بھائی آگے بڑھے۔ چھوٹا بیگ اٹھا کر چادر سنبھالتی صلہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"شاہ رخ! تم یہ بڑا بیگ تم لو اور صلہ سے چھوٹا بیگ لے لو، آپ لوگ میرے ساتھ آئیے۔" منیر بھائی انہیں سانس درست کرنے کا موقع دیے بغیر لے کر آگے چل پڑے۔ شاہ رخ کی تو جیسے دلی مراد بر آئی، وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا سامان جھجک کر بینچ پر رکھ دیا اور خود آگے بڑھ گئی۔ منیر بھائی اور باقی سب ذرا آگے نکل گئے تھے۔ درمیان میں ہجوم بے کراں حائل تھا۔ شاہ رخ نے سامان اٹھا کر پل بھر کر سوچا اور اگلے ہی لمحہ دوڑتا ہوا اس کے پاس سے (X) چلا گیا۔ منیر بھائی سب کو ڈبے میں بٹھانے لگے وہ سامان رکھ کر واپس بھی آ گیا۔ صلہ تیز تیز چلنے کے باوجود بھی سب سے پیچھے رہ گئی تھی۔ شاہ رخ سانس درست کرتا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا، کہنے کو بہت کچھ تھا مگر وقت تھا کہ بھاگا جا رہا تھا۔ اس نے جیب سے دو گجرے نکالے اور دوسرے ہاتھ سے اس کی بھیگی ہتھیلی کھول کر اس پر رکھ دیے، صلہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آئی لو یو۔" تین لفظوں میں سب کچھ کہہ کر وہ دلکشی سے مسکرا دیا۔

صلہ بھاگ کر ٹرین میں سوار ہو گئی، عین اسی لمحہ وسل بجی اور ٹرین دھیرے دھیرے سرکنے لگی۔ جذبات سے مخمور آنکھوں سے وہ اسے دیکھے گیا۔ قندھاری انار کی طرح سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ صلہ کسی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پاتی تھی۔ اس لیے برتھ پر چڑھ کر گھٹنوں میں منہ دے کر بیٹھ گئی۔ چچی، اماں کو باتوں میں لگائے ہوئے تھیں۔ تیمور گیم میں مگن تھا، کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی، سوائے تمنا کے۔ وہ اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔ اسے ٹہوکا دیا، وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ اس کی حالت دیکھ کر تمنا ٹھٹک گئی، اس کی گود میں رکھے سرخ گلاب اور موتیا کے گجروں کا عکس اس کی آنکھوں میں جھلملاتے چہرے پر جھلکتے ہوئے بہت کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر تمنا یہ سب اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی اور اسے زیادہ

اصرار بھی نہیں کرتا پڑا' صلہ بھی ایک تجسس۔ بہت کی منتظر تھی۔ ٹرین کی جھک جھک میں وہ سرگوشیوں میں اسے سب کچھ بتانے لگی۔ تمنا مسکراتے ہوئے بہت دلچسپی سے شاہ رخ کی وارفتگیوں کا احوال سن رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

گھر میں ایک اور سرپرائز ان کا منتظر تھا۔ صنم کی شادی کا کارڈ جسے دیکھ کر دونوں کی چیخیں نکل گئیں۔ چھٹیوں سے پہلے تک نہ ہی صنم منگنی شدہ تھی اور نہ ہی اس کے رشتے کی کہیں بات چل رہی تھی' پھر یہ اچانک شادی کیسے؟ حیرت سی حیرت تھی۔

سب کچھ بھلا کر دونوں ہاسٹل روانہ ہوئیں' جہاں فارحہ ان کی منتظر تھی' ملتے ہی وہ' دو دھمو کے جڑ دیے۔

"یہ صنم کی طرف سے تھے۔" "مزے سے ہاتھ جھاڑ کر وہ بستر پر دراز ہو گئی۔ "صنم تم دونوں سے بہت ناراض تھی' اتنا انتظار کیا تھا اس نے تم دونوں کا۔"

"ہائے کاش! ہم لاہور نہ جاتے۔" صلہ کو افسوس ہوا۔

"اچھا۔" تمنا نے معنی خیز انداز میں آنکھیں مٹکائیں۔

"صنم کے سسرال والے کیسے ہیں؟" صلہ نے گھبرا کر بات پلٹ دی۔ "بہت بڑے زمین دار ہیں' اسی لیے تو صنم کے والدین نے فٹ سے رشتہ منظور کر لیا' ویسے سب پڑھے لکھے ہیں' اس کے ہسبنڈ ایگری کلچر انجینئر ہیں' ایک دیور ہے' وہ ڈاکٹر بن رہا ہے' نند بھی ایک ہی ہے' ہماری ہم عمر ہے' وہ بھی۔ ایف ایس سی کر رہی ہے۔ سب بہت اچھے ہیں۔" فارحہ تفصیل بتانے لگی۔ "چلو! صنم کی شادی کی خوشی میں گانے گاتے ہیں۔" تمنا کو جوش چڑھا۔ فارحہ میز بجا کر اور صلہ تالیاں پیٹ کر اس کا ساتھ دینے لگی۔

✲ ✲ ✲

"صلہ! کل میں نے خالہ کے گھر فون کیا تھا' شاہ رخ بھائی سے بات ہوئی' تمہارا پوچھ رہے تھے' میں نے انہیں تمہارا نمبر دے دیا' وہ تمہیں کال کریں گے۔"

"نہیں۔" صلہ کا گلا خشک اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ "یوں چوری چھپے فون پر بات کرنا اچھا نہیں لگتے گا' میں ان کی کال ریسیو نہیں کروں گی۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"تو بھلا اس میں برائی کیا ہے؟ وہ سیریس ہیں تمہارے ساتھ۔ شادی کرنا چاہتے ہیں تم سے' شادی سے پہلے ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے ایک دوسرے سے بات کرنا تو ضروری ہے۔" اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وہ اسے سمجھانے لگی۔

"مگر۔" اس کا دل راضی نہیں ہو رہا تھا۔

"اگر مگر چھوڑو اور چلو' بائیو کا پیریڈ ہو گیا ہے۔" دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

سارا دن کلاس روم میں سرگوشیوں کی صورت' کینٹین میں سموسوں سے انصاف کرتے ہوئے' لائبریری میں نوٹس بناتے وقت تمنا اسے قائل کرنے میں لگی رہی۔ آج تو فارحہ بھی گھر گئی ہوئی تھی' رات کو دونوں پڑھنے بیٹھیں تو تمنا الماری سے صلہ کا موبائل نکال لائی' فرسٹ ایئر میں اچھے نمبر لینے پر تایا ابا نے مقدا سے بطور خاص اس کے لیے بھیجا تھا۔ (ان دنوں موبائل اتنے عام نہیں ہوئے تھے۔) نہ چاہتے ہوئے بھی صلہ کی ساری توجہ کتاب سے زیادہ بے جان پڑے فون پر تھی۔ فون ایک نمبر چمکنے لگا' وہ الجھی نظروں سے دیکھنے لگی۔

اٹھاؤ بات نہیں۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ تمنا نے اسے متذبذب دیکھ کر خود ہی فون آن کر کے اس کے کان سے لگا دیا۔

"ہیلو!" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"شکریہ۔ تم نے بات تو کی۔" شاہ رخ کی آواز جذبات سے مغلوب تھی۔ اس کے پاس کرنے کو بہت سی باتیں تھیں' وہ چپ چاپ سنتی رہی' اس کی باتیں سننا اچھا لگ رہا تھا۔ تمنا اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر پورے انہماک سے پڑھ رہی تھی۔

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening ,or you find any issue in using site send your complaint at
admin@paksociety.com
or
send message at
0336 5557121
www.Paksociety.com

وہ روز اس سے بات کرنے کا متمنی تھا مگر وہ اس کے نمبر نہیں دیتی تھی۔ تمنا کے بے حد سمجھانے اور شاہ رخ کے بے حد اصرار پر بہتے میں صرف ایک بار بات کرنے پر راضی ہوئی تھی، مگر باقی کا سارا ہفتہ اس کی باتوں کی بازگشت اس کے کانوں میں رس گھولتی رہتی تھی، شاہ رخ اس کی مدح سرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا تھا۔

"کیا واقعی میں اتنی خوب صورت ہوں؟" وہ گھبرا کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوتی، عارضوں کے گلال اور آنکھوں میں ستاروں سی چمک دیکھ کر خود سے نظر ملانا مشکل ہو جاتا۔ وہ ہر چیز یہاں تک کہ پڑھائی تک سے لاپروا ہوتی جا رہی تھی۔ تمنا کے نمبر ہر ٹیسٹ میں اس سے زیادہ آنے لگے تھے۔ ہاں مگر شاہ رخ کے معاملے میں بہت احتیاط برت رہی تھی، تمنا اس کا پورا ساتھ دیتی تھی، جب کبھی شاہ رخ کا فون آنے والا ہوتا، وہ فارحہ کو لے کر باہر لان میں چلی جاتی، مگر کہتے ہیں نا عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔

✡ ✡ ✡

فارحہ کافی دنوں سے صلہ کے بدلے بدلے اطوار دیکھ رہی تھی۔ ہر وقت وہ نہ جانے کن سوچوں میں مگن رہتی تھی، پڑھائی کی طرف سے بھی کافی لاپروا ہو گئی تھی، خوب صورت تو پہلے بھی بہت تھی، مگر اب تو دن بدن یوں نکھرتی جا رہی تھی کہ اس پر نظر ٹھہرانا مشکل تھا۔ کل رات اسے اندر آتا دیکھ کر اس نے جس تیزی سے موبائل بند کر کے تکیے کے نیچے گھمایا تھا وہ بری طرح ٹھٹک گئی تھی۔ وہ صلہ میر کو اچھی طرح جانتی تھی، وہ بہت سیدھی سادی اور اچھی لڑکی تھی۔ ڈیڑھ سال کے دن رات کے ساتھ میں اس نے صلہ کے کردار میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ برا سنا تھا، پھر ایک دم سے یہ سب......

فارحہ سے اس کے بدلے تیور ہضم نہیں ہو رہے تھے۔ "بدگمان ہونے سے بہتر ہے میں صلہ سے جا کر صاف صاف پوچھ لوں۔" بال بناتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا اور باہر چلی آئی۔ شام کے وقت ہاسٹل کی ساری لڑکیاں لان میں امڈ آتی تھیں۔ صلہ اور تمنا بھی لان کے بیچوں بیچ بند فوارے کی منڈیر پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

"صلہ! اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟" وہ اچک کر دونوں کے درمیان بیٹھتے ہوئے بولی۔

"اجازت ہے۔" صلہ بہت اچھے موڈ میں تھی، شاہانہ انداز میں بولی۔

"تم کل میرے آنے سے پہلے فون پر کس سے بات کر رہی تھیں؟" صلہ کا فق ہوتا رنگ اسے بہت کچھ بتا گیا۔

"دوست ہوں تمہاری، مجھے نہیں بتاؤ گی؟" اس نے مان سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا، شرم اور جھجک سے صلہ کا سر جھک گیا۔

"میں بتاتی ہوں۔" کچھ سوچ کر تمنا نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

"مائی گاڈ!" وہ چیخ اٹھی۔ "صلہ! تم تو واقعی ہیروئن کی طرح خوب صورت ہو، کیا شاہ رخ بھائی بھی کہانیوں کے ہیرو کی طرح شان دار ہیں، بتاؤ نا؟" اب وہ مزے سے اسے چھیڑ رہی تھی۔

"ارے اس سے کیا پوچھتی ہو، اس کی آنکھوں میں دیکھ لو، ان کا عکس نظر آ جائے گا۔" تمنا بھی اس کے ساتھ مل کر صلہ کو گدگدانے لگی، وہ بس دونوں کو گھور کر رہ گئی۔

✡ ✡ ✡

صلہ چاہ کر بھی اپنی پڑھائی کی طرف پہلی سی توجہ نہیں دے پا رہی تھی، شاہ رخ بھی کم جذباتی نہیں تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا آنکھیں بند کر کے کھولے تو صلہ اس کے سامنے ہو۔ اب بھی کمرے میں ٹہلتے ہوئے وہ مسلسل صلہ کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔

"مجھے امی سے بات کرنا چاہیے اور کچھ نہیں تو کم از کم صلہ سے میری منگنی ہی کر دیں۔" مختصر بھر کمرہ ناپنے

کے بعد اسے یہی حل سوجھا تھا، وہ مسکراتے ہوئے جلدی جلدی سیڑھیاں اترتا نیچے چلا آیا۔ امینہ بیگم لاؤنج میں فون پر ماہتاب سے باتیں کر رہی تھیں۔

"امی! مجھے آپ سے بات کرنا ہے۔" وہ لاڈ سے ان کے گلے میں باہیں ڈال کر جھول گیا۔

"میں ذرا ماہتاب سے بات کر لوں میری جان!" انہوں نے پیار سے اکلوتے لاڈلے کا گال تھپتھپایا۔ بات مکمل کر کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"بولو کیا چاہیے نا؟" وہ انداز سے سمجھ گئی تھیں ان کے لاڈلے کو کوئی فرمائش کرنا ہے۔

"صلہ میر۔" وہ چمکتی آنکھوں سے مسکرایا۔

"کیا؟" وہ جو موبائل کے کسی نئے ماڈل یا پیسوں کی فرمائش سننے کی منتظر تھیں، حیرت سے اچھل پڑیں۔

"امی! میں تمنا کی کزن صلہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے بہت اطمینان سے ان کا سکون غارت کیا۔

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا!" انہیں غصہ آ گیا۔

"سو فیصد ٹھیک ہے، مجھے پتا ہے اب آپ کہیں گی کہ میری عمر نہیں شادی کی، ابھی پڑھائی پر توجہ دوں وغیرہ وغیرہ تو ٹھیک ہے شادی نہ کریں ابھی پر منگنی تو کر دیں، پلیز امی! میں صلہ سے بہت محبت کرتا ہوں، اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

وہ یوں منت کر رہا تھا جیسے دکان میں شوکیس پر سجی کسی گڑیا کا خواہاں ہو، امینہ بیگم کھول کر رہ گئیں، بچپن کی طرح مرجان بیگم سے انہیں بھی شدید چڑ تھی، وہ بھلا کیسے ان کی بیٹی کو بہو بنا سکتی تھیں، ویسے بھی ان کا شمار ان ماؤں میں ہوتا تھا جو بچوں کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے ہوئے ان کے ہر فیصلے خود کرنے کی عادی ہوتی ہیں، شاہ رخ اگر صلہ کے بجائے کسی اور لڑکی کا بھی نام لیتا تب بھی وہ اسے مر کر بھی اپنی بہو نہ بناتیں۔

"آپ چپ کیوں ہیں امی! بتائیں نا میرا پروپوزل لے کر صلہ کے گھر کب جا رہی ہیں؟" اس کے لہجے میں ضد تھی۔

امینہ بیگم نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا، جانتی تھیں صاف انکار کر دیا تو وہ ضد پر اتر آئے گا، آخر کو ان ہی کا بیٹا تھا۔

"بیٹا! ایسے معاملات میں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمائی جاتی، ہم اس معاملے پر بعد میں بات کریں گے۔" اندر اٹھتے ابال پر قابو پاتے ہوئے وہ بدقت مسکرائیں، صاف انکار کر دیتیں تو ہنگامہ کھڑا کر دیتا، وہ اس کی رگ رگ سے واقف تھیں، جانتی تھیں اسے کیسے ہینڈل کر کے محبت کا بخار اس کے دماغ سے اتارنا ہے۔

"مگر امی۔" وہ ٹھنکا۔

"یہ لو پانچ ہزار، کل مانگ رہے تھے نا تم۔" وہ پیسے اس کی طرف بڑھا کر خود کھانا بنانے چلی گئیں۔

شاہ رخ کو بھی دو، چار کام یاد آ گئے، جو ان پیسوں سے پایہ تکمیل تک پہنچانے تھے، وہ بھی معاملہ کل پر اٹھا کر سیٹی بجاتا بائیک لے کر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد امینہ بیگم بہن سے ہاسٹل کا نمبر لے کر تمنا سے بات کر رہی تھیں۔

✡ ✡ ✡

"اف میرے خدایا۔" ناشتے کی میز پر اخبار پڑھتے پڑھتے امینہ بیگم سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

"کیا ہوا امی؟" توس پر جیم لگانا چھوڑ کر شاہ رخ ہیڈ فون اتارتا ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"تو خود ہی پڑھ لو۔" انہوں نے ایک خبر کی طرف اشارہ کر کے اخبار ان کی طرف بڑھایا۔

"بھائی نے لڑکی کے پیچھے سگے بھائی کا قتل کر ڈالا۔" ہیڈ لائن پڑھ کر اس نے جھرجھری لی اور سرسری نظر اندر خبر پر ڈالی۔

"ایک لڑکی موبائل پر بیک وقت دو بھائیوں سے فلرٹ کر رہی تھی، جب یہ بات دونوں بھائیوں کے علم میں آئی تو آپس کی نا چاقی اتنی بڑھ گئی کہ ایک کو قبر اور دوسرے کو جیل جانا پڑا۔"

"یہ لڑکیاں ہیں یا پھل جھڑیاں، کی بات ہے بھئی! جو لڑکیاں موبائل استعمال کرتی ہیں مجھے تو ان کے

www.Paksociety.com

کردار و اطوار کا کوئی بھروسا نہیں۔ ٹائم پاس کرنے کی غرض سے نہ جانے کتنوں کو پھانس رکھا ہوتا ہے۔ دوسری طرف کم عقل لڑکے خود کو ہیرو سمجھتے ہوئے ایسی گھٹیا لڑکیوں کے لیے والدین تک سے ٹکرا جاتے ہیں۔ نادان ذرا نہیں سوچتے۔ آج جو لڑکی ماں باپ کے اعتماد کی دھجیاں اڑاتے ہوئے کھنٹوں ان سے بات کررہی ہے۔ کل کو شادی کے بعد ان سے بے وفائی کرتے ہوئے کسی اور کے ساتھ ٹائم پاس کرنا ایسی لڑکی کے لیے بھلا کیا مشکل ہوگا۔"

وہ ایک ایک لفظ بطور خاص شاہ رخ کو سنا رہی تھیں۔ (ان دنوں موبائل اتنا عام نہیں ہوا تھا لڑکیوں کے پاس شاذ و نادر ہوتا تھا۔)

"لعنت بھیجیں ایسی گھٹیا لڑکیوں پر اور ناشتا کریں۔" وہ سر جھٹک کر ناشتے میں مصروف ہوگیا۔ امہنہ بیگم بھی ناشتا کرنے لگیں۔ مگر بات کو چھوڑا نہیں۔

آئے دن اخبارات میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے واقعات پڑھواتیں۔ لڑکیوں کی بے وفائیوں کے قصے ان کی نادانیوں سے برپا ہونے والے فساد کی خبریں ان پر بننے والی کرائم اسٹوریز کی طرف اس کی توجہ مبذول کرواتیں۔ وہ جب بھی صلہ کا ذکر چھیڑتا وہ ایسے واقعات کی باتیں لے بیٹھتیں۔

"امی! آپ یہ سب مجھے کیوں بتاتی ہیں؟" وہ جھنجلا جاتا۔

"اس لیے کہ میرا بیٹا بہت بھولا ہے۔ ایسی باتوں سے تھوڑی عقل سیکھے۔"

وہ پیار سے اس کے بال بگاڑتیں۔ وہ کانوں کا بہت کچا تھا۔ امہنہ بیگم اس کی نفسیات سمجھتی تھیں۔ انہوں نے اس کا ذہن بدلنے کا عمل پوری پلاننگ اور تیاری سے جاری رکھا۔ مطلوبہ نتائج ان کی توقع سے بھی پہلے انہیں ملنے لگے۔ اب تو شاہ رخ خود ایسی خبروں میں لاشعوری طور پر دلچسپی لینے لگا تھا۔ جہاں بھی کسی لڑکی کو دیکھتا اس کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیں لہرا جاتی۔ یہاں تک کہ وہ ایک دن ماہتاب تک سے الجھ پڑا

کہ وہ گھر میں فون ہوتے ہوئے موبائل کیوں رکھتی ہے۔ وہ چھوٹے بھائی کی اس بازپرس پر آگ بگولا ہو کر غصے سے چلی گئی۔ مگر امہنہ بیگم نے شاہ رخ کو ڈانٹا تک نہیں۔ بلکہ انہیں لگا کہ ان کی محنت اب رنگ لا چکی ہے۔ اب انہوں نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کا فیصلہ کیا۔

وہ کی چین انگلیوں میں گھماتا سیڑھیاں چڑھ کر کمرے میں جارہا تھا۔ انہوں نے اسے آواز دی۔ "شاہ رخ بیٹا! فریش ہو کر ذرا میری بات تو سننا۔"

"جی امی!" کچھ دیر بعد گیلے بالوں میں انگلیاں چلاتا وہ ان کے سامنے بیٹھا تھا۔

"میں صلہ کے بارے میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"ضرور۔" صلہ کے نام سے ہی اس کی آنکھوں میں جگنوؤں کی بارات اتر آئی تھی۔

"تم صلہ میر کے کردار سے مطمئن ہو بیٹا؟" چائے کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"جی... میں سمجھا نہیں آپ کی بات۔" وہ حیرت سے الجھ کر بولا۔

"کیا ایک باکردار لڑکی یوں رات کی تنہائی میں کسی غیر محرم لڑکے سے بات کرسکتی ہے؟" ان کا لہجہ بہت ٹھنڈا تھا۔ وہ تڑپ اٹھا۔

"امی وہ کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے وہ تو مجھ سے بھی بہت جھجک کر بات کرتی ہے۔ وہ بھی میرے بہت مجبور کرنے پر۔"

"کسی اور کے مجبور کرنے پر اس سے بھی تو بات کرسکتی ہے۔ کیا پتا کرتی بھی ہو۔" ان کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔

"صلہ ایسی نہیں ہے۔" کمزور لہجے میں خود کلامی کرتے ہوئے اس نے ماں سے زیادہ خود کو یقین دلانا چاہا تھا۔

"کتنا جانتے ہو تم اسے؟ ماہتاب کی شادی میں اس سے ملے۔ چند بار فون پر باتیں کیں اور جان گئے؟" وہ

استہزائیہ انداز میں مسکرائیں۔

شاہ رخ کی نظریں جھک گئیں۔ واقعی وہ جانتا ہی کتنا تھا صلہ کو؟

"بتاؤ نا بیٹا! کیا ایک پاک باز اور باکردار لڑکی اپنے ماں باپ کے اعتماد کی دھجیاں اڑاتے ہوئے ایک نامحرم سے فون پر باتیں کرسکتی ہے بھلا؟" انہوں نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ اتنے دنوں سے اخباروں میں پڑھی، ٹی وی پر دیکھی عورت کی بدکرداری و بے وفائی کی داستانیں اس کی نظروں میں گھوم گئیں۔ ہر عورت کے کندھوں پر اسے صلہ کا چہرہ نظر آرہا تھا۔

"نہیں۔" شکستہ لہجے میں اعتراف کرتے ہوئے وہ خود بھی اندر تک ٹوٹا تھا۔ دل کی کرچیاں آنکھوں میں نمی بھر لائی تھیں۔ اس کی حالت دیکھ کر امہنہ بیگم کو افسوس ہوا مگر صرف لمحہ بھر کو۔

"خود سوچو شاہ رخ! جو لڑکی اپنے ماں باپ کے ساتھ وفادار نہیں بھلا تم سے کیا ہوگی۔ تم سے بات کرنے کے بعد نہ جانے کتنوں سے کرتی ہوگی۔ اس کے لیے یہ سب صرف ٹائم پاس ہوگا اور تم اتنے معصوم کہ سنجیدہ ہو چلے۔" وہ اس کا ہاتھ پیار سے سہلاتے ہوئے بہت دیر تک سمجھاتی رہیں۔

"اب بھی اگر تم چاہتے ہو کہ ایک بدکردار اور آوارہ لڑکی اس گھر کی بہو بنے تو مجھے بتا دینا۔ میں تمہارا رشتہ لے کر چلی جاؤں گی کیونکہ مجھے ہر حال میں تمہاری خوشی عزیز ہے میری جان!" بظاہر اس کے بال بکھیرتی مگر درحقیقت اس کی ذات کو بکھیر کر وہ سونے چلی گئیں۔

وہ ساری رات شاہ رخ نے وہیں بیٹھے بیٹھے جلتی آنکھوں سے کاٹی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ایک طرف صلہ میر کی بھولی صورت، جھجکتی آواز، معصوم باتیں اس کے متعلق قائم ہر مفروضے کی نفی کرتی تھیں تو دوسری طرف امی کی باتیں بھی شک کی عینک لگا کر دیکھنے سے حرف بحرف سچ محسوس ہو رہی تھیں۔ دن کی سپیدی پھیلنا شروع ہوئی تو آخرکار وہ ایک فیصلے پر پہنچ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے صلہ میر کے

کردار کی ضمانت تمنا میر سے طلب کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

❁ ❁ ❁

کمرے میں اندھیرا تھا اور صلہ کی آنکھوں میں بے یقینی جو اندھیرے سے بھی زیادہ گہری تھی۔ وہ چھٹی پر گھر آئی ہوئی تھی۔ پیپر قریب تھے۔ اس کا ارادہ خوب دل لگا کر پڑھنے کا تھا۔ اب تو شاہ رخ کا فون بھی بہت کم آتا تھا۔ تمنا بتا رہی تھی شاہ رخ کے بھی پیپر ہونے والے ہیں۔ "شاید وہ مصروف ہو۔" اس نے خود کو تسلی دے لی تھی۔ وہ اپنے لیے چائے بنا کر کپ میں نکال رہی تھی۔ جب پاس رکھا فون جگمگانے لگا۔ وہ اپنے خیالوں میں محو تھی، چونکی تو ہاتھ بہک گیا اور گرم گرم چائے ہاتھ جلا گئی۔ اسکرین پر شاہ رخ کا نام چمک رہا تھا۔ وہ تکلیف بھول کر جلتے ہاتھ سے فون کان پر لگاتی اندر چلی آئی۔ مگر شاہ رخ کے لفظ تھے یا انگارے جنہوں نے اس کی روح تک کو جلا کر خاکستر کردیا تھا۔

اس کے ہیلو کے جواب میں وہ شروع ہوگیا تھا۔

"صلہ میر! تم سے پیار میری زندگی کی سب سے بڑی بھول تھی۔ گھن آتی ہے مجھے خود سے، کیسے میں نے اپنے سچے جذبوں کو تم سی بدکردار فلرٹ لڑکی کے نام کیا۔" وہ کیا کہہ رہا تھا اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"شاہ رخ! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"تمہیں آئینہ دکھا رہا ہوں صلہ میر! آئینہ۔" وہ چیخا۔

"ارے تم جیسی لڑکی اور طوائف میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ رات کی تاریکی میں بدنام زمانہ جگہوں پر بیٹھ کر مردوں کو رجھانے کا کام کرتی ہے اور تم جیسی لڑکیاں عزت دار گھرانوں کی چھتوں کے نیچے ماں باپ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر موبائل پر یہ کام کرتی ہیں۔ ارے وہ تم سے تو وہ عورت ہی بھلی، تمہاری طرح شرافت کا ڈھونگ تو نہیں رچاتی۔"

وہ زہر آلود لہجے میں زہر جیسے لفظوں سے اس کے کردار ہی کی نہیں ذات کی بھی دھجیاں اڑا رہا تھا، صلہ پتھرائی تھی۔

"مجھے تم سے نفرت ہے صلہ میرا! نفرت۔ سنا تم نے بدکردار، پیچ، ذلیل لڑکی۔" ہذیانی انداز میں چیخ چیخ کر جب وہ تھک گیا تو فون دیوار پر مار کر پرزے پرزے کر دیا۔

پھٹی پھٹی آنکھوں میں بے یقینی بھرے پتھر ہوئی صلہ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ فون آف کر سکے، بے یقینی اتنی تھی کہ ہوش و حواس ساتھ چھوڑ گئے، وہ بستر پر بیٹھے بیٹھے لڑھک گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

مرجان بیگم صلہ کے سرہانے بیٹھی ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھیں۔ اسے بخار میں پھنکتے آج تیسرا دن تھا۔ ابھی ابھی شاہینہ بیگم یہاں سے اٹھ کر گئی تھیں، پتا نہیں کیسی عجیب عجیب ناقابل فہم باتیں کر رہی تھیں۔

"بھابھی بیگم! آپ کی فہم و فراست کا تو سارا خاندان گرویدہ تھا، صلہ کی دفعہ کیا گولیاں پھانک کر سوئی تھیں یا جان بوجھ کر چشم پوشی کی؟"

ایک نظر بے سدھ پڑی صلہ پر ڈال کر انہوں نے طنز کا تیر چھوڑا تھا۔

"کیا مطلب؟" بات مرجان بیگم کے سر پر سے گزر گئی تھی۔

"تو جی! بیٹی کے کرتوت سارے خاندان میں نشر ہو چکے اور اماں پوچھتی ہیں کیا مطلب۔" "خدا وند موت" بلائے طاق رکھتے ہوئے انہوں نے قہقہہ لگایا تھا۔

"امی! تنزیلہ آپی کا فون ہے، جلدی آئیے۔" ان کی مزید گل افشانی سے پہلے تیمور انہیں بلانے آگیا تھا۔

"چلتی ہوں۔ آپ بس بیٹھ کر اللہ اللہ کیجیے۔" تنفر سے کہتی انہیں ہکا بکا چھوڑ کر وہ چلی گئی تھیں۔ صلہ کے کراہنے پر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی، مگر ذہن بدستور دیورانی کی باتوں میں الجھا تھا جو اتنی معمولی تو

ہرگز نہیں تھیں کہ انہیں نظر انداز کیا جا سکے۔ شام کی فلائٹ سے صائمہ کی بغیر اطلاع غیر متوقع آمد نے انہیں حیران ہی نہیں پریشان بھی کر دیا۔

"صلہ کہاں ہے اماں؟" سلام دعا کے بغیر اس نے آتے ہی صلہ کا پوچھا، چہرے کے تاثرات سنگین تر تھے۔

"کیا ہوا صائمہ! سب ٹھیک تو ہے؟" انہونی کے خدشے نے انہیں دہلایا۔

"کچھ ٹھیک نہیں اماں! کچھ بھی ٹھیک نہیں، صلہ نے ہمیں ذلیل کروا دیا ہے، کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا۔" ان کے گلے لگ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

واش روم کے دروازے سے باہر نکلتی صلہ ادھر ہی ٹھٹک گئی، اس کے جسم کی لرزش بہت واضح تھی۔

"کیا کیا صلہ نے؟ کوئی مجھے تو بتائے۔" اماں گھبرا کر چلائیں، صائمہ نے جھلتی نظر صلہ پر ڈالی۔

"کل امینہ خالہ آئی تھیں میرے گھر، کوئی بھرے چوک میں مجھے دس جوتے مار لیتا، مجھے اتنی ذلت نہ سہنا پڑتی، جتنا ذلیل وہ مجھے کر کے گئی ہیں۔"

"آخر ہوا کیا؟" اماں جھنجلا اٹھیں۔

"وہ کہہ رہی تھیں ماہتاب کی شادی پر صلہ نے ادائیں دکھا کر ان کے اکلوتے بیٹے شاہ رخ کو پھانس لیا، جاتے جاتے اپنا موبائل نمبر بھی اسے دے گئی میں تو مر کر بھی ان کی باتوں کا یقین نہیں کر سکتی تھی اماں، میں نے انہیں برا بھلا کہہ کر جھٹلانا چاہا تو انہوں نے شاہ رخ کا موبائل مجھے پکڑا دیا، کال لسٹ دیکھ کر میری زبان ہی نہیں عقل بھی پتھرا گئی۔"

اتنا کہہ کر احساس ذلت سے وہ پھر بلک کر رو دی۔ اماں یوں دم سادھے اس کی بات سن رہی تھیں کہ ان پر پتھر کا گمان ہوتا تھا، جبکہ صلہ کا بس نہیں چلتا تھا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

"صرف یہی نہیں اماں! وہ کہہ رہی تھیں صلہ تو شاہ رخ کے ساتھ بھاگنے پر تیار تھی، جب لڑکی خود کو پلیٹ میں رکھ کر پیش کرے تو بھلا لڑکا کیونکر انکار کر سکتا ہے۔"

دونوں نے بھاگ کر کورٹ میرج کرنے کا پورا پروگرام بنایا تھا، تاریخ تک طے ہو چکی تھی، مگر تمنا نے انہیں ہوشیار کر دیا، وہ کہنے آئی تھیں اپنے بیٹے کو تو میں نے قابو کر لیا ہے، اب اپنی بسن کو لگام ڈالو، شاہ رخ کے علاوہ بھی کئی لڑکوں سے چکر چلا رکھے ہیں۔"

من و عن امینہ خالہ کی باتیں دہراتے اس کی آواز ہی نہیں، وہ خود بھی احساس ذلت سے کانپ رہی تھی۔ ان جیسے لوگوں کے لیے عزت کے سوا بھلا عمر بھر کی کمائی ہوتی ہی کیا ہے۔

"آپی! یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں اور اس دن فون پر شاہ رخ کے الفاظ کیا تھا یہ سب؟"

"جھوٹ ہے، بکواس ہے یہ، میرا یقین کریں، میں کبھی اتنا نہیں گر سکتی، میں مانتی ہوں، میں نے آپ لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے، غلطی کی ہے، تمنا نے شاہ رخ کو میرا نمبر دیا تھا، وہ مجھے فون کرتا تھا، میں اس سے بات کر لیتی تھی، اس فون پر بات کے سوا میں نے اور کوئی جرم نہیں کیا۔"

زار و قطار روتی آپی اور ساکت کھڑی اماں کو دیکھ کر وہ ہذیانی انداز میں چیخ اٹھی، آپی کی آنکھوں میں بے اعتباری کی تحریر اس کی روح پر کوڑے کی مانند لگی تھی۔

"اگر آپ کو میرا یقین نہیں تو تمنا سے پوچھ لیجیے۔" تمنا اس دوران نہ جانے کب یہاں آئی تھی، ستون کے پیچھے کھڑی سب سن رہی تھی، ماحول اتنا کشیدہ دیکھ کر پلٹنے کو تھی کہ صلہ کی اس پر نظر پڑ گئی، وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچ لائی۔

"دیکھو تمنا! یہ کیسے الزامات اور بہتان مجھ پر لگ رہے ہیں، بات کو کیا سے کیا بنا دیا گیا ہے۔ تم تو ہر بات سے واقف ہو، میری رازدار دوست ہو، بتاؤ نا حقیقت سب کو۔" چپ کھڑی تمنا کو جھنجھوڑتے ہوئے وہ بری طرح روئے جا رہی تھی، مگر تمنا کے ہونٹوں پہ تو جیسے قفل لگے تھے۔

"چپ کیوں ہو تمنا! بتاؤ نا۔" صائمہ نے اس سے پوچھا، اس کا دل کہتا تھا اس کی ماں جائی اتنا نہیں گر

سکتی، تمنا کی شہادت سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔

"کیا بتاؤں، جو حقیقت تھی، وہ امینہ خالہ نے آپ کو بتا تو دی، مزید کیا سننا چاہتی ہیں آپ؟" سفاکی سے کہتی وہ صلہ کے ہاتھوں سے اپنا بازو چھڑا کر بھاگتے ہوئے اس کی بے یقین نظروں سے دور ہوتی چلی گئی اور صلہ۔

وہ پورے قد سے زمین پر آگری، اس کا نروس بریک ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"دوستی اور اپنی ذات کا اعتبار میری زندگی میں سب سے زیادہ اہم تھا، اب نہ دوستی ہے اور نہ اعتبار، مگر اس کے باوجود میں زندہ ہوں۔"

صلہ نے قلم بند کر کے آسمان پر نظر ڈالی اور تلخی سے مسکرا دی۔ تین ماہ پہلے اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ پورا ایک ہفتہ وہ بے ہوش رہی تھی۔ اماں کی جان پر بنی تھی، رو رو کر اللہ کے حضور اس کی صحت و سلامتی کی دعا میں مانگتے نہیں تھکتی تھیں۔

مسقط میں ابا بھی بہت پریشان تھے۔ اماں نے صرف انہیں صلہ کی بیماری کی اطلاع دی تھی۔ وجہ سے آگاہ نہیں کیا تھا، یہ دن اماں نے حقیقتاً سولی پر گزارے تھے، صلہ کی بدنامیوں کی ہم نوا داستان ان کے خیر خواہوں کی بدولت سارے خاندان میں مشہور ہو چکی تھی، احباب، رشتہ دار، عیادت کی آڑ میں لفظوں کے پتھر سے انہیں سنگسار کرنے چلے آتے تھے، شاہینہ بیگم تو سفاکی کی ہر حد پھلانگتے ہوئے یہاں تک کہہ جاتی تھیں۔

"بھابھی بیگم! دعا کیجیے اس کو کبھی ہوش نہ آئے، مر جائے تو اچھا ہے، چند دن تک باتیں کر کے لوگ بھی بھول بھال جائیں گے، اگر زندہ رہی تو اس کی فکریں آپ کو زندہ در گور کر دیں گی۔"

اماں دل گرفتہ دل پر ہاتھ رکھ لیتی تھیں۔ صائمہ ابھی تک ادھر ہی تھی، مشینوں میں جکڑی صلہ کی معصوم

www.Paksociety.com

صورت دیکھ کر اسے خود پر غصہ آتا تھا کم از کم اسے تو بہن کی بات کا اعتبار کرنا چاہیے تھا کوئی کچھ بھی کہتا پھرے وہ تو اسے بچپن سے جانتی تھی۔ اس کی بے اعتباری ہی نے تو صلہ کو توڑ ڈالا تھا' وہ اس کی حالت کا ذمہ دار خود کو سمجھتی تھی' لوگوں کی انگارے اگلتی زبانیں تو نہیں پکڑ سکتی تھی' اس لیے ہر وقت روتی رہتی تھی۔

وہ امید سے تھی' بہن کی حالت کے پیش نظر اس نے داماد کو بلا کر اسے واپس بھیج دیا تھا۔ پھر بہت مناجاتوں اور منتوں کے بعد صلہ نے آنکھیں کھولی تھیں۔

"اماں! کیا آپ کو بھی میری بات کا یقین نہیں؟" شعور لوٹتے ہی اس کا سب سے پہلا سوال یہی تھا۔

"میری جان! مجھے تجھ پر پورا بھروسا ہے۔" اس کے ماتھے کا بوسہ لیتے ہوئے انہوں نے یقین دلایا تھا۔ آنکھوں سے بہتے سیل رواں کو دونوں ماں بیٹی نے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی' ہچکیوں کے درمیان ہی اسے انہیں ساری باتیں بتادی تھیں۔

شاہ رخ اس کی طرف بڑھا تھا تو اس نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی تھی' وہ نامحرم تھا یہ جانتے ہوئے بھی اس سے فون پر بات کرتی رہی تھی' یہ تھا اس کا گناہ' مگر اس پر جو الزامات لگائے جارہے تھے' وہ سوچ سے بھی زیادہ سنگین تھے' حد تو یہ کہ اس کی عزیز از جان سہیلی تمنا ہر ایک کو اس کے ناکردہ گناہوں کی گواہی دیتی پھر رہی تھی۔ یہ سب بہت اذیت ناک تھا۔ وہ پل پل جیتی' پل پل مرتی تھی۔

اماں کو اپنی محبت' توجہ اور اعتماد سے اسے زندگی کی طرف واپس لانے اور اس میں لوگوں کا سامنا کرنے کی ہمت پیدا کرنے میں پورے دو ماہ لگے تھے۔ صلہ ہر وقت اپنی غلطی کی ان سے معافی مانگتی رہتی تھی۔

"تم نے جو نادانی کی وہ قابل معافی نہیں' مگر میں نے تجھے معاف کیا میری بچی' بس تو اللہ سے معافی مانگ۔" اماں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتیں۔

"اللہ تو معاف کردے گا اماں' وہ تو بہت رحمان الرحیم ہے' مگر اس کے بندے..." وہ لوگوں سے بہت خوف زدہ تھی۔

"جب اللہ معاف کردے گا تو بندوں کی مجال نہیں وہ معاف نہ کریں۔" بہت گہری بات کہی تھی انہوں نے۔

"کیا سوچ رہی ہو صلہ؟" وہ گزشتہ تین ماہ کے سفر پر نکلی تھی' چونک کر حال میں آئی' سامنے تیمور ہاتھ میں کتابیں لیے کھڑا تھا۔

"سوچنے کو بچا ہی کیا ہے۔" پھیکی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں پر دم توڑا' تیمور نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ زرد رنگت' گہرے حلقے' اعتماد سے عاری آنکھیں' پپڑی زدہ ہونٹ' کئی دن پہلے بنائی بالوں کی چٹیا میں سے نکلی الجھی لٹیں چہرے کے اطراف میں بکھری تھیں' سفید لباس میں وہ برسوں کی بیمار لگ رہی تھی' جس صلہ کو وہ جانتا تھا یہ وہ تو نہیں تھی۔

اس کی گود میں کھلی ڈائری کی تحریر پر نظر پڑی تو دل جیسے دکھ سے بھر گیا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"یاد ہے صلہ! ایک بار میری گڈی بلو کے ہاتھوں کٹ گئی تھی' اگرچہ تمہاری وجہ سے مگر کرکری تو یاروں میں میری ہوتی تھی' تب بے عزتی کے ڈر سے نہ میں گھر چھپ کر بیٹھا تھا اور نہ ہی گڈی اڑانا چھوڑی تھی' بلکہ فوراً جاکر بہت بڑی اور خوب صورت گڈی لے آیا تھا۔ پھر سب بچے کے ہاتھوں میری گڈی کٹنے پر مذاق اڑانا بھول کر میری نئی گڈی دیکھنے لگ پڑے تھے' یاد ہے نا؟"

"ہاں' مگر یہ بے تکی بات یاد دلانے کا مقصد؟"

"اس سے میں نے یہ سبق سیکھا تھا کہ عزت اگر بازار میں نہیں ملتی تو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے بھی حاصل نہیں ہوتی' اس لیے زندگی میں اگر کبھی ذلت کا سامنا کرنا پڑے تو آنکھیں بند کرلینے کی بجائے عزت کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے اور اتنی کامیابیاں حاصل کرنا چاہئیں کہ لوگ انہیں شمار کرتے کرتے ہماری بدنامیوں کی داستان بھول جائیں۔" وہ لفظوں کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کررہا

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening ,or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121
www.paksociety.com
www.Paksociety.com

تھا تاکہ اسے ٹھیس نہ پہنچے۔

"بہت بڑی بڑی باتیں کرنا آگئی ہیں تمہیں۔" صلہ نے پیار سے اس کے بال بگاڑے' جب اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ گیا تھا تو اماں اور صائمہ آپی کے بعد تیمور ہی تھا جس نے اس کا یقین کیا تھا' پل بھر کو بھی اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔

"میری بات کو جانے مت صلہ' تمہیں خود کو منوانا ہے اپنی ذات کا کھویا اعتبار پانا ہے۔"

"مگر کیسے؟" اس نے الجھ کر پوچھا۔

"ایسے۔" تیمور نے ہاتھ میں پکڑی کتابیں اس کی گود میں رکھ دیں۔ "اگلے ماہ پیپرز ہیں تمہارے اور تم دے رہی ہو' انڈر اسٹینڈ۔" اس نے رعب جماتے ہوئے حکم دیا۔

"میں واپس ہاسٹل نہیں جانا چاہتی۔" وہ سر جھکا کر ناخن چبانے لگی' پڑھائی کے ساتھ ہی اسے تمنا کا خیال آیا تھا۔

"تو مت جاؤ! گھر پر تیاری کرلو' مگر پیپر ہر صورت میں تم نے دینے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" رضامندی سے سر ہلاتے ہوئے اس نے مضبوطی سے کتابیں پکڑلیں' اب ان ہی کے ذریعے اس نے اپنا کھویا مقام پانے کا عزم کیا تھا۔ منڈیر پر بیٹھی چڑیا نے اڑان بھری' بہت سی یادیں اس کے ذہن میں پھڑپھڑانے لگیں۔

"تمنا نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا تیمور؟" ذہن میں کلبلاتا سوال آخر نوک زباں پر آہی گیا' اس کے لہجے میں شکوہ نہیں تھا بس حیرت سی حیرت تھی۔

"وہ ہمیشہ سے تم سے جلتی تھی صلہ! تمہیں دوست نہیں حریف سمجھتی تھی' تمہاری وجہ سے اسے ہر بار ہر میدان میں دوسرے نمبر پر رہنا پڑتا تھا' اس لیے اسے جیسے ہی موقع ملا اس نے تمہیں پچھاڑ دیا۔"

غیر جانب داری سے حقیقت بتا کر وہ اٹھ کر نیچے چلا گیا' صلہ کے چہرے پر پھیلا کرب اس سے دیکھا نہیں جارہا تھا۔ وہ بہت دیر تک وہاں بیٹھی خالی نظروں سے پرندوں کو گھر لوٹتا دیکھتی رہی' آنسو نہ چاہتے ہوئے بھی روانی سے بہہ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

اس نے پیپر دیے اور نوے فیصد سے کم نمبر نہ لینے والی صلہ میر کے چالیس فیصد نمبر جہاں کالج والوں کے لیے حیران کن اور اس کے اپنے لیے اہانت ناک تھے وہیں کسی کے لیے انتہائی خوشی کا باعث تھے' تمنا نے صلہ کے ہوتے ہوئے زندگی میں پہلی بار پہلا نمبر حاصل کیا تھا' خوشی اس قدر تھی کہ ضمیر پر دھرا بوجھ جیسے کم ہوگیا تھا' اسے آرام سے میڈیکل کالج میں داخلہ مل سکتا تھا۔

صلہ نے اپنے ڈاکٹر بننے کے خواب کو پس پشت ڈال کر بی ایس سی آنرز کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ فرسٹ ایئر میں چونکہ اس نے بہت اچھے نمبرز لیے تھے' اس نے ٹاپ کیا تھا۔ اس کی ایف ایس سی کی ایوریج اچھی تھی' ایڈمیشن ٹیسٹ پاس کرکے اسے آرام سے بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا تھا۔ اگرچہ اس کے یونیورسٹی جاکر پڑھنے پر خاندان والوں نے بہت باتیں کی تھیں' اس کے ہاتھ سے نکل جانے اور مزید گل کھلانے کی پیش گوئیاں ہوئی تھیں' مگر اماں نے پروا نہیں کی تھی۔

"مجھے اپنی بیٹی پر پورا بھروسا ہے۔" اس کی پیشانی چوم کر وہ بہت مان سے بولی تھیں۔ صلہ کی آنکھیں چھلک گئی تھیں۔

"یقین رکھیے اماں! میں اپنی نادانیوں سے سبق سیکھ چکی ہوں' خود ٹوٹ جاؤں گی مگر ان شاء اللہ اب آپ کا بھروسا نہیں توڑوں گی۔"

یونیورسٹی کے گیٹ پر کھڑے ہوکر خود کلامی کرتے ہوئے اس نے خود سے عہد کیا تھا اور پھر یہ عہد پوری ذمہ داری سے اگلے پانچ سالوں میں بی ایس سی آنرز اور ایم ایس سی کرتے ہوئے نبھایا بھی تھا۔

یونیورسٹی کی آزاد فضاؤں میں اس کی ذہانت سے متاثر ہوکر مقابل سے جھانکتی اس کی گہری سیاہ آنکھوں کے اسیر ہوکر اس کے گریز اور جھجک کو چیلنج سمجھ کر'

دل باندھ کر' چند ہاتھ انتہائی خلوص سے اس کی جانب بڑھے تھے۔ اس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کیا کیا کوشش نہ کی گئی تھیں' مگر اس کے قدم نہیں ڈگمگائے تھے' استقامت میں لرزش نہیں آئی تھی' وہ اپنی ذات کا اعتبار پانے نکلی تھی' اتنی جلدی کیسے ہار جاتی' یہاں تک کہ اس کے پردے کو ڈھکوسلہ کہنے اور اس کی ذات کا غرور توڑنے کا عزم رکھنے والوں نے بھی اسے ناقابل تسخیر جان کر اس کی عزت کرنی شروع کردی تھی۔

"مس صلہ میر کو دیکھ کر عورت ذات کی عزت کرنے کو دل چاہتا ہے۔" یہ یونیورسٹی کے سب سے ہینڈسم اور فلرٹ لڑکے کے الفاظ تھے۔

"صلہ میر آج کل کی لڑکیوں کے لیے رول ماڈل ہے۔" یہ اس کے اساتذہ کی رائے تھی۔

ایم ایس سی کے پیپرز کے بعد یہ ہاسٹل میں اس کی آخری رات تھی' جب اس کی روم میٹ شاہم خان نے اس سے اس کے گھر کا ایڈریس مانگا تھا' وہ چائے بنا رہی تھی' جب شاہم نے کہا تھا "صلہ! ہم آج کل اپنے بھائی کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہے ہیں' ان کی بس ایک ہی شرط ہے' ان کی بیوی باکردار ہو' مجھے پورا یقین ہے تم ان کے لیے پرفیکٹ رہوگی۔" وہ خلوص سے کہہ رہی تھی' مگر چائے کپ میں ڈالتے ہوئے صلہ کا ہاتھ چھلک گیا تھا۔

گرم چائے کی جلن ذہن میں بہت سی یادوں کو جگا گئی تھی۔

"بدکردار' بدچلن' مردوں کو ورغلانے والی۔" لفظ تھے کہ نشتر' جیسے وہ چھریاں لے کر روح گئی تھی۔

"باکردار اور میں... میرے کردار کی حقیقت تم کیا جانو شاہم بی بی۔" تلخ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آٹھہری تھی' پھر اس نے بات بدل دی تھی اور اگلے دن شاہم کو اپنا ایڈریس دیے بغیر گھر واپس آگئی تھی۔

☆ ☆ ☆

صبح بہت روشن اور تازہ تھی' صلہ نماز پڑھنے کے بعد باہر آئی۔ خستہ پراٹھوں' آملیٹ اور چائے کی مہک اسے سیدھا کچن میں کھینچ لائی۔

"نور ابھی تک نہیں اٹھا؟" پہلا نوالہ توڑتے ہی اسے بھانجے کی یاد آئی۔

"تو بھی رات تک تو تم سے کہانیاں سنتا رہا' اب دن چڑھے اٹھے گا نواب زادہ۔" صائمہ کا لہجہ ممتا سے چور تھا۔

"پھر تم نے کیا سوچا صلہ؟" ناشتے کے بعد وہ اسے لے کر تخت پر آبیٹھی۔

"آپ اچھی طرح جانتی ہیں میرا فیصلہ۔" وہ سپاٹ سی بولی' وہ پچھلے دنوں جب پی سی ایس کا انٹرویو دینے لاہور گئی تھی تو صائمہ کے گھر منیر کے کسی دوست کی والدہ نے اسے دیکھ کر اپنے بیٹے کے لیے پسند کرلیا تھا' وہ ہائی کلاس سے تعلق رکھنے والے بے حد ماڈرن لوگ تھے' بقول صائمہ' انہیں صلہ کے ماضی کی کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا' بس ان کی صرف اتنی خواہش تھی کہ صلہ حجاب ترک کردے' مگر وہ تھی کہ مان کر نہیں دے رہی تھی۔

"سمجھنے کی کوشش کرو صلہ! اماں تمہاری وجہ سے کتنی پریشان ہیں' بدخواہوں نے پہلے ہی خاندان میں تمہارے بارے میں اتنی باتیں پھیلا رکھی ہیں کہ وہاں سے تو کسی اچھے رشتے کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' اس لیے اتنا اچھا پروپوزل تم اپنی بے وقوفی کے سبب مت گنواؤ' آخر پہلے بھی تو حجاب نہیں کرتی تھیں۔" اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وہ اسے سمجھانے لگی۔

"غلط کرتی تھی پہلے میں' مگر اب اپنی غلطیوں سے سبق سیکھ چکی ہوں' پردہ میں فیشن کے طور پر تو نہیں کرتی کہ جب جی چاہے آؤٹ آف فیشن سمجھ کر چھوڑ دوں' آپی! جس طرح خانہ کعبہ اور قرآن مجید کا غلاف انہیں دنیا کے تمام گھروں اور کتابوں سے ممتاز کرتا ہے' ویسے ہی پردہ ہم مسلمان عورتوں کو دنیا کی دوسری تمام عورتوں سے ممتاز کرتا ہے' بری نگاہوں سے بچاتا ہے' ہمارے گرد حفاظت کا گھرا حصار قائم کردیتا ہے۔

www.Paksociety.com

پردہ عظمت ہے ہماری اور آپ کہتی ہیں اسے چھوڑ دوں' وہ بھی صرف ایک رشتے کی خاطر۔" وہ لمحہ بھر کو سانس لینے رکی۔ "اگر مجھے کسی نے اپنانا ہے تو اسی پردے کے ساتھ اپنانا ہوگا' ورنہ میری طرف سے صاف انکار ہے۔" اٹل انداز میں کہتی وہ اٹھ کر چلی گئی۔ اس کی باتوں کے زیر اثر صائمہ کتنی ہی دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہی۔

☼ ☼ ☼

بی ایس سی کلیئر کر کے اپنے شہر کے ڈگری کالج میں ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے صلہ نے عزم کیا تھا' وہ نہ صرف لڑکیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرے گی بلکہ ان کی اخلاقی تربیت کر کے ان کے کردار کو بھی نکھارے گی۔ مگر اگلے دن یونی کی لیکچرار کے طور پر شاہم کو دیکھ کر اسے خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔

"بے وفا لڑکی! اتم تو پانچ سال کا ساتھ بھلا کر ایسی غائب ہوئیں کہ بس' حد تو یہ کہ اپنا ایڈریس بھی دینا بھول گئیں۔ میں نے تمہیں اتنا مس کیا کہ بتا نہیں سکتی۔" اسے گلے لگا کر زور سے بھینچتے ہوئے وہ حسب عادت بلا اسٹاپ شروع ہو گئی۔

ارد گرد سے گزرتی لڑکیاں رک رک کر مزے سے یہ نظارہ دیکھنے لگیں' صلہ جھینپ گئی' جبکہ شاہم تو سدا کی ڈھیٹ تھی۔

"چلو اسٹاف روم میں چل کر باتیں کرتے ہیں' میرا یہ پیریڈ فری ہے۔" وہ اسے پکڑ کر اندر لے آئی۔

"تمہارا گھر تو گاؤں میں ہے' یہاں کیا ہاسٹل میں رہو گی؟" شاہم کا تعلق کسی زمین دار فیملی سے تھا' صلہ نے چائے کا کہنے کے لیے انٹرکام اٹھایا۔

"ساری زندگی تو ہاسٹلز میں گزاری ہے' اب مزید خانہ بدوشوں کی طرح رہنے کا حوصلہ نہیں ہے' مجھ میں' یہاں شہر میں ہمارا گھر ہے' بھیا اپنی جاب اور بچوں کی تعلیم کی وجہ سے بھابھی کے ہمراہ یہاں ہی رہتے ہیں۔ اب میں ضد کر کے اماں کو بھی اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔ ابا کا زیادہ وقت تو زمینوں پر گزرتا ہے' مگر ہفتے کے ہفتے وہ بھی چکر لگا جاتے ہیں۔" حسب عادت انتہائی تفصیل سے جواب دیا' صلہ مسکرا دی۔

"اب یہ بتاؤ' اپنے گھر چائے پر کب بلا رہی ہو؟" صلہ نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھایا تو اس نے پوچھا۔

"جب تم کہو۔"

"تو جلدی سے یہاں پر ایڈریس لکھ دو۔" میز سے کاغذ قلم اٹھا کر اس کے آگے کیا تو ناچار اسے پتا لکھنا پڑا۔

"میں بہت جلد اماں اور بھابھی کو لے کر تمہارے گھر آؤں گی۔" وہ شرارت سے بولی۔

اس کی بات کا مقصد سمجھ کر صلہ بیل کی آواز پر طویل سانس لیتی اٹھ گئی۔

"لب تمہاری آنکھوں میں بھی اپنے لیے تضحیک دیکھنا ہو گی مجھے۔" تلخی سے سوچتے ہوئے اس کے قدم بہت بھاری ہو گئے تھے۔

ابا مستقل سے اپنی نوکری کی مدت پوری کرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے لوٹ آئے تھے' صائم بھی آج کل چھٹی پر گھر آیا ہوا تھا' اماں نے صائمہ کو بھی بلا لیا' وہ اس بار لمبے قیام کے ارادے سے آئی تھی۔ ہر وقت سنسان پڑا رہنے والا گھر جیسے رونقوں سے بھر گیا تھا۔ ہال کمرے میں رات گئے تک محفلیں جمتی تھیں' اس وقت بھی سب جمع تھے۔ بہت مزے مزے کی باتیں چل رہی تھیں' ابا کو چائے کی طلب ہوئی تو وہ کچن میں چلی آئی۔ چائے بنانے لگی' چائے کی ٹرے لے کر وہ اندر جا رہی تھی' مگر صائم بھائی کی بات سن کر جھجک کر رک گئی۔

"ابا! میں نے کیپٹن صالح اور اس کی فیملی کے متعلق تمام چھان بین کر لی ہے' بہت اچھے اور شریف لوگ ہیں۔" اندر اب موضوع گفتگو اس کے لیے آنے والا کیپٹن ڈاکٹر صالح خان کا رشتہ تھا۔ اس نے اندر جانے کے بجائے ٹرے جانباں بھابھی کو پکڑا دی' اس کی جھجک پر مسکراتے ہوئے جانباں نے شوخ نظروں سے اسے دیکھا' مگر اس کا چہرہ بے تاثر تھا' اپنے کمرے میں چلی آئی۔

صرف مہینہ بھر پہلے ہی شاہم اپنی والدہ اور بھابھی کے ہمراہ ان کے گھر آئی تھی' اس کی بھابھی کے روپ میں اپنی پرانی دوست صنم کو دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی تھی۔ صنم بھی اس سے مل کر نہال ہو گئی تھی' صلہ کے حق میں اس کا ووٹ بھی شاہم کی طرح پکا ہو گیا تھا' جبکہ شاہم کی والدہ تو صلہ کی موہنی صورت پر جیسے فدا ہو گئی تھیں۔ ان کا والہانہ انداز مرجان بیگم کو بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔ جاتے جاتے وہ لوگ انہیں اپنے ہاں آنے کی پر جوش دعوت دینا نہیں بھولے تھے۔ یوں مہینہ بھر ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا لگا رہا تھا' ابا کے مستقل سے آتے ہی وہ لوگ باقاعدہ رشتہ ڈال گئے تھے۔

ابا نے صائم کو بلوا لیا تھا۔ انہوں نے ساری چھان بین کر لی تھی' سب کو صالح اور اس کے گھر والے بہت اچھے لگے تھے' یہ رشتہ ہر لحاظ سے بہترین تھا' بس اب صلہ کی رضامندی درکار تھی۔ اس کی رائے جاننے کی ذمہ داری صائمہ کو سونپی گئی۔ اس نے سر جھکا کر گویا اپنی رضامندی دے دی۔ اور اگلے ماہ ہی خاندان کے سب افراد کو مدعو کر کے ان کا نکاح کر دیا۔ سب بہت خوش تھے۔ شاہم اور صنم کی خوشی دیدنی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں شاہ رخ سے شادی نہیں کروں گی۔ خالہ نے اسے صلہ سے بدگمان کرنے کے لیے عورت پر سے اس کا اعتبار ختم کر دیا ہے۔ عورت ذات سے اس کی بے اعتباری اتنی بڑھ چکی ہے کہ اب وہ اپنی ماں تک پر روک ٹوک کرنے لگا ہے' شک کا مرض لاحق ہو چکا ہے اسے' ہر بات پر روک ٹوک کرتا ہے' میڈیکل کی پڑھائی کی غرض سے پانچ سال ان کے گھر میں کسی عذاب کی طرح کاٹے ہیں میں نے اور اب آپ چاہتی ہیں اس سے شادی کر کے یہ عذاب میں ساری زندگی سہوں' ہونہہ' جب صلہ جیسی لڑکی نے نیچا دکھانے اور بدنام کرنے کے لیے میں نے اخلاق پستی کی پاتال کو چھونے سے گریز نہیں کیا' کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اسے مرعوب کا مالک اعلا تعلیم یافتہ اور شان دار نوکری کا حامل شخص مل سکتا ہے تو میرے ڈاکٹر تمنا میر کے لیے کیا وہ نفسیاتی مریض شاہ رخ ہی رہ گیا ہے؟"

چلا چلا کر بولنے کی وجہ سے اس کا سانس پھول رہا تھا' چہرہ پکے ٹماٹر کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔

"چپ کر نا ہنجار لڑکی! سیدھی طرح کہہ' صلہ کی خوشی برداشت نہیں ہو رہی' شاہ رخ بیچے پر کیوں الزام لگاتی ہے' لکڑے' میری بہن کے گھر روپے پیسے کی کمی نہیں' عیش کرے گی تو۔ خبردار اب جو انکار کی بات دوبارہ کی' میں اپنی بہن کو ہاں کر چکی ہوں' اگلے مہینے اگر انگوٹھی پہنا جائے گی وہ تجھے۔"

"میرا یقین کیجیے امی! شاہ رخ واقعی نفسیاتی مریض بن چکا ہے' میں جھوٹ نہیں بول رہی' وہ تو خالہ تک کو اکیلے گھر سے نکلنے نہیں دیتا' عورتوں کے پاس کھڑا دیکھ لے تو سوال کر کر کے زچ کر دیتا ہے' میں نے پڑھائی کی غرض سے پانچ سال ان کے گھر میں عذاب کی طرح کاٹے ہیں' اس سے میری شادی کر کے مجھے میرے کیے کی سزا دنیا میں ہی مت دیں۔" وہ اب روتے ہوئے منتیں کر رہی تھی۔

"بند کرو اپنی یہ ڈرامے بازی' اچھی طرح جانتی ہوں میں تمہاری مکاریوں کو' میرے آگے نہیں چلنے کی تمہاری' بس کہہ دیا تمہاری شادی ہو گی تو صرف اور صرف شاہ رخ سے' میری ضد سے تم اچھی طرح واقف ہو' دیکھتی ہوں کیسے نہیں مانتیں تم۔" وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر چلی گئیں۔

"مت کریں میرے ساتھ ایسا۔" وہ دیوار سے لگ کر روتے ہوئے بیٹھتی چلی گئی' بہت دیر تک کراہتی رہی' مگر امی نے یقین کرنا تو دور کی بات دیکھا تک نہیں۔

تمنا ان کی ضدی طبیعت سے واقف تھی' جانتی تھی جو انہوں نے سوچا ہے' کر کے رہیں گی' اس کے پاس صرف دو ہی راستے تھے' یا تو شاہ رخ سے شادی کر کے زندگی تباہ کر لے یا اپنا گھر چھوڑ کر مستقبل برباد

کر لے گی یا دونوں صورتوں میں تباہی اس کا مقدر بننے والی تھی۔

"تمہیں تڑپوں اور تم خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولو، نہیں صلہ میرا، میں اگر خوش نہیں رہ سکتی تو تمہیں بھی سکون سے جینے نہیں دوں گی۔" میز پر رکھی مٹھائی پر نظر پڑتے ہی اس کے سینے میں حسد کی آگ ایک دم سے بھڑکی، اس نے میز پر ہاتھ مارا، صلہ کے نکاح کی مٹھائی یہاں سے وہاں تک بکھرتی چلی گئی، پلیٹ زمین پر گر کر ٹوٹ چکی تھی۔ آنسو صاف کرتی وہ اک عزم سے اٹھ کھڑی ہوئی، آج سالوں بعد اس نے ساتھ والے پورشن میں قدم رکھا تھا۔ ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر آرام آرام سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے عجیب سی بے چینی اس کے وجود میں تھرک رہی تھی۔ عام حالات میں اسے صلہ کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، مگر آج بات اور تھی، آخری سیڑھی پر آ کر وہ رک گئی، سامنے ہی صلہ گردن اٹھائے کھڑی بڑے پرشوق نظروں سے آسمان پر شام کا حسن دیکھ رہی تھی۔ تمنا نے چھپتی۔۔۔ نظر اس پر ڈالی، وہ آج بھی ہمیشہ کی طرح بہت خوب صورت تھی، کندھوں سے نیچے پڑے رہنے والے بال کمر تک آ رہے تھے۔ تمنا نے تو اسے برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ صلہ آج بھی اس سے آگے تھی، ہر لحاظ سے آگے۔

نفرت میں ڈوبی نظر کی تپش صلہ کو خیالوں کی حسین دنیا سے حقیقت میں لے آئی تھی۔ اتنے سالوں بعد تمنا کو سامنے پا کر وہ ساکت رہ گئی، وہ نفرت جو اس کی نظروں میں ہوتی چاہیے تھی، تمنا کی نظروں میں مقیم تھی۔

"تم کیا سمجھتی ہو صلہ میرا مجھ سے آگے نکل جاؤ گی، ہرا دو گی مجھے؟" آگے بڑھ کر تیز تیز سانسوں کے درمیان کہتی وہ کوئی جنونی لگ رہی تھی۔

"میرا تمہارا کوئی مقابلہ ہی نہیں تمنا! پھر ہار جیت کیسی؟" وہ سکون سے مسکرائی، شکوہ، شکایت، غصہ، نفرت کچھ بھی نہیں تھا اس کے لہجے میں۔ تمنا کو ایک پل کو حیرت ہوئی، پھر غصہ آیا۔

"زیادہ اعلا ظرف بننے کی ضرورت نہیں۔" وہ چلائی۔

اس کا پر سکون چہرہ تمنا کو زہر لگ رہا تھا۔

"بہت خوش اور مطمئن ہو نا تم صلہ میر! مگر جب ماضی کی تلخیاں تمہارے حال کو برباد کر کے مستقبل کو تاریک کریں گی، تب تمہاری حالت دیکھنے میں ضرور آؤں گی۔" وہ زہر خند انداز میں مسکرائی۔ "تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے میں تمہارے منکوح کا نمبر صائم بھائی کے موبائل سے لے چکی ہوں۔"

"تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں تمنا! میں نے اس نئے رشتے کی بنیاد سچ پر رکھی ہے، صلح نے میرے ماضی کی غلطی جاننے کے باوجود مجھے اپنایا ہے۔" اس کی دھمکی کے باوجود وہ پر سکون تھی۔

"ویٹ اینڈ واچ ڈیئر صلہ میر! میں بھی دیکھتی ہوں۔ میری زبانی تمہارا ماضی جان کر وہ تم جیسی بدکردار لڑکی سے رشتہ کیسے قائم رکھتا ہے۔" چیلنج کر کے وہ ایک جھٹکے سے مڑ کر تیز تیز سیڑھیاں اتر کر چلی گئی۔

"ایک اور امتحان۔" اس کے سامنے چٹان سی مضبوطی سے کھڑی رہنے والی صلہ اس کے جاتے ہی خالی بوری کی طرح بیٹھتی چلی گئی۔ "زندگی کے تپتے صحرا میں آبلہ پا پھرتے میں تھک گئی ہوں، میرے اللہ! میں آبلہ پا ہوں، میری غلطی معاف کر دے، اب کسی کی بے اعتباری سہنے کا حوصلہ نہیں مجھ میں۔ مجھ پر رحم کرنا میرے مالک!" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور سورج ڈوب رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

صلہ کو پچھلے ایک ہفتے سے بخار تھا۔ اس وقت بھی وہ غشی کے عالم میں سر ادھر ادھر ہلاتے ہوئے بہت بے چین لگ رہی تھی، مسلسل کچھ بڑبڑائے جا رہی تھی۔ صائمہ کا دل دکھ سے بھر گیا، "میں ایج کی ذرا سی غلطی کیسے اس کی زندگی کا روگ بن گئی تھی۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے پر سکون کرنے لگی۔ صائم بھائی اسے دیکھنے آئے تو بتا رہے تھے تمنا صلہ سے ملنے آئی تھی اس کا ماتھا ٹھنکا، اگلے دن صلہ کی طبیعت کافی بہتر تھی، مگر بے چینی اور اضطراب ہر جنبش میں پنہاں تھا۔

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening ,or you find any issue in using site send your complaint at
admin@paksociety.com
or
send message at
0336 5557121

www.Paksociety.com

صائمہ کے پوچھنے پر پہلے تو ٹال مٹول کرتی رہی مگر اس کے بہت اصرار پر اسے تمنا کی ساری باتیں بتاتے ہی بنی۔ وہ بہت سہمی ہوئی تھی۔

"تم فکر مت کرو چندا صالح کوئی نادان بچہ نہیں جو کسی کی باتوں میں آجائے وہ بہت سمجھ دار اور زیرک انسان ہے۔" اسے تسلی دیتے ہوئے صائمہ کو اپنی اور صالح کی ٹیلی فونک گفتگو یاد آگئی۔ صلہ کے متعلق ساری حقیقت جاننے کے بعد اس نے بہت تحمل سے کہا تھا۔

"آپی! یہ رشتہ بھجوانے سے پہلے میں نے اور اماں نے استخارہ کیا تھا۔" جو بات صلہ کے ماضی کے متعلق ابھی آپ نے بتائی ہے اس سے ہم لاعلم تھے مگر اللہ تو علیم ہے نا، اس پاک ذات نے ہمارے دلوں میں اطمینان ڈالا تھا تب ہی ہم نے بات آگے بڑھائی تھی، اس لیے آپ بے فکر رہیے، یہ سب جاننے کے بعد بھی میرا ارادہ اٹل برقرار ہے۔"

صائمہ نے صلہ کو یہ سب بتاتے ہوئے ڈھیروں ڈھیر تسلی دی مگر وہ تھی کہ مطمئن ہونے میں نہیں آرہی تھی، آخر تھک کر اس نے صالح کو فون کیا اور سب کچھ بتا دیا۔

"اچھا تو یہ محترمہ تمنا صاحبہ تھیں۔" سب سن کر اسے پچھلے ایک ہفتے سے انجان نمبر سے آنے والی کالز کا خیال آیا، انجان نمبر دیکھ کر پہلے تو اس نے کال ریسیو نہیں کی تھی مگر مسلسل کال آنے پر اسے ریسیو کرنی پڑی تھی، دوسری طرف کوئی لڑکی فون نہ اٹھانے پر بے حد جھلائی ہوئی تھی، ہذیانی انداز میں چیخ چیخ کر صلہ کے کردار پر کیچڑ اچھالنا شروع ہوگئی تھی۔

"تم بے غیرت ہو جو صلہ جیسی بدکردار لڑکی سے شادی کررہے ہو۔" وہ حلق کے بل چیختے ہوئے آپے میں نہیں تھی، حسد اور نفرت نے اسے پاگل سا کردیا تھا۔

"دیکھیے محترمہ! میں کیا ہوں اور کیا نہیں، یہ آپ کو مجھے بتانے کی ضرورت نہیں اور خبردار جو صلہ کے متعلق ایک لفظ بھی کہا، وہ اب میری منکوحہ ہے، اس

کے خلاف کوئی غلط بات برداشت نہیں کروں گا میں، سمجھیں آپ۔" صالح نے درشت اور دوٹوک انداز میں اسے ٹوک کر موبائل بند کردیا تھا۔ اب آپی کی زبانی اسے صلہ کی پریشانی کا سن کر حیرت ہوئی تھی۔

"صلہ تو بہت باہمت لڑکی ہے آپی! وہ کیسے صرف دھمکیوں سے ڈر گئی؟"

"وہ کیا ہے نا صالح! دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ وہ تمنا کے ہاتھوں پہلے بھی زک اٹھا چکی ہے، اس لیے میرے لاکھ اطمینان دلانے پر بھی مطمئن نہیں ہورہی ہے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو میں خود آجاؤں اسے مطمئن کرنے؟" مسکراتے ہوئے اس نے اجازت چاہی، اسے صلہ کو دیکھنے کا اشتیاق ہو چلا تھا۔

"مجھے خوشی ہوگی۔" صائمہ کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

شاہینہ بیگم، تمنا کی شادی کا کارڈ دینے آئی تھیں۔ گویا دوسروں کی بیٹیوں کی پاک دامنی پر دنیا بھر میں کیچڑ اچھالنے والی خاتون خود اپنے ہاتھوں اپنی بیٹی کی بربادی کی نوید سنانے آئی تھیں۔ امینہ بیگم کی شاہ رخ کا صلہ کی طرف سے دھیان ہٹانے کی ساری کوششیں خوب رنگ لائی تھیں۔ اب وہ مستقل طور پر ایسا ہی بن گیا تھا جیسا وہ اسے عارضی طور پر بنانا چاہ رہی تھیں، یہاں آکر تمنا کے سب کس بل نکل گئے تھے۔ شاہ رخ سے شادی کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ حقیقتاً اس گڑھے میں گرنے گئی تھی جو اس نے کبھی صلہ کے لیے کھودا تھا اور صلہ...

"صلہ..." گمبیر آواز پر وہ جھٹکے سے پلٹی، ڈھیلا جوڑا کھل گیا، کالے بالوں کا آبشار ایک دم سے پشت پر بہہ چلا، صالح مبہوت رہ گیا، اس کی تعریف ہر ایک سے سنی تھی، اندازہ تو تھا خوب صورت ہوگی مگر اتنی حسین ہوگی، یہ نہیں سوچا تھا، وہ بس اسے دیکھتا رہ گیا، اس کی نظریں جھک گئیں، بالوں کو سمیٹ کر دوپٹا ٹھیک

کرتے ہوئے وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے لگی، نجانے اندیشوں سے دل اٹک کر رہ گیا تھا۔

"السلام علیکم!" اسے بت بنا دیکھ کر اسے خود ہی پہل کرنی پڑی۔

"صلہ میر! بہت کچھ سنا تھا آپ کے بارے میں، ماہم سے، صنم بھابھی سے، صائمہ آپی سے اور... تمنا سے بھی۔" سینے پر ہاتھ باندھ کر وہ اس کے مقابل آکھڑا ہوا۔

"تمنا سے؟" صلہ کا سانس حلق میں اٹک گیا۔ تو گویا آخر تم نے اپنا کہا پورا کر ہی دکھایا، گویا صالح اب مجھے سزا سنانے آئے ہیں یا پھر شاید مجھ سے صفائی مانگنے۔" تمنا کے نام پر اس کے چہرے پر پھیلتے اضطراب و ہراس کو بغور دیکھتے ہوئے وہ نرمی سے مسکرایا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"اور آج آپ کو دیکھ بھی لیا، آپ کو پتا ہے...؟" وہ پھر کورا، صلہ کی سوالیہ نظریں اس کی نظروں سے ٹکرائیں، وہ جس دیا اور اس کی طرف قدرے جھک کر بولا۔ "آپ کو دیکھتے ہی مجھے آپ سے محبت ہوگئی ہے۔"

"جی۔" اتنی غیر متوقع بات سن کر صلہ کی حیرت بجا تھی۔

"ہاں جی!" جی پر زور دے کر صالح بالکل اسی کے انداز میں بولا تو چاہتے ہوئے بھی ہلکی سی مسکراہٹ صلہ کے لبوں کو چھوگئی، پھر کچھ یاد آنے پر لب بھینچ کر بولی۔

"میرے ماضی کے بارے میں جاننے کے بعد بھی۔" اس کا سر جھکا تھا، یہ سب پوچھتے ہوئے۔

صالح نے افسوس سے اس کانچ سی لڑکی کو دیکھا، اک ذرا سی غلطی کا خمیازہ بھرنے کو کیسے کانٹوں پر ماہ و سال گھسیٹے تھے۔ اسے صلہ کی تکلیف دل میں اترتی محسوس ہوئی۔ بس صلہ اب اور نہیں۔

"ہاں، اس کے باوجود۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "تم اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرچکی ہو۔ اب تمہیں مزید شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔"

اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا کر اسے

اپنی ذات کا تحفظ اور یقین بخشتے ہوئے اس کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔ پوری سچائی اور یقین سے یہ کہہ کر اس نے گویا صلہ کو اس کی ذات کا اعتبار لوٹا دیا تھا۔

دو آنسو بے ساختہ اس کی پلکوں سے ٹوٹے اور ماہ و سال کی تھکن ان میں کھل کر اترتی چلی گئی۔ روح پر لگے سارے گھاؤ اس ایک جملے کی سچائی نے بھر ڈالے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے تپتے صحرا میں گلستان مل گیا ہو۔ صالح نے بہت نرمی سے اس کے آنسو پونچھے۔ صلہ نے مطمئن ہو کر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کے لبوں پر بہت آسودہ مسکراہٹ تھی اور دل اللہ رب العزت کے شکر سے لبریز تھا جس نے اس کی خطا کو معاف کرکے پھر سے معتبر بنا دیا تھا۔

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

میں عبدالقادر ہوں

شروت نذیر

قیمت -/225 روپے

منگوانے کا پتا

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37، اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر 32735021

میمونۃ الکبریٰ

ایسا بہروپ

عالیہ باغوں میں سویرے کی سیر کو نکلی تھی جب اچانک ہی بائیں پہلو میں اٹھتے درد کی ٹیسوں نے اس کے کھڑے وجود کو دھادیا۔ وہ سینے کو اپنی ہی بانہوں میں بھینچے ہوئے بیٹھتی چلی گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ جب ذرا کچھ سنبھلی تو اسے احساس ہوا کہ اس کا خاندانی عارضہ قلب اس تک پہنچ چکا ہے اور کسی بھی لمحے اس کی کھلکھلاتی زندگی کو ڈس لے گا۔

وہ خود بھی ایک ڈاکٹر تھی اور اپنی حالت کو خوب سمجھ سکتی تھی۔ اس کا ساتھی ڈاکٹر جو کہ اس کا منگیتر بھی تھا اس لواس بھیگی شام میں کاسنی گلابوں کا گلدستہ لیے اس کی عیادت کو آیا اور مژدہ سنا گیا کہ وہ عارضہ قلب والی کسی خاتون سے شادی نہیں کر سکتا۔

درد پہ پھاہار کھنے کے بجائے جو یہ صدمہ ملا اس سے عالیہ شاید ساری عمر سنبھل نہ پاتی۔ مگر اس نے ایک اور راہ نکالی۔ اگلی ہی صبح بستر چھوڑ اٹھ کھڑی ہوئی، شہر چھوڑ دیا اور دور دراز ایک پہاڑی علاقے کے چھوٹے سے گاؤں کے خستہ حال اسپتال میں ٹرانسفر کروالیا اور پہاڑی جھرنوں کے شور میں اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

عالیہ نے اسپتال سے ملحق سرکاری مکان میں ڈیرہ ڈال لیا۔ مکان کی حالت بھی اسپتال کی طرح کافی ابتر تھی۔ مگر ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق وہ وہاں زیست کرنے پہ راضی ہوگئی۔ وہ دن کو مریض دیکھتی اور شام کو کھڑکی سے لگی بیٹھی رہتی۔ سورج کو ڈوبتے دیکھتی اور پھر ابھرتے دیکھ کر اٹھتی۔ درمیان کا وقت کیسے بیتتا کچھ پتہ نہ چلتا۔

یونہی متواتر کو تجتی ہوئی تو اس خاموشی میں دن گزر جاتے اگر برسات کا موسم نہ آن ٹپکتا۔ بارشیں ہوئیں جوں زور پکڑتی گئیں گھر کی چھتیں ٹپکنے لگیں۔ عالیہ کو اپنا جمود توڑنا ہی پڑا۔ اس نے اسپتال کے عملے سے بات کی کہ اسے گھر کے لیے ایک مزدور چاہیے جو کہ مرمت کا کام جانتا ہو۔

اگلی صبح وہ اپنے لیے ناشتہ بنانے میں مگن تھی جب مسلسل بجتی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ وہ جھنجلا کر باہر کو نکلی۔ دروازے پہ بارش میں بھیگا ایک نوجوان کھڑا تھا۔ مدعا جاننے پہ معلوم ہوا کہ مرمت کے کام کے لیے آیا ہے۔

اسے گھر کی چابیاں، ہدایات اور ناشتہ دیتے ہوئے وہ اسپتال چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

میں نے گھوم پھر کے گھر کا جائزہ لیا۔ چھت ٹپکنے کے علاوہ بھی وہاں کرنے کو بہت کام تھا۔ میں نے ایک ہی لمحے میں ٹھان لیا کہ اس لمحے کو لے کر دور تک جاؤں گا۔

ٹپکتی ٹونٹیوں کی مرمت کر کے میں چھت کا جائزہ لینے اوپر چڑھ گیا۔ بارش کچھ تھمی تو جستی چادروں کی چھت کے سوراخوں میں سیسہ پگھلا کے ڈالا۔ تب تک شام کے سائے پھیلنے لگے۔

نیچے جا کے باورچی خانے کا جائزہ لیا۔ اپنے لیے چائے بنائی اور صبح کی بچی روٹی لے کر بیٹھ گیا۔ پھر کچھ کو بھوک مٹا کے سامان باندھا اور باہر کی راہ لی۔ اگلے دن میں پھر سویرے ہی جا پہنچا۔ ابھی وہ محترمہ جمائیاں ہی لے رہی تھیں۔

اسے کہا کہ دن کے لیے بھی ایک روٹی بنا کے رکھ جائے اور پھر میں کرنے والے کام کا جائزہ لینے لگا۔ ناشتے پر اسے مطلع کیا کہ آج دیواروں کا اکھڑا پلستر ٹھیک کرنا ہے اور پھر کل سے رنگ و روغن کا کام شروع کروں گا۔

کام کی لمبی تفصیل سن کر وہ ماتھے سے اکھڑنے لگی تو میں نے اس کی توجہ گزشتہ دن کے کیے ہوئے کام کی طرف مبذول کروادی۔

اس نے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور مجھے کام جلد ہی ختم کر کے چلتا پھرتا نظر آنے کو کہا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے اپنی تنہائی میں کسی کا مخل ہونا پسند نہیں آرہا تھا۔

میں نے بظاہر تو کہہ دیا کہ چند دن کا ہی کام ہے اور ابھی میں آوارہ تو رہ طبیعت مجھے بہت دن کہیں ٹکنے نہیں دیتی تھی۔

دل میں گزشتہ دن کا عہد پھر سے دہرا لیا کہ اس لمحے کو لے کر دور تک جانا ہے، جہاں پیچھے صرف عہد کا ہو اور کسی کو کچھ دکھائی نہ دے۔

میں نے رنگ و روغن کے ساتھ ساتھ چھت کی مرمت اور آرائش کا کام بھی چھیڑ دیا۔ ہر شام جب میں کام سے تھک جاتا تو اپنے لیے کھانا بھی خود ہی تیار کرتا اور کچھ اس کے لیے بھی بچا جاتا۔

وہ کبھی شام کو جب تھکی ہاری لوٹتی تو میں اسے مخاطب کر کے کہتا۔ "عالیہ! کھانا تیار ہے، کھا لینا۔" وہ بھوکی شیرنی کی طرح بھری نظروں سے مجھے دیکھتی اور ہنستے ہوئے اندر چلی جاتی۔ میں جان گیا تھا کہ اندر جا کر وہی کھانا وہ بہت آرام سے کھا لیا کرتی تھی۔

میں نے اس کے گھر کے لاؤنج میں روشن صبح کا ایک تازہ دم کرنے والا منظر پینٹ کیا اور اس کے بنگلے کے چھوٹے سے باغیچے میں رنگا رنگ پھولوں اور تازہ سبزیوں کے پودے کاشت کر دیے۔ دروازے کے ساتھ ڈاکٹری تختی اور دھم سروں کی گھنٹی نصب کی اور پھر "کچھ عرصے کے لیے" اس کا گھر چھوڑ دیا۔

عالیہ نے اسپتال کے عملے کے ذریعے مجھے تلاشا لیکن کوئی میرے نام کے کسی مزدور کو نہیں جانتا تھا۔

اسے میرے ہاتھ کے ذائقے کی عادت سی پڑ گئی تھی اور میں، جو دن بھر اس کے گھر میں رنگ بھرتا رہتا تھا، وہ اس کی زندگی میں گھلتے رہتے تھے۔ میری موجودگی نے اس کے گرد تحفظ کا اک ہلکا سا حصار تن دیا تھا جو میرے چلے جانے کے بعد بکھرتا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ بہت باقاعدگی سے میرے لگائے ہوئے پھولوں کے پودوں کو پانی دیتی اور کیاریاں صاف کرتی۔ جب پھول کھلنے لگے تو اس نے گلدان میں سجائے اور اپنے سرہانے بھی رکھنے شروع کر دیے۔

اب وہ پوری طرح میری ذات کی گراں مائیگی کو تسلیم کر رہی تھی۔

مزید آزمانا مجھے ٹھیک نہ لگا۔ میں نے اپنی ماں جی کو اس کے ہاں بھجوایا۔ اسے بھلا کیا تامل ہو سکتا تھا۔ بستی کے چند لوگ ہماری شادی کے مہمان بنے۔ ماں جی سے ہی اسے معلوم ہوا کہ میں مزدور نہیں، بلکہ ایک مصور ہوں اور میری تلاش مجھے جانے کہاں کہاں لیے پھرتی ہے اسی لیے میں بہروپ بدل لیتا ہوں۔

میرا بہروپ یاد کر کے وہ بہت عرصے بعد یا شاید زندگی میں پہلی بار کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ اور یہی بچپنا پھر اس کی زندگی میں ٹھہر گیا۔

ناولٹ

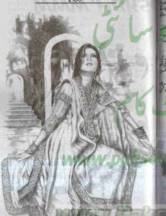

میں ایک سیاح ہوں کہانیاں ڈھونڈتا ہوں۔ نگری نگری محبت کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہوں۔
میرا دل لوگوں کے چہروں میں ان کی باتوں میں ان کے لہجوں میں محبت ڈھونڈتا ہے اور محبت دیکھتا ہے تو خوش ہوتا ہے۔
اور میری آنکھیں تجسس و شوق سے مجبور ہر روز ایک نیا نظارہ مانگتی ہیں۔
میری ٹانگیں سفر در سفر کبھی تھک جائیں تو سستا لیتا ہوں۔ مگر زیادہ دیر تک میں بیٹھ نہیں سکتا۔ میری ٹانگیں دل کے حکم پر ایک دم ہشاش بشاش ہو جاتی ہیں نئے سفر کی اور۔ ایک بے چینی سی ہے من میں جو ذرا دیر کو دم لینے نہیں دیتی جب فطرت اتنا مجبور کردے، آنکھیں نظاروں کی کھوج میں ہوں، دل بچوں کی طرح ہمک ہمک جائے اور قدم بے چینی سے راستوں کی دھول میں سفر پر گامزن ہو جائیں۔
نئے چہرے، نئے مسافر، نئی ملاقاتیں نیا سفر اور میرا سامان شوق راستے راستے کہانیاں جمع کرتا اور کہانیاں لکھنے والا ایک بے چین سیاح محبت کاشت کرنے والا لکھاری۔
اور اس سفر میں میری داستانوں کے ہمراہ میرے پرانے سفر کے ساتھی جو میری کمزوریاں بن جاتے ہیں۔ وہ نئے چہروں میں زندہ رہتے ہیں، میرے ساتھ سفر کرتے ہیں۔
میری یادیں، میرے ساتھی۔ میری کہانیاں اور آپ سب میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ آپ سب۔ میری کہانیوں کے سچے کردار اور۔ اور میری محبت

☼ ☼ ☼

جب رات کی خاموشی میں ٹرین کا شور ماحول میں ارتعاش پیدا کرتا۔ ہر سوئی ہوئی چیز ہڑبڑا کر ٹرین کی آمد پر جاگ اٹھتی۔ تب بنچ پر ایک ہی زاویے سے ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھے ہوئے وہ سگریٹ پھونکا کرتا۔
اور اس کا بچپن کا ساتھی قطب الدین عرف بابو ٹکٹ بیچنے والا کرسی پر اخبار تھامے لالٹین کی روشنی

سدرۃ المنتہیٰ

پریت نگر کا شہزادہ

www.paksociety.com

تیز کرتا تو گھنے لگتا۔ ٹرین کی آمد پر اخبار اپنی کرسی پر رکھ کر اٹھتا ایک نگاہ مائیکل کے بت بنے دھواں چھوڑتے چہرے کی طرف دیکھتا اور پھر کندھے اچکاتا آگے بڑھتا اور کچھ دیر بعد پھر وہی اخبار اور کرسی اور چائے کی پیالی جس میں چائے رکھے رکھے ٹھنڈے شربت میں بدل جاتی۔ اس کا ہاتھ گھڑی بھر کو چائے کے کپ سے بے دھیانی میں مس ہوتا۔ تھوڑی سی چائے چھلکتی اس کی قمیص پر جسے ہاتھ سے تھوڑا صاف کرکے وہ مگن سے انداز میں پھر سے لالٹین کی روشنی میں اخبار کی سرخیاں دیکھنے لگتا۔

اور وہ تھکے ہوئے انداز میں ہمیشہ کی طرح ان کی حرکات کو کچھ بیزاری سے دیکھتا اور پھر خود چیخ کر کے گھر کی راہ لیتا۔ جہاں گھر والوں کے سوتے میں باآواز بلند خراٹے اس کا استقبال کرتے وہ اسی بیزاری سے ایک خالی چارپائی پر بستر ڈالتا اور اجرک تان کر سو جاتا۔ لمحے بھر کو دل چاہتا اسے جگائے۔ اس سے باتیں کرے۔ اس کا حال احوال پوچھے اور باتوں باتوں میں پوری رات بیت جائے۔ اسے تھکن کا احساس ہی نہ ہو۔ مگر اس کے پھیکے لہجے اور بے سروپا باتوں کے خیال سے ہی اس کے چہرے پر بیزاری اور جھلاہٹ کا تاثر آجاتا اور وہ اپنے نادر خیالات پر مٹی ڈال کر کروٹ بدل کر سو جاتا تمام کارروائی کو صبح کے سپرد کرکے۔

اور صبح ...... وہی سوالات، وہی باتیں اور طعنے اس کا جی جلاتے۔ اس کی باتوں کے جواب میں اس کے پاس کوئی وضاحت نہ ہوتی۔ وہ خاموشی سے اس کے لہجے کی کڑواہٹ ناشتے کے ساتھ ساتھ حلق سے اتارتا۔ پھیکی سی بے جان مسکراہٹ زبردستی لبوں پر سجائے اس کے چہرے کے غصیلے تاثرات دیکھتا رہتا اور جب ضبط کا پیمانہ لبریز ہونے کو ہوتا تب وہ اپنی ڈائری سنبھالے کتاب بغل میں دبائے چپن باتھوں میں جائے کسی گھنے درخت کے نیچے جاکے بیٹھ جاتا اور گیت لکھنے کی ناکام کوشش کرنے لگتا تو کبھی اپنے ادھورے گیتوں کو بھول کر کتاب کھول کر بیٹھ جاتا۔

اور پھر دنیا جہاں بھلا دیتا۔

شام ہونے کو آتی۔ تو گھر کی راہ لیتا تو کتاب کی دنیا کے منظر خواب ہو جاتے اور ادھورے گیتوں کے دکھ بھی کا حصہ بن کر اسے وقت اور حالات کا تقاضا نبھانے پر مجبور کرتے۔

اور وہ اس کی ہربات کی تلخی کو جذب کرکے بڑے ماں کی دلجوئی کرنے لگتا ساتھ ہی ان کی ملامت رہی سہی کسر پوری کرکے اسے اور مجبور اور احسانوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھکے وجود شکست کا احساس دلاتی۔

اور وہ ضبط کا بندھن باندھے احسانوں کا بوجھ اتارنے کی کوشش میں ہمیشہ کی طرح اپنے خواب و خیال کو ذہن کے کونوں میں سمیٹ کر زیست کو ہمکنار کرنے میں جت جاتا۔ چھٹی کا دوسرا دن فصلوں کی رکھوالی اور نئی فصل پکنے تک کے کام سوچتا اور ذہن میں منصوبے بناتا رہتا۔

اور چھٹی کی آخری رات اس کے نام کرکے اپنے وجود کے قفل کھول کر دل کے کواڑ بند کر لیتا اور پوری رات سماعتیں اس کی بے سروپا باتوں پر مجبوراً گزرتیں اور وہ اپنے ہونے کا یقین دلانے کی خاطر اپنا دل کہیں گروی رکھ کر اس کی خواہشوں کا تاوان بھرنے لگتا۔

اور اگلی صبح ...... اگلی صبح اپنے تھکے ہوئے وجود کو گھسیٹتے ہوئے اسٹیشن تک لے آتا اور تمام تلخیاں و مجبوریاں اگلے ہفتے کے چھٹی والے دن پر رکھ کر ان دونوں کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگتا ایسے جیسے وہ اپنے گھر سے جہاں بھر کی خوشیاں لے کر بانٹنے نکلا ہو۔ ایسے جیسے اس سے زیادہ تو کوئی اور جہاں میں آسودہ نہ ہو۔

مگر اک بے چینی ۔ تھی جو اسے تمام وقت گھر بدر رہنے پر مجبور کرتی اور وہ بے چینیوں کو سلائے سلائے زیست کا تھکا ہوا مسافر بن گیا جو اپنے وجود کے قفل توڑ کر خود کو ہواؤں کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔ مگر اک مجبوری اور اک احسانوں کا بوجھ جس نے اس سے اپنے احساسات کی قربانی لمحہ لمحہ مانگی اور وہ تمام عمر قربانیوں کی بھینٹ چڑھنے کے لیے رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ سر نیہوڑائے بازوؤں کو گھٹنوں کے گرد لپیٹے خاموش آنسوؤں سے بدبختی پر رو رہی تھی۔ جب دروازہ کھلا اور تیزی سے بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ میں تکبر و رعب کی دھمک تھی۔ بکھرے بالوں سے پکڑ کر فرعونی ہاتھوں نے کمزور سر کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ ساتھ ہی اس کی دبی دبی سسکی درد کا احساس لے کر ابھری اور وحشیانہ ماحول میں دم توڑ گئی۔

"بیوہ ہو گئی ہے کیا جو ماتم کر رہی ہے۔" ایک کرخت آواز سے خاموشی چھناکے سے ٹوٹ گئی۔

"ہائے کاش ......" اس کے لبوں پر دعا ابھر کر سسکی کی طرح ماحول کے سپرد ہو گئی۔

ایک جھٹکا اور لگا اور تکبر سے بھرا ایک وحشیانہ قہقہہ۔

"ابھی ان ہاتھوں میں بہت دم ہے۔ ابھی بڑھاپا مجھے کمزور کرنے میں ہارا ہوا ہے۔" ساٹھ سالہ دار اسو لنگی کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ اور چہرے پر فرعون سا تکبر تھا۔

"اب تو تجھے عادی ہو جانا چاہیے' کیوں؟ ابھی تو پوری زندگی پڑی ہے۔" وہ آگ برسانے لگا اس کے وجود پر۔

اور پوری زندگی کا سوچ کر ہی اسے اپنے وجود سے گھن آنے لگی جس پر اس کے ستم کی تھکن تھی۔ ایک اذیت پوری زندگی وہ اس وجود کے زخم سہتی رہے گی۔ ایسی زندگی سے موت بہتر ہے۔

دل کسی ہارے ہوئے پرندے کی طرح پھڑپھڑایا جس کے پر کاٹ دیے گئے ہوں اور اڑان بھرنے کو بے تاب پرندہ اڑنے کی کوشش میں کسی چٹان پر گر جائے اور کٹے ہوئے پروں کا دکھ جان جلا دے تو وہ اڑان کی خواہش چٹان تلے مضبوط پتھروں کے حوالے کرکے اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا زندگی تمام کرے۔

اسے پتا تھا تمام زندگی اس نے ایسے ہی تمام کرنا ہے اور دل کے درد کو دبایا تو ستم معمول کی طرح لگنے لگے جیسے تقدیر سے سمجھوتہ کیا جاتا ہے۔ انسان اپنے ارادوں میں بعض اوقات کتنا ناکام رہتا ہے۔ اسے کبھی فرصت کے لمحات میں اپنی شکست کی پہلی شب یاد آجاتی جب آسودہ زندگی کی تلاش میں قدم دہلیز سے باہر نکلے اور زمانے کے تھپیڑوں کی نذر ہو گئے۔

جب دل کچھ خواب لیے رستے تکتا منزل کے پیچھے خواب لے کر نکل پڑا تھا اور جب محبت ...... اور جب محبت کے دعوے دار کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔ سینہ پھولا ہوا تھا۔ ہونٹوں میں دبی دبی مسکراہٹ پیار بھری سرگوشی تھی۔ کئی لفظ اپنی بے حرمتی پر دکھی ہوئے۔

کئی احساس بے احساس ہونے کو تھے اور جب محبت کے دعوے دار کے ہاتھوں محبت کی پامالی ہوئی۔ بھلا کوئی اپنی محبت بھی پامال کرتا ہے کیا۔ وہ سوچتی ہی رہ گئی۔

اسے آج تک وہ شکستہ شب یاد تھی۔ اور محبت اس کے دوپٹے کے پلو میں بندھی اور محبت اس کے پیروں کی پائل سے لپٹی اور محبت اس کی چٹیا کے بل میں الجھی۔

جب دوپٹہ سر سے چھن لیا گیا۔

پائل ٹوٹ گئی۔ اور چٹیا کھل گئی۔ تو محبت سولی چڑھ گئی۔

اور اس نے لمحے کی بے حرمتی سے بچنے کے لیے صدیوں کا تاوان بھرنے کی ہامی بھرلی اور ذہن جائز و ناجائز کے بیچ الجھنے لگا۔ تب اس نے شکست مان لی۔ یہ اس کی شب اول تھی۔ جو تمام لمحے محبت کی پھانسی پر بین کرتی رہی۔ اس کے خواب تو آنکھوں ہی میں مر گئے۔

مگر زندگی تمام کرنی تھی اور پاؤں جو پائل کی چھن چھن سے چھنکتے تھے۔ وہ انگاروں پر سفر کرنے لگے تھے۔

اس نے گھٹنوں کو بازوؤں کا جو ہار پہنایا تھا سو توڑا۔ بکھرے بال سمیٹے اور ماتم کدے سے اٹھ کر زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگی۔ اس کے کمرے سے باہر بھی اک زندگی تھی۔

www.paksociety.com

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening ,or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

ایک زہریلی مسکراہٹ سے اس کی وحشت سے بھری مسکراہٹ کا جواب دیا اور کچن کا رخ کیا۔
ایک وحشیانہ قہقہہ گونجا تھا جواب برتنوں کی کھٹ کھٹ میں کچھ دب سا گیا اور وہ زندگی کا ایندھن ہنڈیا میں پکانے لگی۔

☼ ☼ ☼

آج ڈائری کھولنے کا اتفاق ہوا تو پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔
کئی ادھوری کہانیاں سر اٹھانے لگیں۔ نجانے میری کہانیاں کہاں تک پہنچ گئی ہوں گی۔
جب نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا تب سوچا تھا اپنے ساتھیوں کی کہانیاں لکھوں گا۔
میرا پریتم گیت لکھنے والا۔ سنا ہے ریلوے میں گارڈ بن گیا ہے۔
اور میرا گاؤں کا ساتھی جو چند جماعتیں پڑھ کر اسکول سے بھاگ گیا اور اپنے باپ کا تانگہ چلایا کرتا تھا۔ سنا ہے وہ اب میرے گاؤں کے اسٹیشن پر بابو ٹکٹ چیکر لگ گیا ہے۔
اور مائیکل جو بچپن سے ذہین اور سازشی ہوا کرتا تھا۔ سنا ہے وہ کبھی کبھی اسٹیشن پر رات بسر کرنے آتا ہے۔ گھر کیوں نہیں جاتا ہو سکتا ہے اس کی شادی نازنین سے ہو گئی ہو اور اب اس کا غبار محبت ختم ہو گیا ہو۔ یا وہ بھی حالات کا شکار ہو گیا۔
پتا نہیں پریتم اپنی بیوی سے محبت کرنے لگا ہے یا ابھی تک ملالہ کے عشق میں جلتا ہے جو اس کی جوانی کی غلطی تھی۔ جس کے لیے وہ گیت لکھا کرتا تھا۔ بڑا ہی من موجی سا گیت کار تھا۔
اور مہر جو روز اپنی سوتیلی ماں کی مار کھا کر بھی بیگ ہاتھوں میں لیے ہمارے ساتھ تانگے پر سوار ہو جاتی۔ اس کا خواب مستقبل کی پروفیسر بننا تھا۔ خدا جانے یہ خواب پورا ہوا یا اس سے پہلے اس کی شادی ہو گئی؟
کئی سوال یادوں کی لوٹ سے سر اٹھانے لگے ہیں اور آپ کو پتا ہے، جب سوال سر اٹھانے لگے تو جوابات کی بے چینی شروع ہو جاتی ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے مجھے اپنے آبائی گاؤں کی زمین بلا رہی ہے۔ مجھے میرے ساتھیوں کی محبت پکار رہی ہے۔
مجھے میری ادھوری کہانیاں آوازیں دے رہی ہیں

اور آپ کو تو پتا ہے کہ سیاح زیادہ دیر تک اک جگہ بیٹھ نہیں سکتا دل کی آواز پر محبت کے حصول کے لیے محبت نگر کا سفر کرتا ہے اور اب میرا دل بے چین ان ادھوری کہانیوں کی آواز پر اڑا جاتا ہے۔ آپ بھی آئیے میرے گاؤں کے اسٹیشن پر ادھوری کہانیوں سے ملنے اور انہیں مکمل دیکھنے کے خواہش مند راستوں پر سوار ہو جائیے۔
جہاں میرے پریت نگر کے باسی ہیں۔
میرا قطب الدین، میرا مائیکل، میرا موجی پریتم، میری پیاری ساتھی مہانو محبوب اور میرا اداس سا ریلوے اسٹیشن۔
ہمارے استقبال کے لیے بے چین ہے۔ جس کی خاطر یہ سیاح روشنیوں کے شہر سے نکل کر اپنے سادہ سے گاؤں کی طرف رواں ہے۔
جہاں داستان محبت جنم لیتی ہے۔
اور دلوں میں پروان چڑھتی ہے۔
جو پریت نگر کہلاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

"یہ تو سارا دن کیا کیا لکھتا رہتا ہے۔" وہ پراندہ گھماتے ہوئے اس کے سامنے آکر پوچھنے لگی۔ بات کرنے کا اک بہانہ تھا ورنہ اس کے لکھنے سے اسے کون سا مطلب تھا۔
"گیت ہے۔" اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہی جواب دیا۔
"اس گانے والی کی خاطر لکھ رہا ہے؟" اس نے اپنے انداز میں قدرے معصومیت سمو کر کہا۔
اسے اس بھول پن پر جی بھر کر پیار آیا۔ اک نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر سے اپنے کام میں جت گیا۔

"ابھی تک محبت کرتا ہے اس گویئے سے۔" اس کے لہجے میں شکایت اشتیاق تھی۔

"اس کا نام ملا ہے۔" اس نے کاٹ کھانے والی نگاہ اس پر ڈال کر جھکائی۔

"ہے تو گانے والی نا۔" عجب بے نیازی تھی۔ وہ اس بار خاموش رہا تھا۔

"اتنا چاہتا ہے اس کو؟" اب وہ کچھ ڈرے ہوئے انداز میں بولی۔

"عشق کرتا ہوں۔۔۔ پھر؟" اس نے قلم روک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔۔۔ عشق ابھی تک، ارے اب تو تجھے مجھ سے عشق کرنا چاہیے اپنی بیوی اپنی رانو سے۔"

"عشق زبردستی کا سودا نہیں۔" اس نے لہجے کی تلخی کو قدرے کم کرتے ہوئے عام سے انداز میں اس کے تیور نظر انداز کر کے کہا۔

"ہائی۔۔۔ میں مر گئی۔" اس نے افسوس سے اپنا دل تھام لیا۔

"نہیں۔۔۔ مرا تو میں ہوں۔" وہ اب تلخی روک نہ سکا۔

"آں۔۔۔ میرے خدا۔۔۔ یہ گویئ ابھی تک میرے شوہر کے پیچھے پڑی ہے۔" وہ برآندہ پشت پر چھوڑ کر رونی سی صورت بنا کر اٹھی اور با آواز بلند بڑبڑ کرتی ہوئی اپنے باپ کو سنانے باہر نکل گئی۔

اور اس نے اپنا سر تھام لیا۔ ابھی تو شروعات تھی۔ وہ دن بہ دن اس کے لیے امتحان بنتی جارہی تھی۔

جب اس کی ماں بے آسرا ہو گئی اور اس کے ماموں نے چھت دے کر اور دو وقت کی روٹی کھلا کر اس پر زندگی بھر کا احسان کر کے اس کی زندگی خرید لی تھی۔

وہ لمحہ بھر کو بھول گیا جو اس کے ماموں نے اسے یاد دلایا تھا تب سے اس نے ہار مان لی تھی کہ ماں کی چند نصیحتیں جو پلے سے بندھی تھیں اور ان کی محبت جس نے قدم روک رکھے تھے۔ اسے آج بھی وہ صبح یاد تھی جب اس کے لیے کوٹھی بناتے ہوئے ماں اپنے خوابوں کا اظہار کر رہی تھی۔ اس گارے مٹی اور لکڑی سے بنی اس کوٹھی میں اس کی ماں کے ہاتھوں کی محنت اور خوشبو تھی۔

اور جب جانے سے پہلے اسے اک نظر دیکھ کر التجا کی تھی۔

"موتی۔۔۔ میں نے تیرے لیے گھر بنا دیا ہے۔ اب اسے بسانا تیرا کام ہے۔ میں نے اپنا کام کر دیا۔ تو اپنا کام پورا کرنا۔" اس نے اپنی محبت کی زنجیر اس کے پاؤں میں باندھ دی۔

اور وہ چاہتے ہوئے بھی انکار نہ کر سکا۔ اس ماں کو جس نے باپ کی شفقت کی کمی پوری کر دی تھی۔

وہ ماں جو فصلوں کی بوائی کے دوران کام کر کے اس کے تعلیمی اخراجات پورے کیا کرتی تھی۔

اسے وہ دن یاد تھا جب قریبی گاؤں سے پرائمری پاس کر کے وہ نزدیکی شہر اس کا داخلہ کرانے اسے خود لے گئی۔ اور پھر غربت کے اس حال میں بھی پرائیوٹ اسکول کے خرچے بڑی خوشی سے برداشت کرنے لگی تھی اور جب وہ انٹر میڈیٹ کر چکا تو اس کے منگنی کی رسم اس کی ماموں زاد رشیدہ سے ہو گئی۔

تب انکار کا کوئی خاص جواز تھا نہ ہی ابھی زندگی کا شعور۔ وہ بتائے گئے راستوں پر چلنے لگا۔ مگر جب زندگی کا ورق پلٹا اور حالات نے رخ بدلا۔ یونیورسٹی لائف کی سرگرمیاں اور تعلیمی رجحان نے اک اور دنیا دکھائی۔ اسی دوران شادی کا شور اٹھا۔ جسے اس وعدے پر اس نے روکا کہ تعلیم پوری کر کے نوکری حاصل کر کے پھر شادی کرے گا' دوسری صورت اپنے ماموں کے احسانوں کا بدلہ اتارنے کی خاطر روزگار کا سہارا ضروری ہے۔ ماں کو آرام سے بیٹھ کر وجہ بتائی تو وہ قائل ہو گئی اور اس دوران۔۔۔ وہ تمام زنجیروں کی بندشیں بھلا کر خواب بننے بیٹھ گیا۔ یہ اس کی زندگی کا ہلچل سے بھرا ایک خوب صورت دور تھا۔ اس نے ان دیکھے رشتوں پر خوشبوؤں کے حصار میں قدم بڑھا لیے۔ اسے لگا جیسے یہ شہر روشنیوں سے بھر گیا ہو۔

☆ ☆ ☆

"میری مہانو نصیبوں والی بنے گی۔ عیش کرے گی۔

بہت سی خوشیاں ملیں گی اسے۔" سرپرست شفقت سے شہر جاتا اور دعا اس کا سر چومنے لگتی۔

"ابا یہ بھی تو کہہ ناں بہت سا پڑھے گی استانی بنے گی۔"

اپنی من پسند دعا کی فرمائش کرتے ہوئے اس نے باپ کے سینے پر سر رکھ لیا۔

"ہاں بہت سا پڑھے گی۔ استانی بھی بنے گی۔" وہ اس کے بال سنوارتے ہوئے ہلکا سا ہنسنے لگتے۔ بیمار وجود میں امید کی اک کرن جاگتی۔ ان کی باتیں۔ ان کے لیے زندگی سے کم نہ تھیں۔

مسکراہٹ کا جواز اس کی ہنسی تھی جو ابھی تک اس کے لیے طمانیت کا سبب تھی۔ گردوں کی بیماری نے اسے آخری اسٹیج تک پہنچا دیا تھا۔ ڈر موت کا نہیں اس کے مستقبل کا تھا۔ سوتیلی ماں کا رویہ ان کے سامنے تھا۔

اس حالت میں یہ جنگ وہ تو لڑ لڑ کر تھک گیا تھا۔ جس بیٹی کے مستقبل کا سوچ کر اس نے بیوی کے مرنے کے بعد دوسری شادی کی تھی۔ اس کے نتائج وہ اب بھگت رہا تھا۔

جب تک صحت رہی اور اس کی کمائی گھر میں اس کی آسائشوں کو ممکن بناتی رہی۔ تب تک جھوٹے پیار کی بوچھاڑ اس بچی کا نصیب تھی مگر جب سے بیماری نے فصل اگانے کے قابل نہ سمجھا زمین کرائے پر چڑھا دی۔ آمدنی میں گھر کی ضرورتوں کا بمشکل خرچا پورا ہوتا۔ اس پر یہ بیماری جو جان کا روگ بن گئی تھی۔

ایسی حالت میں اس کے سامنے ہی اس کی بچی کی پٹائی لگتی تو وہ چپ چاپ تڑپتا رہ جاتا۔ پھر اس کی سسکیاں اس کا من چھلنی کر دیتیں۔

اپنے سینے میں اس کی ہچکیاں دباتے سر تھپکتا رہتا اور کئی خاموش آنسو بے ساختہ اس کے چھوٹے چھوٹے بال بھگوتے اس کا دکھ اٹھاتے رہتے۔ مگر جب وہ اس کے پاؤں دبانے آ بیٹھتی تو باتوں سے دل خوش ہونے لگتا۔ اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کے ہاتھ پاؤں سے درد اکھاڑ پھینکتے اور وہ سوچتا رہ جاتا کہ کاش وہ بھی اس کی تمام مشکلیں اس کی زندگی اور حالات سے اکھاڑ پھینکے۔ یہ سوچ کر ہی دل درد کرنے لگتا اور اسی درد کو لیے وہ جہان فانی سے کوچ کر گیا۔

اس دن ایک قیامت تھی۔ جب مہانو چیخ چیخ کر روتی رہی۔ مگر اس کا بیمار ابا جو سینے میں اس کا سر چھپائے اس کے بال سنوارتا تھا۔ اسے تھپکیاں دے کر چپ کراتا تھا۔ کہانیاں سناتا اور وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر کہانی سنتے سنتے سو جاتی جس میں مہانو ایک اچھی استانی تھی۔ وہ کہانی کو خواب میں دیکھتی اور اس سینے پر سر رکھے لیٹے لیٹے اپنے مستقبل کے خواب بننے لگتی تھی۔

آج جب وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی تب اس کا ابا بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔ اور وہ جو کہتا تھا کہ میں تجھے کہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ وہ اسے تنہا چھوڑ کر دنیا کے حوالے کر کے جا چکا تھا۔

اور وہ مسلسل اسے آوازیں دیتی رہی اپنے معصوم ذہن کو اس کی موت کی بے یقینی سے بہلاتے ہوئے۔

پھر اس نے خاموشی اوڑھ لی۔ گھر کے اندر اس کا دم گھٹنے لگا۔

☆ ☆ ☆

ان دنوں وہ نوکری کی تلاش میں تھا۔ اس کے قلم تھامنے والے ہاتھ مانگنے چلا چلا کر تھک گئے تھے۔ ماں کی وفات کیا ہوئی وہ جیسے بے اماں سا ہو گیا۔ سادگی سے رخصتی ہو گئی ایک سال کے اندر ہی۔ وہ اس کی تعلیم کا آخری سال تھا' جب وہ سندھی لٹریچر میں ماسٹرز کی ڈگری لے کر وہاں سے نکلا تو جیسے اپنا آپ سندھ یونیورسٹی کے کلاس روم میں ہی چھوڑ آیا ہو اور جب ماسٹر چندر نے اسے ماتھے پر بوسہ دیا تھا تب اس نے ملا کے لیے آخری گیت لکھا تھا۔ اس کے بعد وہ کبھی ادھورے گیت پورے نہ کر سکا تھا۔ یہ آخری ملاقات سمجھ کر وہ حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن گیا تھا۔ وہ گیت گا رہی تھی۔ اس کا لکھا ہوا گیت۔ محبت کا گیت جو اس کی آواز کا محتاج تھا۔

www.Paksociety.com

"تم ہمیشہ ملا کے لیے گیت لکھنا۔" ماسٹر نے فرمائش کی اور وہ مسکرا کر رہ گیا۔ جب رخصت لینا چاہی تو وہ اس کے راستے میں آگئی۔

"پر تم۔۔۔ گیت لکھو گے ناں۔۔۔؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھنے لگی تھی۔

اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ اس نے بے خبری میں شانے اچکائے تھے۔ جیسے اسے آنے والی زندگی کا اندازہ تھا۔ وہ پھر ایسے ہی انداز میں پوچھنے لگی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔

"پر تم محبت کرو گے ناں؟" اور وہ آنکھیں چرانے لگا۔ جیسے دل بھی بس سے باہر ہو۔

"پر تم یاد رکھو گے ناں؟" وہ سوالوں سے اس کو پریشان کرنے لگی سب ایسے سوال جن کے جواب اس کے پاس بھٹکتے پھر رہے تھے۔ جیسے وہ درست پوچھ رہی ہو۔

جیسے وہ حاصل کی خواہش میں مجبور ہو رہی ہو۔

اور اسے اس کی مجبوری کہاں منظور تھی۔

"ملا! تم چندر جی سے شادی کر لو۔ وہ تمہیں چاہتے ہیں۔"

وہ اسے راستہ دکھانا چاہ رہا تھا۔

"تم بہت بھولے ہو۔ یا بننے کی کوشش کر رہے ہو۔" وہ اس کا امتحان بن رہی تھی۔

"میں بھولا بننا چاہتا ہوں۔" اس کے انداز میں بے چارگی تھی۔

"کاش میں تمہاری خواہش پوری کر سکتی۔" وہ ہلکے سے مسکرا دی۔

"اپنا خیال رکھنا۔" وہ جیسے جانے کو پلٹا۔

"مجھ سے ملنا۔۔۔ ایک بار ضرور۔ میں تمہیں وہ سب بتاؤں گی۔ جو ابھی تک دل میں رکھا ہے اور جو زندگی نے دیا اور جو چھین لیا۔" اس کا لہجہ خالی خالی تھا اور آواز جیسے بہت دور سے آرہی ہو۔

وہ اس کے خالی پن کو دیکھ کر دکھی سا ہو اٹھا۔

"ابھی نہیں۔۔۔ ابھی تو ہم راستے میں کھڑے ہیں۔" اس نے دور سے آتے چندر کو دیکھ کر کہا تھا۔

وہ کوئی بھی وعدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے خاموش رہا۔

"مجھے تمہیں بہت کچھ بتانا ہے۔ تمہیں پتا ہے میرا تمہارے علاوہ کوئی اچھا دوست نہیں ہے۔" وہ اپنی اداسیاں سمیٹتے ہوئے بمشکل مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ کے جواب میں بھی وہ خاموش ہی رہا۔ چونکہ اس کی تنہائی پسند طبیعت کا تو یونیورسٹی میں ساتھ پڑھنے کے دوران اسے علم ہو ہی چکا تھا۔

"تم بہت اچھے دوست بن کر رہے ہیں۔" وہ جاتے ہوئے اسے کچھ اور تو کہہ نہ سکا محبت کو سمیٹ کر محدود کر گیا۔

"ہم ہمیشہ دوست رہیں گے۔" اس کے لہجے میں کیسا یقین تھا۔ وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔

"جیسے وہ کہہ رہی ہو ہمیشہ محبت کریں گے۔" اور وہ محبت کا دعویدار بننا نہیں چاہتا تھا کیونکہ خاموشی کو اگر زبان دی جائے تو سحر ٹوٹ جاتا ہے۔ لفظوں کے موتی بکھر جاتے ہیں۔ اور ہاتھ خالی رہ جاتے ہیں وہ پھیکی ہنسی ہنس دیا۔ اپنے خالی ہاتھ دیکھ کر جہاں کچھ نہیں تھا۔

"تمہیں پتا ہے عورت سچی محبت چاہتی ہے۔ اپنی بیوی سے سچی محبت کرنا۔ بیویوں کو تو ویسے بھی پورے شوہر چاہیے ہوتے ہیں۔" وہ اس کی بے بسی دیکھ کر موضوع بدلنے لگی دوسرے لفظوں میں اسے حوصلہ دینے لگی۔ وہ اب کی بار مسکرا بھی نہ سکا۔

"گیت لکھتے رہنا۔ تم لکھو گے تو میں گاؤں گی۔ ورنہ نہیں۔" وہ جیسے زندگی میں رہ کر موت کا حکم سنانا چاہ رہی تھی۔ اسے عورت کی بھی سمجھ نہ آئی۔ جو کسی وقت بڑی سے بڑی قربانی کے لیے تیار تو بھی ظلم۔۔۔ کبھی بے وفائی بھی برداشت نہیں اور کبھی زمانے کے گرم ہوا کے تھپیڑوں میں خود محبت چھوڑ دینے کو تیار۔ وہ اسے کیسے مشورے دے رہی تھی۔ وہ جو کچھ نہیں جانتا تھا۔ اپنے آپ کو بھی نہیں۔ سو اس کو کیا سمجھتا۔ بس ایک محبت کی بات تھی جو کہ خاموشی میں بھی شور کرتی تھی اور اپنے ہونے کا احساس دلاتی تھی۔

☆ ☆ ☆

پھر مہری کتابیں بہتی ندی میں پھینک دی گئیں اور جن ہاتھوں میں قلم تھاما تھا برتن مانجھنے، جھاڑو دینے کپڑے دھونے اور روٹی پکانے تک محدود ہو گئے۔ وہ کام سے انکاری نہیں تھی۔ مگر ساتھ ساتھ پڑھنا چاہتی تھی۔

مگر اس کی ہر خواہش کو دبایا گیا۔ جب بچے تانگے میں چڑھ کر ساتھ بستی والے اسکول یا نزدیکی شہر جاتے۔

تب وہ راستے کے ساتھ بہتی ندی میں کپڑے دھونے یا برتن دھونے آتی اور انہیں دیکھ کر حسرت سے، بے چارگی کے ساتھ چپ ہو جاتی۔ کون تھا جو روتے میں بہلاتا۔ اس لیے خاموشی کو بہتر جانا۔

اور اسی خاموشی میں دل کے اندر تمام خواہشوں کے طوفان ہلچل مچاتے۔ وہ طوفانوں کو دباتی رہی۔ مگر جتنا دباتی اس کی سوتیلی ماں کی انگارے برساتی آنکھیں سینے میں نفرت کے شعلوں کو ہوا دیتیں۔

اور وہ اس کی نفرت کی آگ میں جلتی رہتی۔ یہاں تک کہ اس کے ظلم کا زہر پی کر دل زہر بن گیا تھا اور وہ محبت کو ڈھونڈتی ہی رہ گئی۔۔۔ مگر زندگی نے کب رکنا ہے وہ اس کے لیے مزید امتحانات لیے مسکرا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اتنے لوگوں کے ہجوم میں بھی اسٹیشن کی اداسی نہیں جاتی۔ میری نگاہ سب سے پہلے اسٹیشن کی پرانی عمارت پر پڑی تھی، جو پہلے سے زیادہ پرانی لگتی تھی اور سب سے پہلے جس تبدیلی کا مجھے احساس ہوا وہ بجلی کی جگمگ کرتی روشنیوں کا تھا، مجھے یاد ہے میں جب یہاں سے گیا تھا تو لالٹین بتی کا استعمال ہوتا تھا۔ کتنا عرصہ۔ میں یاد کرنے کی کوشش کروں تو تقریباً ستر سال بیت چکے تھے، جب ہماری فیملی کراچی شفٹ ہوئی تھی۔ مجھے آج بھی یاد ہے پہلے پہل میں چھپ چھپ کر رویا کرتا تھا، سب کو یاد کر کے دو سال تک جلدی جلدی چکر لگاتا تھا مگر پھر اپنی مصروفیات اور شہر کی روشنیوں میں کھو گیا۔

کچھ ساتھیوں سے دور رہنے کی عادت بھی ہو گئی تھی اور یادیں جیسے ذہن کے کسی کونے میں چھپ کر بیٹھ گئیں۔

اور اب اتنے عرصہ بعد جب تقریباً "تو ساندہ دیکھ چکا تھا۔ اب گاؤں کی یاد مجھے یہاں کھینچ لائی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا "اس پرانی عمارت سے لپٹ جاؤں۔ میں نے عمارت کو ہوائی بوسہ دیا اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔ جہاں ایک سفید بالوں والا آدمی کرسی پر بیٹھا پشت کیے اخبار میں محو تھا اور دوسرا چہرے پر سندھی ٹوپی رکھے با آواز بلند خراٹے لے رہا تھا۔ پہلے تو اتنے شور میں مجھے اس بندے کی اتنی گہری نیند پر حیرت ہوئی پھر اپنی پہچان کرانے کے لیے میں نے سوال کرتے ہوئے اس کا کندھا ہلکا سا تھپتھپایا۔

"قطب الدین یہاں ہوتا ہے۔"

اس نے اخبار پیچھے کر کے گردن موڑ کر دیکھا مگر پہچاننے میں ناکامی ہوئی تو کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں قطب الدین ہوں۔۔۔ تم؟" وہ کھچڑی داڑھی کھجاتے ہوئے تجسس سے پوچھنے لگا تھا۔

میں چند لمحے تو اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ وہ اتنا بوڑھا ہو گیا یا مجھے لگ رہا ہے اور ایک لمحے کو اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ کیا میرے نقش بدل گئے ہیں۔ یا میں بھی قطب الدین کی طرح بوڑھا ہو گیا ہوں۔

"تو۔۔۔ تو رؤف ہے؟" وہ آنکھیں جھپک جھپک کر کچھ حیرت سے پوچھنے لگا۔

میرے دل میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میرے اندازے غلط تھے اور وہ مجھے پہچان چکا تھا۔ میں بڑھ کر اس سے بغلگیر ہوا تھا۔

"ارے یار تو تو اب بھی ویسے کا ویسا ہے۔" وہ میری پشت تھپکتے ہوئے پرجوش انداز میں بولا۔

"جب ہی پہچان نہیں پایا تھا۔" میں ہنسا۔

"ارے کیسا ہے تو یار! کیسے یاد آگئی تجھے یہاں کی۔ چل بیٹھ۔" اس نے کرسی میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"میں تو فٹ ہوں مگر تم ان فٹ لگ رہے ہو یار!"

اتنے بوڑھے کیوں ہو گئے ہو ہم میں صرف چھ سال کا فرق ہے۔ مگر تو مجھے ابا لگ رہا ہے۔

"قسم سے مائیکل بھی یہی بکتا ہے حالانکہ ہم دونوں ہم عمر ہیں۔ مگر وہ بھی ایسا کہتا ہے۔"

"ارے وہ ہے کہاں یار؟" میں نے ادرگرد نگاہیں دوڑائیں اس کی تلاش میں۔

یہیں تمہارے پیچھے سو رہا ہے، جو 'اٹھا اسے۔ شرافت سے کہاں اٹھے گا یہ۔"

"ارے اتنے شور میں یہ سازشی سو رہا ہے یہاں۔" میں ایک دم پرجوش ہو کر اٹھا تھا۔ جیسے ہی اس کے چہرے پر سے ٹوپی اٹھائی روشنی لگنے کی وجہ سے اس نے آنکھیں زور سے میچیں اور کسمسایا۔ میں نے اس کے دونوں گال بچوں کی طرح تھپتھپائے تھے۔

اور اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑ کر ایک موٹی گالی دی تھی۔

وہ قطب کی حرکت سمجھ رہا تھا۔ میرے زوردار قہقہے پر اس نے ایک آنکھ کھول کر میری طرف دیکھا، پھر دونوں آنکھوں سے ابھی شاید اس کا ذہن نیند میں تھا یا وہ بھی پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ابے اٹھ سازشی میں ہوں روف 'تیرا پرانا یار۔'" میں نے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔

وہ اسی حیرت سے ایک لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر اچانک اٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

"ابے گیدڑ یار! تو نے بڑی جلدی صورت دکھائی۔ کہتا تھا' ہر سال چکر لگاؤں گا جھوٹا کہیں کا۔"

"تیرا شکوہ اپنی جگہ مگر اب گیدڑ نہیں 'شیر بن گیا ہے تیرا روفی یار۔"

"اچھا وہ لومڑی کہاں ہے جو اسٹیشن پر بتی لے کر گھومتی تھی۔" "اور ہمارا چھوٹا سا ممنا' سنا ہے ریلوے میں گارڈ ہے۔"

"ارے موی کی بات کر رہا ہے ناں۔"

"ہاں۔"

"اس نے ٹرانسفر کرا لیا مگر اس طرف بھی آتا ہے کل ہو سکتا ہے' آ جائے اور یار بے چارہ آج مٹی کے حوالے ہو گیا۔" اس نے قلی کا بتایا جس سے ہماری بہت اچھی گپ شپ رہتی تھی۔ مجھے افسوس ہوا تھا۔ ابھی ہم باتوں میں ہی لگے تھے کہ سفید وردی میں ملبوس کا بچہ اندر داخل ہوا۔ اس کی حالت بھی ویسی ہی تھی۔

"مجھے کل یہاں آنا تھا مگر آج دل بار بار سگنل دے رہا تھا تو میں چلا آیا اتفاق سے ڈیوٹی لگ گئی۔ تجھ سے جو ملنا تھا۔" وہ بھی میری طرح ہی خوش تھا۔ مگر اس کی آنکھیں۔ میں نے لمحہ بھر کو غور سے ان آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھیں ابھی تک اسی طرح اداس رہتی ہیں۔

"کیا دیکھ رہا ہے؟ وہی ہوں تیرا موی۔" وہ لڑکیوں کی طرح حسب عادت گھبراتے ہوئے بولا جیسے انسان کسی راز کی افشائی سے ڈر کر آنکھیں ادھر ادھر گھمانے لگتا ہے۔

"یار یہ تم ابو ابھی تک گیت لکھتا ہے؟" میں نے دیکھا اس کا پرانا نام لینے پر اس کے چہرے پر اک سایہ سا لہرا گیا تھا۔

"اب گیتوں میں کیا رکھا ہے۔" اس کی آواز دھیمی تھی اس بار۔

"ملا؟" میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کس طرح پوچھوں۔

"مر گئی۔" اس کی آواز میں جیسے چھناکے سے کچھ ٹوٹا تھا۔

اور میرے دل کی وہی حالت تھی۔

"پر یہ تم... ملا مر گئی۔"

مجھے یقین نہیں آیا تھا' پتا نہیں کیوں۔ "ملا کیسے مر سکتی ہے۔"

پورے ماحول پر اداسی چھا گئی تھی۔ وہ جیسے سوچ میں پڑ گیا۔ جیسے میرے سوال کا جواب تلاش کر رہا ہو۔ کہ ملا کیسے مر سکتی ہے۔

"ارے! چائے پیو گے یار! میں چائے لے کر آتا ہوں۔" مائیکل نے خاموشی میں اک پتھر پھینکا تھا۔

قطب ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا تھا تاکہ ماحول بدلے۔ اس نے سگریٹ سلگایا۔

"تو سگریٹ پینے لگا ہے؟" میں نے حیرت سے اس سے پوچھا جیسے سگریٹ پینا کوئی بڑا گناہ ہو۔

صرف سگریٹ پیتا ہوں یار مگر پھر بھی نشئی کہہ سکتے ہو۔" وہ ہلکے سے مسکرایا۔

"کیا مطلب صرف سگریٹ؟"

"تم اس کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو بھئی! چائے پیو۔" مائیکل نے انٹری دی۔ وہ جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں مائیکل کا شکر گزار ہوا تھا اور سگریٹ بجھا کر چائے کا کپ اٹھا لیا۔

پھر پرانی باتوں کا دور چلا تو ہم سب پل بھر کو بھول کر ماضی میں بھٹکنے لگے تھے بے چین روحوں کی طرح اور رات آہستہ آہستہ کھسکنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

یہ ایسی عمر تھی جب آنکھیں صرف اور صرف خواب دیکھتی ہیں اور تعبیر سوچتی ہیں' جب صرف دل کا حکم چلتا ہے ذات پر اور وہ جب گھر کے کام کاج سے تھک جاتی تو نمرو میاں اسے گھیرے میں لے لیتیں اور وہ اپنے ابا کو یاد کرتے کرتے اور اپنے اچھے دنوں کے بارے میں سوچتے سو جاتی۔

صبح نیا دن اس کے لیے نئی آزمائش بن کر آتا تھا۔ ایسے میں کسی کی تسلی یا ہمدردی کے چار بول بھی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بن جاتے ہیں۔

اور اس سے اس کی ملاقات ہوئی' جو دھیرے دھیرے اس کے دل میں محبت کی جڑیں اگا گئی' وہ کچھ ایسی عجیب باتیں نہیں کرتا تھا اس سے۔ بس اس کا دکھ سمجھ کر اس کا حال پوچھ لیتا اور ہمدردی کے چند بول لیتا۔ رفتہ رفتہ اس کی گفتگو بدلتی گئی۔ وہ اس سے محبت کی باتیں کرنے لگا اور اس کی آنکھوں میں خواب سجانے لگا۔

اس کی تھکن جیسے اتر سی جاتی' جب سوتے وقت اس کی باتیں یاد آنے لگتیں۔ وہ باتوں کا ماہر تھا' وہ اس بات کی قائل ضرور تھی۔ مگر اسے یہ باتیں اچھی لگتی تھیں۔ اس سے اس کی تھکن جو اتر جاتی تھی۔

اسے اب اتنا ضرور لگنے لگا تھا کہ زندگی میں کچھ اچھے لوگ ضرور ہوتے ہیں جو انسان کو جانتے ہیں۔ انسانوں سے محبت کرتے اور وہ اسے وہی سمجھتی تھی۔ اسے بھلا لوگوں کی پہچان کہاں تھی۔

☼ ☼ ☼

"موی! ایک بات پوچھوں؟" وہ اس کے سامنے کھانا رکھ کر پرسوچ انداز میں بولی۔ اس نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا اور لقمہ توڑنے لگا۔

"تو اب تو اس گانے والی کو نہیں چاہتا؟ میرا مطلب ہے شہر میں اس سے ملتا تو نہیں؟" وہ اسے جانچنے والے انداز میں دیکھ کر بولی۔

"تو بار بار اس کا نام کیوں لیتی ہے؟ وہ میری زندگی میں نہیں اب۔" اس نے حد درجہ غصے کو دبایا اور آرام سے کہنے لگا۔

"پتا نہیں سنا تھا کہ یہ شہر کی چھوریاں پیچھے پڑ جائیں تو جان نہیں چھوڑتیں۔"

"کس نے یہ بکواس کی ہے۔ اور تو ذرا تمیز سے بات کیا کر۔ ایسے کسی کو بار بار ذلیل کرنا کہاں کی انسانیت ہے۔" اس کا لہجہ کچھ تیز ہوا تھا۔

"لے میں نے کون سا اس کو ذلیل کیا ہے۔ جو تو مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ میں تو سمجھ رہی تھی تو اس کو بھلا چکا ہوگا۔ مگر نہیں۔"

"تیری ہر بات اس سے شروع ہو کر اس پر ہی کیوں ختم ہوتی ہے آخر؟"

اس نے پلیٹ کھسکائی اور وہاں سے اٹھ گیا۔ "میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں اس کا نام مت لیا کر۔ خدا کے واسطے رحم کر مجھ پر' تھک گیا ہوں میں اب' بہت تھک گیا ہوں۔ تجھے روز روز جواب دے دے کر عاجز آ گیا ہوں۔"

اس کا بس چلتا تو بچوں کی طرح رونے بیٹھ جاتا۔ مگر دل کی بھڑاس نکال کر گھر سے نکل گیا۔

اور اس کے پیچھے جتنا اس نے بولنا تھا بولی۔ پھر محلے کی ہمدردیاں بھی اس کے ساتھ ہو گئیں۔

www.Paksociety.com

"ابھی تیرا باپ مرا ہے۔ ایک ہی مہینہ ہوا ہے اور یہ تجھے دبا تا ہے۔ کل کو تو مارے گا بھی پھر کیا کرے گی تو؟" یہ بروس حمیدہ کی ہمدردیاں تھیں۔

"مجھے تو پہلے ہی سے پتا تھا کہ یہ اس سے ملتا ہے۔ میں نے کیا پوچھا مجھے مارنے کو دوڑ پڑا۔ لہا کے بعد کھلا ہے ہیچ کہتی ہے تو۔" وہ پیشانی پر ہاتھ رکھے پریشانی سے روتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں تو کہتی ہوں دبا کر رکھ اسے۔ میرا شوہر دیکھ کتنی محبت کرتا ہے مجھ سے۔ ایک یہ ہے کہ سیدھے منہ بات تک نہیں کرتا مجھ سے۔ میں بھی جب سے بیاہ کر آئی ہوں۔ یہ رنگ دیکھ رہی ہوں۔" اس نے معمولی سی بات کو ہوا دی۔

"پہلے ایسا نہیں تھا حمیدہ! شاید اب سے ڈرتا تھا۔ مگر پھر بھی۔ کبھی گھر میں اس کی آواز بھی اونچی نہ ہوئی تھی۔ میں تو کہتی ہوں سارا کچھ اس گانے والی کا کیا ہوا ہے۔"

"تو بھی ٹھیک کہتی ہے۔ مگر پھر بھی نظر رکھ۔ مرد کو اگر آزاد چھوڑ دو تو پوچھتا تک نہیں ہے۔ اری تیرا ابا کیسا تھا اور تیرا چاچا۔ سنا ہے بیویوں کو اتنا مارتے تھے۔ اتنے ظالم تھے کہ خدا کی پناہ۔"

"یہ تو نشہ نہیں کرتا حمیدہ! یہ تو اتنا پڑھا لکھا ہے۔ اسے تو سب پتا ہے نا۔ بس میرے پر توجہ نہیں دیتا۔ مجھ سے بیزار رہتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔" وہ اپنی پریشانی اسے بتانے لگی۔

"اپنے آپ کو سجا سنوار کر رکھ۔ تو اتنی خوبصورت تو ہے ہی۔" اس نے اپنے تئیں اسے نادر مشورہ دے ڈالا۔

"یہ بھی کر کے دیکھ لیتی ہوں۔ کیا نہیں کیا آج تک میں نے اس کے لیے۔ صبح صبح اٹھ کر اس کے لیے ناشتا تیار کروں۔ گھر کا پورا کام کر کے اس کے کپڑے دھوؤں۔ اس کی ہر ہر چیز سنبھال رکھوں۔ اس کا اتنا خیال کروں اور وہ چند روپے ہاتھ پر رکھ کر سمجھتا ہے۔ سب کر لیا۔ روپے سے خالی زندگی تو نہیں بنتی رے اور پھر میں اسے اتنا چاہتی بھی تو ہوں نا۔ کیا الو کا پٹھا ہے جو نہیں سمجھتا۔" وہ دل کی بھڑاس نکال کر خاصی ہلکی ہو گئی تھی۔

"تجھے تو میں جانتی ہوں۔ بس۔ خدا اس کے دل میں بھی تیرے لیے رحم ڈالے۔ وہ بھی تو تیرا خیال رکھے نا۔" وہ اسے بھرپور احساس دلانے لگی۔ اور پھر جب اپنی لو راپنے شوہر کی باتیں کرنے لگی تو اس کے اندر کی تمام خواہشیں جاگ اٹھی تھیں۔ ساتھ ساتھ شکستیں بھی۔ آج اسے انتظار تھا کہ وہ اسے منائے گا۔ یہ اس کی خوش فہمی ہی تھی۔

☼ ☼ ☼

میں جب نیند پوری کر کے اٹھا تو ان دونوں کو آپس میں گتھم گتھا پایا۔ "کیا ہے بھئی تم لوگ رات کو اچھے بھلے تھے۔ یہ لڑائی ہو رہی ہے کیا؟"

"وتمہیں پتا ہے" آج تم میری طرح گدھے بیچ کر سوئے ہو گیدڑ۔ وہ اس کے ساتھ بحث چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہوا تھا۔

"ہاں یار تھکن جو تھی۔ مگر تو تو روز سوتا ہو گا اس طرح۔"

"ہاں یہ کمینہ دوسروں کی نیندیں حرام کر کے خود سوتا رہتا ہے۔" قطب خاصا غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔

"تیری طرح کم از کم بیوی کے ذکر پر ٹسوے نہیں بہانے آتے عورتوں کی طرح۔" وہ رومال جھاڑ کر بیچ سے اٹھا۔

"جا نکل جا یہاں سے خبیث کمیں کا" بددعا پڑے گی کبھی تجھے کسی معصوم کی۔" اس نے اس کا سیل فون اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا اور اپنی آواز دبا کر قدرے تلخی سے ملامت آمیز انداز میں کہا تھا۔

"جاتا ہوں۔ بددعا کا خوف نہ دے مجھے کوئی پروا نہیں مجھے نہ میری بیوی ہے کہ جس کے مرنے کے بعد پوری زندگی روتا پھروں۔ نہ ہی گھر جس کے تباہ ہونے پر رونے بیٹھ جاؤں۔ باقی تیرے کہنے پر میری عادتیں نہیں بدل سکتیں۔ تو شریف زادہ ہے۔ اتنا بہت ہے

میرے لیے۔" وہ لٹھ مار انداز میں اس کا ہاتھ سے موبائل جھپٹ کر رومال جھاڑتا باہر نکل گیا۔ قصہ ابھی میری سمجھ سے باہر تھا۔

"تجھے پتا ہے۔ یہ رات بھر لڑکیوں سے فون پر بات کرتا ہے۔ رات بھر اس کا سیل ٹوں ٹوں کرتا رہتا ہے۔ پوری رات اپنی جھوٹی باتوں سے بہلاتا رہتا ہے کسی کو۔"

"تو یہ کون سی نئی بات ہے یار! سب ہی ایسا کرتے ہیں۔ خود لڑکیاں بھی۔"

"تجھے نہیں پتا رؤف۔ اس نے بہت لڑکیوں کو جہنم میں دھکیل دیا۔"

"اس نے چن چن کر شریف لڑکیوں کا محبت کے نام پر بیڑا غرق کیا ہے۔ ایک کو تو گھر سے بھی بھگایا اور بیچ دیا۔ پھر کیا یہ معاف کرنے کے لائق ہے؟ کیا اس کو کوئی بددعا نہیں لگے گی کسی معصوم کی؟"

شدت جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور سانس بے ترتیب۔

"اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ مگر وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ اس کی وجہ کیا اس کی منگیتر کا اس کو ٹھکرانا ہے؟" میں اس کی حرکتوں کی اصل وجہ جاننا چاہتا تھا۔

"ہاں صرف یہی وجہ ہے اور یہ کیا اس کے لائق تھا۔ اس نے پڑھائی چھوڑ دی۔ اس نے کوئی ڈھنگ کا کاروبار نہ کیا۔ کوئی کام نہ کر سکا اور جو اس کی فطرت تھی۔ عورت کو ملکیت سمجھنے والی۔ کیا ایسے بندے کو کوئی خوب صورت، شریف ذہین اور پڑھی لکھی لڑکی قبول کرے گی جو اسے اور اس کی عادتوں کو پوری طرح جانتی ہو۔ اس کے بعد بھی ایک محبت ہوتی ہے جو سمجھوتہ کرنا سکھاتی ہے۔ جب اس کی خیالی ہی نہیں تو وہ کیوں ایسا کرے اور اس کا یہ اور لڑکیوں سے کیوں بدلہ لیتا ہے؟ کیوں برباد کرتا ہے کسی کو؟"

مجھے اس کی باتوں سے اتفاق تھا۔ مگر اتنا سب پتا لگنے کے باوجود بھی مائیکل کی ذات میرے لیے ایک معما تھی۔ میرا دل اسے ولن کی جگہ تسلیم نہیں کر پا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہتھیلی پر مہندی نے خاصا رنگ چھوڑا تھا۔ اس نے اپنے مہندی لگے ہاتھوں کو تصور میں ہی کسی کی نگاہ سے دیکھا اور مسکرا دی۔

بالوں میں سیدھی مانگ نکالی اور لمبے لمبے بال سنوارنے لگی جنہیں ابھی تک پراندے میں گوندھ کر ہی رکھا تھا۔ اس نے ہلکی سی ڈھیلی چوٹی بنا کر بالوں کو پشت پر چھوڑ دیا۔ اب سامنے دیوار میں لگا آئینہ تھا اور اس کا چہرہ۔ وہ کوئی بدصورت لڑکی نہ تھی۔ اچھے خاصے نقش تھے۔ گہری گہری بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ آنکھیں جو پر ہتم کی کمزوری تھیں۔ مگر ملا کی آنکھوں میں وہ ایسا کھویا کہ کبھی کسی کی آنکھوں میں ڈوبنے کو کچھ ملا ہی نہیں۔ وہ ملا کی اداس آنکھوں میں ہی اپنا دل رکھ گیا تھا۔ دل جو ممکن ناممکن کو نہیں سمجھتا۔

اور محبت جو ذات پات کے مسئلے میں نہیں الجھتی۔ عشق جو سرحدیں پار کر لیتا ہے۔ وہ محبت میں ڈوبا تو ہوش نہ گیا۔ نہ ہی کہیں سے کوئی سہارا ملا تھا۔ اسے دل لگی منظور نہ تھی۔

مگر زندگی تمام کر کے اس کا کام تھا۔ سو وہ کر رہا تھا۔ وہ کئی گھنٹوں تک اپنے آپ کو سمجھاتی رہی۔ وہ دل لگی کا سامان کرنے لگی تھی۔ وہ اپنے تئیں حمیدہ کی طرح آج اسے فتح کرنے کی ترکیب کر رہی تھی۔ اس کے دل کی حالت سے بے خبر۔

اس کی تیاری مکمل ہو گئی۔ ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک لگاتے ہوئے وہ اس کا تصور کر کے مسکرا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد تیار ہو کر وہ برآمدے کی دہلیز پر آ کر بیٹھ گئی۔ آج اس کے موتی کی چھٹی تھی۔ اسے اندازہ تھا وہ گھر آئے گا۔ آج اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ سوچا اس کے ساتھ کھائے گی۔

اس نے سوچا اس سے بہت سی باتیں کرے گی۔ اسے بتائے گی وہ بچپن سے اس سے محبت کرتی ہے۔ آج وہ اس سے سب کچھ کہے گی۔ ساری وضاحتیں۔ اسے یقین دلائے گی۔

اور پھر وہ بھی اسے اسی طرح ٹوٹ کر چاہے گا۔ اس کا خیال رکھے گا اور کسی اور کا خیال اپنے دل سے نکال

دے گا۔

اس سے بڑی بات بھلا کیا ہو گی کہ اس کا مرد کسی اور کو چاہے، اس کو نظر انداز کر کے کسی اور کو دل کے مسند پر بٹھا دے۔

سو وہ اب حمیدہ کے مشورے پر اسے فتح کرنے چلی تھی۔ اس کا دل جیتنے۔ اس کی آنکھیں دروازے پر تھیں اور وہ رات کے کسی پہر دہلیز سے لگ کر سو گئی تھی اس کا انتظار کرتے کرتے۔

☆ ☆ ☆

"اماں ابھی تک مارتی ہے۔ تو پورے گھر کا کام کرتی ہے اس کے باوجود بھی۔ اور وہ تیری شادی اپنے بڈھے بھائی سے کرنا چاہتی ہے۔"

"مجھے پتا ہے۔"

"پھر بھی تو کچھ کرتی نہیں۔ کیا پوری زندگی ایسے کٹے گی تیری...؟" اس کے لہجے میں اس کے لیے فکر مندی تھی۔

"پھر کیا کروں۔" اس نے ہزاروں مرتبہ سوچا ہوا سوال اس سے دوہرایا۔

"میرے ساتھ چل چل۔ اپنی دنیا بنائیں گے، خوش رہیں گے بہت۔ کوئی بھی نہیں ہو گا سوائے ہمارے ایک گھر اور ہم دونوں۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے اسے محبت کا یقین دلا رہا تھا۔

اور اسے چاہیے ہی کیا تھا۔ اس کی بات پر یقین نہ کرنے یا جھٹلانے کا سوال تب پیدا ہوتا۔ جب گھر اس کے لیے گھر ہوتا اور زندگی اس کے لیے زندگی ہوتی۔

اس سے کیا ہوا وعدہ وفا کرنے ایک شب وہ گھر سے خالی ہاتھ ہی نکل پڑی تھی۔

اپنی زندگی کو زندگی کرنے۔ یہ جانے بغیر کہ زندگی مزید کڑا امتحان بن جائے گی۔ جس خواری سے بچنے کے لیے وہ گھر چھوڑ رہی تھی۔ وہی ذلت اس کا انتظار کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

دوسرے دن جب میں ادرگرد کا چکر لگا کر رات کو اسٹیشن پہنچا تو وہ دونوں ایک بنچ پر ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"شکر ہے یار! تم لوگوں کی صلح تو ہو گئی۔" میں ان دونوں کے بیچ جگہ بنا کر بیٹھ گیا۔

میری بات پر دونوں نے کورس میں ایک بھرپور قہقہہ لگایا تھا۔

"تیرا قصور نہیں گیدڑ یار! تو بہت عرصے بعد ملا ہے نا۔" مائیکل نے میری کمزوری سے مجھے بلایا۔

"بھئی۔ کتنی دفعہ بولوں اب میں گیدڑ نہیں پہلے والا۔" مجھے چڑ تھی اس لقب سے۔

"اچھا چل شیر کے پتر۔" اس نے میرا کندھا تھپتھپایا۔

"یار! میں اپنے کیبن میں جاؤں۔ تم لوگ گپ لڑاؤ۔ میں تھکا ہوا ہوں۔ ویسے بھی آج تو اس کو باتوں میں لگ۔ آج کسی کا نقصان ہونے سے رہ جائے گا۔" قطب کی بات پر اس نے پھر ایک قہقہہ فضا میں چھوڑا تھا۔ وہ واقعی کمینہ تھا مجھے اندازہ ہو گیا۔

"تو نے تعلیم مکمل کیوں نہ کی؟" میں نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

"میرا انکل مجھے اپنی بیٹی کے لیے رکھ رہا تھا۔ جب اس نے مجھے چھوڑ دیا تو میں نے تعلیم چھوڑ دی۔ بھاگ آیا یونیورسٹی سے دوسرے سال میں۔" وہ جیسے اپنا کارنامہ بتا رہا تھا بڑے فخر کے ساتھ۔

"کوئی اگر ہمیں چھوڑ دے تو کیا ہم جہاں چھوڑ دیں گے؟"

"میں نے جہاں کب چھوڑا۔ دیکھ! زندہ سلامت ہوں۔ لڑکیوں کو چکر دے کر پھنسانا میرا مشغلہ ہے۔ تو اگر سوچے گا میں کمینہ ہوں تو ٹھیک سوچے گا۔ اپنی زمین اگاتا ہوں۔ کھاتا ہوں، پیتا ہوں اور جیتا ہوں۔ کچھ بھی کہاں چھوڑا ہے میں نے بھلا میں نے کسی کی خاطر۔"

"تو ایسا کیوں کرتا ہے مائیکل تیرا ضمیر؟" میں نے اس کے اندر کے اچھے انسان کو جگانا چاہا تھا۔

"کیوں کرتا ہوں۔ کس لیے کرتا ہوں، یہ میں خود

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121
www.Paksociety.com

نہیں جانتا۔ اگر جان جاؤں تو شاید اپنے آپ کو کمینہ نہ سمجھوں۔ یا ایسا کرنا چھوڑ دوں۔

اس سوال کا جواب مجھے چاہیے۔ تیرے پاس ہے؟"

اس نے میری طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو لگا' یہ آنکھیں مائیکل کی نہیں قطب الدین کی ہیں۔ یا پھر پریتم موچی کی ہیں۔ ایک سا رنگ۔ ایک سی نرمی۔ میں اس کی آنکھوں کو دیکھے گیا۔

وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

"اچھا تجھے بتاؤں۔ ایک لڑکی جسے شاید واقعی مجھ سے محبت ہو گئی تھی۔ مگر تجھے تو پتا ہے کہ میں کتنا کمینہ ہوں۔ ہے ناں۔" وہ تھوڑی دیر بعد خود سے بولا اور پھر ہنسنے لگا۔ اتنا زیادہ ہنسا کہ مجھے ڈر لگنے لگا کہ وہ اب رو دے گا۔ میں ڈرنے لگا۔ وہ چپ ہو گیا۔

"میں نے کہا بولو۔"

اور اس نے بولنا شروع کیا۔

☆ ☆ ☆

اسٹیشن پر آج بھی قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آج بھی اس نے قطب کو ٹکٹ بانٹتے غور سے دیکھا۔ جب سے اس کی بیوی کی وفات ہوئی تھی' وہ خاموش خاموش سا رہنے لگا تھا۔ اگر بات کرتا بھی تو اس کی باتیں کرتا پھر جب اس کی آنکھیں بھر آتیں تو خاموشی سے اپنے ٹکٹ کیبن کی طرف چلا جاتا اور جب رات ہوتی تو لالٹین کی روشنی میں اخبار دیکھنے بیٹھ جاتا اور وہ سوچتا کبھی اس کی بے بسی کے بارے میں تو کبھی اس کی سچائی کے بارے میں۔ اسے شادی کے لیے منانے کا اس نے ہر جتن کر ڈالا مگر بے سود ہوا۔ وہ اس کی یاد میں زندگی تمام کرنے کا خواہش مند تھا۔ اسے حیرت ہوئی۔ وہ اس سے زیادہ وفادار تھا۔ ایک تو بیوی سے محبوبہ جیسی محبت پھر وفا کا یہ سلسلہ جو پوری زندگی تک اس نے اس کے نام کر دیا۔

وہ ایک کتاب لے کر بینچ پر لیٹ گیا۔ ایک ہاتھ سے ایمرجنسی لائٹ پکڑے ایک ہاتھ میں کتاب۔ کتنی دیر تک وہ صرف ورق الٹتا پلٹتا رہا۔

"آج گھر نہیں جانا کیا؟" قطب نے اخبار رکھ کر اپنے کیبن سے جھانک کر اس سے پوچھا۔

"سونا چاہتا ہوں آج۔" اس نے کتاب سینے پر پھیلا دی اور بتی بند کر کے نیچے رکھ دی۔ اب وہ تاروں بھرے آسمان کو دیکھنے لگا تھا۔

"سگریٹ پیئے گا؟" مائیکل نے حرکت کی تھی۔

"کہانا سونا چاہتا ہوں۔" اس نے کچھ بیزاری سے کہا اور تاروں سے آنکھیں چرا کر بند کر لیں۔ آج کی شب وہ واقعی سونا چاہتا تھا۔

"تیری بیوی راہ دیکھتی ہو گی۔" قطب نے باآواز بلند اسے جگانا چاہا۔

"کہانا بابو! آج سونے دے۔ کل ویسے بھی ڈیوٹی ہے ابھی ٹرین نہیں گزرنی۔ سکون لینے دو تم لوگ۔" اس کے لہجے میں وہی بیزاری تھی۔

"بڑا ہی ناقدرا ہے تو' پچھتائے گا۔ اسے تکلیف دے کر تجھے کیا ملتا ہے۔" وہ اپنے کیبن سے نکل آیا تھا۔

"بابو! مجھے سونے دے تو سوؤں' ورنہ چلا جاؤں۔ یہاں تو کیا بیوی سے کم ہے۔" وہ جھنجلا کر اٹھ بیٹھا۔

"سو جا دلبر یار! سو جا اس کی پروا چھوڑ جسے تیری نہیں۔" مائیکل نے ٹانگ سے ٹانگ اتار کر اس کی طرف جھک کر کہا۔ اس کی بینچ سامنے ہی تھی۔

"تو کیا جانے گدھے۔ تو نے کون سا شادی کی ہے۔ مجھ سے پوچھ عورت کتنی وفادار ہوتی ہے۔ وہ بھی میرا انتظار کرتی تھی۔ کبھی میں نہ جاتا تو پوری رات جاگتی پریشان ہوتی رہتی۔ میرے لیے دعا کرتی رہتی۔ اس کی دعا مجھے بچائے رکھتی۔"

"ہر بیوی اس طرح کی نہیں ہوتی جی' عورت کے کئی روپ۔" مائیکل طنزیہ ہنسا۔

"ہاں یار! خدا کا واسطہ چین لینے دو مجھے سر میں بڑا ہی درد ہے۔" وہ ان کو نظر انداز کر کے پھر سے لیٹ گیا۔

"اسے سونے دے یار! کیا ہے' جو ہم نہیں سوتے۔ یہ تو سولے۔" مائیکل نے پھر سے سگریٹ سلگا لیا تھا۔ اسے رات تمام جو کرنی تھی۔

"مائیکل! اس طرف دھواں مت چھوڑ یار۔" اسے کھانسی ہونے لگی تھی۔ وہ اٹھ کر ذرا فاصلے پر بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔

"یہ سونا ہے۔ وہ انتظار کرے گی۔ پوری رات بیٹھی رہے گی۔ بیٹھی رہے گی رات بھر۔" وہ بڑبڑاتا ہوا اپنے کیبن کی طرف چلا گیا۔ چارپائی سیدھی کی اور لیٹ گیا۔ لیٹا تو محسوس ہوا جیسے سر میں اس کی انگلیاں رینگ رہی ہوں۔

"تجھے درد ہے نا۔" اس کا تصور اس کا خیال رکھ رہا تھا۔

وہ مسکراتے ہوئے کروٹ لے کر سو گیا۔ جب وہ ساتھ ہوتی تو نیند بھی مہمان ہوا کرتی۔ مائیکل پوری رات سگریٹ پھونکتا رہا۔ جب فجر ہونے لگی تو اٹھ کر اندر دوسری بینچ پر سونے چلا گیا۔

اسے بھی کچھ اسی وقت نیند نے اپنی آغوش میں لیا تھا۔ مگر صبح چھ بجے لوگوں کی آوازوں نے اسے اٹھا دیا۔ اس نے اٹھ کر سفید وردی زیب تن کی اور مسافروں کے ساتھ سوار ہو گیا۔

آج کی رات تو وہ سونا چاہتا تھا۔ مگر آج بھی سو نہ سکا۔ مائیکل اور قطب کی گفتگو ذہن میں گردش کر رہی تھی۔

اور اس کا ذہن ہاں اور ناں کے بیچ الجھنے لگا تھا۔ انتظار کرتی ہو گی' جاگتی ہو گی' سوچتی ہو گی۔ قطب کا خیال اس کو اکسانے لگا۔

"جانے دو۔ وہ ایسی نہیں ہر کوئی اس طرح نہیں سوچتی۔"

"جاگتی ہو گی اور وہ؟" وہ سر جھٹک کر ہنس دیا اور کھڑکی سے باہر کے مناظر میں نگاہیں الجھنے لگیں۔ مگر دل مسلسل بے چین تھا۔

☆ ☆ ☆

"وہ ایسی ہی تھی کہ اس سے محبت کی جائے اور مجھے اس سے ہمدردی نہیں محبت ہی ہو گئی تھی۔ مگر تب میں اپنے جذبے کو سمجھ نہ سکا۔ وہ میری زندگی کا پہلا کیس تھا۔ بہت معصوم تھی وہ۔

میں نے اس سے جو بھی کہا غلط نہ تھا۔ مجھے واقعی اس کی فکر تھی اور میں چاہتا تھا وہ اس گھر سے نکل جائے' جہاں اس کی نیندیں حرام ہیں۔"

"اور تو نے اسے بھگا دیا۔" میرے لہجے میں ملامت در آئی اس کے لیے۔

"میں اگر ایسا نہ کرتا تو اس کی سوتیلی ماں اپنے بڈھے بھائی سے اس کو بیاہ دیتی۔ میں اسے جہنم سے نکالنا چاہتا تھا۔"

"اور تو نے اسے بھگا کر کہاں جا پھینکا؟"

"بیچ دیا۔" اس کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔

میرا دل چاہا اس کا گلا دبا دوں۔

"تو خود اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا؟" میں نے لہجے کی تیزی کو روکنا چاہا تھا۔

"میں نے جس کو بیچا تھا' وہ بہت امیر تھا۔ مانا کہ وہ بھی بڈھا تھا۔ مگر تمہیں پتا ہے کہ اس نے اسے بیوی کی حیثیت دی۔ وہ وہاں عیش کرتی ہو گی۔"

"اسی لیے تم نے اس کی بولی لگا دی؟" "میرے پاس اس لڑکی کے لیے صرف ہمدردی تھی۔"

"مجھے پیسے کی ضرورت تھی۔" اس کے چہرے کی بے چارگی میں کتنی کمینگی تھی۔

"تو نے خود کیوں اس سے شادی نہیں کی؟" میں نے کڑے لہجے میں پھر سے اس سے سوال پوچھا۔

"وہ اب بھلا چکی ہو گی مجھے۔ عیش کرتی ہو گی کھیلتی ہو گی پیسوں سے۔ پیسہ ہر غم بھلا دیتا ہے۔ اس نے ایک عمر غربت میں گزاری تھی۔ اگر اس کے نصیب میں ایک بڈھا ہی تھا تب بھی کم از کم وہ سکھی تو ہو گی نا۔" اسے اپنی کمینگی کا احساس رتی بھر نہ تھا۔

"میں نے پوچھا ہے' تو نے اس سے شادی کیوں نہ کی؟ مجھے میرے سوال کا جواب دے مائیکل!"

"تو نے تو شاید مجھے قتل کر ڈالنا ہے۔ مگر سن! میں نے کبھی اس کے ساتھ برا نہیں کیا۔ وہ میرے ساتھ

www.Paksociety.com

بھاگ رہی تھی۔ وہ مجھ سے ملتی تھی۔ مگر میں نے کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہمیشہ اس کی عزت کی پروا کی۔ اس کا خیال رکھا۔" تب وہ اپنے اچھے اوصاف گنوا رہا تھا۔

"تب ہی اسے بیچ دیا۔" میرا بس چلتا تو اس کے دلائل کے جواب میں اس کا چہرہ مسخ کر دیتا۔ وہ محبت کے نام پر داغ تھا۔

"میں مجبور تھا۔"

"تو نے اسے دھوکا نہیں دیا۔؟"

"نہیں۔" اس کا لہجہ نرم تھا۔

"تو پھر یہ سب کیا تھا؟" میں آخر کار چیخ پڑا۔

"محبت ہر قید سے آزاد ہوتی ہے۔ میری حرکت شرمناک تھی۔ مگر میں اس سے زیادہ نہ بڑھا۔ میں چاہتا تو کیا نہ کر لیتا۔" وہ اب بھی خود کو حق پر سمجھ رہا تھا۔

میرا بس چلتا تو اس کا گریبان پکڑ لیتا۔ مگر ابھی اسٹیشن پر اچھا خاصا ہجوم تھا اس لیے اپنے آپ کو روکے رکھا۔ ہم کونے میں رکھی بینچ پر بیٹھے تھے جہاں اسٹیشن کا سرا ختم ہوتا تھا۔ مگر تھوڑی سی آواز پر بھی پاس سے گزرنے والا لمحے کو رکتا تھا۔ سو لڑائی کی صورت پورے مجمع کو دعوت دینا تھا۔ اس لیے میں خاموش رہا۔

"میں کرسچن تھا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "اور وہ مسلم۔" "دور کا نہیں تھا۔

اور مجھ پر جیسے کسی نے کمرے کی خستہ دیوار دھکا دے کر گرا دی تھی۔ مجھے بہت دیر تک جیسے ہوش نہیں تھا۔ میں کتنی ہی دیر تک غائب دماغ سا اس بینچ پر بیٹھا رہا تھا میری کیفیت میری سمجھ سے باہر تھی۔

☆ ☆ ☆

"کیا تو آج بھی گھر نہیں جائے گا۔" اس نے آتے ہی ٹکٹوں کی دستی الماری میں رکھتے ہوئے کہا۔

"چلا جاؤں گا۔" وہ بینچ کر کے آیا تھا اب بال بنا رہا تھا۔ اس کی بات پر رک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر کنگھی جیب میں ڈالتے ہوئے آہستگی سے کہہ کر باہر نکل آیا اس سے پہلے کہ اس کی نصیحتوں کا دور شروع ہوتا۔ وہ جان چھڑا کر نکل آیا۔

باہر موسم بہت خوب صورت ہو رہا تھا۔ شام کے پانچ بجے تھے۔ سواریاں اتر رہی تھیں اور ٹرین رخصت لینے کو تھی۔ اس نے ایک مسکراتی نگاہ پورے احاطے میں ڈالی۔ سامنے ہی لمبے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا، جسے نی الحال ٹرین نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جب ٹرین گزر جاتی تھی تو پٹری سے اس پار لمبے گھنے کھیتوں کا تاحد نگاہ سلسلہ نظر آتا تھا اور ٹرین کی پشت پر ایک خوب صورت نہر تھی۔ جس کو کشتی کے سہارے پار کیا جاتا تھا۔ وہ ٹرین کی پشت سے ہو کر درختوں کے گھنے جھنڈ اور پھولوں کے پودوں کو پار کرتا کشتی پر آیا۔ آج نہر کتنی خوب صورت لگتی تھی۔ وہ پانی میں کشتی کا عکس دیکھنے لگا ہلکا سا دھند لایا۔ آج سب سے سلام دعا ہوئی راستے رافتے، چلتے چلتے اور گھر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ جہاں ایک طوفان اس کا منتظر تھا۔

☆ ☆ ☆

"کچھ سوچ رہے ہو؟" وہ اجرک لے کر میرے برابر میں آکر بیٹھ گیا۔

"سوچ رہا ہوں واپس چلے جانا چاہیے اب۔ ٹھنڈ کچھ ہو رہی ہے۔" مجھے اچھی خاصی سردی لگ رہی تھی کہ ہم اندر بیٹھے تھے۔

"کہاں جاؤ گے؟" وہ سگریٹ سلگانے لگا۔

"یہیں شریف گلی کے پہاڑوں پر۔ تمہیں پتا ہے سردیوں کا موسم پہاڑوں میں گزارنا بہت اچھا لگتا ہے۔ جب سردی بڑھتی ہے تو میں کسی نہ کسی غار میں پہلے لیٹتا ہوں اور صبح کو اٹھ کر چشموں پر نہاتا ہوں۔"

"سنا ہے گلی کے چشموں سے جو پانی نکلتا ہے اس سے منٹ کی خوشبو آتی ہے جیسے تازہ پودینہ۔ بہت لوگ وہاں خارش کا مرض دھونے جاتے ہیں۔" وہ سگریٹ کے دھوئیں سے گولے سے بناتا ہوا پر سوچ آواز میں مجھ سے گلی کے پہاڑوں کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

گلی کے پہاڑ۔ جہاں میری روح کا بسیرا ہے۔ لال باغ اور قلندر کی نگری۔ آہ۔ "میرے دل میں اک یاد نے کروٹ لی۔ "میں ہر سال سردیوں میں گلی کے پہاڑوں پر گھر بنانے جاتا ہوں۔"

"مجھے بھی لے جاؤ اس بار میں وہ چشمے اور پہاڑ دیکھنا چاہتا ہوں۔ قلندر کی نگری بچپن میں دیکھی تھی۔"

"تمہاری ڈیوٹی؟"

"میں بات کر لوں گا۔ تم جب وہاں جاؤ تو مجھے بتانا، میں بھی چلوں گا۔"

"تم پیچھے آ جانا اپنی دلہن لے کر ساتھ میں۔"

"دلہن۔" وہ تعجب سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر ہنس دیا۔

"تمہاری شادی ہو ہوئی تھی ریتم!"

"میری شادی۔ ہاں ہوئی تھی۔" وہ پھر سے سگریٹ سے دھواں چھوڑنے میں مشغول ہو گیا۔

"پھر کیا ہوا۔ ملواؤ گے نہیں کیا؟"

"ٹوٹ گئی۔ اس نے سگریٹ پھینک کر اس کو پیر سے مسلا۔ چنگاریاں اٹھ کر بجھ گئیں۔ مجھے انجام کا سراغ مل گیا۔

"کوئی وجہ تو ہوگی۔" میں پھر بھی اس سے سننا چاہتا تھا۔

"وہ کہتی تھی تم مجھے طلاق دے دو گے۔ میں نے ایک دن دے دی۔" وہ بڑے مزے سے مجھے جتانے لگا۔

"کیا کہتی تھی وہ؟"

"یہی کہ موتی مجھے مارتا ہے پیٹتا ہے۔ مجھ سے نفرت کرتا ہے اور چوری چوری کسی سے ملنے جاتا ہے اور بھی بہت کچھ مگر یہ یاد رہ گئیں۔" اس کے لہجے میں کوئی افسوس نہیں تھا جیسے واقعی وہ ایسا ہی کرتا آیا ہو۔

"تم اسے مارتے تھے۔ اس سے نفرت کرتے تھے؟ اور کسی سے چوری چھپے ملتے بھی تھے؟" میں اس کا اقرار جرم سننا چاہتا تھا۔

"میں نے اسے ایک تھپڑ مارا تھا پوری زندگی میں ایک تھپڑ۔ پھر وہ کہنے لگی مجھے پیٹتا ہے۔ لوگ مجھ پر ملامت کرنے لگے۔ مجھے قابل نفرت نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ایسے ہی جیسے میرے ابے اور چاچے اور ماموں کو دیکھتے تھے۔ ہمارے ہاں عورت پر ہاتھ اٹھانا ایک رواج تھا۔ پھر ایک تھپڑ لگا کر میں بھی ان میں شامل ہو گیا تھا۔ مجھے بار بار لگانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ ایک دفعہ ہی سے جو اتنی شہرت مل گئی تھی۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔ شاید اپنے لیے یا اس کے لیے میں سمجھ نہ سکا۔

"وہ شاید ڈرتی تھی کہ تم آئندہ اسے نہ مار سکو۔ اسی لیے ایسا کرتی ہو گی۔ قطب کا بھی یہی انداز تھا۔" وہ لاپرواہ سے انداز میں باہر دیکھنے لگا۔

"آؤ باہر چلیں! تمہیں تو سردیوں سے ڈر نہیں لگتا نا؟"

"میں ڈرتا ہوں۔ بیمار پڑ جاتا ہوں۔ مگر اب نہیں۔ اب بیمار پڑنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس نے اجرک اتار دی تھی۔ وہ سردی میں بھی پسینے میں نہایا ہوا تھا۔

"آ جاؤ۔ مجھے گھٹن سی ہو رہی ہے اندر۔" وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ اڑسے باہر نکل گیا۔

میں سوچتے ہوئے قطب پر ایک نگاہ ڈال کر باہر نکل آیا۔ نومبر کے آخر میں بھی اتنی سردی۔ دسمبر شروع ہونے کو تھا اور دسمبر میں مجھے جانا تھا۔

"پھر کیا ہوا۔ تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ تم کسی سے ملتے بھی تھے۔"

"تمہیں سب پتا تو ہے۔ میں صرف آخری بار ملا تھا اس سے۔ اس کے مرنے سے پہلے جب ہم نے بہت ساری باتیں کیں۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں اس کے ساتھ پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔

"پھر وہ مر گئی۔ اسے اس کی بددعا لگ گئی۔" اس کا لہجہ ڈوب سا گیا۔

"وہ اسے بددعائیں بھی دیتی تھی کیا؟"

www.paksociety.com

"ہاں! صرف ایک دفعہ جب میں نے اسے تھپڑ لگایا تھا۔"

"مجھے لگتا ہے وہ تم سے محبت کرتی تھی۔"

"کون...؟" وہ رک کر آسمان کو دیکھنے لگا۔

"تمہاری بیوی۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"بہت دیر میں پتا لگا۔" اس نے نگاہیں فرش پر جمالیں۔

"تو عورت کو نہیں سمجھتا اس کی نفسیات اور حرکات اس کے معاشرے اور گرد کے ماحول اور اس کی سوچ پر ہیں۔ مگر وہ محبت چاہتی تھی تجھ سے۔"

"میرا دل خالی تھا اور اس کے رحم و کرم پر تھا۔ جبکہ اس نے...... ہر رشتے کی زنجیر توڑ ڈالی میرے پاؤں سے۔"

"اسے شاید افسوس تھا۔" میں سوچنے لگا۔

"جب میں نے اسے طلاق دے دی تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ وہ بت سی بن گئی۔ بہت دنوں تک وہ خاموش رہی جیسے سکتہ ہو۔ میں اپنی کوٹھی چھوڑ کر نکل آیا۔ لوگوں کو جواب دینا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میرے پاس لوگوں کے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔"

"تم نے اتنے بڑے فیصلے سے پہلے سوچا بھی نہیں؟"

وہ سوچنے کہاں دیتی تھی۔"

"تم نے طلاق کیوں دی اسے؟" مجھے افسوس ہو رہا تھا اس سے زیادہ اس عورت کا۔ "پھر وہ کہاں گئی۔ جب تم نے اسے چھوڑ دیا؟"

"محلے والوں نے اس کی شادی کرا دی۔" اس کے جواب میں میرے لیے کچھ حیرانی تھی۔

"اور تم؟"

میرا سوال تشنہ چھوڑ کر وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر اسٹیشن سے باہر نکل کر کھیتوں میں گم ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

"کہاں تھے تم پورا ہفتہ۔ بتاؤ کس سے ملنے گئے تھے؟ اور کس کے ساتھ تھے؟" دہلیز پار کرتے ہی سوالوں نے اس کا استقبال کیا تھا۔

"میں اسٹیشن پر تھا۔" وہ نرمی سے کہہ کر ہٹ گیا اور اندر جانے لگا۔

"مجھے بتاؤ۔ تم کہاں تھے۔ جھوٹ مت بولو۔ تم اس کے ساتھ تھے نا۔" وہ اسے بازوؤں سے پکڑ کر اس کی راہ میں حائل ہو گئی۔

"ہاں! تھا اس کے ساتھ۔" اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے بازو چھڑائے اور اندر گھس گیا۔

"اللہ کرے وہ مر جائے۔" وہ اس کے پیچھے چیخی تھی۔ "وہ مر جائے۔" اس کی آواز بلند تھی وہ اسے بد دعا دے رہی تھی۔ اس نے رخ موڑ کر اس کی طرف غصے سے دیکھا تھا۔

"رب کرے وہ مر جائے۔ وہ مر جائے۔" وہ روتی بھی جا رہی تھی اور چیخ بھی جا رہی تھی۔

اس نے ایک جھٹکے سے پکڑا اور ایک زبردست تھپڑ کھینچ مارا تھا اس کو اور وہ پاگلوں کی طرح اپنے گال پیٹنے لگی۔

"مارو، مارو مجھے... مارو۔" اسے لگا اس پر پاگل پن کا دورہ پڑا ہے۔ محلے کی عورتیں کن سوئیاں لینے اپنے کھلے صحنوں میں نکل آئیں۔

وہ رستے میں پڑی چارپائی کو ٹھوکر مار کر گھر سے نکل گیا۔

اور پیچھے سے اس کی آہوں اور بد دعاؤں نے اس کے قدم پکڑ لیے۔

وہ درخت کے سہارے بیٹھ کر ہانپنے لگا جیسے چوری کر کے یا پہلا ڈاکا ڈال کر بھاگا ہو اور پوری دنیا اس کے پیچھے ہو۔ وہ بہت دیر تک اندر ہی اندر سسکتا رہا۔ اسے آج ماں یاد آ رہی تھی۔ اس کا بس چلتا تو بچوں کی طرح رونے لگتا۔ مگر اس کا کون تھا جو اسے بہلاتا۔ پھر لالہ کا نام اس کے ذہن میں آیا۔ جس سے ملنے کا وہ اقرار کر آیا تھا۔ اس سے ملے کتنا عرصہ بیت گیا تھا۔ اس نے پوری رات اس درخت کے نیچے گزار دی۔

صبح اس سے ملنے کی خاطر حیدر آباد روانہ ہو گیا۔ وہ

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

www.Paksociety.com

اس سے آخری بار ملنا چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم غائب ہی ہو گئے۔ میں پورا دن ڈائری لے کر فصلوں میں گھومتا رہا۔ پرانا وقت یاد کرتا رہا۔ اپنی کہانی مکمل کرتا رہا۔ میں نے تمہاری سابقہ بیوی کو دیکھا تھا۔ بہت مرجھائی ہوئی تھی۔"

آج بہت دنوں بعد میں نے اسے پکڑا تھا پورے ہفتے بعد اور یہ موقع مس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اجرک لیے اندر مسافر خانے میں جا رہا تھا۔ شاید سونے کی نیت سے کہ میں نے اسے پکڑ لیا۔

وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلتا ہوا باہر آ گیا۔ بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی آج چاند اپنی پوری روشنی کائنات میں بانٹ رہا تھا۔ مجھے سی ویو کا کنارا یاد آنے لگا۔ جب میں کراچی میں ہوتا تو چودھویں رات ہمیشہ سمندر کے کنارے گزارتا۔

اسٹیشن کی بوڑھی عمارت اپنے بچوں کو گود میں اٹھائے ہوئے جیسے مسکراتی تھی۔ چاند کی چاندنی میں نہائی ہوئی سفید عمارت ہم پٹری پر آ کر بیٹھ گئے۔

اپنے کیبن میں قطب بابو اخبار دیکھ رہا تھا۔ مائیکل اس دن سے غائب تھا۔ اندر مسافر خانے میں ایک قلی اور دو مقامی لوگ سو رہے تھے۔ ہم سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے اس عمارت کو دیکھنے لگے۔ جیسے اسٹیشن اندر بلاتا ہو "آجاؤ سردی لگ رہی ہے۔" میں نے دیکھا وہ کانپ رہا تھا۔ اس کی اجرک ہوا سے پھڑپھڑا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "چلو اندر چلیں۔"

وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ جیسے معصوم بچہ ضد کرتا ہے۔ مجھے اس پر بے طرح پیار آیا۔ اس کے چہرے پر اس عمر میں بھی عجیب معصومیت تھی اور آنکھوں میں اداسی۔

"آج میں مہانو سے ملا تھا۔"

اس نے مجھے چونکا دیا۔ "مہانو؟ ارے ہاں! مہانو کیسی ہے؟ کہاں ہے وہ؟ میں اس سے تو ملا ہی نہیں۔"

مجھے اچانک ہی وہ یاد آ گئی۔

"بہت دکھی ہے وہ۔"

"کیوں؟"

"اس کا بڈھا شوہر بڑا عیاش ہے۔ بڑا ہی خبیث" میں اس کی پیشانی پر غصے کی لکیریں دیکھ سکتا تھا۔

"اس نے بڈھے سے شادی کر لی۔" مجھے تعجب ہوا۔

"بہت لمبی داستان ہے۔ وہ محبت کے جھانسے میں آ گئی تھی۔"

"بڈھے سے محبت۔" میں سوچنے لگا۔

"نہیں! کسی سوداگر سے محبت کی تھی۔ جانتی تک نہیں کہ وہ کون تھا۔ کہاں کا تھا۔ بس اس نے ساتھ والے گاؤں سے آتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ وہ ویسے بھی نادان تھی اور اکیلی بھی۔ اس کے چکر میں آ گئی۔" وہ بتا رہا تھا۔

میں پورا قصہ سمجھ گیا۔ "کیا کہا پھر اس نے؟"

کہنے لگی دعا کرو یا میں مر جاؤں یا یہ بڈھا مر جائے۔ تھک گئی ہوں۔"

"اور تم نے کیا دعا کی؟"

"میری دعا کہاں لگتی ہے بھلا۔ میرا دل کیا اس بڈھے کو مار دوں۔" مجھے اس کی بات پر ایک دم سے ہنسی آ گئی تھی۔ وہ بھی ہنسنے لگا۔

"اچھا! تو نے اسے دیکھا؟ کیسی ہے؟"

"بہت مرجھائی ہوئی۔ مجھے پہچان گئی تھی۔ حال احوال پوچھ رہی تھی۔

سنا ہے اس کا شوہر اسے بہت مارتا ہے۔ نشہ بھی کرتا ہے۔ سارا پیسہ اڑا دیتا ہے۔ جو بھی فصل سے ملتا ہے۔ پھر بھی جب میں اسے ملا تو کہنے لگی میں بہت خوش ہوں۔ وہ بہت محبت کرتا ہے مجھ سے۔ تمہیں پتا ہے وہ پچھلی زندگی سے سبق لے چکی ہے۔ جیسا اس کا شوہر ہے اس کے ساتھ گزارا کرنا آسان نہیں ہے مگر وہ کر رہی ہے۔ اس کے پڑوس سے پتا چلا۔ وہ پٹتی رہتی ہے۔ مگر اف تک منہ سے نہیں نکالتی۔ وہ صبر کرنا سیکھ گئی ہے۔ تمہیں پتا ہے مجھ سے پوچھ رہی تھی' رونی

صاحب! موچی کیا ابھی تک کلف والے کپڑے پہنتا ہے۔ کھڑکھڑاتے ہوئے۔ میں نے کہا نہیں تو ڈریس کے بعد پاجامہ شرٹ یا پھر واش اینڈ ویئر کی قمیص پہنتا ہے۔

کہنے لگی اسے کھدر کا کپڑا پسند تھا اس کے علاوہ وہ کلف والے کپڑے پہنتا تھا کھڑکھڑاتے ہوئے۔ اسے کہیں اب کے شادی کرے تو وہی جوڑا پہنے جو اس نے کبھی پہنا تھا۔ بوسکی کا اور کھڑکھڑاتے کپڑے کیوں نہیں پہنتا۔ میں جانتی ہوں اسے یہ کپڑے اچھے لگتے ہیں۔" میں جب بات کر رہا تھا تو وہ حیرت سے منہ کھولے میری باتیں سن رہا تھا۔

"ایک بات کہوں پریتم یار! اگر اس کا شوہر اسے چھوڑ دے تو کیا اسے اپنا لے گا؟" میں نے اسے کشمکش میں ڈال دیا تھا۔

"یہ تو کیسی بات کر رہا ہے؟"

"تو اس سے ایک دفعہ مل تو سہی یار۔" میں نے اصرار کیا۔

"یہ اب اتنا آسان نہیں ہے۔"

"کیا تو اسے معاف نہیں کر سکتا؟"

"معاف تو کر دیا تھا کب کا۔ مگر نہ اس کا بوڑھا شوہر اسے چھوڑے گا اور نہ ہی۔ میں اگر ایسا کروں بھی تو کون سا خوشیاں لوٹ آئیں گی۔"

"پھر بھی۔ اچھا تو اس سے ایک بار مل لے۔"

"اس کے لیے پریشانی کھڑی کروں؟"

"ملنے میں کیا حرج ہے بھلا؟ وہ صبح صبح فصلوں پر کام کرنے آتی ہے۔ تو اس سے اک بار مل تو لے یار۔" میں نے جیسے التجا کی تھی اور وہ سوچ میں پڑ گیا۔

☼ ☼ ☼

"تو نشئی ہے۔ تو موالی ہے۔ تو پیسے اڑاتا ہے۔ دیکھ میں تو شروع سے کہتی تھی۔ تیری آنکھوں میں کتنا نشہ ہے۔ کتنی نشیلی ہیں تیری آنکھیں۔ بتا سگریٹ کے علاوہ اور کیا کیا پیتا ہے۔" وہ اس پر برس رہی تھی۔ شور کر رہی تھی۔ مگر وہ چارپائی پر بیٹھا خاموشی سے

سگریٹ پھونکتا رہا۔

وہ بولتی رہی اور آخر کار بول بول کر چپ ہو گئی اور اسے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے نیند آ گئی۔ اسے پتا بھی نہ چلا' ستون سے ٹیک لگائے وہ کب کا سو چکا تھا کس نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر بجھایا' کس نے اسے لٹایا اور رلی ڈالی۔ اس کی جب آنکھ کھلی تو وہ آرام سے لیٹا ہوا تھا اور نیچے زمین پر آدھا سگریٹ بجھا ہوا پڑا تھا۔ اس نے رلی اتاری اور اٹھا۔ آج وہ نہایا بھی نہیں تھا ...... اس نے دیکھا' وہ تولیہ اور صابن لے کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ اس پر تعجب ہوا تھا۔ مگر کبھی بھی نہ سمجھنے کا ارادہ کرتے ہوئے اسے نظر انداز کرتا اس کے پاس سے گزر گیا۔ جب سے اس سے مل کر آیا تھا۔ اسے لگتا وہ واقعی نشئی ہو گیا ہے۔

اس کی زندگی بدل گئی ہے۔ اس کی امیدیں ختم ہو چکی تھیں۔ وہ کتنی بیمار تھی۔ اسے رہ رہ کر بالا کا خیال آ رہا تھا۔ اور جتنا اس کا خیال آتا اسے رشیدہ سے نفرت سی ہونے لگتی۔ اس کا بددعا دینے کا وہ انداز اسے نہ بھولتا۔ اندر سے آگ کے شعلے بھڑکتے۔ دل ایک دم سے بجھ جاتا۔ وہ اپنی کیفیت نہیں سمجھ پا رہا تھا۔

کچھ ہی دنوں میں وہ عجیب سا ہو گیا تھا۔ وہ جیسے اس دنیا میں ہی نہیں تھا۔ وہ کہتی رہتی اور یہ سنتا رہتا۔ چپ رہتا۔ بہت خاموش اور کچھ ہی دنوں میں اس کا سکتہ ٹوٹا جب اسے پتا چلا کہ بالا مر گئی۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں پتا ہے پریتم۔ میں گانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر مجھے میری ماں نے مجبور کیا۔ وہ شادی بیاہ میں گاتی تھی۔ مگر مجھے ایسے در در کی ٹھوکریں نہیں کھانا تھیں جب اسی فیلڈ میں آنا ہے تو عزت سے آؤ۔ مگر جب تم نے پہلی مرتبہ گیت لکھا۔ تو گانا مجھے بہت اچھا لگا۔ آہستہ آہستہ مجھے اس پیشہ سے محبت ہو گئی۔ مگر جب تم نے گیت لکھنا چھوڑ دیا تو میں نے گانا چھوڑ دیا۔ اب میں نہیں گا سکتی۔"

www.paksociety.com

"میں گیت نہیں لکھ سکا تمہارے لیے۔" وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گیا۔
"کوئی بات نہیں پریتم! تو گیت لکھے یا نہیں۔ پر ہے تو میرا پریتم ناں۔ میرا دوست میرا ساتھی۔" وہ نقاہت کی وجہ سے دھیمے دھیمے انداز میں بات کرنے لگی۔ بہت کمزور ہو گئی تھی وہ۔ آنکھوں میں گہرے گہرے حلقے نمایاں ہو گئے تھے۔ جیسے ہڈیوں کا ڈھانچہ سی بن گئی تھی وہ۔ وہ اس کی حالت دیکھتا رہ گیا۔
"اب چندر جی کی مہیاں دم توڑ گئی ہیں؟ ان کے سارے فرائض کہاں گئے۔"
"پتا نہیں۔ سنا ہے دوسری شادی کر رہے ہیں۔ مگر مجھ سے چھپا رہے ہیں۔ حیرت ہے۔ میں بھلا ان کو کیسے روک سکتی ہوں۔ میں تو خود جانتی ہوں کہ میں مرنے والی ہوں اور وہ مجھ سے چھپا رہے ہیں۔ حیرت ہے۔" وہ ہنسنے لگی۔ شاید اپنے آپ پر اور اس کا دل کٹتا گیا اس کی حالت دیکھ کر۔ آخری بار اس نے جی بھر کر بہت سی باتیں کیں پھر جب وہ اٹھ کر جانے لگا تو کہنے لگی۔
"پریتم! گیت ضرور لکھنا۔ جب گیت لکھو گے تو تمہیں ملا کی یاد آئے گی۔" "جب محبت کا گیت لکھو گے تو ملا کی روح خوش ہو گی۔ گیت ضرور لکھنا۔" اس نے آخری فرمائش کی تھی۔
اور وہ اس سے وعدہ کر کے چلا آیا۔ ہمیشہ کے لیے اور اپنا دل اپنا دل تو ہسپتال کے اسی روم میں چھوڑ آیا جہاں وہ لیٹی تھی۔
اسے پتا تھا اسے کینسر ہو گیا ہے۔ اسے یہ بھی پتا تھا بروقت علاج نہ کروانے پر یہ بیماری جان لے کر ہی چھوڑتی ہے اور اس کی خود سے لاپروائی اور چندر کی سنگ دلی اسے یہاں تک لے آئی تھی۔
اسے پتا تھا کہ ملا اب مر جائے گی۔ اس کے سُر دفن ہو جائیں گے۔ اس کے گیت مر جائیں گے اب۔ مگر اس کے باوجود وہ گیت لکھنے کا وعدہ کر آیا۔
اس کی آخری فرمائش کہاں ٹال سکتا تھا بھلا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ تو اس نے کچھ مانگا تھا۔ وہ انکار کیسے کرتا

ایک ہی جملہ ذہن میں گونجتا رہا۔
"تم گیت لکھو گے تو ملا کی روح خوش ہو گی۔ گیت، محبت کا گیت۔"

☆ ☆ ☆

"کیسی ہو؟" وہ بغل میں کتاب دبائے اسی راہ سے گزرا جان بوجھ کر جہاں سے اس کی واپسی ہوئی تھی۔
"ٹھیک ہوں تو سنا۔" وہ کچھ عجلت بھرے انداز میں بولی۔ جیسے اسے گھر جانے کی جلدی ہو۔
"تم خوش ہو نا اپنے گھر میں۔"
"ہاں بہت۔ تم دعا کرنا۔ محرم کو بہت تیز بخار ہے۔ کل سے گھر میں پڑا ہے۔" وہ بہت پریشان دکھ رہی تھی۔
"چنگا ہو جائے گا۔" وہ مسکرا کر آگے بڑھا۔ وہ عورت کو سمجھ نہ سکا کبھی۔
"موجی۔۔۔" اس نے پیچھے سے آواز دی۔ وہ بغیر مڑے رکا۔
"کیا تو ابھی تک گیت لکھتا ہے؟" وہ خود اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔
"نہیں کوشش کرتا ہوں۔" وہ اس سے نگاہیں چرا رہا تھا۔
"شادی کب کرے گا۔۔۔؟"
"جب نصیب میں ہوئی ابھی دل نہیں کر رہا۔"
"شادی کر لے موجی! مگر اب کی بار کسی شہری کی میم سے شادی کرنا۔" وہ مشورہ دے رہی تھی۔
اسے اس کے مشورے پر ہنسی آ گئی۔ وہ اس کا مطلب سمجھ چکا تھا۔
"ہنستا کیوں ہے۔ میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا ناں؟"
لمحے بھر کو وہ اس کی میٹھی زبان و لہجہ پر حیرت سے کچھ سوچنے لگا۔
"اچھا دعا کرنا۔" اس نے آگے بڑھنے کے لیے قدم بڑھا لیے۔
"موجی! تو بڑا اچھا ہے۔ تیرے ساتھ بڑا ظلم ہوا

تھا۔ معاف کر دینا۔" اس نے دیکھا اس کی آنکھیں بھر گئی تھیں۔ "ہیرے کی پہچان ہیرا کھونے کے بعد ہوتی ہے۔" وہ اپنا کھلا اقرار کر رہی تھی۔
"میں تجھے کبھی سمجھ نہ سکا۔" وہ اور بھلا کیا کہتا۔
"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اب شہری لڑکی سے شادی رچانا تاکہ تو اس کی زبان سمجھ لے آسانی سے۔ ہم جاہل لوگ تو محبت بھی اپنے ڈھنگ سے کرتے ہیں۔" وہ کتنا گہرا بول رہی تھی۔ اسے لمحے بھر کو تعجب سا ہوا تھا۔
"ہاں۔۔۔ دل کی باتیں تو دل والے جانیں پریتم بابو! ہم ایسی باتوں کو کیا جانیں بھلا۔" اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے فرضی نام سے پکارا تھا جو نام صرف اس کے دوستوں میں اس کی پہچان تھا۔ یہ نام ملا نے اسے دیا تھا۔
"سنا ہے، وہ مر گئی۔"
"اس کا ذکر مت کر۔" وہ بے بس سا ہوا تھا۔
"اب بھی تجھے غصہ آتا ہے؟ چل نہیں کرتی۔"
"تجھے تب اگر میرے غصے کی پروا ہوتی۔" وہ بے ساختہ کہہ گیا۔
کہاں بابو! ہم جاہل لوگ نہیں سمجھتے ہر بات کو۔" وہ جھٹ سے بول پڑی۔
"کوئی بھی کسی کو نہیں سمجھ پاتا۔ اگر سمجھ لے تو۔۔۔ خیر تو جا۔ تیرا شوہر انتظار کرتا ہو گا یوں راہ میں بات کرنا وہ بھی کسی نامحرم سے۔ کسی نے دیکھ لیا تو گاؤں والوں کو بات بنانے میں دیر کہاں لگتی ہے۔" اسے اتنی دیر بعد احساس ہوا تھا۔
"جاتی ہوں۔ وہ کہیں نشے میں دھت پڑا ہو گا اسے کسی چیز کی پروا کب ہوتی ہے۔"
"تو اس کے ساتھ۔" وہ جملہ ادھورا چھوڑ گیا۔
"جیسے تو میرے ساتھ رہتا تھا۔ ویسے میں بھی رہ لیتی ہوں۔"
تو نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں اسے نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ جیسا بھی ہے۔ اس کے ساتھ زندگی تو کرنی ہے نا کہتا ہے تو کبھی مجھے اچانک چھوڑ کر نہ چلی جائے۔ ڈرتا ہے۔

تو بھلا! مجھے کہاں جانا ہے میں گھر چھوڑ کر کہاں جاؤں گی بھلا۔" اس نے دوپٹے کا پلو پشت پر گراتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
وہ اس کے رنگ دیکھتا رہ گیا۔ اس نے کبھی اس طرح سے بات کرتے ہوئے کب دیکھا تھا اس کو۔
"تو کتنی بدل گئی ہے ناں۔" وہ منہ میں بڑبڑایا۔
"تو کیوں حیران ہوتا ہے موجی! ناز تو اپنوں کے ساتھ کیے جاتے ہیں نا۔ جن پر ہمارا حق ہوتا ہے نا۔" وہ مزید حیران ہوا۔ وہ اسے اپنا سمجھتی تھی۔
"کہاں بابو! ہر کسی کا اپنا طریقہ ہوتا ہے محبت کا بھی۔ ہم نرے جاہل آپ پڑھے لکھے۔ نہ آپ ہماری زبان سمجھیں نہ ہم آپ کی۔ اچھا ہوا آپ کی جان چھوٹی۔ ہماری خیر ہے۔" اس نے دوپٹے کا پلو منہ میں دبا اب صرف اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں جو اور نمایاں ہو رہی تھیں۔
پانیوں سے بھری ہوئی کالی آنکھیں۔ جیسے منہ کھلے مٹکے جن سے پانی چھلکنے کو بے تاب ہو۔ اس نے نیچے سے مٹکا اٹھا کر کمر پر ٹکایا۔ تھوڑا سا پانی چھلکا تھا۔ ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے دو قطرے ٹپک پڑے۔ وہ آنکھیں چھپاتی مٹکا سنبھالے کچے کے راستے پر نکل پڑی۔ تھوڑا سا آگے جا کر اس نے ایک لمحے کو پیچھے مڑ کر دیکھا اور اسے وہیں کھڑے پایا۔ چند لمحے رکی رہی پھر ایک بازو مٹکے کے گرد پھیرے۔ ایک سے دوپٹہ سنبھالتی چلتی گئی۔ بغیر رکے۔ اس کی چال کی لڑکھڑاہٹ دور ہو گئی تھی۔ وہ تیزی سے گھر کی طرف سفر کر رہی تھی۔
وہ بغل میں کتاب دبائے مڑا اور قدم کچے پر ڈال لیے۔
"پتا نہیں کیوں اس کی چال لڑکھڑاہٹ سی آ گئی تھی۔ پل بھر میں ہی تھکن بڑھ سی گئی۔ وہ اپنے تھکے ہوئے وجود کو کچے کے راستے پر گھسیٹتا رہا۔ راستہ جیسے طویل ہو گیا تھا۔ اس کے قدم کتنے بھاری تھے اس وقت۔

☆ ☆ ☆

www.paksociety.com

ٹرین کے گزرنے کے بعد پھر وہی خاموشی اسٹیشن سے چمٹ گئی تھی۔ میں ہجوم کے چھٹنے کے انتظار میں اسٹیشن کی پچھلی طرف کھیتوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ جب ہر طرف سے خاموشی کا سائرن بجنے لگا۔

کھیتوں کو چھوڑ کر جھاڑیوں میں سے رستہ بناتا ہوا میں دوسری جانب سے اسٹیشن کے سامنے سے اندر گئے لگا تو پٹڑی پر بیٹھے کسی گٹھڑی کو دیکھا۔ میں آگے بڑھا تو وہ کوئی بندہ تھا اور جب میں بالکل قریب پہنچا تو وہ سر نیہوڑائے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پریتم تھا۔

”پریتم! اس طرح کیوں بیٹھے ہو؟“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ہلانے کی کوشش کی۔

جب اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں شدید سرخ ہو رہی تھیں۔

”پریتم! کیا ہوا ہے؟“ مجھے اس کی آنکھوں سے ایک دم سے خوف سا آنے لگا تھا۔

”وہ... مجھ سے محبت کرتی تھی۔“ اس کے گلے سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔

”مجھے پتا تھا... میں عورت کو جانتا ہوں۔ وہ غصہ کرے، جب بھی محبت اس کے اندر ہوتی ہے۔ وہ محبت دیتی ہے اور محبت لینا چاہتی ہے۔ وہ قربانی دیتی ہے یا لیتی ہے تو بھی محبت کی وجہ سے اور محبت کے لیے ہی پروان چڑھتی ہے اور پرورش کرتی ہے۔ مجھے ماں، بیوی اور بہن کے رشتے میں جو مشابہت لگتی ہے۔ وہ ایثار اور محبت کی ہے۔ اس کی مٹی میں تو محبت گندھی ہوئی ہے۔“

”اور میں اسے محبت ہی نہ دے سکا۔“ اس کی آواز جیسے ڈوب سی گئی۔

”تمہارا قصور نہیں ہے۔ تم اسے سمجھ نہ سکے۔ اس کا جاہلانہ رویہ اور اس کی ذہنیت میں اس کے ماحول اور حالات کا ہاتھ تھا۔ مگر وہ تمہیں چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی۔ تم نشہ کرو۔ تم پیسے اڑاؤ۔ تم بھی عام مردوں کی طرح رہو جیسے اس کے گھر کے مرد تھے۔ وہ تمہیں مختلف دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں تم بدل نہ جاؤ۔ اسی لیے وہ تم پر سختی کرتی تھی کہ کہیں دوسروں کی طرح تم اپنی عورت پر حاوی نہ ہو جاؤ۔ اس کو مارنا پیٹنا نہ شروع کر دو۔ میں اس کی نفسیات اسی روز سمجھ گیا جب تم نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا۔“

”مگر میں تو ایسا نہیں تھا۔ میں نے تو کبھی نشہ نہیں کیا۔ اسے مارنا تو دور کی بات کبھی ڈانٹا تک نہیں۔ پھر بھی وہ مجھ پر شک کرتی رہی۔ میں تھک گیا اس کے رویے سے اس کی باتوں سے۔ مجھے اس کا لہجہ ڈسنے لگا تھا۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ تم کہو! میں نے اتنا برا ہونے کے باوجود بھی اس سے شادی کی۔ اس کو دل سے قبول کیا۔ اس کے ساتھ نارمل رویہ رکھا۔ مگر وہ... وہ مجھے کبھی نہ سمجھ پائی۔“ اسے بہت دکھ تھا اس بات کا۔

”تمہیں پتا ہے پریتم! وہ ڈرتی تھی۔ تم ان ہی لوگوں کے بیچ رہتے تھے۔ پھر بالا کے بارے میں جو شک و شبہ اسے تھا اسے تم نے کہاں دور کیا تھا۔ تم نے کبھی بیٹھ کر اس سے بات تک نہ کی تھی۔ تم نے کبھی اس کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی پریتم! کہ وہ تم سے کیا چاہتی ہے۔ کبھی پیار کے دو بول بھی نہ بولے ہوں گے تم نے اس سے۔“

”اس کی باتیں۔ اس کا رویہ پھر اس کا لہجہ۔ کیا میری ہمت پڑ سکتی تھی۔ پیار کے دو بول تو دور کی بات میں نارمل بات کرتے ہوئے بھی اس سے ڈرتا تھا کہ کہیں میری کوئی بات پکڑ کر اپنی سوچ کے مطابق مطلب نہ نکال لے۔ میں ڈرتا تھا۔ وہ بلاوجہ ہی بالا کا ذکر نہ لے بیٹھے۔ اسے کچھ برا بھلا نہ کہے۔ میں خاموشی سے اس کی ضروریات پوری کرتا رہا۔ وہ بولتی رہی۔ میں سنتا رہا۔ کہاں تک بولوں۔ کہاں تک ایسے چلتا۔“ کچھ غلط نہ کہہ رہا تھا۔

”تم دونوں فطرت سے ہٹ کر جینے لگے تھے۔ ایک محبت ہی تم دونوں کے بیچ جگہ پیدا نہ کر سکی۔ تم دونوں نے محبت کو اکھاڑ پھینکا اور چلے تھے زندگی کی قربانیاں دینے۔“ مجھے ان دونوں پر بے حد غصہ تھا۔

”میرے نصیب میں محبت ہی نہیں ہے۔“ وہ جیسے زندگی ہار چکا تھا۔

میں اسے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میں اس کے نصیب کے بارے میں بھلا کہاں جانتا تھا۔

وہ سرخ آنکھوں میں لو اسی لیے وہاں سے اٹھ گیا اور اسٹیشن سے نکل کر کہیں جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔

سردی بہت بڑھ رہی تھی۔ رات پچھلے پہر میں منتقل ہو رہی تھی۔ میں ٹھٹھرتا ہوا اسٹیشن کے اندر چلا گیا اور مسافر خانے میں ایک خالی بینچ دیکھ کر لیٹ گیا۔ نیند کہاں تھی میں نہیں جانتا تھا۔

میں نے اپنے چہرے پر اپنی انگلیاں پھیریں تو گیلی ہو گئیں۔ یہ کیا؟ میں رو رہا تھا۔ مجھے کس کا غم تھا؟ میں سوچنے لگا۔

پریتم کا یا رشیدہ کا؟ یا ان کی علیحدگی کا؟ رشو کی مجبوری کا یا پریتم کی تنہائی کا؟ میں نہیں جانتا۔

”پریت کا، محبت کا۔“ میرے دل نے جواب دیا۔

کیا پریت، پریت سے روٹھ گئی ہے۔ کیا محبت اس کے نصیب میں واقعی نہیں ہے۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

کیا پریتم سے محبت روٹھ سکتی ہے۔ مجھے ساری رات سوال ستاتے رہے اور میں رات بھر جواب کی تلاش میں بے چین رہا۔ ذہن جیسے سوچ چکا تھا اور دل، دل اتنا خاموش کیوں تھا۔

میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا چاہا۔ جہاں خاموشی گھر بنائے بیٹھ گئی تھی کچھ دنوں سے۔

☆ ☆ ☆

”تمہیں پتا ہے عورت صرف تحفظ چاہتی ہے۔ صرف تحفظ۔“ وہ مجھے اپنا مسئلہ بتا رہی تھی۔

میں بہت دنوں بعد اس رات کی بے چینی کے بعد گاؤں کا اسٹیشن چھوڑ کر باہر نکلا تھا۔ مجھے اگلے اسٹیشن پر ایک نقاب پوش پلیٹ فارم کے سرے پر ملی۔

”میں تمہیں دور سے پہچان گئی تھی۔ موتی لالا تھا کچھ دن پہلے اس نے بتایا تھا، روتی کیا ہوا ہے۔“

”میں تم سے ملنے کے لیے رہ گیا تھا۔ جانے ہی والا تھا یار! شکر ہے تم مل گئیں، سوچا تم سے مل لوں۔ حال چال پوچھ لوں۔“ ہم اسٹیشن چھوڑ کر ہجوم سے نکل کر راستے پر آ گئے تھے۔

”تمہارا شوہر؟“

”مر گیا۔ اسے اس کے بڑے بیٹے نے دولت کی خاطر مار دیا۔“

”چلو! تمہاری جان چھوٹی۔“ مجھے تو خوشی سی ہوئی تھی اس خبر سے۔

”ہاں! گھر سے نکل کر سڑک پر آ گئی ہوں۔ وہ بہت برا تھا۔ اس نے بہت ظلم کیا تھا۔ گھر میں ایک چار دیواری میں قید تھی۔ اب سڑکوں پر تحفظ ڈھونڈتی ہوں۔ کہاں جاؤں۔ پچھلے دنوں دارالامان گئی تھی۔ وہاں کا ماحول بھی اچھا نہیں۔ عورت کے لیے ہر جگہ ایک کھائی موجود ہوتی ہے۔ جس میں گرانے کے لیے اسے بار بار دھکیلا جاتا ہے۔ پولیس والوں کی نگاہیں بڑی قاتلانہ ہوتی ہیں۔ ناچار وہاں سے چلی آئی۔ ایک لمحے کو سوچا کہ گاؤں چلی آؤں۔ ایک چھپر کے نیچے رہ لوں گی دو گز زمین مل جائے گی۔ مگر ایک تو لوگوں کی باتیں پھر اکیلی عورت کا تو ہر جگہ رہنا عذاب ہو جاتا ہے۔ ایک تحفظ بھی نہیں ملتا۔ محبت تو دور کی بات ہے۔“

اس کی پہلی ترجیح تحفظ تھا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہتی تھی۔

”اب کہاں جاؤ گی؟“

”جہاں قسمت لے جائے۔“

”میرے ساتھ چلو گی؟“

”کس تعلق سے؟“

”اسی تعلق سے جو ایک عورت کو ایک مرد کی زندگی میں شریک ٹھہراتا ہے۔ تم ہر لمحہ میرے ہم قدم رہنا۔ میری زندگی کے ہر اچھے برے موڑ پر، میری پرخلوص ساتھی بن کر۔ اور میں تمہیں تحفظ دوں گا۔ بولو! چلو گی میرے ساتھ؟“ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

وہ چند لمحے سر جھکائے ہوئے کچھ سوچتی رہی اور پھر نظریں اٹھا کر میری آنکھوں میں غالباً سچائی اور خلوص کو تلاشنا چاہا تھا۔

اور اگلے ہی لمحے اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔

آج پریت نگر کے شہزادے نے اپنی شہزادی پالی تھی۔

☆

www.paksociety.com

دکھ تو یہی ہے اُس سے کنارا نہیں ہوا
جو شخص لمحہ بھر بھی ہمارا نہیں ہوا

میں کیا کسی کے ساتھ چلوں گا تمام عمر
میرا تو اپنے ساتھ گزارا نہیں ہوا

جس شخص کے لیے مجھے ٹھکرا گئے ہو تم
میں نے سُنا ہے وہ بھی تمہارا نہیں ہوا

خوابوں کے ٹوٹنے سے بدن ٹوٹنے تلک
وہ دُکھ بتا جو ہم نے سہارا نہیں ہوا

کیسے مقامِ عشق پہ پہنچے ہوئے ہیں ہم
ہارے ہیں جان اور خسارا نہیں ہوا

احباب دے رہے ہیں نئے عشق کی خبر
اپنا تو ایک شخص بھی سارا نہیں ہوا

میثم تمام عمر یہی دُکھ رہا مجھے!
میں کیوں کسی کو جان سے پیارا نہیں ہوا

میثم علی آغا

مٹی ہو کر عشق کیا ہے اک دریا کی روانی سے
دیوار و در مانگ رہا ہوں میں بھی بہتے پانی سے

بے خبری میں ہونٹ دیے کی لَو کو چومنے والے تھے
وہ تو اچانک پھوٹ پڑی تھی خوشبو رات کی رانی سے

وہ مجبوری موت ہے جس میں کاسے کو بنیاد ملی
پیاس کی شدت جب بڑھتی ہے ڈر لگتا ہے پانی سے

دُنیا والوں کے منصوبے میری سمجھ میں آئے نہیں
زندہ رہنا سیکھ رہا ہوں اب گھر کی ویرانی سے

جیسے تیرے دروازے تک دستک دینے پہنچے تھے
اپنے گھر بھی لَوٹ کے آتے ہم اتنی آسانی سے

ہم کو سب معلوم ہے محسنؔ حال پسِ گرداب ہے کیا
آنکھ نے سچے گُر سیکھے ہیں سورج کی دربانی سے

محسنؔ اسرار

جب رکھے پاؤں اس نے پانی میں
آگئی موج بھی روانی میں

سارے مضمون تھے بلاغت کے
اک کمسن کی بے زبانی میں

غم نہ دیکھا کوئی بڑھاپے کا
مر گئے شکر ہے جوانی میں

اک نیا ذائقہ جنم لے گا
پیاس دیکھو ملا کے پانی میں

آج روٹھی ہے سانولی مجھ سے
کہہ دیا جانے کیا روانی میں

نعمان فاروق

چھٹی حس،

زمین اوپری اوپری لگ رہی ہے
فلک پر جو مانوس تارے چمکتے تھے 'جانے کہاں ہیں
ہوا میں کوئی ایسی خوشبو رچی ہے، جو دل چیرتی ہے
فضاؤں میں کڑواہٹیں سی گھلی ہیں
وہ تشنہ لبی ہے
کہ حلق اور زباں سے لہو رِس رہا ہے
کہیں دُور سے بین کرنے کی آواز بہتی چلی آرہی ہے
کبھی ایسا لگتا ہے، پیروں تلے خاک ہے ہی نہیں ہے
کبھی دھوکا ہوتا ہے، کوئی شجر سسکیاں لے رہا ہے
کبھی یہ توہم، پرندے چہکتے نہیں رو رہے ہیں
نجانے یہ کیا ہے
کہیں کچھ ہوا ہے
یا... ہونے لگا ہے

حمیدہ شاہین

شگفتہ جاہ

رنگا رنگ پھول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"نوحہ (بین) جاہلیت کا رواج ہے۔ نوحہ کرنے والی اگر توبہ کیے بغیر مر گئی تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے تارکول کے کپڑے اور آگ کے شعلے کی قمیص تیار کرے گا۔"

فوائد و مسائل،

1- جاہلیت سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کا زمانہ ہے۔ جب کسی کام کو جاہلیت کا کام قرار دیا جائے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اسلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ کام مسلمانوں کو زیب نہیں دیتا۔

2- زندگی کے ہر معاملے میں کافروں کے رسم و رواج اختیار کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

3- توبہ کرنے سے کبیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

رازق،

حضرت ابراہیم مہمان کے بغیر کھانا نہ کھاتے تھے ایک مرتبہ تین روز تک کوئی مہمان نہ آیا۔ پھر ایک بوڑھا آتش پرست کا گزر آپ کے دروازے سے ہوا۔ آپ نے اس سے پوچھا۔

"تو کون ہے؟"

اس نے بتایا۔ "میں آتش پرست ہوں۔"

حضرت ابراہیم نے فرمایا۔ "تو میرا مہمان بننے کے لائق نہیں۔"

اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہیں آئی اور ارشاد الٰہی ہوا۔

"اے ابراہیم! میں تو ستر برس سے اس کی پرورش کر رہا ہوں اور تجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ ایک وقت کی روٹی کا ٹکڑا اسے دے دیتا۔"

شازیہ افضال ملک۔ لاہور

حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا،

"اگر لوگ تم سے کوئی امیدیں وابستہ کرتے ہیں تو یہ تم پر خدا کے فضل کی دلیل ہے۔"

عائشہ۔ منڈی محمد خان

باعلم، باعمل، پُرخلوص اور تکبر سے پاک لوگ،

"سب انسان مردہ ہیں، زندہ وہ ہیں جو علم والے ہیں۔ سب علم والے سوئے ہوئے ہیں۔ جاگ وہ رہے ہیں جو عمل والے ہیں۔ سب عمل والے نقصان میں ہیں فائدے میں وہ ہیں جو پُرخلوص ہیں۔ سب خلوص والے خطرے میں ہیں۔ کامیاب وہ ہیں جو تکبر سے پاک ہیں۔"

(امام غزالی)

انمول موتی،

- جو کرتا ہے اللہ کرتا ہے۔ اللہ جو کرتا ہے صحیح کرتا ہے۔

(واصف علی واصف)

- کوئی شخص تمہاری پیٹھ پر سواری نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ جھکی ہوئی نہ ہو۔

(مارٹن لوتھر کنگ)

- دُنیا میں جو دیتا ہے وہ پینے کا خیال خود پال لیتا ہے۔ یہی خیال طمع بن کر زہریلا ہو جاتا ہے اور محبت کو ہی مار ڈالتا ہے۔

(اشفتہ عباس)

زینب لودھی۔ اوکاڑہ

بدلہ،

ایک ٹرین پٹڑی سے اُتر کر کپاس کے کھیتوں میں گھس گئی۔ اسے دوبارہ پٹڑی پر لانے میں کافی دیر لگ

گئی۔ اس واقعہ نے تمام مسافروں کو خوفزدہ کر دیا۔ اگلے اسٹیشن پر جب گاڑی رُکی تو ناراض مسافروں نے ٹرین کے سکھ ڈرائیور کو گھیر لیا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"مجھے ایسا کرنا پڑا۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔ "ایک آدمی پٹڑی پر عین بیچ میں کھڑا ہوا تھا اور میرے مسلسل ہارن دینے کے باوجود ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔"

"کیا تم پاگل ہو؟" لوگوں نے غصے سے کہا۔ "محض ایک آدمی کی خاطر تم نے اتنے سارے مسافروں کی جانیں خطرے میں ڈال دیں۔ ایسے بدبخت کو تو تمہیں ٹرین سے کچل کر ہلاک کر دینا چاہیے تھا۔"

"وہی تو میں کر رہا تھا کیونکہ جیسے ہی ٹرین اس کے قریب پہنچی تو وہ کپاس کے کھیتوں میں گھس گیا۔"

نمرہ، اقرأ۔ کراچی

پس تحریر،

ایک صاحب نے اپنے ایک ڈاکٹر دوست کو دعوت نامہ بھیجا۔ جواب میں انہیں ڈاکٹر کا ایک خط موصول ہوا جو کسی طرح پڑھنے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ صاحب جاننا چاہتے تھے کہ ڈاکٹر نے معذرت کی ہے یا آنے کی ہامی بھری ہے۔ ان کے دوست نے مشورہ دیا۔

"بھئی اسے کیمسٹ کے پاس لے جاؤ۔ وہ ڈاکٹر کی تحریر پڑھنے کے ماہر ہوتے ہیں۔"

وہ صاحب ایک کیمسٹ کے پاس گئے اور اسے پرچہ دیا۔ اس نے کچھ دیر اسے دیکھا پھر الماری کھول کر اس نے ایک شیشی نکالی اور ان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔

"پندرہ روپے نوتے پیسے۔"

مسز ارشد آسی اتوولا۔ کھاریاں

جھوٹے کی نشانیاں

- جھوٹ بولنے والا نظر نہیں ملاتا۔
- پلکیں زیادہ جھپکاتا ہے۔
- اس کی آنکھوں کی پتلیاں خود اپھیلی ہوتی ہیں۔
- وہ اچانک بات شروع کرتا ہے، جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سوالات کا سامنا کرنے سے کتراتا ہے۔
- وہ ہکلاتا ہے، ہچکچاتا ہے... یا پھر بہت زیادہ نپے تلے انداز میں بولتا ہے جیسے خوب ریہرسل کر رکھی ہو۔
- آپ کی توجہ ہٹانے کے لیے وہ آپ کے سوال کے جواب میں بھی ایک سوال کر دے گا۔
- اس کی آواز خواہ مخواہ۔۔۔ تیز ہو جائے گی۔
- بات کرتے وقت ہاتھ ملے گا، انگلیاں چٹخائے گا۔ چہرے پر ہاتھ پھیرے گا یا کسی چیز کو کھٹکھٹائے گا۔

عائشہ، تحریم۔ گوجرہ

نظریۂ خواتین،

مرد جب کوئی چیز خریدتا ہے تو اس کی نظر میں عام طور پر صرف یہی وجہ ہوتی ہے کہ "اسے ضرورت ہے۔" جبکہ خواتین کوئی چیز خریدتی ہیں تو مندرجہ ذیل وجوہات ہو سکتی ہیں۔

- ایسی کسی اور کے پاس نہیں ہے ابھی تک۔
- شوہر نے خاص تاکید کی ہے اس کو نہ خریدنے کی۔
- باہر کی بنی ہوئی ہے۔
- سستی ہے۔
- اس کی وجہ سے تو اس کی پڑوسن لاجواب ہو جاتی ہے۔
- سب کے پاس ہے، میرے پاس نہیں ہے۔
- سہیلی جل جائے گی۔

نسیم سحر۔ کراچی

حماقت،

پانی سے آگ بجھ سکتی ہے۔ چھتری سے دھوپ رُک سکتی ہے۔ لکڑی سے دوسرے جانور رُک سکتے ہیں۔ ہر بیماری کے لیے ایک دوا ہے۔ ہر گناہ کی

تلافی کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ ہے لیکن احمقوں کی حماقت کسی طرح دور نہیں ہو سکتی۔
(فرینکلن)
آمنہ اجالا۔ ڈہرکی

اعتراف،

اب کہاں اتنی شدت سے یاد آتے ہو
اگر آتے بھی ہو تو روتی نہیں اب میں
یونہی روز مین ورک میں مصروف رہتی ہوں
ہنستی ہوں اور لوگوں سے بھی مل لیتی ہوں
ہاں کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ تم بہت یاد آنے لگتے ہو
تو میں دل کو ڈھونڈنے نکل جاتی ہوں۔
نواب زادی سوہنگی۔ مورو (سندھ)

کوئی بات نہیں،

ایک سکھ نے ایک لڑکی کو شادی کا پیغام دیا۔ لڑکی نے جواب دیا۔
"مگر سردار جی! میں تو آپ سے دو سال بڑی ہوں۔"
"تو ٹھیک ہے میں تم سے دو سال کے بعد شادی کر لوں گا۔" سردار نے اطمینان سے کہا۔
عظمیٰ غلام نبی۔ کراچی

سانحہ،

☆ تنہائی کے مسافر بیمار روحوں کی طرح اذیت کی منزلیں طے کرتے ہیں۔
☆ رفاقتوں کے فیض اعتماد کے دم سے ہیں۔ بد اعتماد انسان نہ کسی کا رفیق ہوتا ہے اور نہ اس کا کوئی حبیب۔ بد اعتمادی کی سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ انسان کو کوئی ایسا انسان نظر نہیں آتا جس کے تقرب کی وہ خواہش کرے اور نہ ہی وہ خود کو کسی کے تقرب کا اہل سمجھتا ہے۔
☆ اینٹ کا اینٹ سے ربط ختم ہو جائے تو دیواریں اپنے ہی بوجھ سے گرنا شروع ہو جاتی ہیں۔

☆ زندگی کا خوبصورت میلہ سنگت کے دم سے ہے۔ سنگت نہ ہو تو اس میلے میں ہر انسان اکیلا ہے۔ خوش نصیب وہ ہے جو کسی انسان کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ جو کسی کا منتظر ہے اور جس دل میں رفاقت کی روشنی نہ ہو وہاں چراغوں کے میلے کس کام کے؟
رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

ایک سے بڑھ کر ایک،

ایک شخص پہاڑی راستے پر جا رہا تھا، راستے میں اس کی ملاقات ایک چرواہے سے ہو گئی۔ اس نے چرواہے سے کہا۔
"اگر میں تمہاری بھیڑوں کی صحیح تعداد بتا دوں تو کیا دو گے؟"
"ایک بھیڑ۔" چرواہے نے کہا۔
"ٹھیک ہے!" اس شخص نے جواب دیا۔ "تمہاری بھیڑوں کی تعداد دو سو ستاسی ہے۔"
تعداد درست تھی۔ چرواہا حیران ہو گیا۔
اس شخص نے ایک بھیڑ اٹھا کر اپنے کندھوں پر لاد لی۔ جب وہ جانے لگا تو چرواہے نے کہا۔
"اگر میں یہ بتا دوں کہ تم کون ہو تو کیا تم میری چیز مجھے واپس کر دو گے؟"
"ٹھیک ہے۔" اس شخص نے رضامندی ظاہر کر دی۔
"تم ایک بیوروکریٹ ہو۔" چرواہے نے کہا۔
جواب درست تھا۔ بیوروکریٹ نے حیرت سے پوچھا۔
"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"
"بتاتا ہوں۔" چرواہے نے کہا۔ "پہلے میرا کتا اپنے کندھوں سے نیچے اتار دو۔"
عذرا ناصر۔ کراچی

امت الصبور

خواتین کی ڈائری

یوں تو بھری بہار میں ہر طرف خوشبو ہوتی ہے
دل کو نہ جانے کس کی جستجو ہوتی ہے
جب بھی یہ مہکی فضائیں آتی ہیں
گزرا وقت یاد دلاتی ہیں
جو ہر طرف گل کھلے ہوتے ہیں
دل میں یادوں کے نشتر چبھوتے ہیں
کون کہتا ہے
بہاریں خوشیاں لاتی ہیں
یہ تو اداسیوں سے دامن بھر جاتی ہیں

کنول شاہین قمر کی ڈائری سے

فیض احمد فیض اتنے اچھے شاعر کہ جن کے خوبصورت کلام کی تعریف کے لیے الفاظ ذہن میں آنا تو در کنار، ڈھونڈے سے بھی ملنا مشکل ہیں۔ انہی کی یہ خوبصورت سی غزل جو کہ مجھے بے حد پسند ہے۔ قارئین کی نذر۔

نہ اب رقیب، نہ ناصح، نہ غمگسار کوئی
تم آشنا تھے تو تھیں آشنائیاں کیا کیا

جدا تھے ہم تو میسر تھیں قربتیں کتنی
بہم ہوئے ہیں تو پڑی ہیں جدائیاں کیا کیا

پہنچ کے در پہ ترے کتنے معتبر ٹھہرے
اگرچہ رہ میں ہوئیں جگ ہنسائیاں کیا کیا

ہم ایسے سادہ دلوں کی نیاز مندی سے
بتوں نے کی ہیں جہاں میں خدائیاں کیا کیا

ستم پہ خوش کبھی لطف و کرم پہ رنجیدہ
سکھائیں تم نے ہمیں کج ادائیاں کیا کیا

صبا طارق کی ڈائری سے

بہار کا موسم ہر شخص کے لیے صرف خوشیاں اور خوشبوئیں ہی لے کر نہیں آتا، بعض اوقات تم سے ایسے قیمتی و نایاب گوہر بڑی بے دردی سے چھین کر لے جاتا ہے کہ آنے والی ہر بہار کی خوشبوؤں کی یاد پر حاوی ہوتی ہے۔ موسم بہار کے حوالے سے میری ڈائری میں تحریر یہ نظم آپ سب کے لیے۔

مارچ اپریل کے دن بھی
کتنے عجیب ہوتے ہیں
جب پھول کھلتے ہیں
دل مرجھانے لگتے ہیں
کچھ بچھڑے لوگ یاد آنے لگتے ہیں

حرا قریشی کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر فاخرہ بتول کی یہ غزل، جس کے ہر شعر میں ایک انوکھے احساس کا سراغ ملتا ہے۔ پڑھیے اور محسوس کیجیے۔

نشانِ منزل کا ان آنکھوں کو ہم بتلا بھی سکتے تھے
جو دل رستہ بدل لیتا اسے سمجھا بھی سکتے تھے

تری آنکھوں نے جانے کس لیے محور بدل ڈالا
وگرنہ ان کے رستے دھڑکنوں تک جا بھی سکتے تھے

نہ جانے کس لیے اقرار کرنے میں لگیں صدیاں
ذرا سا کام تھا پل بھر میں وہ کر جا بھی سکتے تھے

سنو! احسان ہے تم پہ کہ دل اب تک تہی رکھا
کسی مہمان کو اس گھر میں ہم ٹھہرا بھی سکتے تھے

بتول اچھا ہوا جو راستے سے ہی پلٹ آئے
گلابوں کے تعاقب میں خزاں تک جا بھی سکتے تھے

www.Paksociety.com

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

سونیا ربانی ــــــــ تاجپورہ محلہ بالا

لوگ کیوں چپ ہو گئے خدا جانے
میں نے تو صرف روشنی کی ہے
کتنی معصوم ہے محبت بھی
جس نے اپنا لیا اسی کی ہے

مصباح گل ــــــــ سرگودھا

کیسی بستی ہے کہ بے چین کیے رکھتی ہے
کیسی دنیا ہے یہاں کوئی سہولت ہی نہیں
ہم کو تنہا ہی کسی جنگ کو لڑنا ہو گی
ظلم برداشت کریں ایسی طبیعت ہی نہیں

مریم مظہر ــــــــ لاڑکانہ

وہ خود پرست بھی ہے زندگی شناس بھی ہے
اسے خبر ہے مرا دل بہت اداس بھی ہے
میں اس کے جھوٹ میں سے سچ نکال لاتا ہوں
میں جانتا ہوں کہ وہ مصلحت شناس بھی ہے

صبا سلیم ــــــــ ٹنڈو جان محمد

فاصلے کیوں ہیں، رابطے کیوں ہیں
ہم تجھے اتنا چاہتے کیوں ہیں
ہے مرا مسئلہ فقط اک شخص
پھر یہ اوروں سے واسطے کیوں ہیں

رضوانہ شکیل راؤ ــــــــ لودھراں

کسی کی گفتگو اور خامشی میں کھو گئے ہیں
مگر ہم اس لمحہ موجود ہی میں کھو گئے ہیں
بہت دنوں بعد اتنے زور سے دھڑکا ہے تو دل
بہت دنوں بعد اک خوش قامتی میں کھو گئے ہیں

ایمن انا ــــــــ چکوال

اس سے رشتے عجیب ہیں میرے
اک محبت کا اک جدائی کا

حفصہ انعام ــــــــ کراچی

ہیں سینکڑوں خواہشیں ہزار ارماں
دل کہاں میرے بس میں آتا ہے

طوبیٰ دانش ــــــــ کراچی

زندگی اپنی حسب حال کہاں
ایک گردش ہے ماہ و سال کہاں

فوزیہ سعید ــــــــ کراچی

شہر کے کوچہ و بازار میں سناٹا ہے
آج کیا سانحہ گزرا ہے خبر تو لاؤ

ثمینہ اکرم ــــــــ کراچی

دل سے آغاز کیا، جاں کے زیاں تک کھیلے
بازی عشق کو ہم دیکھئے کہاں تک کھیلے
ہار اور جیت کے معیار بدلنے ہوں گے
ایک سے کھیل کو اب کوئی کہاں تک کھیلے

گل پری مرزا ــــــــ لاہور

احوال عشق یوں بھی تماشے سے کم نہیں
اک چپ کو اور کتنا فسانہ کریں گے ہم

کومل عدنان ــــــــ کراچی

کچھ جہد مسلسل سے تھکاوٹ نہیں لازم
انسان کو تھکا دیتا ہے سوچوں کا سفر بھی

رخسانہ ظفر ــــــــ لاہور

اک دنیا بھول بھلیاں سی
ایک گونگا بہرا اندھا دل

فریال صلاح الدین ــــــــ کراچی

کچھ دھڑکتا تو ہے پہلو میں میرے رہ رہ کر
اب خدا جانے تیری یاد ہے یا میرا دل

فرح فاطمہ اشرف ــــــــ حویلی لکھا اوکاڑہ

آپ اگر تخت نشیں ہیں تو بڑی بات نہیں
دھول بھی اڑ کے بلندی پہ پہنچ جاتی ہے

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening ,or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

www.Paksociety.com

7 "شوبز میں آمد؟"
"چھوٹی عمر سے ریڈیو کیا۔ پھر ایک پروڈیوسر ڈائریکٹر نے ٹی وی پہ آنے کے لیے کہا تو بس آگیا۔"
8 "گھر والوں کا ردعمل؟"
"بہت خوش ہوئے کیونکہ میں نے تعلیم بھی مکمل کی ہے۔"
9 "پہلا پروگرام / وجہ شہرت؟"
"ہوم آن لائیو / یہی شہرت کا باعث بنا۔"
10 "پہلی کمائی / کیا کیا تھا؟"
"پہلی کمائی ریڈیو کی تھی۔ ایک شو کے 325 روپے ملتے تھے اور ٹی وی پر مجھے چھ ہزار ملے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔"
11 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
"کہ ایکسر سائز کروں۔"

ڈرامہ سیریل ہم سفر کا خضر

باتیں نور حسن سے

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"نور حسن۔"
2 "پیار کا نام؟"
"نور نوری۔"
3 "تاریخ پیدائش / شہر / ستارہ؟"
"16 مئی نور میں لیبیا کے شہر طرابلس میں پیدا ہوا / ٹورس۔"
4 "تعلیمی قابلیت؟"
"ایم ایس سی ان مارکیٹنگ۔ یو کے۔"
5 "بہن بھائی۔ آپ کا نمبر؟"
"ایک بڑا بھائی، پھر میں اور پھر چھوٹی بہن۔"
6 "شادی؟"
"فی الحال چار پانچ سال کوئی ارادہ نہیں۔ پہلے کچھ بننا چاہتا ہوں۔"

12 "اپنے چہرے کے خدوخال میں کیا پسند ہے؟"
"اپنی آنکھیں۔"
13 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"اپنے کمرے میں سکون ملتا ہے۔"
14 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"
"مجھے شدید بھوک لگتی نہیں ہے۔ لگے بھی تو کھیرا کھالیتا ہوں۔ کیونکہ ریسرچ کے مطابق بھوک میں یہ بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے۔"
15 "اپنے مسائل کس سے شیئر کرتے ہیں؟"
"اپنی ماں سے۔"
16 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"مجھے چکر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔"
17 "پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا دیکھتے ہیں؟"
"خدوخال دیکھتا ہوں۔ پھر یہ کہ کس طریقے سے ڈریس

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening ,or you find any issue in using site send your complaint at
admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121
www.Paksociety.com

پیار آتا ہے۔"
40 "کبھی چھٹی حس ایکٹو ہوئی؟"
"اکثر و بیشتر۔ لوگوں کو پرکھنے کے معاملے میں بہت ایکٹو ہے۔"
41 "گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟"
"اپنی ماں کو گلے لگاؤں۔"
42 "موت سے ڈر لگتا ہے؟"
"بہت زیادہ۔"
43 "کون سی تقریبات میں جانا پسند نہیں کرتے؟"
"تقریبات میں جانا پسند نہیں ہے۔ میں اکیلا رہنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔"
44 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"
"کمپیوٹر۔"
45 "جھوٹ کب بولتے ہیں؟"
"اکثر و بیشتر۔"
46 "تہوار جو شوق سے مناتے ہیں؟"
"سارے مذہبی تہوار میں بہت شوق سے مناتا ہوں اور ان کے علاوہ مدر ڈے، بہت جوش و خروش سے مناتا ہوں۔"
47 "شوبز کی سب سے بڑی برائی؟"
"دکھاوا بہت ہے۔"
48 "چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہیں؟"
"سو کے یا پھر فیس بک پہ۔"
49 "موبائل فون کے بارے میں آپ کے تاثرات؟"
"اس کے فائدے بھی ہیں اور نقصانات بھی ہیں۔ نقصان یہ کہ پرائیویسی ختم ہو جاتی ہے لیکن پوری دنیا سے رابطہ بھی اسی کی وجہ سے ہوتا ہے۔"
50 "شہرت کے بارے میں آپ کے تاثرات؟"
"فی الحال بہت اچھی لگ رہی ہے مگر خوف بھی آتا ہے کہ کہیں چلی نہ جائے۔"
51 "لوگ آپ سے ملتے ہیں تو کیا کہتے ہیں؟"
"آپ اتنے نخرے والے اور اتنے چڑچڑے نہیں ہیں جتنا ہم آپ کو سمجھتے ہیں۔"

52 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"زندگی کبھی بھی بری نہیں لگتی۔"
53 "انٹرویو کا ایک سوال جو برا لگتا ہے؟"
"کہ آپ شادی کب کر رہے ہیں۔"
54 "کوئی لڑکی اگر مسلسل گھورے تو؟"
"تو خوشی ہوتی ہے۔"
55 "سارا دن میں آپ کا پسندیدہ وقت؟"
"صبح کا وقت۔ صبح کی سیر کو جانا اچھا لگتا ہے کیونکہ صبح وقت ایک بہت خوشگوار احساس لے کر آتا ہے۔"
56 "کس جگہ جا کر بہت انجوائے کرتے ہیں؟"
"کسی گرین ایریا میں یا پھر سمندر کے کنارے بہت اچھا محسوس کرتا ہوں۔"
57 "کب چیخنے چلانے کو دل چاہتا ہے؟"
"جب اپنے ملک کے حالات دیکھتا ہوں اور میں کچھ کر نہیں سکتا۔"
58 "کس لمحے نے زندگی بدل دی؟"
"جب میں نے کراچی آنے کا سوچا۔"
59 "زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟"
"مخلص دوستوں کی۔"
60 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"کوئی نصیحت بری نہیں لگتی اگر وہ اچھی نیت کے ساتھ دی جائے۔"
61 "ایک رشتہ جس نے بہت دکھ دیا؟"
"تھا ایک رشتہ جس نے بہت دکھ دیا۔ اب اس کا کیا ذکر کرنا۔"
62 "غصہ کب آتا ہے؟"
"اس وقت آتا ہے جب مجھے پتا چلتا ہے کہ مجھ سے جھوٹ بولا گیا اور میری معصومیت اور میرے اعتماد کا بار بار فائدہ اٹھایا گیا ہو۔"
63 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتے ہیں؟"
"جتنا ہو سکتا ہے۔"
64 "کن باتوں پہ کنٹرول نہیں ہے؟"
"اپنے غصے پر۔"

65 "کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟"
"نہیں محبت بار بار ہوتی ہے۔"
66 "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟"
"بالکل کر لیتا ہوں اور غلطیوں کو سدھارنے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔"
67 "اپنا موبائل نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کر چکے ہیں؟"
"اب تو یاد بھی نہیں کیونکہ نمبر جب بہت عام ہو جاتا ہے تو پھر بدلنے کے سوا چارہ نہیں ہوتا۔"
68 "سفر کس پہ کرتے ہیں بس، رکشہ یا اپنی کار؟"
"اپنی کار۔"
69 "آپ کی کوئی انوکھی خواہش ہے؟"
"انوکھی تو نہیں ہے۔ لیکن میں پوری دنیا گھومنا چاہتا ہوں اور دنیا کی خوب صورتی اور ثقافت کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"
70 "ٹین ایج کا پیار سچا ہوتا ہے یا نادانی ہوتی ہے؟"
"نادانی ہوتی ہے کیونکہ بچپنا ہوتا ہے۔ بہت سی باتیں انسان وقت اور عمر کے ساتھ سیکھتا ہے۔"
71 "کن چیزوں پر بہت خرچ کرتے ہیں؟"
"جتنی بھی الیکٹرانک کی چیزیں ہیں ان پر۔"
72 "فٹ پاتھ پہ کھڑے ہو کر کن چیزوں کا جائزہ لیتے ہیں؟"
"اپنے ماحول کا اور یہ ایسا پلیٹ فارم ہوتا ہے جہاں آپ کو ہر طرح کے لوگ دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔"
73 "خودکش حملہ کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟"
"بے وقوف ہوتا ہے کیونکہ اس کو نہیں پتا ہوتا کہ وہ کیا کھونے والا ہے۔"
74 "کس شخصیت سے خوفزدہ رہتے ہیں؟"
"فی الحال تو کسی سے نہیں۔ آگے کا پتا نہیں۔"
75 "اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیے؟"
"اچھی عادت یہ ہے کہ مجھ میں انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور بری عادت یہ ہے کہ غصہ بہت آتا ہے۔ اسے کنٹرول کرنا چاہتا ہوں۔"
76 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو ترو تازہ محسوس کرتے ہیں؟"

"صبح سویرے۔"
77 "کبھی رات کو آنکھ کھل جائے تو؟"
"ٹرائی کرتا ہوں۔"
78 "کوئی شام جو آپ اپنی پسندیدہ شخصیت کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں؟"
"انڈیا کے میوزک ڈائریکٹر اے آر رحمان صاحب کے ساتھ۔"
79 "گھر والوں کی کس بات سے موڈ آف ہو جاتا ہے؟"
"جب وہ مجھے ایک بچے کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھے زندگی کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔"
80 "کس ملک کے لیے کہتے ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟"
"میں اپنے ملک سے محبت کرتا ہوں اگر کچھ مثبت تبدیلیاں آجائیں تو اس سے اچھا کوئی ملک نہیں۔"
81 "اچانک چوٹ لگنے پر بے ساختہ جملہ؟"
"کوئی ہائے ہائے ہی۔"
82 "بستر پر لیٹتے ہی سو جاتے ہیں یا کروٹیں لیتے ہیں؟"
"کروٹیں لیتا ہوں۔"
83 "انسان کا بہترین روپ مرد یا عورت؟"
"میرے خیال میں عورت اور میرے۔ خیال میں بدترین روپ بھی عورت ہی ہے۔"
84 "خدا کی حسین تخلیق؟"
"حسین تخلیق بھی عورت ہے اور بدترین تخلیق بھی عورت ہی ہے۔"
85 "کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ؟ ڈائننگ ٹیبل یا چٹائی؟"
"میری پہلی چوائس تو دسترخوان یعنی چٹائی ہوتی ہے۔"
86 "آپ کا ذریعہ معاش؟"
"اداکاری... یہی میرا پروفیشن ہے۔"
"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"تو میں پھر سے کوشش شروع کر دوں گا اپنے زوال کو ختم کرنے کی۔"

www.Paksociety.com

آپ کا باورچی خانہ

فرح کاظمی

خواتین ڈائجسٹ میں اس وقت سے پڑھ رہی ہوں جب سے ہوش سنبھالا ہے اور یاد نہیں کب یہ خواہش میرے دل میں بیدار ہوئی کہ میں بھی "آپ کے باورچی خانہ" میں شرکت کروں۔ اب چونکہ میٹرک کے ایگزامز کے بعد میں فارغ ہوں اور کوکنگ کا شعبہ میں نے ہی سنبھال رکھا ہے تو اب میں اس سلسلہ میں شرکت کرنے کی اہل ہوگئی ہوں۔ (آمین)

1۔ ہمارے ہاں کھانا کھاتے وقت گھر والوں کی پسند اور ذائقے کا ہی خیال رکھا جاتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ غذائیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ ہر ڈش کو بناتے ہوئے حتی المقدور کوشش کی جاتی ہے کہ اس کے غذائی اجزا ضائع نہ ہوں۔

2۔ مہمان ہمارے ہاں اچانک ہی آتے ہیں۔ اطلاع دے کر آنے کا کوئی رواج نہیں۔ لہٰذا ان کی آمد کی خوشی بھی بے تحاشا ہوتی ہے۔ ہمارے خاندان میں اگر مہمان عین کھانے کے وقت آئیں تو کوئی تکلف نہیں کیا جاتا جو کچھ گھر میں موجود ہو وہی پیش کر دیا جاتا ہے اور ایسا کرنے سے آپس میں محبت، خلوص اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ اگر کچھ ٹائم ہو تو اضافی ڈشز ضرور بنائی جاتی ہیں۔

چپلی کباب بنانے کی ترکیب لکھ رہی ہوں بہت مزے کے بنتے ہیں۔

چپلی کباب

اشیا:

قیمہ	ایک پاؤ
ثابت دھنیا	دو چائے کے چمچے
پیاز	ایک عدد
انار دانہ	دو چائے کے چمچے
ہری مرچیں	دو عدد
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
پودینہ	چند پتے
کٹی سرخ مرچیں	ایک چائے کا چمچہ
نمک	تین چوتھائی
انڈا	ایک عدد
مکئی کا آٹا	نصف چھٹانک
گھی	تلنے کے لیے

ترکیب:

انار دانہ اور دھنیا موٹا موٹا کوٹ لیں۔ پیاز، پودینہ، ہرا دھنیا اور سبز مرچ باریک کاٹ لیں۔ انڈا پھینٹ کر اس میں سرخ مرچ، نمک، مکئی کا آٹا اور قیمہ سمیت تمام اجزا خوب اچھی طرح ملا دیں۔ پھر ٹکیاں بنا کر کڑکڑاتے گھی میں تل لیں۔

اس کے علاوہ ایک بہت سادہ سی سوئیٹ ڈش "گڑ مکئی کی چوری" (جو کہ میری امی کی ایجاد ہے) کی ترکیب پیش خدمت ہے۔ بہت لذیذ ہوتی ہے۔ آزمائش شرط ہے۔

گڑ مکئی کی چوری

اشیا:

مکئی کی تیار شدہ روٹیاں	دو عدد
گڑ کی ڈلیاں (درمیانے سائز کی) (جتنا گڑ اتنا میٹھا کا اصول ہے)	دو عدد
گھی	حسب ضرورت

ترکیب:

مکئی کی روٹیوں کا موٹا موٹا چورا بنالیں۔ گڑ کو باریک پیس لیں اور تھوڑا سا گھی ڈال کر چولہے پر رکھ دیں۔ جب پگھلنے لگے تو اس میں مکئی کی روٹیوں کا چورا ڈال دیں۔ اچھی طرح مکس ہو جائے تو اتار لیں۔

3۔ ہمارے خاندان میں پردے کی سخت پابندی کی جاتی ہے۔ باہر کھانا کھانے کا کوئی تصور نہیں۔

4۔ ناشتے میں ہمارے ہاں پراٹھے اور رات کا بچا ہوا سالن چلتا ہے یا انڈے کی کوئی بھی قسم "مثلاً" فرائی، آملیٹ وغیرہ وغیرہ۔ سردیوں میں چائے اور گرمیوں میں میٹھی لسی ناشتے کا لازمی جزو ہیں۔

5۔ موسم کے حساب سے کھانے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ یعنی بارش کے ہمراہ پکوڑے، چائے وغیرہ مزا دے جاتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی بغیر موسم کے کھانے کا بھی لطف بے انتہا ہوتا ہے۔ یعنی گرمیوں میں ساگ بے حد لذیذ لگتا ہے۔

6۔ کچن کی ٹپ تو یہ ہے کہ کھانا پکانے سے پہلے بسم اللہ اور درود شریف پڑھنے سے کھانے میں لذت اور برکت پیدا ہو جاتی ہے۔

سالن بھونتے ہوئے ڈھکن اتار کر تھوڑا تھوڑا پانی ڈال کر بھونیں تو سالن خوش رنگ بنتا ہے۔

سالن میں نمک زیادہ ہو جائے تو ٹماٹر یا دہی ڈال دینے سے افاقہ ہوتا ہے۔

☆

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول
میرے ندیم

قیمت -/275 روپے
رضیہ جمیل
منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

چاکلیٹ کریمی کیک

اجزا:

میدہ	دو کپ
بیکنگ پاؤڈر	2 کھانے کے چمچے
انڈے	2 عدد
چینی	ڈیڑھ کپ
کریم	ڈیڑھ کپ
مکھن	ایک کپ
کوکو پاؤڈر	2 کھانے کے چمچے
آئسنگ شوگر	آدھی پیالی
دودھ	آدھی پیالی
تیل	دو کھانے کے چمچے

ترکیب:

ایک بڑے پیالے میں میدہ، بیکنگ پاؤڈر، ایک چمچہ کوکو پاؤڈر اور چینی ملالیں۔ چار بڑے چمچے مکھن الگ کرکے باقی مکھن میں انڈے پھینٹ لیں۔ دونوں آمیزوں کو الگ الگ اچھی طرح مکس کرنے کے بعد اس میں ملادیں۔ (میدہ، انڈہ اور مکھن آسانی سے مکس نہیں ہوپاتے اس لیے پہلے انہیں الگ الگ مکس کریں، پھر سب کو ملاکر) سانچے میں ڈالنے سے قبل سانچے پر ایک چمچہ تیل یا گھی مل دیں۔ براؤن کاغذ سیٹ کرکے آمیزہ ڈال دیں۔ خیال رکھیں آمیزہ خوب اچھی طرح مکس کیا ہوا ہو۔ 180 سینٹی گریڈ پر پہلے سے گرم شدہ اوون میں رکھ دیں۔ اگر اوون کے سہولت نہ ہو تو ایک بڑے پتیلے میں خوب سارے چکنے پتھر ڈال کر چولہے پر گرم ہونے کے لیے رکھ دیں۔ تقریباً ایک گھنٹے میں وہ صحیح طور پر دہک سکیں گے۔ کیک کا سانچہ اس پتیلے میں پتھروں پر رکھ کر ڈھکن بند کردیں۔ آنچ ہلکی کردیں۔ آدھے گھنٹے بعد چھری ڈال کر چیک کریں، سخت محسوس ہو تو سمجھیں تیار ہے، ورنہ آدھا گھنٹہ اور بیک کریں۔ ایک گھنٹے میں کیک اچھی طرح بیک ہوجاتا ہے۔

بچے ہوئے چار چمچے مکھن میں آئسنگ شوگر (پسی ہوئی چینی) اور کوکو پاؤڈر اتنا مکس کریں کہ دانہ یا پھٹکی نہ رہے۔ اس آمیزے کا کیک پر لیپ کریں۔ چاروں طرف اور اوپر اچھی طرح کریم لگانے کے بعد اگر چاہیں تو چھری سے سجاوٹ کرلیں یا کریم کون سے ڈیزائن بنائیں۔ چاکلیٹ کریمی کیک تیار ہے۔

رنگ برنگے سینڈوچ

اجزا:

چکن	آدھا کلو
بند گوبھی	آدھا پاؤ
گاجر	آدھا پاؤ
شملہ مرچ	1 عدد (بڑی)
ہری پیاز	1 عدد
میدہ	2 کھانے کے چمچے
بڑی ڈبل روٹی	1 عدد
انڈے	2 عدد
پسی کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

فرائنگ پین میں دو کھانے کے چمچے تیل گرم کریں اور میدہ ڈال کر ہلکا سا بھون لیں۔ پھر اس میں نمک اور کالی مرچ ملادیں۔ اب بند گوبھی، ہری پیاز، شملہ مرچ اور گاجر چوپ کرکے شامل کریں اور چمچہ چلائیں۔ چکن کو ابال کر ریشہ کرلیں اور وہ بھی اچھی طرح مکس کرلیں۔ ڈبل روٹی کو حسب پسند شیپ میں کاٹ لیں۔ سلائس پر چکن اور سبزی والا آمیزہ رکھ کر پھیلائیں اور انڈے میں ڈبو کر ہلکے تیل میں تل لیں۔ جلد تیار ہونے والے مزے دار سینڈوچ حاضر ہیں۔

www.Paksociety.com

نادرہ خاتون
سارے خال

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

شمع احمد ۔ شٹ چونکی

چراغ آخر شب جیسی شان دار تحریر کے ساتھ کافی عرصہ منسلک رہنے کے بعد آخری قسط پڑھ کر جدائی کی گھڑی آگئی۔ رفعت ناہید سجاد نے اپنے الفاظ اور حروف کی گرفت میں پوری کہانی میں لیے رکھا۔ آخر دم تک یہ گرفت ڈھیلی نہ ہو پائی، ابھی بھی یہ تشنگی ہے کہ چراغ آخر شب مسلسل جاری رہے۔

"چراغ آخر شب" جب سے چلا ہے رسالے کی جان رہا۔ بعد مدت وطن کی محبت کا موضوع اتنی گہرائیوں سے گہرائیوں تک لے جاتا رہا۔ یادگار رہے گا اس لیے کہ اس کے کردار عبیر، کریم بی بی، سر عباس، شمشان، شہریار، حمیرا، پروین دسایا اس کا باپ سب ہی میرے پسندیدہ ترین تھے۔ خصوصاً عبیر کا کردار۔ عبیر کا خود سے جدا ہونے کا دکھ ہو رہا ہے۔ اس کی سوچیں، باتیں، محبت، خاص طور پر ان کا پورا گروپ اپنے وطن کے لیے بہت پرجوش، پریکٹیکل، پرخلوص، وفادار اور خاص طور پر سر عباس کے گھر کے تمام درپچے سیڑھیاں، جس پر یہ سب بیٹھتے اور ان کی نہ سمجھوتہ کرنے والی عادت۔ ڈٹ جانے والی۔ ذلیل عورت سادہ حق اور گندے کیڑے، نعیم ملک (ایسے غدار وطن جو وطن کے تاریک حصے بن کر چراغوں کی لو بجھانے کی کوشش کرتے ہیں) کے مقابلے میں، ہاں وطن کی محبت کے مقابلے میں محب وطن کبھی غدار سے سمجھوتا کر ہی نہیں سکتا، نہ کل، نہ آج اور نہ ہی آنے والے وقتوں میں۔

یوں شاء اللہ تعالیٰ رات کتنی ہی کالی کیوں نہ ہو اس کے آخری سرے پر ہمیشہ ایک سورج روشن اور بھرپور صبح ہے منتظر کھڑا ہوتا ہے۔

اس خوب صورت ناول کو پڑھ کر احساسات بالکل یوں ہو گئے ہیں۔ جس طرح ایک ریل گاڑی اپنے ٹریک پر چلتی تیز رفتاری سے بھاگتی، ادوتی، مختلف خوب صورت مناظر دکھائے اور جب سانسوں کے باغات سے گزرے تو خوشبودار مہک اپنے اندر اتار تا مسافر بے اختیار یہ آرزو کر بیٹھے کاش میں عمر بھر کے لیے کہیں پڑاؤ ڈال لوں اور اس ہریالی میں سدا کے لیے مقیم ہو جاؤں کہ میرا پاکستان ان شاء اللہ تعالیٰ ہمیشہ سلامت رہے گا۔ اس کی بنیاد میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور اس کے جانثاروں کا وہ خون شامل ہے جس کی پاکی اسے کبھی میلا نہیں ہونے دے گی۔

اقرا اور لائی محمد اشرف گاؤں بھوبڑا شرمنڈی سکھیکی

سب سے پہلے فرحت اشتیاق کا مکمل ناول "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" پڑھا۔ مجھے لیزا کا کردار بہت پسند ہے اور شہریار خان کو بھی جلدی سے اصلیت کا پتا چل جانا چاہیے۔ اس کے بعد "ساری بھول ہماری تھی" پڑھا۔ راحت جبیں اپنے کرداروں سے بالکل صحیح انصاف کر رہی ہیں۔ اس کے بعد "میں شرمندہ ہوں" کچھ متاثر نہیں کر پایا۔ "آپ نبیلہ جی کہانی میں کچھ نیا پن نظر نہیں آیا۔ "میرے خواب لوٹا دو" "شکر ہے اریبہ کی آنکھیں بھی کھل

گئیں۔ اب اریبہ اور اجلال رازی کو مزید مت خوار کریں اور انہیں ایک کریں۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ اس کے بعد اقرار علی نازش سے ملاقات اچھی لگی۔ عزیزہ فاروقی کا انٹرویو بھی اچھا تھا۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ سمیع خان کا انٹرویو شامل کریں۔ کرن کرن روشنی پڑھ کر بے اختیار منہ سے نکلا۔ سبحان اللہ۔ دلشاد نسیم کے شوہر کی وفات کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔

ج: اقرا! دلشاد نسیم کے شوہر کی وفات پر ہمیں بھی بہت دکھ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صبر دے۔ (آمین)
خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

نایاب چندا ۔ اچھی کوٹ

ٹائٹل بس ٹھیک ہی تھا۔ سب سے پہلے میں نے "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" پڑھا اور اس کہانی نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا۔ اس کہانی میں سکندر میرا پسندیدہ کردار ہے۔ دسمبر کے شمارے میں آپ نے لیزا کی بہن کا نام "مسمانا" بتایا تھا اب آپ نے اس کا نام ام مریم کر دیا، یہ کیا ہے بھئی۔ راحت جبیں کے ناول نے مجھے بہت غصہ دلایا۔ عرشہ نے اپنی ماں کے منع کرنے کے باوجود سیٹ دے کر اچھا نہیں کیا۔ باقی سب کہانیاں ٹھیک تھیں۔

ج: نایاب! شاید آپ کو یاد نہیں "مسمانا" نام ام مریم کی ماں نے رکھا تھا۔ جبکہ اس کے والد نے اس کا نام ام مریم رکھا تھا۔ جبکہ لیزا کا نام کلثوم رکھا تھا۔ راحت جبیں کے ناول میں آپ کے اندازے کس حد تک درست ہیں۔ یہ تو آگے چل کر ہی پتا چلے گا۔

مہرین آصف ۔ بٹ بھلہ آزاد کشمیر

ہمارے گھر کا ماحول ہی ایسا ہے کہ ہمارے گھر میں سب کو لکھنے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ میرے ابو کا تعلق کھنے پڑھنے کے شعبے سے ہے۔ وہ کافی عرصے تک مختلف اخبار و رسائل میں لکھتے رہے۔ گھر میں ہمیں جس ہستی نے خواتین سے متعارف کروایا۔ وہ ہماری پھوپھو ہیں۔ ہمارے ابو کی کزن وہ خواتین و شعاع باقاعدگی سے پڑھتی تھیں۔ ہماری ساری کزنز، ہماری چچیاں یہ رسالے پڑھتی ہیں اور اس کے بعد اس پر تبصرہ کرتے ہیں۔ اس کا ہمارے اخلاقی تربیت میں بہت بڑا کردار ہے۔ تمام لکھاری بہنیں بہت اچھا لکھتی ہیں۔ بشریٰ سعید صاحبہ کو میری طرف سے مبارک باد کہ انہوں نے اتنی اچھی تحریر سفال گر ہمیں دی۔ اس کے علاوہ چراغ آخر شب رفعت ناہید سجاد صاحبہ کی تحریر مجھے بہت پسند ہے۔ نفسیاتی و ازدواجی الجھنیں بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اس سے ہمیں مسائل سے چھٹکارا پانے کا راستہ ملتا ہے۔

ج: مہرین! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔
یہ اللہ تعالیٰ کا کرم اور مہربانی ہے کہ قارئین خواتین ڈائجسٹ کو پسند کرتی ہیں اور خواتین ڈائجسٹ آج اردو کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا پرچہ ہے۔

امید اقبال ۔ چیچہ وطنی

میں نے آج سے پہلے کبھی کسی رسالے میں خط نہیں لکھا۔ میں چاہتی تو تھی مگر اچھے لفظوں کی کمی نے مجھے کبھی اجازت نہ دی۔ ماشاء اللہ آپ کے سب ہی ماہنامے بہت معیاری ہوتے ہیں جن میں ادبی جھلک بہت نمایاں ہوتی ہے۔ آپ کی محفل میں میری شمولیت کا موجب بنا "سفال گر"۔ سفال گر ایک ایسا ناول جس پر میں تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔ میری طرف سے بشریٰ آپی کو ڈھیر ساری مبارک باد۔

ج: پیاری امید! کسی بھی تحریر کو ڈرامے کے طور پر پیش کرنا مصنف کی اپنی مرضی اور خوشی پر منحصر ہوتا ہے۔ اس پر پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ جن کہانیوں کی کتابی شکل میں

"میرے خواب لوٹا دو"

آپ کی پسندیدہ مصنفہ نگہت عبداللہ علالت کی بنا پر ناول "میرے خواب لوٹا دو" کی قسط نہ لکھ سکیں۔ اس ماہ ناول کی قسط شامل نہیں ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ آپ ناول "میرے خواب لوٹا دو" کی قسط پڑھ سکیں گی۔

www.Paksociety.com

پیش کرنے کی آپ نے فرمائش کی ہے' ان میں سے کچھ کتابی شکل میں آچکی ہیں' بقیہ جلد آنے والی ہیں۔

سورتھ سائڈ۔۔۔ روحل والی گاؤں

حسب معمول مارچ کا خواتین بہت ہی اچھا تھا۔ مکمل ناول میں نبیلہ عزیز فرسٹ رہیں۔ سلسلے وار ناولز' افسانے ناولٹ غرض سارا رسالہ بہت ہی اچھا تھا۔ شاعری بس سو سو تھی۔ نبیلہ ابر راجہ سے کچھ لکھوائیں نا اور پلیز پرانی کہانیاں دوبارہ شائع کریں۔

ج پیاری سورتھ! پرانی کہانی کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ تھوڑا انتظار کرلیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے۔ شکریہ

ام رومان۔۔۔ عبدالحکیم

ٹائٹل گرل بہت اچھی لگ رہی تھی۔ سب سے پہلے اپنی موسٹ فیورٹ رائٹر کے ناول کی طرف دوڑ لگائی۔ ام مریم کا ایرا کی بہن ہونا بہت شاکنگ لگا۔ ہمیشہ کی طرح فرحت کا یہ ناول بھی تعریفوں کا محتاج نہیں۔ اس کے بعد نگہت عبداللہ کا "میرے خواب لوٹا دو" پڑھا۔ شکر ہے ادیبہ کو ہوش آیا اور اپنی ماں کی اصلیت جان گئی۔ "ساری بھول ہماری تھی" راحت جبیں کی نہایت دلچسپ تحریر ہے' بس عریشہ کے ساتھ برا نہ ہو۔ نبیلہ عزیز کا ناول "میں شرمندہ ہوں" بھی بلاشبہ اچھی تحریر تھی۔ آسیہ رزاقی کا ناول بھی اچھا لگا۔

ج ام رومان! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعہ پہنچائی جارہی ہے۔

سلمیٰ سحر۔۔۔ حافظ آباد

ڈائجسٹ ملا فہرست پہ نظریں دوڑائیں' آسیہ رزاقی اور نبیلہ عزیز کو دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔

"چراغ آخر شب" کی آخری قسط دیکھ کر جھٹکا لگا۔ یہ کیا؟ میں تو ابھی بالکل توقع نہیں کررہی تھی کہ اس خوب صورت سے ناول کا اختتام ہونے والا ہے۔ 2009ء سے شروع ہونے والا یہ تاریخی ناول 2012ء میں ختم ہوا۔ کون ہوگا جو اسے پڑھ کر رفعت صاحبہ کا مداح نہ ہوا ہو۔ آپ نے بتادیا کہ اس ملک کی تاریخ کس قدر لہولہان ہے۔ نہ جانے کتنی جون آف آرک اندھیرے کنوؤں کی نذر ہوئیں۔ نہ جانے کتنے گھر جلے اور زندہ بچنے والے اپنے پیاروں کی یاد میں سسک سسک کر جیے۔ کس قدر خوب صورت انداز میں آپ نے موجودہ زبوں حالی بیان کی' یسال نعیم ملک اور سارہ حق جیسے دوغلے اور کرپٹ لوگوں کی بہتات ہے' جبکہ ابھی تک ایمان اور جذبے کے ساتھ سرعباس جیسے لوگ بھی رواں دواں ہیں۔ ریئلی اٹس امیزنگ۔ کمال کی رومانٹک' کمال کی حساس اور کمال کی نرم گداز جذبوں سے لبریز ناول کی مالک فرحت اشتیاق کو ہم اس ناول میں پہلے سے بڑھ کر پارہے ہیں۔ ناول میں نبیلہ عزیز کا "میں شرمندہ ہوں" ٹاپ رہا۔ جبکہ آسیہ رزاقی بھی کسی طور کم نہ تھیں۔ افسانوں میں نفیرہ ناز اور ثمینہ سید کے افسانے پسند آئے۔

راحت جبیں' عریشہ میں زرد موسم کی ایمن کی جھلک دکھا رہی ہیں۔ "میرے خواب لوٹادو" میں نگہت عبداللہ سابقہ تسلسل برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

موجودہ زندگی میں اگر کوئی ہلچل ہے تو وہ آپ کے شمارے کی بدولت ہے۔ ورنہ تو جمود ہی جمود ہے' سو میں آپ کی اس کاوش کی تہ دل سے مشکور ہوں۔ گھر بیٹھے بٹھائے دنیا جہان کی معلومات کے ساتھ ساتھ ہم لڑکیوں کی تربیت کا بھی بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ شکریہ!

ج سلمیٰ جی! معذرت آپ کے پچھلے خط شامل نہ ہوسکے۔ رفعت ناہید سجاد اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈرامہ' ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

والی چار تحریریں ہیں۔ رفعت ناہید سجاد کی تحریر "چراغ آخر شب" بہت خوب صورت بلکہ یوں کہنا چاہیے' ایک شاہکار تھی۔ کردار بہت خوب صورت اور حقیقت سے قریب تھے۔ اس کہانی کو پڑھتے ہوئے بعض اوقات لگتا تھا ہم خود بھی F.80 میں موجود ہیں۔

دوسری کہانی بشریٰ سعید کی "سفال گر" ہے۔ بہت اچھی لگی۔ مصنفہ کی کہانی پر گرفت کمال کی تھی۔ کہیں کوئی جھول یا بوریت محسوس نہیں ہوئی۔ اس تحریر کو بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے اور ہر بار میں اسی طرح انجوائے کرتی ہوں جیسے پہلی بار پڑھا ہو۔ اس کہانی سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ اللہ کے احسان یاد کیے۔ وہ احسان جن کے متعلق پہلے کبھی یہ خیال ہی نہیں آیا کہ اللہ ہمیں کتنا پیار کرتا ہے۔

تیسری تحریر نمرہ احمد کی "مصحف" ہے۔ اس تحریر نے بھی بہت متاثر کیا۔ ایک ایسی تحریر جو آپ کو قرآن سے قریب کردے۔ اس سے اچھی تحریر بھلا کیا ہوسکتی ہے۔ قرآن بے شک ایک معجزہ ہے۔ میرا ذاتی تجربہ بھی ہے۔ جب بھی کوئی پریشانی یا الجھن ہو۔ قرآن کہیں سے بھی پڑھنا شروع کردو۔ اکثر ہی ایسی آیات آجاتی ہیں' جن میں ہمارے مسئلے کا حل موجود ہوتا ہے۔ اگر نہ بھی آئیں تو دل کو سکون ضرور مل جاتا ہے۔

چوتھی تحریر فرحت اشتیاق کی کہانی "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" ہے۔ یہ مجھے اس لیے پسند ہے کہ اس کہانی کو پڑھ کر گھر بیٹھے روم کی سیر ہوگئی۔ اس کو پڑھ کے میں اتنا ہی انجوائے کررہی ہوں' جیسے مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے کو پڑھ کے انجوائے کرتی ہوں۔

2۔ بشریٰ سعید کے سفال گر سے اقتباس

"اللہ تم سے پیار کرتا ہے۔ اس نے تمہیں گناہ کرنے سے روک دیا۔ کیونکہ اسے پسند نہیں کہ جہنم کی آگ تمہیں چھوئے۔ مجھے تم پر رشک آتا ہے۔ کاش ہمیں بھی اس صف میں تمہارے برابر ہوتا۔ کاش! وہ مجھ سے بھی اتنا ہی پیار کرتا' تم چنے ہوئے لوگوں میں سے ہو۔"

ملا احمد۔۔۔ کراچی

1۔ آپ کے پہلے سوال کا جواب کسی تحریر نے متاثر کیا؟ تو کسی ایک نے نہیں بہت سی تحریروں نے متاثر کیا۔ سب سے پہلے بشریٰ سعید کا "سفال گر" الفاظوں کا خوب صورت چناؤ اور عمدہ انداز بیان پھر شازیہ ہمایوں کا "نگاہ آئینہ ساز میں" بہت عمدہ پلاٹ' خوب صورت انداز بیاں۔

نومبر میں آسیہ رزاقی "جیسے کچھ ہوا ہی نہیں" قلم پر عمدہ گرفت۔

اب فرحت اشتیاق "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" کردار نگاری' منظر نگاری' انداز بیاں سب ہی اے پلس۔ صوفیہ امجد کا "کہیں دیر نہ ہوجائے" بہت زبردست۔ سب پڑھیں' جس نے نہیں پڑھا وہ اب پڑھ لے۔

راحت وفا کا "سائبان" بہت اچھا تھا۔ صوفیہ بشیر کا "توبہ" بہت اچھا اور بہت زبردست اور غزالہ خالد کا "اے پی کے" اے ون تھا۔ ان سب کہانیوں کی پسندیدگی کی اہم وجہ عمدہ پلاٹ کا انتخاب اور خوب صورت انداز بیاں۔

2۔ دوسرا سوال پسندیدہ اقتباس' تو جناب یہ رہا۔

صوفیہ امجد کے ناولٹ "کہیں دیر نہ ہوجائے" سے۔

"لڑکیاں تو پودوں کی مانند ہوتی ہیں۔ جب آپ کسی پودے کو ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لگاتے ہیں تو اگر پودے کو نئی جگہ کی مٹی اور آب و ہوا راس آجاتی ہے تو وہ پھلتا پھولتا ہے اور پھول پھل دیتا ہے۔ ورنہ مرجھا جاتا ہے اور کبھی تو جل کر ختم ہوجاتا ہے۔"

صوفیہ بشیر کے مکمل ناول سے "توبہ" سے

"المیہ اصل میں یہ ہوا کہ ہم اسلام کی حقیقی تعلیمات سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ مثلاً "عورت کی گواہی کن معاملات میں آدھی ہے" یہ کنڈیشنز شادی

www.Paksociety.com

گئیں۔ عورت پہ کن حالات میں ہاتھ اٹھا سکتے ہیں' یہ صورت حال بتا دی ہے۔ طلاق کیسے ہوتی ہے' یہ طریقہ کار بتا دیا گیا ہے۔ حلالہ اصل میں ہے کیا' یہ واضح کر دیا گیا ہے۔ ان سب حالات و معاملات کی غلط پریکٹس نے مرد کو اپنی فیور میں لے لیا اور وہ عورت کا اصل مقام اور تقدس بھول گیا۔ اس عورت کا جو ماں ہے تو جنت اس کے قدموں تلے ہے' جو نیک بیوی ہے تو بہترین متاع ہے' جو بیٹی ہے تو رحمت ہے۔"

حنا عنبرین "آمنہ قیوم"...... گوجرانوالہ

1۔ ویسے تو سب تحریریں بہترین تھیں لیکن کچھ کی تعریف کرنی ہے تو سب سے پہلے "مصحف" کا ذکر کریں گے۔ نمرہ احمد نے اپنی تحریر میں یہ پیغام دیا کہ قرآن مجید طاق میں سجا کر رکھنے کے لیے نہیں ہے بلکہ سمجھ کر پڑھنے اور اپنی زندگی کے ہر فیصلے میں شامل کرنے کے لیے ہے۔

"سفال گر" میں تو بشریٰ سعید نے دعا مانگنے کا طریقہ سکھا دیا کہ دعا فرشتے کے پر کی طرح کوری ہونی چاہیے اور یہ کہ نیت کھری ہو تو گلدان کو بھی گلدان کا روپ دیا جا سکتا ہے۔

مکمل ناول میں اس سال صوفیہ بشیر نے اپنے ناول "توبہ" میں بہت سے ایسے مسائل کی وضاحت کی جو ہم نہیں جانتے کہ یہ ایسے کیوں ہے۔

عنیزہ سید کا ناول "معجزہ" اور زہرہ ممتاز کی تحریر "ایک ادھوری بات" بہت اچھی تحریریں تھیں۔

2۔ پسندیدہ پیراگراف اور لائنیں تو بہت ہیں لیکن پھر وہی ایک کی شرط۔

"مصحف" کی یہ لائن۔

"قرآن صرف صادق اور امین کے دل میں اترتا ہے۔"

کنیز نبوی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ ان کے ناول "روشنی کی خواہش" سے یہ اقتباس بہت پسند ہے۔

"محبت کی حسینہ بہت خوب صورت تھی۔ اس کے وجود میں ٹھنڈک تھی تو تپش بھی۔ وہ آگ اور پانی کا طلاپ سورج اور سمندر کا ہالہ اور کنک کی جلن رکھتی' وہ رگوں کو جھنجوڑتی اور دل کو اپنے گرد محور رقص رکھنے کے گر سے آشنا اور سارے ماحول پہ چھا جانے میں ماہر رہی۔ وہ کبھی صوفیوں کے سلوک میں چھپتی اور کبھی دلوں میں پردہ پوش ہو جاتی۔"

سورٹھ سائنہ...... روحل وائی گاؤں

1۔ خواتین کی پورے سال میں کئی اچھی تحریریں چھپیں۔ لیکن 2011ء کی خاص تحریر اور خاص کاوش بشریٰ سعید کی "سفال گر" تھی۔ اس کی کردار نگاری کرداروں سے بھرپور انصاف' فلسفیانہ انداز تھا۔ سب بہت کرشماتی ہوا۔

2۔ سفال گر سے یہ اقتباس "یہ میری قیمت ہے جو تم نے مقرر کی ایک اہم موقع کے عوض مجھے بیچ دیا۔ ترازو کے ایک پلڑے میں غیر اہم پرنیاں اور ایک پلڑے میں ایک اہم موقع جس پلڑے میں پرنیاں تھی وہ جھکا ہی نہیں۔ تمہاری پیمائش کو کیا الزام دوں؟ ایک پیمائش میں نے بھی کی تھی۔ ایک پلڑے میں پوری دنیا اور میرا ایمان اور دوسرے پلڑے میں احمد گرانٹ۔ تمہارا والا پلڑا اوپر اٹھا ہی نہیں۔ یہ تمہاری قیمت ہے جو میں نے طے کی۔"

نرگس عباسی...... کراچی

1۔ اپریل 2011ء سے مارچ 2012ء کے دوران شائع ہونے والی سب سے بہترین تحریر بشریٰ سعید کے "سفال گر" کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ سفال گر جیسا کوئی ناولٹ کم از کم میں نے تو اپنی پوری زندگی میں نہیں پڑھا۔ بشریٰ جی کے لکھنے کا انداز ہی سب سے منفرد ہے۔ مشکل الفاظ اور انداز کے باوجود سفال گر اپنی طرز کا ایک بہترین ناولٹ رہا۔

سفال گر کے بعد سب سے بہترین آمنہ ریاض کا ناول "مرگ وفا" رہا۔ انسانوں کی مادہ پرستی' سوچ اور دھوکہ دینے والوں کی یہ کہانی ایک حقیقی داستان محسوس ہوئی۔

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening ,or you find any issue in using site send your complaint at
admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121
www.Paksociety.com

اس کے علاوہ راحت جبیں کا "ہم سے مل کے" ،اور نمرہ احمد کا "مصحف" بھی اے ون رہے جبکہ فرحت اشتیاق کا "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" بھی اچھا چل رہا ہے۔

2- اپریل 2011ء سے مارچ 2012ء تک کی بہت سی تحریریں ہیں جن کے جملوں نے بہت حد تک مجھے متاثر کیا۔ ان میں سے بشریٰ سعید کے ناول سفال گر کے یہ جملے۔

"تم نے مجھے برباد نہیں کیا۔ کوئی انسان کسی انسان کا مقدر نہیں بدل سکتا۔ مجھے خدا نے برباد کیا ہے۔ میں نے ایک انسان کو خدا کے برابر لانے کی کوشش کی تھی اور خدا نے مجھے میری اوقات یاد کرادی۔ میرے لیے زمین اور آسمان کے بیچ کہیں پناہ نہیں ہے۔ میری بربادی کی کوئی حد نہیں ہے۔ میں تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ جان لو، خدا جب منہ کے بل گراتا ہے تو ٹھوکر کھانے کے لیے کسی رکاوٹ کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

اس کے علاوہ آمنہ ریاض کے ناول مرگ وفا کے چند جملے۔

"جس انسان کی ترجیحات جس قدر مادیت پر مبنی ہوں گی وہ اتنا ہی بڑا دھوکہ باز ہوگا۔ وہ دوسرے سے اتنی ہی بڑی بے وفائی کرے گا۔"

اس کے علاوہ مئی 2011ء کی سیماب عاصم کی تحریر "بھروسہ" کے یہ الفاظ۔

"جب راستے خود بخود سہل ہوتے چلے جائیں تو سمجھ لو کہ یہی رب کی منشا ہے۔ انسان کو زندگی میں سب کچھ حسب منشا نہیں ملتا۔ تقدیر کا ایک اشارہ انسان کی سالوں کی پلاننگ پر پانی پھیر دیتا اور جو لوگ اپنے معاملات اللہ کے سپرد کرنے کے بجائے اپنی عقل و دانش کو اہمیت دیتے ہیں 'لکھ کر رکھ لو کہ تقدیر سے مات ضرور کھاتے ہیں۔"

شائستہ اکبر..... ڈگری کالج گدو

1- خواتین ڈائجسٹ جی! آپ کو سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ آپ ہمیشہ ایسے ہی ہنستے مسکراتے اور کھلکھلاتے اپنا سفر جاری رکھیں (آمین)

مصحف ہاں جی! ہمیں "مصحف" نے بہت متاثر کیا۔ نمرہ احمد کے اس ناول کے لیے میں کیا کہوں تعریف کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہے۔

فرحت اشتیاق کے ناول "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" نگہت عبداللہ کا ناول "میرے خواب لوٹا دو" "بہترین کہانی ہونے کی وجہ سے اور "سفال گر" بشریٰ سعید نے (اپنے تھیم کی وجہ سے) ہمیں بہت متاثر کیا۔

2- اقتباسات تو بہت سے پسند کیے پر جو اک خاص پسند آیا وہ ہے رخسانہ نگار عدنان کے ناول "محبت خواب سفر" سے۔

"تو بھی عمر بھر رشتوں کی کھوج میں بھٹکتا ہے۔ اس کے رشتوں کی بھاری گٹھڑی جس کا بوجھ وہ خوشی ڈھوتا ہے اور زندگی کے آخری پہر میں جب اسے اس گٹھڑی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ اسے کھولتا ہے۔ ایک ایک گرہ کھولتا ہے اور حیران ہو جاتا ہے کہ وہ گٹھڑی تو بالکل خالی تھی۔ ایک رشتہ "ایک ناتا" ایک بھی تعلق اس گٹھڑی میں نہیں ہوتا تو پھر وہ عمر بھر کس کا بوجھ ڈھوتا رہا؟ وہ خالی گٹھڑی اٹھا کر اتنا جھک کر کیوں چلتا تھا۔ وہ کیسا بوجھ تھا؟ گٹھڑی تو خالی تھی تب اسے پتا چلتا ہے وہ بوجھ تو اس کی اپنی خواہشوں "اپنی ہوس اور اپنی حرص کا تھا۔ اور اس آخری پہر میں آکر جب سب رشتے ناتے چھوڑ گئے تو اس خالی گٹھڑی میں حرص ہے نہ ہوس' خواہش نہ خواب 'صرف اکیلا پن اور اعمال کی فصل۔"

خبریں ویریں

تحسین نشاط

شادی مبارک

لوگوں کو پل پل کی خبروں سے آگاہ رکھنے والی عائشہ بخش کی شادی ہوئی تو اس خبر سے اکثر لوگ بے خبر ہی رہے۔ حالانکہ شادی میں دھوم دھڑکا بھی ہوا اور باجے گاجے بھی بجے۔ پتا نہیں کیوں میڈیا نے اس خبر کو زیادہ نمایاں نہیں کیا' جبکہ دوسری تیسری شادی کرنے والی اداکارائیں منگنی بھی کریں تو ہر چینل پر اس کی دھوم مچ جاتی ہے۔ عائشہ بخش نے میڈیا سائنسز میں ماسٹر کیا ہے' جبکہ ان کے شوہر عدنان امین سوفٹ ویئر انجینئر ہیں۔ میاں عدنان امین کا تعلق ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک تاجر خاندان سے ہے۔ ان کے ایک چچا میاں خالد گوجرہ یونین کونسل کے نائب ناظم بھی رہے ہیں۔ یہ مکمل طور پر ارینج شادی ہے (عائشہ اور عدنان نے ارینج نہیں کی' بلکہ بزرگوں نے کی ہے) اور دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں نے نکاح سے قبل ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں تھا۔ (عائشہ کا تو سمجھ میں آتا ہے' مگر عدنان خبریں نہیں دیکھتے کیا؟)

عائشہ اور عدنان کی شادی گزشتہ ماہ گوجرہ میں ہوئی جبکہ ولیمہ نواب شاہ میں واقع ان کے شوہر کے ذاتی فارم ہاؤس پر ہوا۔ شادی میں معروف سیاسی و سماجی شخصیات نے بھی شرکت کی۔

عائشہ اور عدنان کو زندگی کا یہ خوشگوار موڑ مبارک ہو۔

پانچ لاکھ

معروف فنکار علی اعجاز کو اداکاری کرتے ایک طویل عرصہ بیت چلا ہے۔ وہ گزشتہ چار دہائیوں سے فن کی خدمت میں سرگرداں ہیں۔ ٹی وی کے علاوہ فلموں میں بھی کام کیا' بلکہ جب آتش قدرے جوان تھا تو اس وقت کی نامور ہیروئن انجمن کے ساتھ ہیرو بھی آئے (اور فلم بینوں سے زیادہ انجمن کے صبر کو آزمایا) مشہور زمانہ گیت "وے اک تیرا پیار مینوں ملیا میں دنیا سے ہور کی لیتا۔" پردہ اسکرین پر انجمن ان ہی کے لیے گاتی نظر آئی تھیں' مگر جناب! یہ تو ان کی ہیروئن کی

قناعت پسندی تھی کہ وہ فن کے پیار کی خواہش میں ساری دنیا سے بے نیاز ہو بیٹھیں ہم علی اعجاز نے سوچا کہ

"صرف مداحوں کا پیار ہی کافی نہیں کہ اس پیار کو گھر میں تو نہیں سجایا جا سکتا ناں، سو فنی خدمات کے اعتراف کے طور پر کوئی معتبر سا ایوارڈ بھی ہونا چاہیے، جسے بطور ثبوت گھر میں سجایا جا سکے۔۔۔ اور سرکاری اعزاز سے معتبر کوئی دوسرا ایوارڈ ہو سکتا ہے بھلا۔"

اس خیال کے آتے ہی علی اعجاز نے ایوارڈ کا فیصلہ کرنے والے شعبے سے رابطہ قائم کیا کہ یہ صرف ان کی خواہش ہی نہیں بلکہ ان کا حق بھی ہے۔ مگر انہیں مایوس ہونا پڑا کہ وہاں کے کرتا دھرتا افراد نے ایک لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ کے بدلے "پانچ لاکھ روپے سکہ رائج الوقت کا حق مہر" طلب کیا۔

علی اعجاز کے زمانے میں نہ تو اتنے چینلز تھے اور نہ ہی اتنا زیادہ معاوضہ، سو ان کی عمر بھر کی کمائی مداحوں کے پیار اور چند ستائشی الفاظ کے سوا کچھ نہیں۔ یوں علی اعجاز اس ایوارڈ سے محروم رہ گئے۔ (چالیس سال تک شجر فن کی آبیاری کرنے والے معصوم فنکار علی اعجاز غالباً نہیں جانتے تھے کہ علی بابا کی کمائی کے وہ چالیس چور آج مختلف شعبوں میں تعینات ہو چکے ہیں۔)

یہ بیان کا لمانہ

"آسکر ہو یا کوئی اور عالمی اعزاز، صرف اسی صورت میں کسی پاکستانی شخصیت، ادارے، تنظیم یا این جی او کا مقدر بنتا ہے، جب زیر نظر فلم، تحقیق، کارنامے یا ادب پارے میں پاکستانی معاشرے کی کوئی گھناؤنی، متعفن اور نفرت انگیز تصویر پیش کی گئی ہو۔ یوں پاکستان کی کسی شخصیت، ادارے، تنظیم یا این جی او کے سینے پر ایک تمغہ سجا کر بظاہر پاکستان کو شاباش دی جاتی ہے، لیکن درحقیقت پاکستان کا تیزاب زدہ مسخ چہرہ ساری دنیا کو دکھا کر یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ پاکستان، درندوں کی کمین گاہ ہے جہاں اس نوع کے بھیانک جرائم معمولات حیات کا درجہ رکھتے ہیں۔"

(نقش خیال۔ عرفان صدیقی)

"بچپن سے اب تک ہم سب لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ نجات کے لیے عبادات اور وظائف ہی کافی ہیں۔ یہ اسی سوچ کا نتیجہ ہے کہ ہمارا معاشرہ بظاہر مذہبی مگر درحقیقت غیر مذہبی ہوتا جا رہا ہے۔ نفسانی خواہشات نے ہمارے دل سیاہ کر دیے ہیں۔"

(روزن دیوار سے۔ عطاء الحق قاسمی)

"سرکاری رپورٹ کے مطابق کراچی میں ایک ماہ کے دوران بھتہ نہ دینے پر 20 تاجر قتل کیے گئے۔ کراچی میں بھتہ خوری صرف ایک کارپوریٹ گروپ کے پاس تھی یعنی اس کی اجارہ داری تھی۔ اب شاید فری مارکیٹ پالیسی کے تحت دو مزید البتہ چھوٹے گروپ بھی میدان میں آ گئے ہیں۔"

(وغیرہ وغیرہ۔ عبداللہ طارق سہیل)

عدنان

دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو گا جس میں احساس کمتری نہ ہو اور شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جسے کبھی نہ کبھی یہ احساس نہ ہوا ہو، دنیا میں کئی ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جسمانی کمزوری اور معذوری کے باوجود کارہائے نمایاں انجام دیے۔ عصمت انونو کان سے ذرا بہرے تھے لیکن اس جسمانی کمزوری کی انہوں نے پروا نہ کرتے ہوئے ترکی کو بچایا اور ترکی قوم کے نجات دہندوں میں سے ایک ہیں۔ امریکہ کے صدر روزویلٹ بچپن میں منحنی جسم کے انسان تھے۔ جس کا اثر ان کی ابتدائی زندگی اور شخصیت پر نمایاں رہا لیکن انہوں نے طاقت حاصل کرنے کے لیے میدان عمل میں سرگرمی دکھائی، جو ان کی شخصیت اور خود اعتمادی کے رنگ میں ظاہر ہوئی۔

صرف احساس کمتری کوئی بات نہیں اگر کوئی چیز ہے تو وہ ہمارا احساس کمتری کے متعلق رویہ ہے کہ اس سے ہم کس طرح اثر لیتے ہیں۔ اگر اس احساس کا مقابلہ، ذرا جرات سے کیا جائے تو اس سے انسان اعلیٰ بلندی پر پہنچ سکتا ہے۔ لیکن جب یہ احساس کمتری شخصیت پر تسلط جمائے تو پھر اس کا اثر ہمارے کردار پر بہت برا ہو گا اور صحت بھی خراب ہوتی جائے گی۔

انسان سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ جو چیز انہیں ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ ان کی انفرادیت، ذاتی جوہر، صلاحیت اور استعداد ہے اور یہی صلاحیتیں انہیں ایک دوسرے سے مختلف کرتی ہیں، جن میں سب ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں اور یہ قدر مشترک کا درجہ رکھتی ہیں۔

احساس کمتری کے شکار لوگوں کا علاج یہ ہے کہ اپنے آپ میں ایسی صفات پیدا کریں کہ دوسرے انہیں عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھیں جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ان میں عزت نفس کا جذبہ ترقی پائے گا۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکے گا جب وہ زندگی کا مقابلہ جرات اور استقلال سے کریں۔ گو ایسا کرنے میں انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن آخر کار ان کی محنت اور کوشش رنگ لائے گی اور وہ اپنا مقام حاصل کر لیں گے۔

بعض لوگ زندگی کے ایسے ہدف مقرر کر لیتے ہیں جن کا حاصل کرنا محال ہوتا ہے پھر اس کے لیے بے کار کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ نتیجہ سوائے مایوسی کے انہیں کچھ نہیں ملتا۔ مایوسی انہیں زندگی سے بیزار کر دیتی ہے۔

لیکن جب کسی اعلیٰ اور صحیح مقصد کے لیے کوشش کی جائے تو اس کوشش میں ایک راحت محسوس ہوتی ہے اور یہ کوشش ہی آپ کا صلہ ہوتی ہے، خواہ اصل مقصد نہ بھی حاصل ہو سکے لیکن اس کے برخلاف جو کوشش ذاتی نمائش اور بے فائدہ باتوں کے لیے کی جائے اس کا نتیجہ آخر کار ناامیدی ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ شخص چڑچڑا، مایوس اور صحت میں کمزور ہو جاتا ہے۔

شازیہ

شازیہ بہن" آپ جن حالات میں سے گزر رہی ہیں۔ یہ مسئلہ تو ہے اور اہم مسئلہ ہے لیکن اس مسئلے سے بے شمار گھرانے دوچار ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آدمی خود کو بیمار ڈال لے یا قنوطی ہو جائے کیونکہ بیمار ڈال لینے کی صورت میں یا قنوطی ہو جانے کی شکل میں مشکلات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرے۔ پہلا شکر تو اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے انسان کی شکل میں پیدا کیا۔ دوسرا شکر اس بات کا کہ ناک، کان، آنکھیں، ہاتھ اور جسم عطا کیا۔ بھائی، بہن اور تعلیم اور دوسری نعمتوں سے نوازا۔ رہی وہ محرومی جس کا ذکر آپ نے کیا ہے تو ہر بات کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے اور وہ وقت کسی وقت بھی آسکتا ہے۔

مشہور مفکر ڈاکٹر ماؤرن نے لکھا ہے۔

"جیسا ہم سوچتے ہیں ویسا ہی بن جاتے ہیں۔ ہماری زندگی ہمارے خیالات سے عبارت ہے۔ اپنی امید سے بڑھ کر آپ کچھ حاصل نہیں کرسکتے۔ بہت سے لوگ اپنی مایوسیوں ہی کے باعث اپنی خداداد صلاحیتوں کو ناکارہ کر لیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے ہمیشہ اپنی غریبی، دوستوں کی کمی وغیرہ ان گنت مایوسیوں کا تصور کر کے وہ خود اپنی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔"

ایک بڑے مفکر نے ان الفاظ میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔

"اپنی امیدوں سے زیادہ آپ نہیں بن سکتے۔"

ن۔ آ۔ ک

اچھی بہن! آپ نے ایف ایس سی کے پارٹ ون میں بہت اچھے نمبر لیے۔ پوری محنت کی کیونکہ آپ ڈاکٹر بننا چاہتی تھیں سیکنڈ ایئر میں آنے کے بعد آپ نے پڑھائی پر توجہ نہ دی جب پانچ چھ ماہ گزر گئے تو آپ کو وقت ہاتھ سے نکلنے کا احساس ہوا۔ یہ احساس اتنا شدید تھا کہ اس کے آپ کے ذہن پر اثرات ہوئے اور آپ کو لگا کہ آپ کا دماغ "سن" ہو گیا ہے۔ اگر اسی وقت آپ دوائیں لے لیتیں تو یہ مسئلہ حل ہو جاتا لیکن آپ کی امی آپ کو پیر کے پاس لے گئیں۔ پیر نے یقین دلایا کہ آپ پر تعویذ نہیں کرائے گئے لیکن آپ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ امتحان میں ناکامی کے خوف نے آپ کو شدید ڈپریشن میں مبتلا کر دیا۔ ڈاکٹر کے پاس گئیں۔ اس کی دوائیوں سے آپ کو فائدہ ہوا لیکن آپ نے کچھ عرصہ استعمال کر کے دوائیں چھوڑ دیں۔ یہیں آپ سے غلطی ہوئی۔

ذہنی امراض میں دوائیں ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر نہیں چھوڑنا چاہئیں اور ایک دم سے نہیں آہستہ آہستہ چھوڑنا چاہئیں۔

اب آپ ڈاکٹر کی دوائیں استعمال کر رہی ہیں لیکن فائدہ محسوس نہیں ہو رہا ہے۔

آپ کے لیے مشورہ یہ ہے کہ آپ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دوائیں جاری رکھیں۔ سائیڈ ایفیکٹ نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے آپ پر دوا اثر نہیں کر رہی اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جسم میں قوت مدافعت بڑھ گئی ہے۔

اپنے ذہن کو ہر فکر اور پریشانی سے آزاد کر دیں۔ امتحان ہمنبر ہوا ڈاکٹر بننا ان سب سے اہم آپ کی ذہنی صحت ہے۔ سب سے اچھی بات سب کچھ اللہ تعالیٰ پر چھوڑنا ہے۔ اللہ جو کچھ کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے۔ اس نے یقیناً" آپ کے لیے بہت اچھا رکھا ہے دوائیں باقاعدگی سے استعمال کریں۔ آپ کا مسئلہ زیادہ سیریس نہیں ہے۔ ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گی۔

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

www.paksociety.com
www.Paksociety.com

ہری سبزیاں، پھل، دودھ، پنیر وغیرہ کا استعمال زیادہ کریں۔

خشکی کے لیے اینٹی ڈینڈرف شیمپو بازار میں ملتے ہیں لیکن اسے گھریلو نسخوں سے بھی دور کیا جاسکتا ہے۔

ایک مگ پانی میں کھانے کے دو چمچ جو کا سرکہ حل کرلیں۔ شیمپو کرنے کے بعد اس پانی سے بالوں کو دھولیں اور تولیے سے بال خشک کرلیں۔

چائے کے دو چمچ میتھی کے بیج پانی میں رات بھر کے لیے بھگودیں۔ صبح ان بیجوں کو پیس کر ان کا پیسٹ بنالیں اور پھر سر پر مل کر آدھے گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ اس کے بعد بال دھولیں۔

مریم رضوانہ..... ڈگری

س۔ میری عمر 24 سال ہے۔ میرا وزن زیادہ نہیں ہے۔ قد کے لحاظ سے مناسب ہے لیکن اس کے باوجود میں موٹی لگتی ہوں اس کی وجہ بڑھا ہوا پیٹ ہے۔ چہرہ بھی بے رونق اور رنگت پھیکی سی ہے۔ کوئی ایسا نسخہ بتائیں کہ میرے یہ مسئلہ حل ہوجائے کہ میں اس کی وجہ سے اپنی عمر سے بڑی لگتی ہوں۔

ج۔ آپ کے ... درست نہ ہونا ہے۔ غذا جزو بدن نہ بننے کی وجہ سے چہرہ بے رونق اور پیٹ بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔

آپ اپنا معمول بنالیں کہ اپنے دن کا آغاز لیموں سے کریں۔ نیم گرم پانی کے ایک گلاس میں ایک چائے کا چمچ شہد ڈال کر اسے میٹھا کرلیں پھر اس میں ایک لیموں نچوڑ کر پئیں۔ یہ آپ کے پورے نظام کی صفائی کردے گا اور قبض کو دور کردے گا۔ کچھ دنوں میں آپ محسوس کریں گی کہ پیٹ کم ہوگیا ہے اور چہرے پر تازگی اور چمک پیدا ہوگئی ہے۔

کھیرے کا جوس، لیموں کا رس اور عرق گلاب برابر مقدار میں لے کر ملالیں اور اسے چہرے پر لگائیں۔ پانچ منٹ بعد چہرہ دھولیں۔ یہ ٹانک چہرے کا پھیکا پن دور کرتا ہے۔

عفت محمود

بیوٹی بکس

طیبہ اقبال..... لکھوڑ منڈی

س۔ میرے سر میں خشکی ہوگئی ہے پہلے تھوڑی کم تھی، سفید رنگ کے چھلکے سے اترتے تھے لیکن اب دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے، بال بھی جھڑنے لگے ہیں۔

ج۔ بالوں میں خشکی یا ڈینڈرف کی بنیادی وجوہات یہ ہیں۔ غیر متوازن غذا، ذہنی پریشانی یا ٹینشن، ہارمونز کا مسئلہ یا غلط شیمپو یا تیل کا استعمال۔

آپ پہلے ان وجوہات پر توجہ دیں۔ اگر ان میں سے کوئی وجہ ہے تو اسے دور کریں۔ خود کو پرسکون رکھیں بالوں کی صفائی کا خاص خیال رکھیں۔ تیز شیمپو استعمال نہ کریں۔ ہفتہ میں دو یا تین دفعہ اچھی طرح کنگھی کرکے دھوئیں۔ بال دھونے سے پہلے کسی اچھے تیل سے سر کا مساج کریں۔

گھی اور چربی کا استعمال کم کردیں۔ خشک میوہ، چاکلیٹ، تلی ہوئی چیزیں، مچھلی وغیرہ بھی کم کھائیں۔

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening ,or you find any issue in using site send your complaint at
admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121
www.Paksociety.com